جسٹس عبدالمجید ملک

چیف جسٹس عدالت العالیہ ، آزاد جموں کشمیر

جسٹس عبد المجید ملک

چیف جسٹس عدالت العالیہ ، آزاد جموں کشمیر

خود نوشت

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کے جملہ حقوق برائے اشاعت بحق شوکت مجید ملک کے پاس محفوظ ہیں

بغیر اجازت کسی بھی قسم کی اشاعت ممنوع ہے خلاف ورزی پر قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے

ناشر:	شوکت مجید ملک
اہتمام	معاذ ہاشمی
نام کتاب	جسٹس عبدالمجید ملک ریٹائرڈ چیف جسٹس عدالت عالیہ، آزاد جموں کشمیر خودنوشت
آرٹ ڈائریکٹر	خواجہ افضل کمال
ڈیزائن اینڈ لے آوٹ	آرٹ ورکس انٹرنیشنل
سن اشاعت	2021ء
قیمت	-/1000 روپے
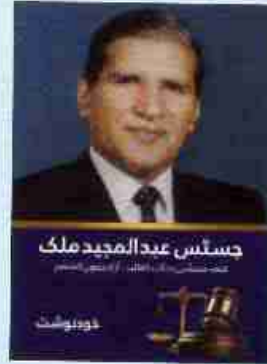
برائے رابطہ:

شوکت مجید ملک 0335-2630008

شاہد مجید ملک 0345-4148921

ارشد مجید ملک ایڈووکیٹ 0345-9604907

پتہ: مکان نمبر ۳۸ سیکٹر بی-۲ میرپور آزاد جموں کشمیر

176, Basement, Ali Market,
Opp. Bible Society,
New Anarkali, Lahore Pak.
Cell: 0092 309 5005471

جسٹس عبدالمجید ملک

مصنف اپنی والدہ محترمہ خانم بیگم کے ساتھ

مصنف کے والدگرامی

ملک محمد لطیف خان

مصنف کی والدہ

محترمہ خانم بیگم

مصنف کے چھوٹے بھائی ملک محمد ایوب خان
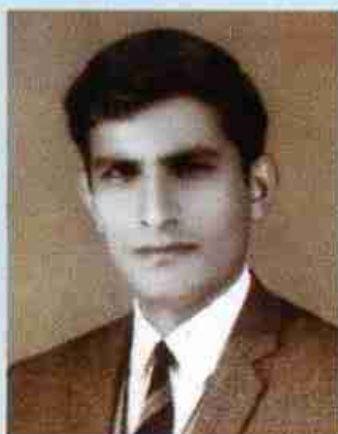
مصنف کے چھوٹے بھائی محمد یعقوب ملک
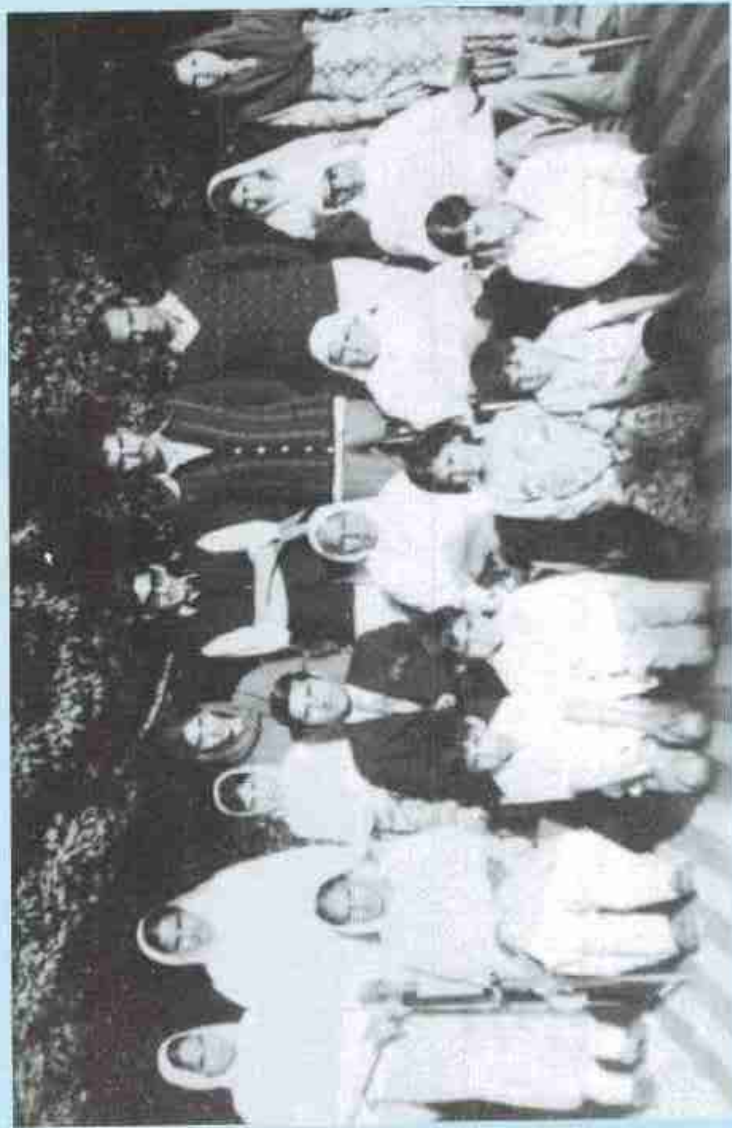
مصنف کی فیملی، امی جان محترمہ خانم بیگم خالہ اقبال بیگم، ہمشیرہ زبیدہ بیگم، خالہ زمان بیگم، خالہ ولایت بیگم، چھوٹا بھائی محمد ایوب، ملک رؤف، بیٹے شوکت مجید شاہد مجید، ارشد مجید، فرحت مجید، یاسمین مجید، عذرا مجید، نجمہ مجید اور دیگر

مصنف اپنی بیگم بلقیس مجید کے ہمراہ حج کے موقع پر ۱۹۷۹ء میں جبل عرفات پر

جسٹس مجید ملک اپنے بیٹے شوکت مجید سیکرٹری آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر کے ہمراہ

جسٹس مجید ملک و اہل خاندان کی ڈاکٹر عائشہ شوکت و ڈاکٹر آمنہ شوکت کی گریجویشن کے موقع پر دی گئی دعوت کے موقع پر لی گئی تصویر

جسٹس مجید ملک

بحیثیت طالب علم گورنمنٹ کالج لاہور 1954ء

جسٹس مجید ملک

بحیثیت طالب علم گورڈن کالج راولپنڈی 1952ء
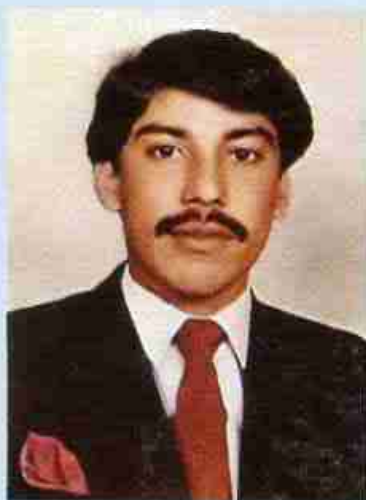
ارشد مجید ملک

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

شاہد مجید ملک

سیاستدان

گورنمنٹ کالج لاہور میں دوستوں کے ہمراہ

مصنف جسٹس مجید ملک گورنمنٹ کالج لاہور میں دوستوں کے ہمراہ۔
کھڑے دائیں سے محمد نواز مخدوم، بشیر حسین بھٹی، غلام نبی رانجھا، محمد اکبر اور تجمل حسین
بیٹھے ہوئے دائیں سے شیخ آفتاب، شیخ مشتاق حسین، سید عبد العزیز شاہ اور افضل ایچ نقوی

مولانا عبداللہ سیاکھوی

ملک فیض عالم نمبردار (مصنف کے نانا جان)

سردار بدھ سنگھ (وزیر وزارت)

راجہ محمد اکبر خان

وید بھسین (ایڈیٹر انچیف کشمیر ٹائمز، جموں کشمیر)

کامریڈ، کرشن دیو سیٹھی

فہرست ابواب وعنوانات

انتساب

پیاری امی مرحومہ، محترم ابو مرحوم
کے نام

عبدالمجید ملک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمت دا مینہ پا خدایا باغ سُکا کر ہریا
بُوٹا آس امید میری دا کر دے میوے بھریا
سدا بہار دئیں اس باغے کدے خزاں نہ آوے
ہوون فیض ہزاراں تائیں ہر بھکھا پھل کھاوے
میاں محمد بخشؒ

تعارف نوشت

تخلیق کائنات میں انسان کو احسن واشرف خلق کا اعزاز حاصل ہے۔ انسان کو دنیا میں مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی نمایاں اور امتیازی صفت یہ ہے کہ انسان کی مشیت میں اختیار اور انتخاب کی آزادی ہے، دنیا اس کی امتحان گاہ ہے۔ دنیا عیش وعشرت کے محبوبوں سے مالا مال اور انسان کو زر کے خزانوں، نوادرات کے انبار، عالی شان محلات نیز ہر طرح کی زینت وسجاوٹ سے سرشار کرتی ہے۔ انسان حکمرانی اور اقتدار کی منزل حاصل کرنے پر امانت، دیانت، عفت، حق شناسی، پاکیزگی اور تزکیہ میں توازن قائم رکھنے میں جوابدہ ہے۔ انسان کے بااختیار ہونے پر اس کے اختیار کردہ اوصاف واصول، اس کا امتحان ہیں۔ خود پسندی اور خودنمائی انسان کی جبلت میں ہے، مگر اس میں اعتدال اور توازن رکھنا بہتر وصف ہے۔ البتہ اس سے اجتناب اور عجز وانکساری میں عظمت ہے، جس کا انحصار علمی، ادبی اور احسن اخلاقی تربیت پر ہے۔ جس طرح انسان کے عمر بھر کے افعال واعمال کا احتساب وحساب لازم ہے، اس کے قریب قریب اور ملتا جلتا معیارِ خودنوشت کا بھی ہے۔ خودنوشت بھی انسان کے کارناموں، خطاؤں کا عکس ہوتی ہے۔ اپنے اعمال کے اظہار میں سچائی اپنانے میں عظمت ہے۔ اس کا مشکل پہلو یہ ہے، کہ خودنوشت انسان کے ذاتی مشاہدات اور تاثرات کی عکاس ہوتی ہے اور ذاتی مشاہدات اور معلومات کا معیار اور سطح، مصنف کی عقل وعلم، شعور و ذہانت کے معیار اور ادراک کے تابع ہوتا ہے۔ جب کہ افعال و واقعات میں شریک دیگر شخصیات کے تاثرات اور تجزیات، ان کے اپنے زاویہ نگاہ اور ادراک کے تابع ہوسکتے ہیں۔

خودنوشت کا اول حصہ ''پہچان'' میں میرپور بالخصوص علاقہ اندرہل خاص اہمیت کا حامل ہے، اس کا قدرتی حسن، معاشرہ کے خدوخال، رسم ورواج، عوام میں باہمی محبت وپیار، خلوص اور رواداری خاص کر مہمان نوازی اور اعلیٰ اخلاق کا ذکر ہے۔ حب الوطنی سے سرشار اندرہل کے لوگ، قدیم ایام سے مرچنٹ نیوی سے منسلک ہونے کی وجہ سے امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں منتقل ہونے شروع ہوئے۔ بعد میں یورپ اور خاص کر انگلینڈ میں آباد ہوئے۔ اب تو دنیا کے ہر ملک میں کاروبار کرتے ملتے ہیں۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے۔ لوگ شروع سے متمول

ہیں۔ابول الفضل نے آئین اکبری میں اندر مل کو بڑا پرگنہ دکھایا ہے۔ یہاں کے عوام نے تعلیم میں ترقی کی ہے۔ اس باب میں میرے بچپن کے مشاہدات، تعلیمی ماحول اور اداروں کا ذکر ہے۔اسی طرح اس دور کے عوامی مسائل اور پاکستان کے قیام، جموں کشمیر کی آزادی وسیاسی قیادت سے متعلق واقعات کا احاطہ ہے، زیادہ حصہ میرے گاؤں اور خاندان سے متعلق ہے۔

دوسرے باب میں وکالت کے شعبہ سے منسلک ہونے، لاہور میں اول سردار محمد اقبال صاحب اور بعد میں ایس ایم ظفر صاحب کے ساتھ وکالت کے دو سال گذارنے کے بعد منگلا ڈیم میں جائیداد متاثر ہونے، نئے شہر میں مکان تعمیر کرنے اور منتقل ہونے کی وجہ سے میرپور میں وکالت شروع کرنے پر مشکلات، منگلا ڈیم کی تحریک میں قید، مقدمات میں کامیابی پر شہرت، بحیثیت صدر میرپور بار جنرل چشتی اور دیگر جرنیلوں کے سامنے پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ کے خلاف تقریر اور دیگر متعلقہ واقعات کا ذکر ہے۔

تیسرا باب میرے انکار کے باوصف ہائی کورٹ جج کے عہدہ پر تقرری۔ پہلے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا تقرری کرنا اور بعد میں جنرل ضیاالحق نے جنرل فیض علی چشتی کی مشاورت سے تقرری کی۔ سپریم کورٹ میں دو دفعہ تقرری۔ چیف جسٹس کے عہدہ پر تقرری۔ ہائی کورٹ وکسٹوڈین اور متعدد مقامات پر ماتحت عدالتوں کی عمارات کی تعمیر، میرپور، کوٹلی، راولاکوٹ اور مظفرآباد میں وکلا چیمبرز کی تعمیر، عدلیہ کے کام اور نظام میں اصلاحات اور ماتحت عدلیہ کے حق میں مراعات کے واقعات اس حصہ میں شامل ہیں۔

جس ماحول میں شعور میں پختگی اور وسعت شروع ہوئی وہ دور تحریک پاکستان اور تحریک آزادی جموں کشمیر کے عروج کا دور تھا۔ سکولوں، کالجوں، دیہاتوں، شہروں میں ہر شخص آزادی کے جذبہ سے سرشار تھا نوجوان ہمہ تن پُرجوش زیادہ متحرک تھے۔ آخری حصہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں جموں کشمیر جدید ریاست کے قیام، معاہدہ امرتسر، معاہدہ لیز گلگت، راجوں مہاراجوں کی ریاستوں سے متعلق کیبنٹ مشن کا پلان۔ وزیراعظم برطانیہ کا، برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بیان، ہندوستان پاکستان کی آزادی کا ۳ رجون کا اعلان قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء، مہاراجہ کی پالیسی، کانگریس سے رابطہ، پٹیل سے خفیہ خط وکتابت، حکومت آزاد کشمیر اور آزاد فوج کا قیام، جہاد آزادی کا آغاز، قبائلی لشکر کا حملہ، ہندوستانی فوج کا حملہ، پنڈت نہرو کے لیاقت علی کے نام ٹیلیگرام، قائداعظم مونٹ بیٹن مذاکرات، مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں، ہندوستان کا استصواب رائے سے انحراف، سندھ طاس معاہدہ و معاہدہ شملہ کے اثرات، دو طرفہ مذاکرات میں تعطل اور ناکامی، ریاست کی جغرافیائی و سیاسی اکائی، ریاست کی خود مختار حیثیت، حکومت آزاد کشمیر کی حیثیت اور بطور متوازی یا متبادل حکومت، آزاد کشمیر کے پلیٹ فارم سے آزادی کی تحریک چلانے کی تجویز۔ لبریشن لیگ قائم کرنے کا کا مدعا، اس کے عروج وزوال کی وجوہات اور ریاست کو لائن

آف کنٹرول کی سطح پر تقسیم کے اقدامات وخدشات کا تجزیہ اور تجاویز شامل ہیں۔ ہندوستان پاکستان کی رواں کشمیر پالیسی اور دریاؤں کے پانی کے مستقبل پر تجزیہ اور ثبوت وتجاویز نا قابل تردید ہیں۔ ان تمام مرحلوں میں میری شمولیت اور ذاتی معلومات کے حوالہ جات کا ذکر ہے۔

جسٹس (ر) عبدالمجید ملک

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند!
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی نا خوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

اقبال

باب اول

پہچان

وسط ایشیا کے جنوب مشرق میں کوہ ہمالیہ، قراقرم کے جنوب میں پیر پنجال کی برف پوش چوٹیوں اور بلند ٹیلوں کے حصار میں سرسبز، وسیع و عریض وادیوں کی آغوش میں بہتے دریاؤں، آبشاروں، چشموں، جھلملاتی خوب صورت جھیلوں، جھرنوں، گلیشیرز اور پھولوں سے آراستہ دھرتی کو کشمیر کا نام دیا گیا۔ اس اسم بامسمّیٰ قطعہ نے پانچ ہزار سال سے زائد مدت اپنے تشخص اور شہرت کا تاریخ عالم میں نام و مقام حاصل کیا۔ اس کے سپوت للہ دتیہ نے پنجاب، کابل، قندھار اور چینی ترکستان کو کشمیر میں شامل کر کے حکمرانی کی (۲۵ء-۸۳ء)۔ ۱۳۳۹ء میں شاہ میری سلطانی دور میں جب سلطنت سکڑ گئی تھی سلطان شہاب الدین نے ماضی کی تاریخ دہرا کر تبت، لداخ، پنجاب، پشاور، کابل، قندھار، بدخشاں اور چینی ترکستان تک اپنی حکومت کو وسعت دی (۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۳ء)۔ مرورِ زمانہ اور تاریخ کے مدوجزر نے وہ لمحات لائے جب تاج برطانیہ کی حکمرانی کا سورج ہندوستان پر طلوع ہوا اور جموں کے ڈوگرہ ہندو جاگیردار کو ۱۶/ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت فاتح برطانوی حکمرانوں نے، کشمیر اور ملحقہ علاقوں کا اختیار حکمرانی منتقل کیا اور ڈوگرہ نے کشمیر کے ساتھ جموں شہر کے نام کی ایف لگا کر، اس کو ریاست جموں کشمیر کی اضافی یا نئی پہچان دی۔ چنانچہ اس ملک کی شناخت جموں کشمیر طے پائی۔

میرپور سے ۹ میل کے فاصلہ پر دریائے پونچھ کے دائیں مغربی سمت اور دریائے جہلم کے بائیں مشرق اور جنوب میں سلسلۂ پیر پنجال کی ۳۵۰۰ فٹ بلند اور جنوب میں ۲۰۰۰ فٹ سر اٹھاتی سنگلاخ چوٹیوں اور ٹیلوں کے دامن سے ۹ سے ۱۲ میل مشرق و مغرب اور شمال و جنوب بیضوی شکل میں طشتری نما وادی اندرہل، کم و بیش ایک لاکھ جفاکش تنومند متمول عوام کی مسکن وادی، بہت خوب صورت اور جاذب نظر خطہ ہے۔ قریب ایک سو چھوٹے بڑے دیہاتوں اور وادی کے عین وسط میں ڈڈیال شہر پر مشتمل علاقہ ہر لحاظ سے انوکھا اور اپنی مثال آپ آبادی، یہاں منگلا ڈیم کی تعمیر سے قبل کی ہیئت ظاہر کرتی ہے۔ ڈیم کی تعمیر کے اثرات کی وضاحت بھی بتدریج بیان ہوگی۔ ماضی اور حال کا امتزاج خود بخود منظر پر آتا جائے گا۔

چوکھ شہر

اندرہل میں جموں اور میرپور سے بھی قدیم ترین قصبہ یا شہر، چوکھ تھا۔ اپنے عروج میں اس کی وسعت اوناع سے سیا کھ تک کم و بیش چھ میل طویل دریا پونچھ کے دائیں کنارے پر پھیلی ہوئی تھی۔ قدیم آثار میں مندر، مسجد،

سکول اور پولیس تھانہ کے علاوہ میل برابر احاطہ میں قدیم قبرستان اور مسلمان حکمران کا بلند و بالا مزار، جس کو مقامی طور پر حجرہ یا جیرہ کا نام دیا گیا تھا۔ اینٹوں اور چونہ سرخی سے تعمیر شدہ، ہندوستان و پاکستان میں قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ منگلا ڈیم میں پانی کی سطح نیچے ہونے پر صحیح سلامت منظر پر آ جاتا ہے۔ اس کے مرکز میں بلند و بالا قبر ہے اور سمتوں میں چند دیگر قبریں ہیں۔ عمارت میں دیواروں پر عربی اور فارسی میں تحریریں کندہ ہیں جو صحیح پڑھی نہیں جاتیں۔ ان میں قرآنی آیات بھی شامل ہیں۔ میں اس کے اندر کئی بار گیا اور فاتح خوانی کے ساتھ جائزہ بھی لیتا رہا مگر صحیح معلومات نہ مل سکیں۔ اندرہل میں ڈوگرہ عہد میں، چونکہ شہر میں پولیس سٹیشن قائم تھا اور ابتدا میں پرائمری سکول بھی یہاں پر قائم ہوا تھا۔ ملک فیض عالم، میرے نانا جان نے اسی سکول میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی۔ چونکہ شہر بتدریج شکست و ریخت کا شکار ہو کر سکڑتا گیا۔ قدیم تاریخ میں پنجاب سے کشمیر جانے کے راستوں میں گجرات بھمبر کے علاوہ، جہلم چوکھ، سہنسہ، کوٹلی، پونچھ، علی آباد، اوڑی، بارہمولہ، کشمیر کا راستہ بھی معروف تھا۔ جب کہ پشاور ہزارہ، مظفرآباد اور راولپنڈی مظفرآباد کے دوسرے راستے بھی تھے۔ ایک راستہ بھمبر راجوری، بہرام گالہ شوپیاں کشمیر بھی زیر استعمال تھا۔ جموں بانیہال کشمیر شاہراہ بعد میں تعمیر ہوئی تھی۔

ڈڈیال شہر

اندرہل وادی کے مرکز میں ڈڈیال شہر قائم تھا۔ اس کے شمال میں موہڑہ بخشیاں، جنوب مغرب میں محلہ راجگان اور جنوب مشرق میں محلہ ملکاں وسیداں تھا۔ جن کے مرکز میں شمالاً جنوباً ڈڈیال کا تجارتی مرکز تھا۔ مرکز میں اکثریت میں سکھ اور چند ہندو مہاجن خاندان آباد تھے۔ مکانات تین اور دو منزلہ تھے۔ نچلے حصہ میں بڑی بڑی دکانیں اور سٹور اور اوپر رہائش تھی۔ مسلمان تاجر چند ایک ہی تھے۔ بازار پختہ اور صاف ستھرا تھا۔ ریاست میں یہ جدید ترین شہر کہلاتا تھا۔ ڈڈیال شہر کے شمال اور جنوب میں پختہ تالاب اور کنویں تعمیر شدہ تھے۔ تالابوں پر پیپل، بڑ اور کیکر کے بڑے بڑے پیڑ تھے۔ گرم موسم میں ان کی چھاؤں میں میلے کا سماں ہوتا۔ چٹائیاں اور چارپائیاں بچھا کر لوگ مختلف کھیل تاش، چوپڑ، لڈو وغیرہ کھیلتے اور ہارمونیم پر لوک گیت گاتے اور عصر تک محفل رہتی۔ گاؤں کے لوگ اشیا کی خرید کے علاوہ صرف تفریح اور میل ملاپ کے لئے بھی جمع ہوتے۔ ڈڈیال کی تجارتی منڈیاں گوجرخان، دینہ، سہنسہ، کوٹلی اور میرپور تھیں۔ بار برداری خچروں اور گدھوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ راستے کچے اور پگڈنڈیوں کی شکل میں پیدل چلنے کے لئے تھے۔ موجودہ سڑکیں آزادی کے بعد تعمیر ہوئی ہیں۔ منگلا ڈیم کی تعمیر سے قبل ڈڈیال او میرپور کے درمیان فاصلہ چوکھ پتن کے راستے ۱۲ میل اور پنیام پتن کے راستے صرف ۸ میل تھا۔ دینہ ۱۴ میل اور گوجرخان ۱۶ میل تھا۔ سفر پیدل ہوتا تھا۔ صرف چوکھ پتن سے میرپور تک تانگہ کی سہولت میسر تھی۔

چار چیف جسٹس صاحبان کی دھرتی

اندر ہل کو اعزاز حاصل ہے، کہ اس خطہ سے ۱۹۷۸ء میں جج ہائی کورٹ اور ۱۹۸۳ء میں چیف جسٹس کے عہدہ پر، سب سے اول مجھے فائز کیا گیا۔ اس کے بعد چوہدری شیر زمان جج اور چیف جسٹس ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ ان کے بعد قاضی عبدالغفور جج ہائی کورٹ، محمد یونس سرکھوی جج اور چیف جسٹس سپریم کورٹ، چوہدری محمد تاج، چوہدری منیر حسین اور شیراز کیانی، یکے بعد دیگرے جج ہائی کورٹ اور چوہدری بوستان سیشن جج مقرر ہوئے۔ میرا بیٹا شوکت مجید سیکریٹری حکومت اور ملک طارق عزیز چیف انجینئر برقیات مقرر ہوئے۔ وکلاء اور پروفیسرز کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ڈوگرہ عہد اور اس سے قبل علاقہ کے عوام، پیشہ زراعت سے منسلک تھے۔ محدود تعداد میں فوج میں بھی تھے۔ کاشتکاری کے بعد دوسرا بڑا شعبہ مرچنٹ نیوی یعنی تجارتی بحری جہازوں کی سروس کا تھا۔ جس سے لوگ منسلک تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندری تجارت کے احیا سے ہی اندر ہل کے لوگ، مرچنٹ نیوی کی سروس میں شامل ہوئے اور ہندوستان میں انگریز اقتدار کے سبب انگریزوں کی تابع کالونیوں کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں اندر ہل کے لوگ آباد بھی ہو گئے۔ برطانیہ کو تو دوسرا گھر بنا لیا۔ اسی طرح امریکہ میں بھی آباد ہو گئے۔ اب تو دنیا کے ہر ملک میں ہمارے لوگ موجود ہیں۔ میرپور، کوٹلی، بھمبر، پونچھ اور پنجاب کے خطہ کے لوگ گذشتہ پچاس سال سے غیر ممالک میں گئے ہیں، البتہ بنگال اور سرحد کے لوگ آزادی سے قبل بیرون ممالک گئے تھے۔ اندر ہل کے لوگوں کو کولمبس کا خطاب بھی حاصل ہے۔

موہڑہ ملکاں

موہڑہ سے مراد بستی ہے اور ملک گکھڑ زئی پٹھان قبیلہ کی آبادی کی وجہ سے نام موہڑہ ملکاں سے پہچان یا شہرت ہے۔ ملک عطا محمد خان اور اس کا بیٹا غلام محمد خان جو غزنی سے لاہور میں آباد تھے، نا جانے کب لاہور سے اس علاقہ میں آباد ہوئے جہاں اب نیو ڈڈیال شہر تعمیر ہے۔ ابتدائی طور اسی جگہ آباد ہوئے۔ ہماری اراضیات کی حد یہاں سے شروع ہو کر، پرانے ڈڈیال شہر اور مشرق میں اوناح، موہڑہ کنیال اور اب گاؤں تک سینکڑوں ایکڑ زمین کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی جو ڈیم کی نذر ہو گئی۔ گاؤں صرف پچیس گھروں پر مشتمل، ڈڈیال شہر سے نصف میل دوری پر شمال مغرب میں واقع تھا۔ اس دور کے مطابق سب سہولتیں میسر تھیں۔ ڈڈیال میں ہوٹل نہ تھے۔ سفر کرنے والے، واقف کار لوگوں کے ہاں اور اجنبی مسجد میں رات بسر کرتے۔ ملک فیض عالم گاؤں میں نمبردار تھے۔ ان کا مہمان خانہ مشہور تھا۔ لہٰذا ریاست کے ہر حصہ سے حکومتی اہلکار اور سیاستدان یہاں ہی قیام کرتے۔ مہمانوں کی آمد روزانہ ہوتی۔ گاؤں کی شہرت کی دوسری وجہ، اسلامی تعلیم کا مکتب تھا۔ ابتداً ڈوگرہ عہد میں صرف چوکھ میں پرائمری سکول تھا۔ بہت

بعد، ڈڈیال میں پرائمری سکول قائم ہوا، جو بعد میں مڈل کے درجہ تک پہنچا۔ چنانچہ گاؤں میں مکتب کے قیام کی وجہ سے علاقہ کے بچوں کو اسلامی تعلیم کی سہولت حاصل تھی۔ ملک سلطان علی اور ان کے بعد ملک فیض عالم اس کے اخراجات اٹھاتے۔ مولوی اخوندزادہ معروف معلم تھے۔ معروف علماء مولوی عبداللہ سیاکھوی، حکیم مولوی حیات علی، قاضی محمد صادق گلہار شریف والے، چورہ شریف کے پیر روشن دین اور دیگر متعدد علماء نے ابتدائی تعلیم یہاں ہی حاصل کی تھی۔ ابتدا میں علاقہ کے لوگ نماز جمع میر پور میں ادا کرنے آتے تھے۔ ڈوگرہ عہد میں ۱۹۳۱ء کی تحریک عدم ادائیگی لگان کے بعد نانا جان ملک فیض عالم نے اراضی وقف کی اور جامع مسجد تعمیر کی، جس پر ڈڈیال میں نماز جمع شروع ہوئی اور اسلامی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم ہوا، لائبریری بھی بنی۔ مولوی عبداللہ سیاکھوی صاحب امام مقرر تھے جن کی قبر مسجد کے ملحق ہے۔ ڈیم میں مسجد کے آثار موجود ہیں۔ ان اداروں کے سبب موہڑہ ملکاں کو شہرت حاصل رہی۔ منگلا ڈیم کے بعد گاؤں کے لوگ نئے ڈڈیال شہر میں منتقل ہو گئے ہیں مگر گاؤں کی مسجد، مکان، کنویں اور قبرستان کے تمام آثار بدستور موجود ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے یہ بستی آباد کی تھی۔

میرے ابا جان

ملک عطا محمد خان کے بعد غلام محمد خان، ان کے بعد ملک شمس خان کے بیٹے ملک سلطان علی خان، ملک حشمت علی خان اور ملک نوازش علی خان تھے۔ ملک سلطان علی کا بیٹا ملک فیض عالم خان، ملک حشمت علی کا ملک فضل حسین خان اور ملک نوازش علی خان کا بیٹا ملک محمد لطیف خان تھے۔ ملک محمد لطیف خان میرے والد، تین بہنوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ چھ سال کے تھے جب والد فوت ہوئے اور ایک سال بعد محترمہ عطر قلی والدہ بھی وفات پا گئیں۔ پیدائش ۱۸۸۷ء اور وفات ۱۰ جون ۱۹۸۲ء میں ہوئی۔ چھ فٹ قد، سانولہ گندمی رنگ، تنومند جسم، کتابی چہرہ، لبوں پر مستقل مسکراہٹ، سفید لباس میں ملبوس خوب صورت پُر وقار اور رعب دار شخصیت کے حامل تھے۔ طبع میں رواداری، بُردباری، خوش اسلوبی اور متانت بدرجہ اُتم تھی۔ بہت خوش مزاج، صلح کن اور مہمان نواز تھے۔ گاؤں میں سب احترام کرتے۔ چچازاد بھائیوں میں کم عمر تھے جن کی اولاد ان کو چچا جان کہتی۔ اس نسبت سے گاؤں میں وہ چاچا کے نام سے معروف تھے۔ بچپن میں ہم بھائی اور بہن ان کو چاچا کے طور پر ہی مخاطب کرتے۔ گاؤں میں سب کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتے بالخصوص شادی اور ماتم کے موقع پر انتظام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اس زمانہ میں شادی ہال نہ تھے اور تمام انتظام گاؤں میں مل جل کر ہی کیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۱ء کی تحریک آزادی میں پیش پیش رہے۔ گاؤں کے نوجوانوں کے ساتھ گرفتار بھی رہے۔ ابتدا میں کاشتکاری میں حصہ لیا۔ میرے دادا جان کی اراضیات اپنے گاؤں کے علاوہ، موضع بلوچ میں ان کے سسرال کے گاؤں میں بھی تھیں۔ والد صاحب دوستوں کے ہمراہ مرچنٹ نیوی میں شامل ہو گئے اور تمام اراضی غلہ بٹائی پر دے دی۔ اراضیات کے اشتمال میں ان کی عدم موجودگی میں، دوسرے قابض لوگوں نے محکمہ مال کے افسران سے مل کر ملکیت اپنے نام کروالی جس کا علم ان کو بہت تاخیر سے

ہوا جب کہ درستی ریکارڈ کی میعاد گذر چکی تھی۔ اس کا ان کو بہت افسوس تھا، جس کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ مرچنٹ نیوی انگریز کمپنیوں کی تھی۔ ابتداً ان کے دفاتر کلکتہ ہندوستان میں تھے بعد میں بمبئی شہر میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس وقت برطانیہ کی حکومت عروج پر تھی۔ امریکہ سے لے کر مشرق بعید تک اس کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے علاوہ افریقہ، چین، جاپان، ملائیشیا وغیرہ، مشرق وسطیٰ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا اور ویسٹ انڈیز کے تمام ممالک میں تجارتی جہازوں کا جانا ہوتا۔ اس کے سبب والد صاحب کو ان تمام ممالک کو دیکھنے اور وہاں کی تہذیب وتمدن کے جاننے کا تجربہ حاصل ہوا۔ وہ جب گھر واپس آتے تو ان ممالک سے تحائف لاتے اور وہاں کے عوام کا رویہ اور حالات ہم کو بتاتے۔ انہیں ایران، عراق، اردن، فلسطین میں مختلف زیارتوں، اسلامی مقامات، نوادرات، مصر کے سیاحتی مقامات دیکھنے کا بھی خوب موقع ملا۔ انھوں نے عمرہ اور حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔ ان کی زندگی انوکھے واقعات اور حادثات سے بھری پڑی ہے، جو الگ کتاب کی متقاضی ہے۔

ہم تین بھائی ہیں اور ایک بہن زبیدہ ہے جو مجھ سے چھوٹی ہے۔ اس سے چھوٹا محمد یعقوب اور سب سے چھوٹا محمد ایوب ہے۔ عمر میں بڑا ہونے کا اعزاز مجھے حاصل ہے۔ والد صاحب کی پہلی اور آخری ہدایت تعلیم حاصل کرنے کی تھی۔ ایوب کی پیدائش سے چند ماہ قبل جب دوسری جنگ عظیم آخری مرحلوں میں تھی ابا جان بمبئی گئے۔ ان کے بحری جہاز کا سفر ہندوستان سے لندن کا تھا۔ سمندر میں جرمن گن بوٹ نے ان کے جہاز کو تارپیڈو کیا اور سمندر کی تہہ میں ڈبو دیا مگر حفاظتی کشتی کی مدد سے وہ بچ گئے۔ دوسرے بڑے جہاز ای ڈی فرانسس نے ان کو پناہ دی، مگر چند ہی گھنٹوں کے بعد دوسرا بڑا حملہ ہوا، جس سے ای ڈی فرانسس بھی ٹوٹ کر ڈوب گیا۔ عملہ کے جو لوگ قریب کے جہاز کے عملہ کی بروقت مدد سے بچ گئے ان میں ابا جان بھی تھے۔ وہ لندن پہنچے جہاں سے ڈڈیال کے پہلے سے آباد احباب ان کو برمنگھم شہر لے گئے اور نچلو پارک ایریا میں نیوٹین فونڈری میں سروس شروع کروادی۔ وہاں انہوں نے لانگ ایکٹر روڈ پہ مکان خرید کیا اور گاؤں کے بے روزگار لوگوں کو وہاں لے جایا گیا۔ انگلینڈ پہنچنے پر انھوں نے پاسپورٹ کی درخواست ارسال کی، جس کے کوائف میرپور کے ڈپٹی کمشنر آفس سے، جو اس وقت وزیر وزارت کہلاتا تھا، سے تصدیق کروا کر جموں دارالحکومت سے پاسپورٹ حاصل کر کے انگلینڈ ارسال کیا۔ اس وقت ریاست کا پاسپورٹ اپنا تھا، جس پر مہاراجہ کا فوٹو چسپاں ہوتا تھا۔ ریاست میں بیرونی تجارت کا اختیار مہاراجہ کو حاصل تھا۔ بعد میں برمنگھم اور برطانیہ کے دوسرے شہروں میں پاکستان و ہندوستان کے لوگ کثرت سے آباد ہو گئے۔ ۱۹۷۲ء میں والد صاحب مستقل طور پر واپس آ گئے۔ ان دنوں محمد یعقوب چھوٹا بھائی، حبیب بینک برمنگھم میں منیجر تعینات تھا۔ ۱۹۷۳ء میں اس کو واپس بلوالیا۔ میرپور میں وہ الائیڈ بینک میں AVP کے عہدہ پر فائز رہا۔ ابا جان شروع سے ہی ہماری تعلیم کے لئے کوشاں رہے۔ جب میں نے وکالت شروع کی تو بہت خوش ہوئے۔ میرے متعلق ان کی پیش گوئی تھی کہ میں نے ملک کا چیف جسٹس بننا ہے۔ میں جب ہائی کورٹ جج تعینات ہوا، تو اس کے بعد ہر ملاقات پر

ضرور سوال کرتے، کہ چیف جسٹس کب بننا ہے، مگر وہ اس سے قبل ہی ۱۰ ارجون ۱۹۸۲ء کو اچانک وفات پا گئے۔

عمر میں بڑا ہونے کے سبب مجھے ان کی قربت کا موقع زیادہ ملا اور شفقت بھی زیادہ ملی۔ انگلینڈ سے خط و کتابت بھی میرے ساتھ تھی۔ ابھی میں سکول میں مڈل کلاس میں تھا کہ امی جان کی نگرانی میں گھر کے اخراجات اور خانگی امور کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی گئی۔ اس سے تجربہ کے ساتھ ساتھ مجھ میں خود اعتمادی، پختگی میں اضافہ ہوا اور احساس ذمہ داری کا احیا ہوا۔ والد صاحب کی زیادہ ہدایت حصول تعلیم کی ہوتی۔ ان کا کہنا ہوتا کہ تعلیم ایسا خزانہ ہے جو عقل و دانش میں نکھار پیدا کرتا ہے، جس کو نہ آگ جلا سکتی ہے، نہ سیلاب بہا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو چور ڈاکو لوٹ سکتا ہے۔ بلکہ تعلیم تخلیق کائنات اور رموز موت و حیات جاننے پہچاننے کی کنجی اور حصول منزل کا زینہ ہے۔ ہم بہن بھائیوں کی اعلیٰ پرورش میں کبھی کمی نہ ہونے دی۔ ان کے ساتھی چوہدری سیف علی، چوہدری سلیمان اور پروفیسر محمود ہاشمی بھی میری راہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے، بلکہ جب میں کالج میں داخل ہوا تو انگریزی لٹریچر پر کتابیں انگلینڈ سے ارسال کرتے، جس سے مطالعہ کے شوق میں اضافہ ہوا۔ ہر اولاد کیلئے والدین کی محبت اور شفقت فطری و لازمی ہوتی ہے، مگر مجھے شدت سے احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت ہی شفیق والدین نصیب کیے اور ایسے ہی پیار کرنے والے بہن بھائی میری بیگم اور بیٹیاں بیٹے۔ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی شکر گذار ہوں۔

امی جان

ملک فیض عالم اور نور بیگم کے بڑے بیٹے عبدالغنی کے بعد، پیدا ہونے والی بیٹی کا نام بہت سوچ و بچار کے بعد خانم بیگم طے ہوا۔ بچپن میں صرف خانم پکارا جاتا تھا۔ ان دنوں گاؤں میں مکتب قائم تھا۔ مولوی اخونزادہ، جن سے نام مقرر کرنے پر بھی مشاورت ہوئی تھی ان سے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ اردو میں اسلامی تعلیمات کی کتابیں پڑھنے اور صوم و صلوٰۃ کے مسائل سے متعلق بھی علم حاصل کیا۔ گاؤں میں ہمارے لوگ والد کو اجی، بڑے بھائی کو لالہ، والد کے بڑے بھائی کو تایا اور چھوٹے کو چچا۔ اپنے سے بڑے بھائی کو پہا پا، بڑی بہن کو بہن اور امی کو بے جی کہہ کر مخاطب ہوتے۔ جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ سارے علاقہ میں ایک پرائمری سکول چوکھ ہی تھا۔ نانا جان نے وہاں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء کی تحریک سے ایک سال قبل ڈڈیال میں پرائمری سکول قائم ہوا جو بعد میں مڈل بنا۔ جس کے بعد موضع رٹہ، بل اور سیاکھ میں بھی پرائمری سکول قائم ہوئے۔ جن کے بعد ڈڈیال میں بچیوں کا پرائمری سکول بھی قائم ہوا جو ۱۹۴۴ء میں مڈل سکول بنا۔ اس پس منظر میں علاقہ کی بچیوں کے لئے کوئی درس گاہ نہ تھی۔ مولوی اخونزادہ کی وفات پر گاؤں میں مکتب ختم ہو گیا۔ چنانچہ امی جان نے اپنے گھر میں گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا۔ ان پر اسلامی تعلیم و تربیت کا یہ اثر تھا، کہ انھوں نے ریشمی لباس اور زیورات کبھی نہ پہنے۔ لباس میں سفید چکن اور ململ کا دوپٹہ، سفید پاپلین کی قمیض، نیلے آسمانی رنگ کی چھینٹ یا پاپلین کی شلوار، تلے دار سرخ چمڑے کی ہلکے وزن کی میرپوری جوتی استعمال میں ہوتی۔ سفید چادر یا سفید سادہ شال بھی استعمال کرتیں، مگر لباس

بالکل صاف شفاف ہوتا۔ قرآن کی تلاوت کے علاوہ بالخصوص سحری کے وقت، تہجد کے بعد درود شریف، حمد و نعت اور کلمہ کا ذکر دھیمی لے میں کرتیں۔ میں بیشتر دفعہ ان کے ذکر کے انداز سے محظوظ ہوتا، جس کا الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ خواہش ہوتی کہ وہ ذکر گنگناتی رہیں مگر اسی دوران صبح کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ کئی دفعہ وظیفہ کر کے مجھ پر آہستہ سے پھونک مارتیں۔ گو کہ میں جاگ رہا ہوتا مگر آنکھیں بند رکھتا۔ امی جان کے اس معمول نے مجھے سحر بیداری کا عادی کر دیا۔ یہ فیضان کرم ماں کے توسط سے نصیب ہوا۔ یہ معمول بظاہر آسان لگتا ہے مگر اس میں نیند کے غلبہ کی کڑی آزمائش ہے۔ گو کہ ابا جان میرے لئے سوٹ وغیرہ انگلینڈ سے ارسال کرتے مگر اچھے اور صاف ستھرے لباس کا سلیقہ اور عادت، امی جان کی تربیت کی وجہ سے میں نے اپنایا۔ بالخصوص لباس کی اچھی سلائی ہمیشہ میری توجہ کا مرکز رہی۔

لباس انسان کی شناخت و تعارف ہے۔ وسائل ہوں تو انسان کو اچھا لباس پہننا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ لباس زیادہ قیمتی ہو بلکہ عمر اور حیثیت کے مطابق ہو، جس میں تکبر و تفاخر کی علامت نہ ہو، استعمال کرنا چاہیے۔ اچھے لباس میں ملبوس انسان، اجنبی اجتماع میں یا شہر یا گھر میں ہو تو دوسروں کی توجہ اور نگاہ کو اپنی طرف بلا ارادہ متوجہ کرتا ہے۔ لباس کی کشش اس کے تعارف کا سبب بنتی ہے، اس سے انسان کے تمدن، تدبر، سلیقہ اور دانائی کا معیار بھی عیاں ہوتا ہے۔ گویا لباس انسان کے اوصاف اور تشخص کا آئینہ اور کسوٹی ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی دانش اور علم کی شناخت انسان کی گفتگو، اسلوب، تکلم اور انداز بیاں ہے۔ گفتگو انسان کے باطنی اوصاف کو آشکارہ کرتی ہے۔ بسا اوقات انسان کی ظاہری وضع قطع، دھوکا اور فریب دیتی ہے لیکن گفتگو اصلیت ظاہر کر دیتی ہے۔ لباس تو ظاہر ہوتا ہے اس لئے انسانی شناخت کا آسان ذریعہ ہے، مگر گفتگو صرف قربت اور تخاطب کے سبب انسان کی اصلیت کو ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا اچھا لباس اور اچھی گفتگو کو اپنانا، ماں کی اچھی تربیت کا آئینہ دار ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے انسان کے متعلق رائے قائم کرنے سے قبل، اس کی ساتھ ہمسفر ہونا اور معاملات یعنی لین دین کرنا ضروری ہے، بصورت دیگر صحیح رائے قائم کرنا شاید ممکن نہ ہو۔

سخاوت اور مہمان نوازی میں ہماری خاص شہرت، گاؤں میں ضرورت مندوں کے علاوہ پڑوس کے دیہات کے حاجت مند لوگوں کی مدد کے حوالہ سے تھی۔ امی جان کے پاس دن بھر خواتین کا مجمع لگا رہتا، زیادہ تر غلہ اور نئے پارچات، صدقہ کے طور پر تقسیم کیے جاتے۔ مسجد کے خادم کے گھر کھانا پہنچایا جاتا۔ امام مسجد کی بیوی، بچوں کی خدمت کی جاتی۔ کھیتوں میں گندم، مکئی، باجرہ اور دال ماش، مونگی، موٹھ، چنا، مسور فراوانی سے پیدا ہوتیں جس میں سے غربا اور مساکین کا حصہ الگ کر کے تقسیم کیا جاتا۔ اس میں قطعاً کوئی کوتاہی نہ ہوتی۔ بچوں کے نام ہر ماہ صدقہ دیا جاتا۔ امی جان کی وفات کے بعد میری بیگم نے بھی یہ روایت قائم رکھی۔ جب سے یہ روایت جاری ہے۔ بچوں کے علاوہ بڑی عمر کی خواتین بھی گھریلو کام سے فارغ ہونے کے بعد نماز روزہ اور دیگر مذہبی امور میں راہنمائی اور علم حاصل کرنے کے لئے امی جان کے پاس مجلس کرتیں۔ امی جان بچپن میں مجھے خواتین سے پوشیدہ رکھتیں۔

حالانکہ میں زیادہ خوب صورت بھی نہ تھا، زبان بھی توتلی تھی، رنگ بھی سانولہ ہلکا گندمی تھا۔ مجھے دوسروں کی نظرِ بد لگنے کا انھیں اندیشہ رہتا۔ ابا جان کے انگلینڈ جانے کے بعد، گھر کے لیے سودا سلف خریدنے کی ذمہ داری میری تھی۔ اس دور میں دکاندار بھی ایماندار تھے۔ ناپ تول اور نرخ قیمتوں کا بھی ایک معیار تھا۔ اس سے اوائل عمر میں ہی مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی اور والدین کا بھرپور بھروسہ اور اعتماد بھی حاصل ہوا۔ خاص بات یہ ہے کہ مجھے کبھی بھی امی جان اور ابا جان سے ڈانٹ نہیں پڑی۔ لغزش اور غلطی پر سمجھایا جاتا اور غلطی سے بچنے کی ہدایت کی جاتی۔ یہی رویہ دوسرے بچوں سے بھی روا رکھا جاتا۔ ایوب کو تو سب سے زیادہ پیار ملا۔ اس ماحول میں ہماری پرورش اور تربیت کا بتدریج آغاز ہوا۔

پیدائش

مون سون کی ہواؤں نے پانی کے قطروں سے لدے بادلوں کو آغوش میں لیے ہلکی رفتار سے سرسبز و شاداب کھیتوں اور بستی کو نیم سرگوشی میں پھوار سے نہلاتے ہوئے گذر کیا ہی تھا اور کچی مٹی میں بھینی بھینی خوشبو مہک اٹھی، تو مشرق سے مغرب میں ہالہ بناتی، قوس و قزح، دلفریب رنگوں کی جھلمل میں، سرمئی بھیگے شمال مشرق پہاڑ کی چوٹیوں پر جلوہ افروز ہوئی۔ جامع مسجد میں نماز جمع کی اذان فضا میں بلند ہوئی، عین اس ساعت میری پیدائش ہوئی۔ ستمبر کی ۱۶ تاریخ اور سال ۱۹۳۲ء اور یکم اسوج کا دن تھا۔ ڈڈیال کی مائی کرم بی بی دائی نے نرم گداز ہاتھوں سے غسل دے کر، مجھے امی جان کی آغوش میں سفید دوپٹہ میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ وہ زندگی بھر ان لمحات کی یاد دہراتی رہی۔ احترام میں ان کو میں نے ہر ملاقات پر ماں جی کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ ماموں عبدالغنی نے میرے کانوں میں اذان دی۔ اسی ہفتہ میں میرے نام کی تجویز شروع ہوگئی۔ سانولہ ہلکا گندمی رنگ، ڈھیلہ سا جسم تھا۔ امی جان نے نظرِ بد سے بچاؤ کی وجہ سے میرا نام "سائیں" طے کیا۔ نانا جان نے ماموں عبدالغنی اور عبدالعزیز کے انداز میں، عبدالمجید تجویز کیا۔ چورہ شریف کے پیر روشن دین صاحب نے، امام الدین نام تجویز کیا، جب کہ سید نگاہ علی شاہ، امام مسجد کی اہلیہ بیگم شاہ بانو نے، انوکھا نام چمن دودھ بدر خان رکھا، مگر امی جان مختصر نام سائیں کہہ کر ہی پکارتیں۔ اسی نام کو نانی جان اور گاؤں کی سب خواتین اور بچوں نے اپنایا۔ اس طرح میرا نام سائیں گاؤں میں معروف ہوگیا۔ روایت بھی یہی ہے کہ ماں کا دیا ہوا نام ہی عوام میں شناخت حاصل کرتا ہے، لہٰذا بچپن ہی سے درویش منش ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا تھا۔

تبدیلی نام کے مرحلے

کائنات میں معرض وجود میں آنے والی ہر شے کی شناخت کے لئے، اس کو مخصوص نام دیا گیا ہے۔ خالق اور مخلوق اپنی اپنی پہچان، اوصاف، جنس کے علاوہ اپنے اپنے نام کی شناخت رکھتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی شناخت خاندان، قبیلوں، رنگ و نسل، علاقوں اور تہذیب و تمدن کی حیثیت اور شکل میں نمودار ہوتی چلی گئی ہے۔ عقل و دانش، علم کی نمو اور ارتقاء نے، دنیا کے سیارہ کو اقوام و ممالک کے دائرہ میں انسانیت کا گہوارہ بنا دیا۔

امی جان مجھے سائیں کے نام سے پکارتیں۔ گاؤں کے مرد، خواتین اور بچے بھی اسی نام سے بلاتے۔ اس طرح میں خود اسی نام سے آگاہ تھا۔ ہر ماں کی طرح امی جان مجھے عام خواتین کے سامنے نہ جانے دیتیں، بلکہ چھپا چھپا کر رکھتیں۔ اسی دوران حسب عادت جب نیا چاند طلوع ہوتا، تو امی جان چاند کو دیکھتے ہی میرا منہ دیکھ کر دعا کرتیں۔ اتفاق سے پورا مہینہ خوش وخرم گذر جاتا۔ اسی کے ساتھ نانی جان اور ان کے دیکھا دیکھی، پڑوس میں خواتین میں اس کا چرچا ہوا۔ گو ہمارا گاؤں چھوٹا سا تھا، مگر نیا چاند طلوع ہوتے ہی میری منہ دکھائی کی مانگ بڑھ جاتی۔ یہ سلسلہ کالج میں داخل ہونے تک چلتا رہا۔ شاہ بانو بیگم جنہوں نے میرا نام چن دودھ بدر خان تجویز کیا تھا اس پر وہ بہت نازاں تھیں۔ بات یہاں ہی ختم نہ ہوئی بلکہ نانا جان جب کسی کام سے لمبے سفر پر میرپور، جموں، کشمیر، لاہور یا راولپنڈی جاتے تو گھر سے روانگی کے وقت مجھ سے مصافحہ کرتے اور سفر پر روانہ ہوتے۔ اتفاق سے ہمیشہ کامیاب واپس آتے۔ کامیابی اور خوشی تو اللہ تعالیٰ دیتا، مگر ان کی دعا میرے حق میں ہوتی۔

سائیں امام الدین

امی جان کے پسندیدہ نام سائیں کے ساتھ روحانی برکت کے طور پر پیر روشن دین چورہ شریف والوں کا تجویز کردہ نام امام الدین شامل کر کے، سکول میں میرا نام سائیں امام الدین درج کروا دیا گیا۔ سکول میں حاضری میں پورا نام پکارا جاتا ورنہ عام طور پر سائیں نام ہی چلتا۔ میں خود بھی اسی نام سے مانوس تھا۔ پہلی جماعت سے میرپور انٹر کالج میں نویں اور دسویں کلاس تک، یہ نام چلتا رہا، البتہ میرے لباس اور وضع قطع سے نام کی مطابقت نہ پا کر، کالج کے پروفیسر میرا جائزہ ضرور لیتے، مگر خاموش رہتے۔ میں ابھی دسویں کلاس میں تھا کہ ہندوستان پاکستان آزاد ہوئے اور جموں کشمیر میں آزادی کی جنگ شروع ہوگئی۔ سکول کالج بند ہو گئے۔ ایک سال جنگ کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ ڈڈیال میں ہائی سکول کا از سر نو اجرا ہوا، تو دسویں کلاس میں داخل ہوا۔ میٹرک کے امتحان کے فارم کی تکمیل پر ہیڈ ماسٹر محمد جان رتیال نے، آفس میں مجھے طلب کیا اور دریافت کیا کہ، کیا سائیں امام الدین کے علاوہ میرا کوئی اور نام بھی تھا؟ میں نے بتایا کہ میرا دوسرا نہیں بلکہ تیسرا نام عبدالمجید بھی تھا۔ یہ سن کر وہ خوش ہوئے اور کہا کہ اس کے بعد کالج میں داخل ہونا ہے۔ آپ کے نام سے بزرگی محسوس ہوتی ہے، لہٰذا دوسرا نام عبدالمجید فارم داخلہ میں لکھ دو۔ انہوں نے بتایا کہ میری وضع قطع اور سمارٹ پرسنیلیٹی سے سائیں امام الدین نام مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کی تجویز پر میں نے اپنا نام عبدالمجید لکھ دیا۔

عبدالمجید ملک

سائیں امام الدین سے میرا نام عبدالمجید طے ہوگیا۔ گورڈن کالج میں فرسٹ ائیر میں داخل ہوا۔ کالج میں پہلے دن جب تعارف شروع ہوا تو اتفاق سے کلاس میں عبدالمجید نام کے چار طالب علم تھے۔ پروفیسر عزیز احمد

نے کہا، کہ شناخت کے لئے اپنے اپنے نام کے ساتھ سرنیم شامل کریں۔ جس پر میں نے اپنے نام کے ساتھ ملک کا اضافہ کیا۔ سکول میں نام سائیں امام الدین ریکارڈ تھا۔ میٹرک سرٹیفکیٹ میں عبدالمجید اور اب کالج میں عبدالمجید ملک کہلایا جانے لگا، مگر گاؤں اور علاقہ میں صرف سائیں ہی کہلاتا۔ میں نے نئے نام کی اطلاع انگلینڈ میں ابا جان اور گاؤں میں امی جان کو تو دی مگر اس کو عام نہ کیا۔ اس سے کئی بار ملاقات کو آنے والے سے ملاقات نہ ہو سکتی۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھا۔ ابا جان کے ملنے والے دو آدمی میرے کالج پہنچے۔ ابا جان نے ان کو میرے لیے سوٹ دیئے تھے۔ وہ کالج میں میری تلاش سائیں کے نام سے کر رہے تھے۔ وہ ناکام اور تھک کر کالج ٹاور کے سامنے بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نیو ہاسٹل سے کالج آ رہا تھا۔ اتفاق سے وہ لباس اور شکل وصورت سے انگلینڈ سے آنے والے معلوم ہوئے۔ ابا جان کا خط بھی مل چکا تھا۔ ان کے پاس گیا اور دریافت کیا، کہ کس سے ملنا تھا، انہوں نے میرا نام لیا کہ سائیں سے ملنا ہے۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو وہ گلے لگ گئے۔ ان کو بتایا کہ کالج میں میرا نام عبدالمجید ملک ہے، تو ان کو یاد آیا کہ ابا جان نے ان کو کیا نام بتایا تھا، مگر وہ پرانے معروف نام کو ہی یاد رکھ سکے تھے۔ کالج کینٹین میں ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ واپس جا کر انہوں نے ابا جان سے میری بہت تعریف کی۔ میرے نام کے ارتقاء کی یہ دلچسپ داستان ہے۔ اب گاؤں کے بزرگ لوگ یا سکول کے پرانے ساتھی ہی میرے بچپن کے نام سے آشنا ہیں۔ باقی تمام لوگ مجھے عبدالمجید نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں۔ نام کا یہ وہ سفر ہے، جس میں، میں سائیں سے سائیں امام الدین اور عبدالمجید سے عبدالمجید ملک کے نام سے معروف ہوا۔

سکول میں پہلا دن

ڈڈیال میں طلباء وطالبات کے الگ الگ مڈل سکول تھے۔ پرائمری کلاسیں ساتھ ہی تھیں۔ سکول داخل ہونے کے بعد کلاس میں بچوں کے ہمراہ فرش پر بچھے ٹاٹ پر بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی چوتھی یا پانچویں کلاس تھی۔ قریب گھنٹہ کے بعد ساتھ والی کلاس میں ماسٹر جی نے، طلباء سے گذشتہ روز پڑھائے گئے کورس سے سوالات کرنے شروع کیے۔ جس لڑکے نے درست جواب دیا، اس کو بٹھا دیتے، جس کو جواب دینا نہ آتا، یا جواب غلط ہوتا، اس کے ہاتھوں پر تڑاخ تڑاخ سوٹی مارتے۔ دو تین لڑکوں کی اس طرح پٹائی دیکھ کر میں چپکے سے اٹھا اور گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جب ماسٹر صاحب میرے بھاگنے پر متوجہ ہوئے، تو واپس آنے کے لئے آواز دی۔ میں تھا تو چھوٹی عمر کا، مگر بھاگنے میں تیز تھا۔ آواز دی جاتی رہی، مگر میں نہ رکا اور سیدھا گھر پہنچا اور سکول جانے کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ امی جان، ابا جان نے بہت کوشش کی، مگر میں مان ہی نہ رہا تھا۔ میں سوٹی کی سزا کا تصور ہی نہ رکھتا تھا۔ کبھی کسی نے اونچی آواز میں نہ بلایا تھا۔ دو دن گاؤں کے بڑے لڑکے اور ایک دو میرے، ہم عمر ساتھی، خوب ترغیب دیتے رہے۔ تیسرے دن سکول پہنچا تو کلاس ماسٹر بابو سردار سنگھ نے، بہت پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور اپنے بیٹے پریتم سنگھ

سے تعارف کروایا۔ ہم دونوں اکٹھے بیٹھتے اور مل کر سبق یاد کرتے۔ بابو سردار سنگھ بہت اچھے، بہترین استاد اور پیار کرنے والے انسان تھے۔ سکول میں مسلمان طلبا کی تعداد زیادہ تھی، دوسری اکثریت سکھ لڑکوں کی تھی، ہندو لڑکے بہت کم تھے۔ ڈڈیال شہر میں سکھ زیادہ تھے، البتہ اندرہل میں ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ سکول میں پانی الگ الگ تھا۔ میل ملاپ، پھل، مٹھائی، خشک میوے سب مل کر کھاتے، کوئی پرہیز نہ تھا۔ پرائمری تک فرش پر ٹاٹ پر بٹھایا جاتا، البتہ مڈل کلاس کو بنچ پر بٹھایا جاتا۔ اسی طرح پرائمری تک اردو لکھائی، قلم سے تختی پر اور حساب کے سوالات سلیٹ پر لکھائے جاتے۔ مڈل کلاس یعنی چھٹی سے آٹھویں تک، تمام لکھائی اور سوالات، ہولڈر سے کاپی پر لکھائے جاتے۔ سکول کا بستہ ہلکا سا ہوتا۔ مڈل کلاسوں میں ننگے سر نہیں بلکہ ٹوپی یا پگڑی لازمی تھی۔ سکول ٹیچر بھی بند کالر قمیض اور ٹوپی یا پگڑی پہن کر آتے۔ وقت کی پابندی سخت تھی۔ سٹاف میں مسلمان، ہندو، سکھ ٹیچر ہوتے مگر ان میں ڈسپلن، ہم آہنگی اور اتحاد ہوتا، البتہ مسلمان ٹیچر تعداد میں زیادہ تھے۔

ریاست میں تعلیم مفت تھی۔ اندرہل میں ڈڈیال کے علاوہ چوکھ، سیاکھ، رتہ ہل اور بیھاری میں پرائمری سکول تھے۔ میر پور میں سری کرن سنگھ انٹر کالج، جموں میں پرنس آف ویلز کالج، سرینگر میں ایس پی (سری پرتاب سنگھ) اور امر سنگھ کالج تھے۔ پرنس آف ویلز کالج سارے ہندوستان میں صفِ اوّل میں تھا۔ اس کی عمارت، گراؤنڈ اور لائبریری کے علاوہ، پروفیسرز اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ یہ کالج گورنمنٹ کالج لاہور کا ہم پلہ ہے، بلکہ اس سے بہتر ہے۔

میری کمزوریاں

بچپن میں میری زبان میں بہت لکنت تھی، دوسرے میں، بہت حساس تھا۔ غصہ بلا کا تھا، چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض ہونا، میرا مزاج تھا۔ طبیعت میں تیزی بھی بہت تھی، اس وجہ سے ابا جان اور امی جان کبھی مجھ سے خفا یا غصہ نہ ہوتے۔ لکنت کے باعث، مجھے ٹھٹھہ اور روٹھنے کی وجہ سے، رُسو کے نام دیئے گئے تھے۔ لکنت آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہو گئی۔ اسی طرح میں نے غصہ پر محنت سے قابو پایا، البتہ کسی کے دباؤ میں اب تک نہیں آتا نہ کسی قسم کی ڈکٹیشن برداشت کر سکتا ہوں۔ اہلیت اور علمیت کا اور بڑوں کا احترام ضرور ملحوظ رہتا ہے، مگر کسی قسم کا ڈر، رعب یا خوف نہیں ہوتا۔ اپنی بات بلا جھجک کرنا، سچ بات منہ پر سامنے کرنا اور ناراضگی کی پرواہ نہ کرنا، مجھے ورثہ میں ملا ہے، جس وجہ سے مجھے نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ میری ان کمزوریوں یا اوصاف کو میرے قبیلہ کے علاوہ، تمام ملنے والے جانتے ہیں اور مجھے برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ کمزوری میرے بیٹوں شوکت، شاہد اور ارشد میں بھی پائی جاتی ہے۔ میں ابھی سکول میں ہی تھا، تو اس وقت کے ایس پی، چوہدری خداداد کو کھانے کے لئے ہاتھ دھلوا رہا تھا۔ انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا، تو پانی کا لوٹا مجھ سے لیتے ہوئے کہا کہ "بیٹا لوٹا مجھے دے دو، میں خود ہاتھ دھولوں گا، تم نے بڑے ہو کر بڑا افسر بننا ہے"۔ اسی طرح چوہدری سیف علی، ابا جان کے دوست کی بیگم، خالہ بھاگی نے پہلی دفعہ مجھے دیکھا تو امی جان سے کہا "بہن تمہارا بیٹا بہت رعب والا نوجوان ہوگا"۔ ایسے آثار بچپن سے ہی مجھ میں نمایاں تھے۔

بچپن کے مشاغل

سگریٹ نوشی سے توبہ

سکول میں پانچویں کلاس میں تھا۔ میرا رشتہ دار عبدالعزیز اگلی کلاس میں تھا۔ اس نے مجھے کلاس سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ٹیچر سے اجازت لے کر اس کے پاس گیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر سکول کے احاطہ سے باہر پہنچا اور ایک کونے میں بیٹھ کر سگریٹ کی پیکٹ نکالی اور سگریٹ سلگا کر مجھے پیش کیا۔ ہمارے گھر میں حقہ اور سگریٹ نوشی نہ ہوتی تھی۔ بہت بعد میں ماموں عبدالعزیز پولیس انسپکٹر اور محمد صادق میرا خالہ زاد، جو برطانوی فوج میں ملازم تھا، دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں قیدی کیمپ میں تھا کیمپ سے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ وہاں ایک بیوہ خاتون کی پناہ میں رہا اور جنگ ختم ہونے پر واپس آیا۔ وہاں جنگی کیمپ میں اس نے سگریٹ نوشی اختیار کی تھی، مگر یہ دونوں نانا جان کے ڈر اور احترام میں خفیہ طور پر تمباکو نوشی کرتے تھے۔ اس پس منظر میں، میں نے سگریٹ لینے سے انکار کیا، مگر اس کے اصرار پر آخر ایک دو اور تین سگریٹ سلگائے۔ حتیٰ کہ ہم نے دو پیکٹ سگریٹ پھونک دیے۔ سردی کا موسم تھا، ہونٹوں کو دھوئیں کی حرارت نے کچھ زیادہ ہی مزہ دیا تھا۔ سکول سے گھر پہنچا، تو سر میں چکر آنے لگے۔ پہلے ہلکی ہلکی حرارت شروع ہوئی، جس نے بخار کی شکل اختیار کر لی۔ دو دن بخار اور سر درد نے میرا برا حال کر دیا۔ دو تین بار اُلٹی بھی ہوئی۔ تب سے سگریٹ کی بو سے مجھے ایسی نفرت اور الرجی ہو گئی، کہ میں نے سگریٹ نوشی سے توبہ کر لی۔

کالج، وکالت اور سروس میں، میرے ساتھی تمباکو نوشی کے سخت عادی تھے۔ کے ایچ خورشید، قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ ۱۹۴۴ء سے اکتوبر ۱۹۴۷ء تک بطور سیکریٹری رہے، تب سے وہ سگریٹ نوشی کے عادی تھے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۸ء تک میں ان کے ساتھ سیاست میں رہا۔ وہ چائے اور سگریٹ نوشی کے بہت رسیا تھے۔ ہمارے گھر ٹھہرتے تو رات کو چائے کے کئی دور چلتے اور تحریک پاکستان، قائداعظم کی سیاسی زندگی اور تحریک آزادی جموں کشمیر پر رات بھر گفتگو جاری رہتی۔ وہ کھانے کے بعد، بسا اوقات سگریٹ سلگا کر مجھے کش لگانے پر اُکساتے، مگر میری معذرت پر مسکرا کر خود ہی کش لگانے پر اکتفا کر لیتے۔

بکریاں رکھنے کا شوق

گاؤں کے دو تین لڑکوں نے بکریاں پالی ہوئی تھیں۔ وہ سکول میں میرے ساتھی تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک بیتل نسل کی، گہرے بھورے رنگ کی بکری خرید لی۔ چند ماہ بعد اس نے دو بچے دیے تو تعداد تین ہو گئی۔ سال کے بعد اس نے مزید دو بچے دیے۔ ہمارا اپنا اندروٹھ تھا، چارہ وافر تھا، بکریاں خوب دودھ دیتیں۔ اس دوران بھینس کے دودھ کی بجائے، میں بکری کا دودھ پیتا تھا۔ میرپور کی لوکل بکری کی نسل، سیاہ لمبے بالوں والی بکری تھی، جس کے بالوں کی کمبل نما، لوئی بنتی تھی۔ اس کا گوشت بہت لذیذ ہوتا، مگر دودھ نسبتاً کم اور نسل میں اضافہ بھی

آہستہ ہوتا۔ وہ نسل اب قریب قریب ختم ہو رہی ہے۔ دوسری پنجاب کے علاقہ میں پائی جانے والی بیتل نسل کی بکری تھی، جس کی نسل تیزی سے بڑھتی اور دودھ بھی زیادہ دیتی۔ میرے پاس بیتل نسل کی بکریاں تھیں۔ اب تیسری نسل سندھ کی چھوٹے قد کی بکری زیادہ مقبول ہے، جو بہت تیزی سے نسل میں بڑھتی ہے۔ قریب دو سال چند ماہ کے بعد، اباجان کے حکم کی تعمیل میں، بکریاں فروخت کردیں اور اس شغل سے فارغ ہوگیا۔

دکانداری

سکول اوقات کے بعد، ایک شغل تو گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں شمولیت تھی، اس کے علاوہ مصروفیت کا کوئی سبب نہ تھا۔ بکریاں فروخت کرنے کے بعد، میں نے مکان کے فالتو کمرہ میں دکان شروع کردی۔ گاؤں کی خواتین اور بچوں کو جو ڈڈیال شہر سے خانگی ضرورت کی اشیاء خریدتے تھے، شہر کے نرخ پر تمام اشیاء گاؤں میں حاصل ہونے کی سہولت مل گئی۔ ایک سال میں تجارت میں خاصا منافع ہوا اور ساتھ ہی اپنے گھر کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتیں۔ دکان پر سکول سے واپس آنے کے بعد ہی بیٹھتا۔ مگر اباجان کی تمام توجہ میری تعلیم پر تھی۔ لہٰذا حفظ ماتقدم کے طور پر انہوں نے دکان بھی بند کروادی۔ جس کے بعد سکول میں والی بال کھیلنے یا کبڈی وغیرہ میں شام کا وقت گذارتا۔ ہمارے سکول کی والی بال ٹیم بہت مشہور تھی۔ ہر میچ میں کامیابی ہوتی۔ والی بال ٹیم میں شامل ہونے کی وجہ سے، سکول اوقات کے بعد شام تک والی بال کھیلنے میں مصروف رہتا۔

سکول سے فرار

بچوں کی عمر میں بارہ سے بیس سال کی عمر بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دورانیہ میں بچوں کی تربیت اور نگہداشت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ عمر کے ان سالوں میں ہی بچوں میں ذوق شوق، طبیعت کے میلان کا ابتدائی ارتقاء اور نمو، سنجیدگی یا غیر سنجیدگی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ مشرقی معاشرہ میں بچپن کے اس مرحلہ پر، والدین بچوں کے مشاغل سے عموماً لاپرواہ ہوجاتے ہیں یا ان کی قدرتی اور فطری نمو پر بھروسہ کرکے، بچوں کے مشاغل میں مداخلت سے اجتناب برتتے ہیں۔ میری رائے میں بچوں کی عمر کا یہ دور والدین کی کڑی نگرانی اور ان کے معمولات میں اعتدال اور نظم وضبط قائم کرنے کا ہے۔ ان ہی سالوں میں بچوں کا مستقبل بنتا اور بگڑتا ہے۔ میری امی اور اباجان مجھ پر اسی مشرقی روایتی روش کے تحت اعتماد رکھتے تھے۔ میں شروع سے سکول باقاعدگی سے جاتا۔ جامع مسجد میں مولوی صاحب سے اسلامی تعلیم بھی حاصل کرتا۔ کبھی کسی قسم کی سکول اور گاؤں میں شکایت کا موقع نہ دیتا۔ اسی دوران گاؤں کے چند لڑکوں نے پرائمری کے بعد تعلیم ختم کردی۔ اس سے قبل ہم سکول میں اکٹھے جاتے اور مل کر کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کی صحبت اور مشاغل کے اثر میں، میں نے چھٹی جماعت میں، شروع میں ہفتہ میں ایک دن، اور کبھی دو دن، ناغہ شروع کردیا۔ گھر سے سکول جاتا مگر راستہ میں سکول کے بجائے ان لڑکوں کے ساتھ

بنٹوں، تاش اور چوپڑ کے کھیلوں میں مشغول ہو جاتا۔ ان لڑکوں کے ساتھ مشاغل میں شمولیت کی وجہ سے، سکول سے میرا نام خارج کر دیا گیا۔ ابھی نام خارج ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ اسکی صرف امی جان کو اطلاع ہوئی۔ ابا جان کو بتائے بغیر امی جان نے ماموں عبدالغنی کو، مجھے تلاش کر کے سکول میں داخل کروانے کے لئے کہا۔ میں ان لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول تھا، کہ ماموں جان نے کان پکڑ کر چونکا دیا اور سیدھے سکول لے گئے اور کلاس میں ماسٹر تارا سنگھ انگلش مضمون کے ٹیچر کے سپرد کیا۔ میں نے معمول کے مطابق سکول جانا شروع کر دیا، البتہ امی جان اور ماموں جان نے، سکول سے میرے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے، نام خارج ہو جانے کا معاملہ، ابا جان سے پوشیدہ ہی رکھا۔

میں ساتویں کلاس میں تھا، ابھی ایک ماہ ہوا تھا کہ کلاس شروع ہوئی تھی۔ لڑکوں کے اسی گروپ میں، گاؤں میں اکٹھے رہنے اور سکول سے واپسی پر ملنے جلنے کی وجہ سے، ایک دفعہ پھر ان کے ساتھ کھیل کود کے شغل میں بھٹک گیا۔ اتفاق سے اُن دنوں ابا جان بخار میں مبتلا تھے۔ میں ان کی دیکھ بھال کرنے کے بہانے، کبھی کبھی سکول سے غیر حاضر رہتا، مگر اصلی وجہ ان لڑکوں سے کھیل وغیرہ میں شامل ہونا ہوتا۔ چنانچہ ساتویں کلاس میں تھا کہ دوسری دفعہ کلاس سے میرا نام خارج ہو گیا۔ اتفاق سے ماموں جان سکول ٹیچر سے ڈڈیال بازار میں ملے، تو ان کو کلاس میں میرا نام خارج ہونے کا علم ہوا۔ انہوں نے مجھے دوسرے روز دوبارہ سکول داخل کروا دیا، مگر میرے علم میں آیا کہ ابا جان کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ ان کے ڈر اور ناراضگی کے خوف کی وجہ سے اپنے گھر جانے کے بجائے، میں چند دن پڑوس میں نانی کے پاس ہی رہا۔ ابا جان کبھی خفا نہ ہوئے تھے، مگر میں ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے خود ہی ان سے چند دن الگ رہا۔ امی جان مجھے گھر لے گئیں تو ابا جان کو دیکھتے ہی بھاگ کر ان کے گلے لگ گیا۔ ان سے غلطی کی معافی مانگی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے صرف یہ کہا، کہ آئندہ سکول سے غیر حاضر مت ہونا۔ پڑھ گے تو اپنے لئے بہتری ہوگی اور دوسروں کے کام بھی آؤ گے۔ اس سے ماں باپ، خاندان اور ملک کی خدمت ہوگی اور نام روشن ہوگا۔ ابا جان کے مشفقانہ رویہ اور ہدایت پر، ندامت سے میرے آنسو چھلک پڑے۔ وہ شفقت اب بہت یاد آتی ہے، مگر بہتے دریا کی موجیں اور زندگی کے گذرے لمحات کب ہاتھ آتے ہیں۔ جیسے دریا بہتا چلا جاتا ہے، اسی طرح زندگی جو ایک سفر ہے گذرتی چلی جاتی ہے۔ وہ بار بار تاکید کرتے کہ ورثہ میں ملنے والی جائیداد میں بھائی بہن شریک حصہ دار بنتے ہیں۔ دولت چوری ہو سکتی ہے اور چھینی بھی جا سکتی ہے، مگر تعلیم ایک ایسی نعمت ہے، جو نہ چرائی جا سکتی ہے نہ کوئی اس کو چھین سکتا ہے اور نہ ہی بھائی اس میں شراکت کا تقاضا کر سکتے ہیں، البتہ اس کا مفاد سب کو مل سکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم ایک میٹھے ٹھنڈے چشمہ کے مانند ہے، جس سے ہر ایک سیر ہو کر پیاس بجھا کر کھیت بھی سیراب کر سکتا ہے۔ یہ اپنی اور سب مخلوق کی روزی اور بھلائی کا فیض یاب ذریعہ ہے، جس میں کمی نہیں آتی، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسی دانش اور نصیحت پر جان نثار۔

بڑوں کی مجلس

گاؤں میں سردیوں کے موسم میں زمیندارہ کام سے فراغت ہوتی۔ رات کو چولہے میں آگ تاپنے کے لئے، چھوٹے بڑے مرد خواتین اکٹھے بیٹھ کر، ماضی میں سنی سنائی داستانیں ایک دوسرے کو سناتے۔ سردیوں میں راتیں لمبی ہوتیں اور وقت گذارنے کے لئے گذرے دنوں کے واقعات بھی گوش گذار کیے جاتے۔ بچے سب کچھ غور سے سنتے تا آنکہ اونگھ نہ آجاتی۔ صبح کو سورج طلوع ہوتے ہی دھوپ کا سہارا لیا جاتا۔ چادر اوڑھے سب دھوپ میں، جس کو چڑکا کہا جاتا بیٹھ جاتے، چڑکا کی محفل جم جاتی۔ اس کے برعکس موسم گرما میں درختوں کے گھنے سایہ اور چھاؤں میں، چارپائیاں اور ٹاٹ بچھا کر، فرشی محفل میں پنچال کیھا، تاش اور چوپڑ وغیرہ کھیلتے۔ گاؤں میں بیری، کیکر اور آم کے پیڑ تھے۔ اباجان نے کھیت میں آم کا اور گھر کے صحن میں بیری کے پودے لگائے تھے اور پھل بھی بہت لگتا۔ اسی طرح بیری کا پھل بھی مٹھاس بھرا تھا۔ دن کو مرد اور بچے آم کے سایہ تلے اور خواتین بیری کی گھنی چھاؤں تلے جمع ہوتیں۔ آم کا پیڑ منگلا ڈیم کی نذر ہو گیا، مگر بیری ابھی تک سرسبز ہے۔ بڑے بزرگ بہت دراز قد، سرخ رنگ، چہروں پر چمک دمک، خوش گفتار اور تندرست وصحت مند تھے۔ اپنے بچپن اور جوانی میں جرأت اور بہادری کے کارنامے، انکساری کے انداز میں بیان کرتے۔

بابا غلام محمد خان

ضعیف العمری میں بھی باوقار چھ فٹ دو انچ قد، سرخ نورانی چہرہ، چوڑا سینہ اور مضبوط بازوؤں کا مالک، جس کو بابا گاماں کے نام سے پکارا جاتا۔ جوانی میں مرچنٹ نیوی کے دخانی جہازوں پر تجارتی ملازمت کرتے رہے۔ وہ ہم بچوں کو مختلف ممالک کے عوام کی زبان، تہذیب وتمدن، مذہب اور طرز حکمرانی کے متعلق بتایا کرتے۔ اس طرح دیگر ممالک اور اقوام کی تاریخ اور جغرافیہ کے علوم سے ہمیں آگاہی ہوتی۔ دریا جہلم پر شہر کے قریب ریلوے اور دوسرے پل کی تعمیر میں کام کیا ہوا تھا۔ اُس دور میں عام اُجرت کی روزمرہ کی شرح دو آنہ اور دریا کے اندر پانی میں کام کرنے کی اجرت، دوگنی یعنی چار آنہ تھی، جو روپیہ کا چوتھا حصہ یعنی موجودہ پچیس پیسے کے برابر تھی۔ وہ بتاتے کہ وہ پانی کے اندر کام کر کے دوگنی اُجرت حاصل کرتے۔ جوانی میں اُن کی طاقت کی یہ کیفیت تھی، کہ صحن میں کھڑے تھے کہ چھینک آئی اور انھوں نے زور سے چھینکا، تو گلی میں جاتی ہوئی ایک خاتون کا اچانک آواز سے یعنی تراہ آنے سے آزار بند ٹوٹ گیا اور دوسری خاتون کے سر سے پانی سے بھرا گھڑا، گر کر ٹوٹ گیا، جس پر خواتین کے رشتہ داروں اور گھر والوں نے بہت احتجاج کیا اور مشکل سے معافی ملی۔

بابا نواب خان اور ابراہیم خان

ملک نواب خان اور محمد ابراہیم خان دونوں بھائی تھے۔ نواب خان بڑے تھے سرخ گلابی چہرے اور تنومند

تھے۔ وہ بھی جوانی میں مرچنٹ نیوی میں سروس کرتے رہے تھے۔ ان دونوں میں طبعی یا فطری ظرافت نسبتاً زیادہ تھی اور یادداشت بہت اچھی تھی۔ اپنے بچپن میں بڑوں سے سنی ہوئی باتوں اور اقوال کا ان کے پاس خزانہ تھا۔ جب لہر میں ہوتے تو بہت دلچسپ ورنگین واقعات سناتے اور سب لوگ دل جمعی سے سنتے۔ یہاں میاں محمد بخش کا یہ قول بابا ابراہیم اور ماموں عبدالغنی اکثر دہراتے تھے:

ع　کیسر سستا وچ کشمیرے　پوچھو مُل لاہوروں

پستہ تے بادام منقہ　سستے مِلن پشوروں!

بابا ابراہیم مجھ سے جب ملتے مسکراتے ہوئے کہتے

ع　او ٹوتا سائیں دیا　لمیاں تیریاں لرجاں

او ٹوتا سائیں دیا

ٹوت شہتوت کو کہا جاتا ہے، جس کے پتے ریشم کے کیڑے پالنے کے لئے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ شہتوت کی شاخوں کو لرج کہتے ہیں، جن کا سایہ گھنا اور ٹھنڈا ہوتا ہے اور پھل رس بھرا میٹھا ہوتا ہے۔ سائیں میرا نام تھا، جس نسبت سے وہ مجھے مخاطب کرتے۔ ان کا ایک اور واقعہ اس طرح کا ہے، کہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں اور بالخصوص ستائیسویں رات شب قدر کی تلاش میں، بیدار رہ کر نوافل ادا کرتے اور وظیفہ کرتے۔ بڑوں کے ساتھ ہم بچے بھی مسجد میں عبادت کرتے۔ ہمارا گھر مسجد کے ملحق تھا۔ کافی رات گذر چکی تھی۔ میں پانی پینے گھر آیا۔ امی جان عبادت میں مصروف تھیں۔ پانی پینے کے بعد بستر پر لیٹا ہی تھا کہ اونگھ آ گئی۔ بابا ابراہیم بھی پانی پینے آئے۔ اُن کی آہٹ سے بیدار ہو کر اُٹھ بیٹھا تو بابا نے کہا۔ او بچے تم رات بھر جاگتے رہے اور جب رحمت کے فرشتے زمیں پر اُترے اور دعا کی قبولیت کا وقت آیا، تو فرشتے تمہاری دائیں طرف کھڑے رہے، مگر تم سوئے رہے اور ابھی ابھی جب فرشتے چلے گئے، تو تم اُٹھ بیٹھے ہو۔ ان کا اتنا کہنا تھا کہ میں نے رونا شروع کر دیا اور میرے رونے اور شور شرابہ پر مسجد سے لوگ آ گئے۔ امی جان اور بابا ابراہیم نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی، کہ یہ محض ایک مذاق تھا، مگر میں بدستور افسوس اور غصہ میں روئے جا رہا تھا۔ بہت دیر تک اسی کیفیت میں رہا۔ بعد میں یہ میرا مذاق بن گیا۔ بابا نواب قدرے مختلف تھے مگر بہت اقوال ان کو یاد تھے، نمونہ کے طور پر وہ کہتے:

ع　ماں پیو بڑی بہار ہے　جے وچ نار نہ ہووے

بھائی بڑی بہار ہے　جے وچ خار نہ ہووے

جُوا بڑی بہار ہے　جے وچ ہار نہ ہووے

چوری بڑی بہار ہے　جے وچ مار نہ ہووے

(نار سے مراد بہو)

وہ کہتے:

ع بس کر بس کر میں نو آکھے تو دس کر
لیسے بس کر

ہس ہسنی ہیں پھر رووئیں گھر جا کے جھاتا کھوئیں!

أنا مارے انی نوں منگ لگے تھمی نوں

وچو وچ کھائی جا اُتوں رولا پائی جا

بھید کسے نہ پھولنا!

میاں محمد بخش کا یہ شعر عام گنگناتے رہتے:

مر مر اک بناون شیشہ مار وٹا اک بھندے
دنیا اُتے تھوڑے رہندے قدر شناس سخن دے

سزا کا افسوس

آٹھویں کلاس میں سینئر ٹیچر انگریزی کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ہر روز گذشتہ دن پڑھائی گئی مشق یا باب کا اعادہ کرتے اور طلباء سے سوالات کرتے۔ کلاس میں سب طلباء بہت محنتی اور قابل تھے۔ گلبہار، ستیش کمار اور میں، آپس میں دوست تھے اور ایک بینچ پر بیٹھتے۔ ستیش کمار کا تعلق جموں شہر سے تھا۔ اس کا ماموں چونکہ تھانہ میں، ہیڈ کنسٹیبل تھا جس کے ساتھ وہ رہتا تھا۔ ماسٹر جی نے گلبہار سے انگریزی کے کسی لفظ کے سپیلنگ پوچھے جو وہ درست نہ بتا سکا، حالانکہ وہ ہم سے زیادہ ذہین تھا۔ ستیش نے صحیح جواب دیا۔ ماسٹر جی نے ستیش سے کہا کہ گلبہار کو تھپڑ مارو۔ ستیش نے گلبہار کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا، جس پر گلبہار کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ دوسرا سوال ستیش سے پوچھا گیا، اتفاق سے وہ بھی صحیح جواب نہ دے سکا۔ حالانکہ وہ تیاری کر کے آتا اور ہم سے زیادہ قابل تھا۔ میں نے درست جواب دیا تو ماسٹر جی نے مجھے حکم دیا، کہ ستیش کو تھپڑ مارو۔ میرا کھیتوں میں کام کرنے والا ہاتھ قدرے بھاری اور سخت تھا، بیساختگی میں کچھ زیادہ ہی زوردار طمانچہ ستیش کے دائیں گال پر تڑاخ سے پڑا، جس سے اس کے گورے چٹے نرم و نازک چہرے پر، انگلیوں کے نشان پڑ گئے اور ستیش کی سیاہ پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے چھلک کر باہر آ گئے۔ وہ رو پڑا، میں نے معذرت بھی کی، ماسٹر جی کو بھی ترس آ گیا۔ انھوں نے اس کو تھپکی بھی دی، مگر اس کے آنسو بند نہ ہورہے تھے۔ ہم تینوں گو کہ دوست تھے، مگر اس کو شکایت تھی کہ میں نے گلبہار کو مارے جانے والے تھپڑ کا، انتقام لیتے ہوئے اس کو زیادہ زور سے طمانچہ مارا۔ حالانکہ ایسی بات نہ تھی ۔ایک ماہ کے بعد امتحانات ہوئے، جس کے بعد ہم تینوں بچھڑ گئے۔ گلبہار نے تعلیم ختم کر دی۔ ستیش واپس جموں چلا گیا، میں میرپور کالج میں داخل ہوگیا۔ ایک سال بعد ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ ہم ایسے بچھڑے کہ پھر نہ مل پائے، مگر ستیش کے منہ پر میری انگلیوں کے نشانات میری آنکھوں میں ابھی بھی نمایاں ہیں اور اس کے آنسوؤں کا ملال ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔

جامع مسجد میں مکتب

ڈوگرہ عہد میں طبقاتی تقسیم کے باوجود، حکومتی اداروں میں تعلیم مفت تھی، مگر تعلیمی ادارے بہت کم تھے، جموں میں پرنس آف ویلز کالج جموں اور سرینگر میں سری پرتاپ سنگھ اور امر سنگھ کالج، بہت بعد میں معرض وجود میں آئے تھے۔ میرپور میں سری کرن سنگھ انٹر کالج ۱۹۴۴ء میں قائم ہوا۔ ان اداروں میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ مگر دور دراز دیہات کے لوگوں کی مالی مشکلات کی وجہ سے، بہت کم بچے ان تعلیمی اداروں میں پہنچ پاتے۔ علاقہ اندرہل سے ماموں عبدالعزیز پرنس آف ویلز کالج میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ماموں نور محمد خان نے ایف اے پرنس آف ویلز کالج اور بی اے، ایس پی کالج سرینگر سے پاس کیا، جب کہ بی ٹی لاہور سے کیا تھا۔ ہربنس سنگھ اور ہربنس لال، صرف دو اور گریجویٹ ڈڈیال میں تھے۔ مسلمان بچے زیادہ تر گاؤں کی مساجد میں امام مسجد سے اسلامی تعلیم حاصل کرتے، جو زیادہ تر ناظرہ قرآن تک محدود رہتی۔ جامع مسجد ڈڈیال میں شروع سے اسلامی فقہ، حدیث اور قرآن کی تفاسیر کے علاوہ، کتب کی لائبریری قائم کی گئی تھی۔ طلباء کی تعداد بیس تک تھی، کبھی اس سے بھی کم ہو جاتی۔ مولوی محمد عبداللہ سیاکھوی، امام تھے اور مولوی محمد ابراہیم مدھانوی مدرس تھے، ان کی عمر ستر سال کے قریب تھی، وہ مدرسہ دیوبند ہندوستان میں چالیس سال تک استاد رہ چکے تھے، بہت دبلے، کم وزن مگر حلیم و شفیق اور علم کا سمندر تھے۔ میں ان سے قرآن ترجمہ سے پڑھتا تھا۔ کچھ طلباء حدیث کچھ صرف و نحو پڑھتے تھے۔ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۴ء تک ڈڈیال میں رہے، جس کے بعد صحت بہت کمزور ہونے کی وجہ سے فارغ ہو گئے۔

راجہ بوٹا کی دستار بندی

ڈڈیال شہر میں ہربنس سنگھ، بہت خوبصورت اور بااثر سکھ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران، وہ ڈڈیال میں بیٹری کی مدد سے چلنے والا ریڈیو لایا۔ خبروں کے وقت اس کے گھر کے باہر لوگوں کا مجمع لگ جاتا۔ نہ جانے اسے کیا سوجھی، کہ ایک روز اس نے اعلان کر دیا کہ آئندہ اسے، راجہ ہربنس سنگھ کے نام سے مخاطب کیا جائے، اس کے لئے منادی بھی کروائی گئی۔ علاقہ میں اس کا خوب چرچا ہوا۔ جامع مسجد کے ساتھ ایک کچے مکان میں بوٹا نامی کمہار رہتا تھا، لمبی گردن، ایک آنکھ سے کانا، لمبوترے، بے ہنگم اور کمزور جسم کا مالک تھا۔ وہ مٹی کے برتن بنا کر فروخت کر کے گذر اوقات کرتا تھا۔ سیاکھوی صاحب سیاست میں بھی تھے۔ وہ ہندو سکھ ساہوکارہ نظام، جو ضلع میرپور میں سودی لین دین کا بدنام ترین نظام تھا، کے خلاف جدوجہد کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ راجہ محمد اکبر، مولوی عبدالغنی المعروف مولوی ڈنڈیوالہ پیش پیش تھے۔ مولوی سیاکھوی صاحب نے ہم تمام لڑکوں کو جمع کیا۔ بوٹا کمہار کو نیا لباس پہنا کر اس کے گلے میں ہار ڈالے، سرخ رنگ کی پگڑی پہنا کر اس کی راجہ بوٹا کے خطاب سے دستار بندی کی۔ ایک گدھے پر رنگدار چادر ڈال کر، اس پر بوٹا کمہار کو سوار کیا اور اعلان کیا، کہ آج کے بعد، بوٹا کمہار کو، راجہ بوٹا کا خطاب

دیا جاتا ہے۔ سیاکھوی صاحب نے نعرہ بلند کیا "راجہ بوٹا" ہم تمام لڑکوں نے بلند آواز میں زندہ باد کہا۔ گدھے پر سوار، سر پر سرخ پگڑی، گلے میں پھولوں کے ہار راجہ بوٹا زندہ باد کے نعرے لگاتا جلوس، جب بازار میں پہنچا تو لوگوں نے تالیاں بجا کر استقبال کیا، ایک تماشہ بن گیا۔ بازار میں اور لوگ بھی جلوس میں شامل ہوتے گئے۔ سکھ دوکاندار اور بڑے بڑے تاجر تماشا دیکھتے رہے۔ اس دوران ہربنس سنگھ کو اطلاع ہوگئی۔ جلوس سیاکھوی صاحب کی قیادت میں ہربنس سنگھ کی دوکانات اور گھر کے سامنے پہنچا، تو بازار میں رہائشی سکھ، ہندو مرد وخواتین دوکانوں سے اور مکانات کی بالکنیوں میں اُمڈ آئے۔ ہربنس سنگھ، ہاتھ جوڑ کر سامنے آیا اور معافی مانگتے ہوئے اعلان کیا، کہ وہ اُس دن کے بعد راجہ نہیں کہلائے گا اور بوٹا کمہار کو بھی راجہ بوٹا نہ کہو۔ اس کی معافی اور اعلان پر جلوس ختم ہوگیا۔ ہربنس سنگھ تو راجہ نہ کہلایا، مگر چند سال بعد وفات تک، بوٹا کمہار راجہ بوٹا ہی کہلاتا رہا۔

گلو اور حلیم

ڈڈیال کے محلّہ راجگان میں دو بھائی، غلام محمد عرف گلو اور حلیم مٹی کے برتن بنا کر گذر اوقات کرتے تھے، ایک کمرہ کے کچے مکان میں غیر شادی شدہ رہتے تھے۔ شاید انھوں نے اوتار سنگھ دوکاندار سے دس بیس روپیہ مالیت کا سودا، ادھار لیا تھا۔ سکھ ساہوکار نے سود در سود لگا کر نوے یا 100 روپیہ کے قرض کی وصولی کا، میر پور منصف کی عدالت میں دونوں کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ پیادہ سمن لے کر تعمیل کے لئے آیا۔ وہ دونوں اَن پڑھ تھے اور اس دور میں عدالت کا خوف اور دبدبہ تو تھا ہی، مگر اس پر قرض وصولی کا دعویٰ، مزید پریشانی کا باعث تھا۔ وہ پیادہ عدالت کو لے کر سیدھے مولوی عبداللہ سیاکھوی صاحب کے پاس لائے۔ انھوں نے سمن پر تعمیل کروادی اور تاریخ سماعت کے روز، ان کے ساتھ میر پور منصف کی عدالت میں پیش ہونے اور مقدمہ کی پیروی کی تسلی دی۔ سماعت کی تاریخ جنوری کے پہلے ہفتہ میں تھی۔ مولوی صاحب نے باجرہ کی باسی روٹی اور ایک ایک ان کو مولی دی اور دونوں کو بتایا، کہ کمرہ عدالت میں منصف جج کے کسی بھی سوال پر جواب نہیں دینا اور دائیں ہاتھ میں روٹی کو منہ میں ڈال کر بائیں بغل میں رکھی مولی کو منہ بغل کی طرف لپکا کر مولی کو چک مار کر کھانا۔ دونوں بہت غریب تو تھے ہی، داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی، بدن پر میلے کچیلے چیتھڑے نما کپڑے، پاؤں سے ننگے، سخت سرد موسم میں ٹھٹھرے ہوئے، مقدمہ کا پکارا ہونے پر، منصف صاحب، جو شوخ انگاروں کی گرم گرم انگیٹھی کے تپتے سینک سے، سرد موسم کی ٹھنڈک کی سختی سے محفوظ، کرسی نشین تھے۔ ان دونوں کو موسم کی شدت اور چیتھڑوں میں دیکھ کر قدرے متعجب ہوئے۔ جج نے ان سے کہا، کہ تمہارے خلاف اوتار سنگھ نے قرض خواہی کا دعویٰ کیا ہے اور تم نے جواب دینا ہے۔ کیا دعوے کو مانتے ہو؟ انھوں نے حسب ہدایت دائیں ہاتھ میں رکھی ہوئی باجرہ کی باسی روٹی کو چک مار کر کھایا اور ساتھ ہی بائیں بغل میں رکھی مولی کو گردن گھما کر چک مارا، اور پھر کھانا شروع کر دیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران سیاکھوی صاحب بھی، کمرہ

عدالت میں داخل ہو گئے۔ منصف نے دوسری بار سوال کیا، تو بغیر جواب دیئے وہی عمل دوہرایا۔ تیسری بار سوال پر بھی وہی روٹی اور مولی کھانے کا عمل، جب دوہرایا تو مولوی صاحب نے منصف صاحب کو بتایا کہ گلو اور حلیم ان کے پڑوسی ہیں۔ یہ بہت غریب، ان پڑھ، سادہ اور کم گو آدمی ہیں۔ اوتار سنگھ نے دھوکہ سے اپنی پوتھی پر قرض کے عوض انگوٹھے لگوا لیے ہیں اور سُود در سُود جمع کر کے قرضہ کا دعویٰ کر دیا ہے۔ منصف صاحب نے گلو اور حلیم کے عدالت میں رویے، ان کے لباس اور مولوی صاحب کی بتائی ہوئی کہانی قلمبند کر کے دعویٰ خارج کر دیا۔ گلو اور حلیم خوشی خوشی گھر پہنچے اور مولوی عبداللہ زندہ باد کے نعرے لگائے۔

ماسٹر بابو سردار سنگھ

ریاست جموں کشمیر میں تعلیم بالغاں کا حکومت نے اعلان تو کیا، مگر اس کا خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا اور نہ ہی کوئی ادارہ قائم ہو سکا۔ ڈڈیال سکول میں مقامی ٹیچر بابو سردار سنگھ پرائمری کلاس میں پڑھاتے تھے۔ وہ بہت رحم دل، ملنسار، شفیق انسان اور استاد تھے۔ سکول اوقات کے بعد، ہاتھ میں قاعدہ کی کتاب، چھوٹی سی چھڑی، سادہ لباس میں ڈڈیال کے ارد گرد، قرب و جوار کے دیہاتوں میں نکل جاتے۔ راستہ میں جو کوئی گاؤں کا اَن پڑھ آدمی نظر آ جاتا اسے وہاں ہی راستہ میں بٹھا کر، پڑھانا اور لکھانا شروع کر دیتے۔ سب سے پہلے نام اور دستخط کرنا سکھاتے۔ چونکہ راہ چلتے لوگوں کو پڑھاتے تھے، یہ اکثر دیکھا گیا کہ وہ انگلی سے زمین پر لکھائی کرتے، جسے بعد میں مٹا دیتے۔ گاؤں میں جاتے تو مسلمان گھروں میں پانی پی لیتے۔ وہ بہت ملنسار اور ہمدرد انسان اور شفیق استاد تھے۔ ان کا بیٹا پریتم سکول میں میرا کلاس فیلو تھا۔

مولوی عبدالمجید

ان کا تعلق سیاکھ گاؤں سے تھا۔ مولوی محمد عبداللہ سیاکھوی کے بھتیجا تھے۔ عربی اور دینیات کے استاد تھے۔ میں نے سکول میں فارسی مضمون کے بجائے عربی مضمون، ان ہی کی ترغیب پر رکھا تھا۔ سکول میں سکھ طلباء گورمکھی، ہندو ہندی اور مسلمان فارسی یا عربی زبان کا مضمون پڑھتے تھے۔ عربی کلاس میں ہم صرف چند طلباء تھے، اکثریت فارسی پڑھنے والے طلباء کی تھی۔ اردو، انگریزی، حساب، تاریخ اور جغرافیہ لازمی مضامین تھے۔ اردو سرکاری زبان تھی۔ ڈوگرہ عہد سے قبل سلطانی دور سے ریاست میں سرکاری زبان فارسی تھی اور قدیم زبان ہندی تھی۔ مغل دور میں عربی زبان بھی رائج ہوئی، لیکن دفتری زبان فارسی ہی رہی۔ مولوی عبدالمجید، مسلمان طلباء بالخصوص غریب اور مفلس طلباء کو کتابیں مہیا کرنے اور وظیفہ دلوانے میں بہت مدد کرتے۔ تعلیم تو مفت تھی، مگر حکومت کی طرف سے مفلس اور نادار طلباء کی مالی مدد کے طور پر، وظائف بھی مقرر تھے۔ جو ہیڈ ماسٹر کی صوابدید کے تابع تھے، مگر اُس دور میں صرف استحقاق کے مطابق ہی دادرسی ہوتی۔ طلباء میں بھی بہت ہی خودداری ہوتی، عزت نفس کا سختی سے تحفظ

ہوتا۔ سکول میں ۱۹۴۷ء تک ہیڈ ماسٹر، زیادہ تر مسلمان ہی تعینات رہے، جن میں جموں شہر سے خواجہ عبدالواحد، خواجہ محمد اسلم، ملک عمر حیات، گجرات کے چوہدری سردار خان، ڈڈیال کے ملک نور محمد خان اور میرپور شہر کے بخشی میلا رام رہے۔ بخشی میلا رام ۱۹۴۶ء تک ہیڈ ماسٹر رہے، وہ آٹھویں کلاس میں انگریزی کے ٹیچر تھے۔ چوہدری غلام حسین فارسی اور اردو، ماسٹر امرناتھ حساب الجبرا، اور جیومیٹری جبکہ چوہدری فضل الٰہی، تاریخ و جغرافیہ کے ٹیچر تھے۔

میرپور کالج

میرپور کو ضلع کی حیثیت حاصل تھی۔ اس سے قبل جموں شہر، تمام خطہ کا صدر مقام اور ضلع کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے بعد نوشہرہ اور مناور کو بھی، مختصر مدت کے لئے ضلع کی حیثیت حاصل رہی۔ بھمبر، کوٹلی اور میرپور کی تین تحصیلوں پر مشتمل، میرپور ضلع قائم ہوا۔ نوشہرہ کی حیثیت بھمبر تحصیل کی نیابت کی تھی۔ صوبہ جموں دیگر صوبہ جات کشمیر، لداخ اور گلگت کی نسبت بڑا صوبہ تھا اور اس میں میرپور سب سے بڑا ضلع تھا۔ رقبہ میں سب سے بڑا صوبہ لداخ، مگر آبادی میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے بعد رقبہ اور آبادی دونوں میں جموں بڑا صوبہ تھا۔ میرپور شہر کھڈ ندی کے بائیں کنارے بلندی پر واقع شرقاً غرباً ایک میل اور شمالاً جنوباً تین سے چار فرلانگ تجارتی شہر تھا۔ شہر میں داخلہ کے لئے دو ہاتھی دروازے، مغرب اور مشرق میں تعمیر شدہ تھے۔ شمال سے جنوب، پختہ صاف ستھری گلیاں بالمقابل اسی طرح بنی تھیں، کہ شہر کو عبور کر کے ایک طرف سے دوسری طرف، آسانی سے گذرا جا سکتا۔ بازار گھڑے ہوئے ہموار پتھروں کے فرش کے طور پر تھا۔ فرش کے دونوں طرف نالیاں اس زاویہ سے بنی تھیں کہ بارش سے فرش اور شہر دھل جاتا۔ شہر کے مغرب میں ہاتھی دروازہ کے ساتھ جامع مسجد اور محلہ گکھڑاں تھا، جس کے مغرب میں میرپور، کوٹلی سڑک، محلہ نلوئی کو شہر سے الگ کرتی، بائیں کنارے ٹھنڈے، پینے کے پانی کے کنویں تھے جو شہر کی ضرورت کے لئے کافی تھے۔ شہر کے مرکز میں رگوناتھ مندر تھا، اس کے علاوہ بھی مندر گوردوارے، مساجد تعمیر شدہ تھیں۔ مشرق میں ہاتھی دروازہ کے باہر تحصیل دفاتر، ایس کے ایس کالج، اس کے ملحق ہوسٹل مزید مشرق میں ضلع کے دفاتر اور عدالتیں تھیں، جن کے جنوب میں ڈاک بنگلہ اور پولیس لائن تھی۔ شہر کے جنوب میں قلعہ تھا، جس میں پولیس سٹیشن قائم تھا۔ اس کے ملحق بس سٹینڈ اور برف کا کارخانہ تھا۔ یہاں سے بسیں براستہ نوشہرہ اور بھمبر، اکھنور، جموں جاتیں اور میرپور کوٹلی سے پونچھ شہر تک چلتیں۔ میرپور سے دریا جہلم، گھڑیالیاں پتن تک بسیں چلتیں۔ کشتی پر دریائے جہلم کے تین نالے عبور کر کے، جہلم شہر تک تانگہ پر سفر کیا جاتا۔ پتن کے ملاح میرپور کے مسافروں کو خوب لوٹتے۔ اس دور میں، میرپور کے عوام کے دو کٹھن مسئلے تھے، گھڑیالیاں پتن اور میرپور میں ہندو ساہوکارانہ نظام۔ میرپور شہر کا نام امیر خان گکھڑ، فاتح علاقہ جن کو میراں شاہ بھی کہا جاتا ہے، کے نام پر رکھا جانا بیان ہوتا ہے۔ ان کا مزار شہر کے مشرق میں ضلع کچہری کے شمال میں واقع ہے، جو اب منگلا جھیل کی نذر ہے۔ ایک روایت کے مطابق پوری نامی ایک ہندو سادھو اور میراں شاہ دونوں میں روحانی تعلق تھا، ان کی دوستی اور تعلق کی نسبت سے شہر کا نام میر (میراں شاہ) اور پور (پوری ہندو سادھو کے مشترک

نام کا غماز ہے، جس کا تحریری ثبوت نایاب ہے، تاہم جموں آرکائیو میں شاید کوئی ثبوت ہو۔

ڈڈیال سکول مڈل درجہ کا تھا، مگر ۱۹۳۶ء میں ہائی سکول کا درجہ دینے کے لئے نویں جماعت کا آغاز کیا گیا۔ میرے ماموں عبدالعزیز پولیس سب انسپکٹر، جموں تعینات تھے، وہ مجھے جموں میں داخل کروانا چاہتے تھے۔ میں بھی جموں کے شوق میں تیار تھا، مگر امی جان اور نانا جان نے میرپور انٹر کالج میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا۔ اس سوچ و بچار میں، میں ایک ماہ تاخیر سے داخل ہوا۔ کالج میں داخلے کے دن ہی ہوسٹل میں کمرہ بھی مل گیا۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ پروفیسر ملک عمر دین تھے، جو کالج میں اردو کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ڈڈیال ہائی سکول کے سابق ہیڈ ماسٹر، چوہدری سردار خان بھی کالج میں لیکچرر تعینات تھے۔ وہ دونوں بھی ہوسٹل میں ہی رہائش پذیر تھے، پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین پرنسپل تھے۔

میرپور کالج میں پہلا پیریڈ

انٹر کالج میرپور میں داخلہ کے بعد مئی ۱۹۴۷ء میں کلاس دہم میں، میں نے دیگر لازمی مضامین کے ساتھ عربی زبان کا مضمون بھی لے رکھا تھا۔ کلاس میں پہلا دن اور پہلا ہی پیریڈ تھا۔ میں کلاس میں داخل ہونے کے شوق میں، نیا لباس پہن کر خوب بن ٹھن کر گیا۔ کلاس میں عربی کے طلبا کوئی گنتی ہی میں تھے۔ میں ابھی کلاس میں سکول اور کالج کے ماحول کا امتیازی جائزہ ہی لے رہا تھا، کہ پتلون کوٹ کے خوبصورت سوٹ میں ایک گورے رنگ کے خوبصورت اور پُر وقار نوجوان پروفیسر، کلاس روم میں رونق افروز ہوئے۔ احترام میں طلباء کھڑے ہو گئے۔ میں قریب دو ہفتے، کلاسیں شروع ہونے کے بعد، کلاس میں شامل ہوا تھا، میں تیسرے نمبر پر بیٹھا تھا۔ پروفیسر صاحب نے آتے ہی اگلے روز پڑھایا ہوا سبق سننا شروع کر دیا۔ پہلے لڑکے کو جواب نہ آیا۔ پروفیسر صاحب نے دائیں ہاتھ سے تڑاخ منہ پر تھپڑ مارا۔ دوسرے نمبر والے کو بھی جواب نہ آیا، اسے بائیں ہاتھ سے تھپڑ مارا، اس کا گال لال سُرخ ہو گیا۔ میں صرف یہ بتانے، کہ میں آج ہی داخل ہوا ہوں اور میرا پہلا دن اور پہلا پیریڈ ہے، کہنے کے لئے پورے اعتماد کے ساتھ، ابھی کھڑا ہی ہو رہا تھا کہ سیدھا تھپڑ میرے سانولے گال پر تڑاخ سے پڑا۔ اس عمر میں، میں بہت غصیل بھی تھا۔ میں نے غصہ میں کہا کہ میرا آج پہلا دن ہے اور...... اتنا ہی کہا تھا، کہ پروفیسر نے ہلکی سی مسکراہٹ میں پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ میں نے بتایا ڈڈیال سے آیا ہوں! انھوں نے اسی انداز میں میری طرف غور سے دیکھا اور کہا، اگر پہلے سے بھی آئے ہوتے، تو کیا کمائی کر لیتے اور کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ میری اس مختصر تکرار کا اثر یہ ہوا کہ باقی طلباء بچ گئے۔ پروفیسر صاحب نے کتاب لی اور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ پیریڈ ختم ہوا تو لڑکے میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ یہ پروفیسر شیخ فتح احمد، جموں شہر کے تھے اور پروفیسر شیخ محمود احمد کے بڑے بھائی تھے۔ اس دن کے بعد کالج میں ایسی نوبت کبھی بھی نہ آئی۔ شیخ فتح احمد پاکستان کے قیام کے دوران لاہور منتقل ہو گئے، ستمبر ۱۹۴۷ء میں کالج بند ہو گیا

تھا۔ لوگ نقل مکانی کر گئے تھے۔ جنوری ۱۹۵۷ء کی صبح کو میں آمن آباد لاہور سے سائیکل پر سول کورٹس جارہا تھا، ایم اے او کالج کے راستے میں، میں نے قریباً پونے دس سال بعد، پروفیسر فتح احمد صاحب کو پیدل آتے دور سے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو میں بے ساختگی میں بغیر تعارف کروائے، اچانک السلام علیکم کہہ کر ان سے بغلگیر ہو گیا۔ وہ اپنے خیال میں تھے، میری اس حرکت پر وہ بری طرح چونک گئے اور بولے، اوئے تو ضرور میرا شاگرد ہوگا۔ میں انھیں قریب ہی سول کورٹس کی کینٹین میں لے گیا اور اُن کو اپنا میرپور کالج میں پہلے روز عربی کلاس میں تھپڑ مارنے والا واقعہ سنایا، تو وہ زوردار قہقہہ لگا کر دوبارہ، مجھ سے بغلگیر ہو گئے اور گھنٹہ بھر میرپور کالج کے بعد پیش آنے والے واقعات سناتے رہے۔ وہ لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ اب ان کا حسن ماند پڑ رہا تھا، مگر لباس ویسا ہی شاندار اور پُر وقار۔ آخری بار میرپور ۱۹۷۶ء میں ملے۔ جب بیٹی کو ساتھ لئے باشندہ ریاست سرٹیفکیٹ بنوانے میرپور آئے تھے۔

میرپور ہوسٹل میں میرے ساتھ چوہدری شیر زمان اور راجہ عبدالخالق، مرحوم کے کلاس فیلو تھے۔ ہوسٹل میں پروفیسر عمر دین، ہماری بہت دیکھ بھال کرتے تھے۔ اُن دنوں تحریک پاکستان آخری مراحل میں تھی، ملک عمر دین ان دنوں روزنامہ ڈان، پاکستان ٹائمز، نوائے وقت پڑھنے کی تاکید کرتے۔ تب سے میں یہ اخبار تواتر سے پڑھتا ہوں۔ البتہ پاکستان ٹائمز کی بندش کے بعد، جنگ اور دی نیوز میرے زیر مطالعہ ہیں۔ کالج میں مسلمان اور ہندو لیکچرر آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ ۳/جون کو اعلان پاکستان ہونے پر، مسلمان ناچ رہے تھے اور ہندو بہت پریشان تھے۔ کالج میں ہندو پروفیسر مہتہ نے، کلاس میں قائداعظم کے خلاف بات کی۔ اس کے بعد کا پیریڈ ملک عبدالرشید کا تھا۔ پروفیسر ملک عبدالرشید کا تعلق بھی، جموں شہر سے تھا۔ وہ بہت نڈر اور تحریک پاکستان کے کٹر حامی تھے۔ ہم نے پروفیسر مہتہ کی قائداعظم پر ان کی تنقید کا ذکر کیا۔ وہ غصہ میں پروفیسر مہتہ پر دوسرے کلاس روم میں جا کر، حملہ آور ہوئے۔ طلباء نے ان کو پکڑا تو پروفیسر مہتہ نے چیختے چلاتے بچاؤ بچاؤ کا شور کرتے ہوئے، بھاگ کر پرنسپل کے آفس میں پناہ لی۔ رشید صاحب تعاقب میں وہاں پہنچے، مہتہ نے معافی مانگی جس پر معاملہ ختم ہوا۔

کلاس میں میری لڑائی

کلاس روم میں ہندو لڑکے پہلی قطار میں سیٹوں پر اور مسلمان طلباء عموماً پچھلی سیٹوں پر بیٹھتے تھے۔ مجھے ابھی داخل ہوئے دو ہفتے ہی گذرے تھے۔ کلاس میں ایسر پنڈ کا لڑکا عثمان غنی میرا دوست بن گیا۔ وہ، خواجہ افضل دین اور خواجہ لعل دین گلبہار، جنہوں نے بعد میں آزاد ٹرانسپورٹ کمپنی بنائی تھی، ان کا بھائی تھا۔ وہ ہر روز گاؤں سے پیدل کالج آتا تھا اور پہلے پیریڈ میں تاخیر سے پہنچتا تھا۔ ایک دن پروفیسر عبدالرشید نے کلاس میں تاکید کی کہ مسلمان طلباء اگلی سیٹوں پر بیٹھا کریں۔ دوسرے روز میں پہلی لائن میں آ کر بیٹھ گیا اور دوسری سیٹ پر کتابیں رکھ کر، عثمان غنی کے لئے سیٹ محفوظ کر لی۔ عثمان حسب معمول لیٹ تھا۔ اس دوران ہندو طلباء جادیو اور ننھی آ گئے، وہ بہت

توانا اور لڑاکے بھی تھے۔ ابھی کلاس شروع نہ ہوئی تھی، انھوں نے مجھے سیٹ خالی کرنے کو کہا۔ جھگڑالو اور توانا تو میں بھی تھا۔ جب میں ڈٹ گیا، تو تین چار ہندو لڑکے مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ مسلمان لڑکے زیادہ تھے، مگر وہ میری مدد کو نہ آئے اور تماش بین بن گئے۔ ہندو لڑکوں نے مجھے اٹھا کر پچھلے ڈیسک پر پھینک دیا اور کتابیں بھی پھینک دیں۔ اسی دوران پروفیسر کے آنے پر کلاس شروع ہو گئی، عثمان بھی آ گیا۔ جب کلاس ختم ہوئی تو اگلی کلاس پروفیسر رشید کی تھی۔ کلاس شروع ہونے سے پہلے ہی عثمان اور میں نے، ہندو لڑکوں کی پانچ منٹ کے اندر اندر وہ درگت بنائی، کہ وہ اگلی سیٹوں سے بھاگ گئے۔ پروفیسر رشید کو جب اس کا علم ہوا وہ خوش ہوئے۔ انگریزی کے پروفیسر جادیو تھے، وہ بھی جموں شہر کے تھے، وہ بہت خوش مزاج تھے۔ جب ان کو ہماری لڑائی کا علم ہوا، تو اس کے بعد وہ مجھے پہلوان کہہ کر کہتے، اوہ میرے پہلوان شاگرد اُٹھ میرے سوال کا جواب دے۔ لڑائی کے بعد ہندو لڑکے میرے گہرے دوست بن گئے۔ تب سے میری اور عثمان غنی کی، اگلی سیٹیں پکی محفوظ ہو گئیں۔ شام کو کالج گراؤنڈ میں ہاکی، فٹ بال، والی بال اور کرکٹ کے کھیل ہوتے۔ پروفیسر رشید سپورٹس انچارج تھے اور فزیکل انسپکٹر، پونچھ کے عبدالحمید صاحب تھے۔ کھیلوں کا شوق بھی تھا، قد و قامت کی وجہ سے بھی مجھے کھیل میں شامل کر لیا جاتا، زیادہ مہارت والی بال میں تھی۔ پروفیسر رشید صاحب بھی والی بال میں زیادہ دلچسپی لیتے۔ ایک دفعہ غلط پاس دینے پر میچ کھیلتے ہوئے، مجھے ٹیم سے ہی نکال دیا، لیکن جب غصہ ختم ہوا تو پھر شامل کر لیا۔ جب ہم میچ جیت گئے تو بہت خوش ہوئے۔

سیّد علی احمد شاہ اور غازی الٰہی بخش ضلع بدر

قیام پاکستان کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی، پنجاب میں ہنگامے اور بلوے شروع ہو گئے۔ ریاست میں گو حالات پُرسکون تھے، مگر مہاراجہ نے اپنی حکمت عملی کے تحت ریاستی فوج کی مسلمان یونٹس لداخ، گلگت کی جانب تعینات کر دیں اور سوچیت گڑھ سے لے کر بھمبر، میرپور، ڈڈیال، کوٹلی، پونچھ اور مظفرآباد تک مجوزہ اور متوقع پاکستان اور ریاست کی سرحد پر، ڈوگرہ، ہندو اور سکھ کمپنیاں تعینات کر دیں۔ اسی دوران مسلمان آبادیوں میں پاکستان کے حق میں جوش و خروش جوبن پر تھا۔ سیّد علی احمد شاہ، مہاراجہ کی ڈوگرہ آرمی میں میجر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ پارلیمانی بورڈ کے چیئرمین تھے، جبکہ غازی الٰہی بخش، میرپور شہر میں مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ چوہدری غلام عباس خان، اے آر ساغر، آغا شوکت وغیرہ گذشتہ اکتوبر سے جموں جیل میں قید تھے۔ حکومت نے بطور حفظ ماتقدم، علی احمد شاہ اور غازی الٰہی بخش کو ضلع بدر کر دیا۔ وہ جہلم چلے گئے اور وہاں جہاد آزادی کا کیمپ قائم کر لیا۔ گرمیوں کی تعطیلات کے بعد، جب ہم کالج واپس آئے، تو ہوسٹل اور کالج گراؤنڈ، پنجاب سے نقل مکانی کرنے والے ہندو اور سکھ خاندانوں کے کیمپ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ رٹہ کے ہندو طوطا رام کا ایک مکان، سی ایم ایچ کے بالمقابل تھا، راجہ عبدالخالق نے ایک کمرہ لیا، جس میں خالق، شیر زمان اور میں نے رہائش اختیار کی۔

غازی دوست محمد کا حملہ

وقت کے ساتھ ساتھ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ راو رتن سنگھ مہاراجہ کے سوتیلے بھائی، میرپور ضلع کے حاکم اعلیٰ وزیر وزارت کے عہدہ پر فائز تھے اور جموں شہر ہی کے محمد یحییٰ، ایس پی تعینات تھے۔ انھوں نے تین بسوں میں خزانہ لاد کر اور اپنی خواتین، بچوں کے علاوہ، مخصوص لوگوں کو سوار کر کے، براستہ نوشہرہ، جموں روانہ کیا۔ حفاظت کے لئے ڈوگرہ فوج بھی ساتھ ارسال کی۔ اکالگڑھ سے چند میل آگے، پیر گلی سے پیچھے، چٹانوں کے موڑوں کی چوٹیوں پر، بوتھی کے کشمیری خاندان کے ڈاکو، دوست محمد عرف دوسہ نے، مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ بسیں جب اُن موڑوں میں پہنچیں، تو آگے سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ صبح دس بجے سے لے کر شام تین بجے تک، بالمقابل فائرنگ جاری رہی۔ میرپور سے اضافی کمک شامل ہونے کے باوجود، تمام بسیں، مع خزانہ شام پانچ بجے میرپور واپس آگئیں۔ تب سے دوست محمد کو غازی کا خطاب ملا اور کل کا دوسہ ڈاکو، آج کا غازی دوست محمد بن گیا۔ اس نے بس میں سوار خواتین اور بچوں پر قطعی فائرنگ نہ کی اور بار بار آواز بلند اعلان کیا کہ "میرپور کا خزانہ جموں نہیں جانے دوں گا بلکہ میرپور کا خزانہ میرپور ہی رہے گا"۔ اس واقعہ سے میرپور میں کہرام مچ گیا اور شہر کی مورچہ بندی شروع ہوگئی۔

ڈوگرہ کپتان کی حراست میں

میرپور شہر میں سوائے مسلمان ملازمین کے، دیگر مسلمانوں کا آنا جانا کم ہوتا گیا۔ ان دنوں کالج بند کرنے کا سوچا جا رہا تھا، مگر حکومت اتفاق نہ کر رہی تھی۔ صبح کالج جانے سے پہلے ہی، شیر زمان کے چچا کرم حسین آگئے اور کہا کہ میرپور چھوڑنا ہے۔ ہم نے بستر وغیرہ لپیٹ کر بند کیے۔ انھوں نے مجھے ذمہ داری سونپی، کہ سامان لے کر ڈڈیال جانے کیلئے اڈہ تانگہ جھنگ پر آ جاؤں اور وہ تینوں شہر کے باہر سے وہاں پہنچ کر میرا انتظار کریں گے۔ وہ یہ ہدایت دے کر فوراً نکل گئے۔ سامان تین بستر اور تین بکس تھے اور کتابیں الگ، ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد بس اڈہ سے مزدور ملے اور وہ بھی دوگنی مزدوری پر۔ سامان لے کر میں بازار سے پنڈی ڈھکی کی گلی کی طرف بڑھا، وہاں قریب ہی ایک فوجی چوکی تھی۔ سامان اور مزدوروں کو دیکھتے ہی فوجی بھاگ کر آگئے اور مجھے چوکی پر بٹھا دیا، وہاں کرسی پر بیٹھا کپتان سوالات کرنے لگا کہ کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیئے مگر وہ مطمئن نہ ہوا اور مجھے بٹھا دیا۔ اپنے اوپر، اپنی سادگی اور بھولے پن بلکہ حماقت پر، اس وقت تک کی زندگی میں غصہ آگیا، کہ جب ان تینوں نے، چالاکی سے سامان میرے سپرد کر کے، خود شہر کے باہر باہر سے جانے کا کہا، تو عقل اور علم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایسی چال تو کم عقل انسان بھی بھانپ سکتا ہے اور پھر خیال آیا کہ میرے ساتھ دھوکہ کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ مگر پھر خیال آتا کہ نہیں شاید ان کو بھی اس بات کا علم نہ ہو اور وہ بھی میری طرح معصوم ہی ہوں۔ لہٰذا ان کے خلاف جو غلط خیالات اس وقت ذہن میں آئے، میں نے ختم کر دیئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ حراست میں گذرا

ہوگا۔ میرے ساتھ مزدور بھی پکڑے گئے تھے۔ اسی دوران ایک سکھ سردار گذرتے ہوئے قریب آ گیا اور کپتان سے پوچھا، اس لڑکے کو کیوں بٹھا رکھا ہے؟ کپتان نے جواب دیا کہ یہ اپنے آپ کو کالج سٹوڈنٹ بتاتا ہے، مگر شہر کیوں چھوڑ رہا ہے۔ اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ سردار جی نے پوچھا کہ، کاکا کہاں جانا ہے؟ میں نے بتایا ڈڈیال! اس نے کہا کہ وہاں کسی آدمی کو جانتے ہو۔ میں نے ملک فیض عالم خان نمبردار کا نام لیا، کہ وہ میرے نانا ہیں۔ اس پر سکھ سردار جی، جو نانا جان کو جانتا تھا، اس نے کپتان سے کہا یہ لڑکا اچھے خاندان کا ہے، اس کو جانے دیں۔ ڈوگرہ کپتان نے میری طرف دیکھ کر کہا، ٹھیک ہے جا سکتے ہو۔ میں نے سردار جی اور کپتان دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں افسوس ہوا کہ پریشانی میں سردار جی کا نام پوچھنا بھی بھول گیا۔ مصیبت اور پریشانی میں، سردار جی رحمت کا فرشتہ بن کر آئے۔ میر پور شہر کو ڈوگرہ عہد میں آخری بار الوداع کہا اور منزل کی طرف چل پڑا۔ اس کے بعد میر پور کو آگ کے شعلوں اور لوٹ مار کی خوفناک حالت میں ہی دیکھا۔ میر پور میں ہندو، سکھ اور مسلمان سب صحت مند اور توانا تھے۔ کبڈی کی ٹیم ریاست میں اول پوزیشن میں تھی۔ پہلوانی کے اکھاڑے تھے اور پنجاب کے پہلوانوں کے ساتھ مقابلہ کی کشتی کے دنگل، اکثر منعقد ہوتے۔ بازو یعنی بینی پکڑنی، مگدر اٹھانے کے مقابلے، کھیلوں میں مسلمانوں کو سبقت حاصل تھی۔ میر پور کے ہندو اور سکھ خوبصورت تھے، خواتین بہت زیادہ حسین تھیں۔ دولت اور سرمایہ میں ہندو ساہوکار اور سکھ تاجر بہت امیر تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں ان کی نقل مکانی کے کئی سال بعد منگلا ڈیم کی تعمیر تک، لوگ سونے چاندی کے دفینے نکالتے رہے۔ سب سے زیادہ سونا چاندی قبائلی پٹھانوں نے حاصل کیا۔ مقامی طور پر شہر کے باشندوں میں سرکردہ لوگوں کو بھی مال ہاتھ آیا۔ وہ راتوں رات امیر بن گئے۔ متروکہ دولت نے معاشرہ میں تمام اخلاقی اقدار کو بری طرح متاثر کیا اور تمدن مکمل زوال پذیر ہو گیا۔

ڈڈیال میں فوج کی طلبی

پاکستان ۱۴/اگست کو معرضِ وجود میں آ جانے پر، مسلمانوں میں بہت جوش و جذبہ تھا۔ برطانوی حکومت اور ہندو کانگریس کی تمام تر رکاوٹوں اور مخالفت کے حربے ناکام ہوئے اور قائداعظم کو جو عظیم تاریخی فتح حاصل ہوئی اور نیا ملک اور نئی قوم دنیا کے نقشے پر معرضِ وجود میں آئی، اس سے مسلمانوں میں نیا اعتماد اور عزم پیدا ہوا تھا۔ آزاد خود مختار مسلم ریاست کا قائم ہونا، ایک معجزہ ہی تھا۔ آزادی کے اُس پر جوش ماحول میں، جموں کشمیر کے مسلمان اپنے آپ کو پاکستان کا حصہ ہی سمجھتے تھے۔ میر پور کے پر خطر، سہمے سہمے اور گھٹن کے ماحول کے برعکس، ڈڈیال میں پوزیشن قدرے مختلف تھی، تاہم خوف و ہراس اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہندو اور سکھ، دیہاتوں سے چپکے چپکے، ساز و سامان، بچوں اور خواتین کو میر پور منتقل کر رہے تھے۔ ڈڈیال شہر سے بھی نقل مکانی کا سلسلہ محتاط اور خفیہ طور پر شروع تھا۔ گاؤں کے ہم تمام لڑکے آم کے پیڑ کے سایہ میں حسب روایت اکٹھے تھے اور پاکستان اور قائداعظم کے

حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ فاصلہ پر سردار ارجن سنگھ، جسے ارجن سنگھ کپتا کہا جاتا تھا، اس کی زرعی اراضی تھی۔ وہ اراضی میں مصروف تھا، جس کے قریب ہی مسلمان کسان کے مویشی اور بکریاں چر رہی تھیں۔ ارجن سنگھ نے مسلمان کو ڈانٹنا شروع کر دیا، کہ وہ اپنے مویشی اور بکریاں وہاں سے لے جائے۔ ان میں تکرار ہو رہی تھی۔ اُس تکرار کے دوران ہم نے جوش میں کہہ دیا، کہ ارجن سنگھ اب پاکستان بن گیا ہے، تو مسلمان کسان پر رعب مت جما۔ ہماری آواز سنتے ہی وہ بڑبڑاتا ہوا، تیز تیز فوجی ہیڈ کوارٹر میں گیا اور ہمارے خلاف شکایت کر دی، کہ ہم نے اس پر حملہ کیا ہے۔ وہ ہمیں نام سے جانتا تھا، اس نے ہمارا نام لے کر شکایت کی۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہماری کیمپ میں طلبی ہوگئی۔ ارجن سنگھ نے ہمارے خلاف پاکستان کے حق میں نعرے لگانے، اُس کو قتل کرنے کی دھمکی اور منافرت پھیلانے کا سنگین الزام لگا دیا۔ نانا جان نے ہمیں گھر میں ہی رہنے کو کہا اور خود ملٹری کیمپ گئے۔ ارجن سنگھ کے ساتھ، چند اور معتبر سکھ اور سب انسپکٹر پولیس پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے نانا جان کے پہنچنے پر ارجن سنگھ کو سمجھا کر اس معاملہ کو ختم کروا دیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ پُر امن ماحول خراب ہو جائے گا۔ اس طرح تنازعہ ختم ہوگیا۔

۱۰؍ اکتوبر کو میرے خالہ زاد محمد صادق اور محمد رفیق کوٹلی کے گاؤں ڈھیری نالہ، ملک علی اکبر نمبردار کے ہاں، شادی پر جانے کے لئے تیار ہوئے اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ امی جان نے منع کر دیا کیونکہ حالات بہت خراب اور پُر خطر تھے۔ مگر انھوں نے امی جان کی منت سماجت کر کے منا لیا۔ ہم دوسرے روز براستہ چھوچھ، جب دوپہر کے وقت سہنسہ بازار کے باہر تھے، کہ سامنے چند ڈوگرہ فوجی اور دو تین پولیس والے نظر جمائے کھڑے نظر آئے، جب ہم ان کے قریب پہنچے، تو پولیس ہیڈ کنسٹیبل لپک کر میرے بغلگیر ہوگیا اور فوجیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، کہ جناب یہ تو میرے مہمان ہیں اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر بازار سے تھوڑے فاصلہ پر، ایک مکان کے صحن میں چارپائیاں بچھوا کر آم کے پیڑ کی چھاؤں میں بٹھایا۔ اُس نے تعارف کرواتے ہوئے اپنا نام قاضی محمد اعظم بتایا، وہ قاضی محمد بشیر، ایس پی کے چچا تھے۔ ہماری ان سے ملاقات نہ تھی، اس لئے ہم ان کے رویہ اور سلوک سے قدرے حیران تھے۔ انھوں نے سرگوشی میں کہا، کہ سہنسہ بازار مکمل کرفیو کی حالت میں تھا۔ دو دن قبل سے مسلمانوں کا بازار میں داخلہ بند تھا اور بازار میں ہندو آبادی اور ڈوگرہ فوج پر حملہ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں بازار کی طرف آتے دیکھ کر فوجی ہمیں گرفتار کرنے کے لئے کھڑے تھے، مگر میرے ماموں عبدالعزیز پولیس انسپکٹر سے، میری مشابہت کی وجہ سے، انھوں نے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا اور ڈوگرہ سپاہیوں سے کہا، کہ ہم اُن کے مہمان ہیں، تاکہ وہ ہمیں گرفتار نہ کر لیں۔ انھوں نے کھانا تیار کروایا اور کھانے کے بعد واپس چلے جانے کی تاکید کی۔ ان سے اجازت لے کر، بجائے واپس آنے کے، ہم نے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ پگڈنڈی نما راستہ تھا، مکئی کی فصل اور گھاس سر تک تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم راستہ بھول گئے، بھول بھلیوں میں گھروں میں جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی کی نشاندہی کا سہارا لیتے ہوئے رنگڑ نالہ عبور کر کے ایک ٹیکری، جس پر بستی کے آثار نظر آئے پہنچے۔ بستی کے کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا،

چند لوگ روشنی لے کر راستہ میں آئے اور ہمیں ایک بڑے صحن میں لے گئے دیکھا، کہ ایک بزرگ بستر پر دراز ہیں اور دائیں بائیں لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے پوچھنے پر ہم نے اپنا تعارف، نانا جان ملک فیض عالم نمبردار کے نام سے کروایا اور بتایا کہ ہم نے نمبردار ملک علی اکبر کے گھر جانا ہے، مگر راستہ بھول گئے ہیں۔ اس پر وہ بزرگ اٹھ کر ہم سے بغلگیر ہوگئے اور کہا، کہ تم میرے محترم دوست ملک فیض عالم کے نواسے ہو۔ انھوں نے فوراً بستر لگوائے اور کھانا تیار کرنے کو کہا۔ ہماری ٹانگیں پاؤں دبانے پر نوجوان مامور کیے۔ ہم سخت تھکے ہوئے تھے، بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ اس سے قبل معتبر اور محترم شخص نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے، اپنا نام ذیلدار راجہ سیف علی خان بتایا۔ وہ ہماری ہاں کئی بار آ چکے تھے، نام بتانے پر ہم نے پہچان لیا، مگر قبل ازیں سفر کی تھکاوٹ اور رات میں کم روشنی کی وجہ سے، نہ پہچان سکے تھے۔ وہ علاقہ میں، بہت بااثر تھے، مگر ڈوگرہ حکومت کے ذیلدار ہونے کی وجہ سے، وفادار تھے۔

ذیلدار صاحب کو اس علاقہ میں حکومت کے خلاف، عسکری جدوجہد شروع ہونے کی اطلاع تھی۔ وہ سحری کے وقت کوٹلی روانہ ہوگئے اور ڈوگرہ فوج کی کمک ہمراہ لے کر نگڑ نالہ عبور کر رہے تھے، کہ راجہ سخی دلیر خان، ان کے نواسہ نے، چند ہمراہیوں کے ساتھ جو پہلے سے گھات لگا کر بیٹھے تھے، ان پر فائرنگ کی، جس کے نتیجہ میں ذیلدار سیف علی خان اور چند فوجی ہلاک اور دیگر زخمی ہوئے، باقی نفری بھاگ کر کوٹلی پہنچی۔ اسی رات سہنسہ بازار سے، ہندو سکھ اور ڈوگرہ فوج نقل مکانی کر کے کوٹلی پہنچے۔ جب ہم بیدار ہوئے تو علاقہ میں خوف و ہراس تھا۔ ہم نے دوسری رات ڈھیری نالہ میں گذاری۔ اگلی رات جس گاؤں میں ذیلدار صاحب سے ملے تھے، وہ گاؤں چک میر تھا۔ ملک علی اکبر صاحب نے دو نوجوان ہمارے ساتھ روانہ کیے۔ ہم سحری کے وقت وہاں سے چلے اور دوپہر کو موضع بلوح، خالہ کے گھر پہنچے۔ اس علاقہ میں سہنسہ سے فوج کے انخلا، کوٹلی میں، ذیلدار اور ڈوگرہ فوج پر حملہ اور ہلاکت کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ یہی کیفیت ڈڈیال میں تھی۔ ہم نے کوٹلی کے واقعات گاؤں میں بیان کیے تو گاؤں کے کسی آدمی نے ڈڈیال شہر میں، کسی سکھ سے اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ ہمارے نام سے یہ اطلاع ڈوگرہ کرنل تک پہنچ گئی۔ دوسری بار پھر ہماری طلبی ہوئی۔ نانا جان نے ہمیں گھر رہنے کی ہدایت کی اور وہ خود ملٹری کیمپ گئے۔ فوج ایسے واقعات کی اطلاعات کو، علاقہ میں امن قائم رکھنے کی غرض سے، مخفی رکھنا چاہتی تھی۔ وہاں سید تصدق حسین، تھانیدار نے سختی سے اس خبر کی تردید کی، مگر شہر کے ہندو سکھ جمع ہو گئے۔ تھانیدار نے تجویز دی کہ مخبر پیش کیا جائے، اس دوران ہم گاؤں کے چند لڑکے بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ سکھوں کو اطلاع دہندہ کا نام نہ یاد رہا۔ چنانچہ تین چار گھنٹے کی بحث و تکرار کے بعد۔ اجلاس برخاست ہوگیا۔ تعجب تھا کہ کوٹلی جو میرپور کی تحصیل تھی، وہاں کے بڑے خطہ سہنسہ وادی سے فوج اور ہندو آبادی نقل مکانی کر چکی تھی، پونچھ میں جنگ شروع ہو چکی تھی، مگر ڈڈیال انتظامیہ بے خبر تھی یا دانستہ طور چشم پوشی ہو رہی تھی۔

ڈڈیال سے انخلا اور آزادی

محمد صادق میرے خالہ زاد، جو دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لے چکے تھے اور یورپ میں جرمن کے خلاف

برسرِ پیکار رہے تھے۔ گرفتار بھی ہوئے، مگر قیدی کیمپ سے روپوش ہو کر سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے تھے، ان کے ساتھ علاقہ کے سابق فوجیوں کا رابطہ تھا۔ کوٹلی سے واپس آتے ہی وہ اس گروپ میں شامل ہو گئے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ڈڈیال میں ڈوگرہ فوج پر حملہ کی تیاری ہو چکی تھی اور دوسری رات کو حملہ ہونا تھا۔ ۲۴ راکتوبر کو ہم نے خواتین اور بچوں کو گوڑہ گاؤں میں، چوہدری منگا کے گھر منتقل کیا۔ گاؤں کے دیگر افراد نے عارضی پناہ کے لئے گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ڈوگرہ فوجی کیمپ ہمارے گاؤں کے سامنے مشرق میں دو فرلانگ کی دوری پر واقع تھا۔ بریگیڈیئر دلاور کی قیادت میں، علاقہ کے سابق فوجی جمع ہوئے۔ دریائے جہلم کے دائیں کنارے علاقہ پوٹھوہار سے کچھ سابق فوجی صوبیدار روڈا کی قیادت میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ بن سائیں، معروف زیارت کے ملحق ہیڈکوارٹر قائم کیا گیا۔ رات کو صادق بھائی اور اس کے ساتھ دو اور ساتھیوں نے ہمارے گاؤں میں صادق بھائی کے مکان کی دوسری منزل کی چھت، چوبارہ سے فائرنگ شروع کی، جنوبی اور شرقی جانب سے دوسرے گروپوں نے رائفل سے فائر کھولا، جس پر ڈوگرہ فوج نے شہر کے شمال جنوب اور مرکز میں موجود، تین منزلہ عمارتوں کی چھتوں پر نصب شدہ مارٹر گنوں سے، ہر طرف آگ برسانی شروع کر دی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، کہ علاقہ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔ رات بھر آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ ۲۵ راکتوبر کو عیدالاضحیٰ کا دن تھا۔ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد، میرے پھوپھا ملک محمد ابراہیم، مسجد سے اپنے صحن میں پہنچے ہی تھے، کہ ڈوگرہ سپاہیوں نے، جو رات کو فائرنگ والے مکانات پر پوزیشن لے چکے تھے، اچانک فائرنگ کر کے ان کو شہید کر دیا۔ دوسرا کالم گاؤں کی جنوبی سمت بڑھا اور میرے خالو ملک محمد حسن خان، جوں ہی سامنے ہوئے اُن کو بھی شہید کر دیا۔ یہ دونوں شہدا مرچنٹ نیوی میں سروس کرتے تھے۔ ڈڈیال کے معرکہ میں یہ دونوں پہلے شہدا تھے۔ گاؤں کے عوام نے رات سے ہی اپنے آپ کو مکانات کے اندر بند کر کے، باہر سے تالے لگا رکھے تھے۔ فوجیوں نے گاؤں میں مکانات پر تالے دیکھ کر واپسی کی راہ لی۔ ساتھ والے گاؤں سگوال میں پانچ آدمی، سید محمد، شمس دین، اس کا جوان بیٹا اور بدر دین وغیرہ کو شہید کر دیا گیا۔ خبر ملنے پر ہم نے شہدا کی میتوں کو اٹھایا اور رات کو نماز جنازہ کے بعد دفن کیا۔ تین دن تک جنگ جاری رہی، جبکہ تھروچی قلعہ کی پوسٹ چھوڑ کر۔ ڈوگرہ فوجی میرپور جاتے ہوئے، جب پلاک پہنچے، تو گاؤں والوں نے اُن کو پکڑ لیا اور بن سائیں ہیڈکوارٹر پر لائے۔ ان سے ایک مارٹر گن، تین گولے، تین ہینڈ گرنیڈ اور ۳۰۳ کی سات بندوقیں ملیں۔ ڈڈیال بازار کے درمیان والی اور جنوبی مارٹر گنیں بہت مؤثر تھیں، ان کو اڑانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کتھاڑ گاؤں کے صوبیدار عبدالکریم نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔ اس نے کمال دفاعی حکمت عملی سے تیسری منزل پر پہنچ کر، ہینڈ گرنیڈ سے جنوبی مارٹر گن کو اڑا دیا۔ جب دستیاب مارٹر گن سے دو گولے فوجی کیمپ پر پھینکے گئے، تو مخالف طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ ۳۰ راکتوبر کو ڈوگرہ فوج اور سول آبادی میں سے سکھ اور ہندو ڈڈیال شہر خالی کر گئے۔ نومبر میں میرپور شہر سے بھی ڈوگرہ

فوج اور ہندو و سکھ نقل مکانی کر گئے۔ ۴ راکتوبر اور بعد میں ۲۴ راکتوبر کو یکے بعد دیگرے اعلانات کے تحت، ڈوگرہ مہاراجہ کی حکومت معزول کر کے، عبوری حکومت آزاد کشمیر کے نام سے قائم کرتے ہوئے ڈوگرہ انتظام و انصرام سے خالی کردہ علاقہ یا عرف عام میں آزاد کشمیر کے خطہ میں، تمام حکومتی ادارے قائم کیے گئے، جس سے نیا نظام قائم ہو گیا۔

ڈڈیال ہائی سکول میں، سکول ٹیچر

تحریک آزادی کی جدوجہد میں میرپور شہر تباہ ہو گیا تھا، البتہ ڈڈیال شہر اپنی اصلی حالت میں قائم رہا، کسی عمارت کو کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا، چند سابق سکول ٹیچروں نے اپنی مدد آپ کے تحت، ڈڈیال سکول کے احیا کا فیصلہ کیا اور اس کی حکومت کو بھی اطلاع کر دی، جس کی حکومت نے باقاعدہ منظوری دے دی۔ سکول سٹاف میں مجھے بھی بطور ٹیچر شامل کر لیا گیا۔ تین ماہ کے بعد پروفیسر عبدالرشید، جو میرپور کالج میں لیکچرر رہتے، بحیثیت ڈائریکٹر سکولز، دورہ پر تشریف لائے۔ سکول سٹاف میں مجھے بطور ٹیچر دیکھ کر پہلا حکم یہ کیا، کہ مجھے ملازمت سے سبکدوش کر کے دسویں کلاس میں، بطور طالبعلم میرا نام درج کروایا۔ شام کو ہمارے گھر تشریف لائے اور میرے نانا جان کو کہا، کہ اس لڑکے نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے اور یہ ذہین طالب علم ہے۔ اس لئے ملازمت سے سبکدوش کر دیا ہے اور مجھے تھپکی دے کر محنت کرنے کی تاکید کی۔ دوسرے روز میں سکول میں بحیثیت طالب علم، ڈیسک پر بیٹھا تھا۔ میٹرک کے امتحان کے لئے، ڈڈیال ہائی سکول ضلع میرپور میں واحد ہائی سکول تھا۔ امتحان کے لئے طلباء کی تعداد صرف آٹھ تھی، ان دنوں امتحان پنجاب یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ ہمارے امتحان کا مرکز، گورنمنٹ ہائی سکول جہلم مقرر ہوا۔ جہلم میں باقی طلباء اپنے اپنے تعلق داروں کے ہاں قیام پذیر ہوئے، میرے ساتھ ٹکہ خان، سیاکھ کے شامل ہوئے۔ ہم دونوں جہلم شاندار چوک کے قریب کشمیر ہوٹل میں ٹھہرے۔ ہوٹل پنیام میرپور کے، چوہدری کرمداد صاحب کا تھا۔ جہلم میں دو سینما گھر، امپیریل اور ریجنٹ نام کے تھے، جو اَب بھی شاید ہیں۔ ریجنٹ سینما میں ثریا اور شیام کی فلم "پیار کی جیت" دکھائی جا رہی تھی۔ ٹکہ خان بہت سریلی آواز رکھتا اور فلمی گیت گانے کا شوقین تھا۔ وہ پہلے ہی دن پہلے شو میں فلم دیکھنے ساتھ لے گیا۔ ثریا کی ایکٹنگ اور سریلے گیت اتنے پرکشش تھے، کہ ہم امتحان کے تمام دنوں میں فلم دیکھتے رہے۔ امتحان میں لگن کم اور فلم کے گیتوں اور ڈائیلاگ کے حفظ کرنے کا شوق زیادہ تھا۔ ہم دونوں نے نہایت غیر ذمہ داری اور غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ تو فیل ہو گیا، مگر میرے اچھے نصیب تھے، کہ جب نتیجہ آیا تو ہیڈ ماسٹر رتیال، جنھوں نے میرا نام داخلہ فارم میں عبدالمجید، درج کروایا تھا، وہ ایک ماہ کی رخصت پر تھے، سیکنڈ ماسٹر کے پاس رزلٹ گزٹ تھا، اس نے باقی سات طلبا کو تو نتیجہ بتا دیا، مگر مجھے کہا کہ فہرست میں تمہارا نام نہیں ہے، تمہارا نتیجہ بعد میں آئے گا۔ ہر ہفتہ میں دریافت کرنے جاتا، مجھے وہی جواب ملتا۔ ایک ماہ بعد پھر گیا، تو ہیڈ ماسٹر رتیال صاحب نے سکول گیٹ میں داخل ہوتے ہی، مجھے دیکھ لیا اور چپراسی کو مجھے بلانے بھیجا۔ ملتے ہی امتحان میں پاس ہونے کی مبارک دی اور

پوچھا، کہ کالج میں داخل کیوں نہیں ہوئے۔ سیکنڈ ماسٹر ان کے پاس ہی تھے، میں نے بتایا کہ ان کا کہنا تھا، کہ میرا رزلٹ ابھی نہیں آیا، میں تو اسی انتظار میں تھا، مگر نام کی تبدیلی نے ایک ماہ کالج داخلہ میں تاخیر کرا دی۔

گورڈن کالج راولپنڈی

جموں میں پرنس آف ویلز کالج کا شمار، پورے برصغیر میں اعلیٰ معیار کے کالجوں میں ہوتا تھا۔ شہرہ آفاق، اعلیٰ تعلیم یافتہ پی ایچ ڈی پروفیسر تعینات تھے۔ کالج کی لائبریری، لیبارٹری، کھیلوں کے بڑے بڑے گراؤنڈ، طلباء کے ہاسٹل، نہر کے کنارے آموں کے باغات اور مفت تعلیم کا نظام تھا۔ سرینگر میں ایس پی اور امر سنگھ دو کالج تھے، وہ بھی اعلیٰ معیار کے ادارے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں رونما ہونے والے واقعات کی وجہ سے، ان کالجوں تک رسائی منقطع ہو گئی تھی۔ جس وجہ سے پنجاب میں لاہور یا راولپنڈی کے کالج میں ہی داخل ہوتا تھا۔ لاہور ایشیاء کا علمی وادبی ثقافت کا مرکز تھا، مگر اس وقت مجھے اس کا کم ہی شعور تھا۔ میرے ساتھی بھی راولپنڈی گورڈن کالج میں داخل ہو چکے تھے، لہٰذا میں نے بھی ادھر ہی کا رُخ کیا۔ کالج داخلہ کے وقت بھی خاص راہنمائی حاصل نہ کر سکا اور دیکھا دیکھی جن مضامین کا انتخاب کیا، ان میں انگریزی کے علاوہ اکنامکس، اردو اور عربی کے مضامین تھے۔ یہ ایک امریکن مشنری تعلیمی ادارہ تھا۔ پرنسپل ڈاکٹر آر آر سٹورٹ، وائس پرنسپل اور دیگر پانچ پروفیسر امریکن گورے تھے، چند ایک پاکستانی عیسائی اور باقی مسلمان تھے۔

پہلی دشواری یہ پیش آئی، کہ تاخیر سے داخلہ کی وجہ سے ہوسٹل میں کمرہ نہ دستیاب ہوا۔ راولپنڈی میں شناسائی قطعی نہ تھی، دوسری مشکل یہ کہ نوجوان فرد واحد کو کرایہ پر مکان دینے کو تیار کوئی نہ تھا۔ سامان میں نے شیر زمان کے کمرہ میں ہوسٹل میں رکھا اور خود کالج اوقات کے بعد، راولپنڈی کے گلی کوچوں میں رہائش کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ دس دنوں کے بعد، میں تھکاوٹ سے چور چور، جھنڈا چیچی میں ایک کیفے پر چائے کے لئے رُکا، چھوٹا سا کیفے تھا، چائے پر توجہ کم اور رہائش کی فکر زیادہ تھی۔ خیالات میں گم تھا کہ ایک گورے رنگ کا آدمی، منیجر کیفے کی سیٹ پر آ کر بیٹھا، میں نے فوراً اُس سے اپنا مدعا بیان کیا اور راولپنڈی میں اجنبیت کا بھی اظہار کیا۔ اس نے وہی کہانی شروع کر دی، کہ محلہ میں اکیلے آدمی کو کرایہ پر رہائش مشکل سے ملتی ہے۔ شام ہونے کو تھی، میں کیفے کے مالک کو مدد کے لئے قائل کر رہا تھا، چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی، لہٰذا گرم چائے لانے کے لئے کہا۔ اس دوران ایک بھاری بھر کم شخص کلاہ پر پگڑی پہنے تشریف لائے، تو کیفے کے مالک اور باقی لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا، وہ قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کو چائے پیش کی، تو انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کیفے کے مالک سے پھر بات شروع کی، تو اس نے ان بزرگ شخص سے، میری پریشانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے دریافت کیا، کہ کیا کام کرتے ہو؟ میں نے بتایا کہ کالج

میں طالب علم ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنے ہمراہ لیا اور تھوڑے سے فاصلہ پر موجود، ایک گھر کھلوایا۔ تین کمروں پر مشتمل مکان، کھلا صحن، انھوں نے صاف شفاف مکان، میرے حوالہ کیا اور کہا، کہ جب تک ہوسٹل میں کمرہ ملتا ہے، اس مکان میں رہو اور کینٹے کے مالک سے کہا، کہ میرے لئے دو وقت کا اچھا کھانا اور ناشتہ مکان پر پہنچانے کی ذمہ داری اس کی ہوگی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا اور چوہدری ولائیت، مالک مکان کا میں نے دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کیا اور اسی شام میں نے مکان میں رہائش اختیار کر لی۔ جب دوسرے روز کرایہ کے متعلق میں نے دریافت کیا، تو وہ شفقت سے مسکرا کر کہنے لگے، تم مکان میں رہو، بس تم سے یہی کرایہ لینا ہے۔ چوہدری ولائیت، اب دنیا میں نہیں، ان کی فیاضی اور شفقت پر اور میرے لئے، اتنے بڑے احسان پر، بحیثیت انسان، ان کی جس قدر تعریف کی جائے، بہت کم ہے۔ وہ رانا تنویر، ممبر قومی اسمبلی اور نون لیگ کے رکن کے والد تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور میرے ساتھ نیکی کا اجر دے، وہ بہت بڑے انسان تھے۔ تین ماہ کے بعد، مجھے ہوسٹل میں کمرہ مل گیا، میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے اجازت لی۔ کینٹے کے مالک چوہدری نذیر تھے، وہ چوہدری ولایت کے بھانجے تھے۔

بنک اکونٹ میں مشکل

اباجان نے انگلینڈ سے، ہر ماہ اخراجات ارسال کرنے کے بجائے، دس ہزار روپیہ یکمشت ارسال کر دیا اور ہدایت کی، کہ لائیڈز بینک میں اکونٹ کھلوالوں۔ یہ برطانیہ کا بینک تھا، جس کی شاخیں ان دنوں پاکستان میں بھی قائم تھیں، جو ۱۹۶۰ء تک قائم رہیں۔ راولپنڈی صدر میں یہ بنک تھا، میں رقم لے کر وہاں گیا، منیجر سے ملا اور اکونٹ کھولنے کے لئے کہا۔ منیجر نے کہا کہ اس کے لئے، کسی اکونٹ ہولڈر کی تصدیق اور ریفرنس ضروری ہے۔ میں نے اس کو کالج کا شناختی کارڈ پیش کیا، مگر وہ نہ مانا۔ میں طبعی طور پر ضدی اور غصیل تھا اور چھوٹی چھوٹی بات پر اڑ جاتا تھا۔ آج کل کے بینکنگ نظام کے بالکل برعکس، وہ وضع کردہ قواعد کے مغائر بالکل کوئی کام نہ کرتے تھے۔ میں راولپنڈی میں اس لحاظ سے اجنبی تھا، میں بینک اکونٹ ہولڈر کہاں تلاش کروں۔ اس وقت کرنسی نوٹ بھی سو روپیہ کے تھے۔ بینک منیجر سے دیر تک بحث رہی، وہ شریف آدمی اپنی مشکل بتا رہا تھا، مگر میں بدستور اس سے تکرار کرتا رہا۔ اس نے چائے پیش کی، حالانکہ ان دنوں ایسا تکلف نہ تھا، چائے کیسے حلق سے اترتی، اتنی بڑی رقم کہاں رکھتا۔ میں راولپنڈی میں اکونٹ ہولڈر کہاں تلاش کرتا۔ میرا تو وہاں کوئی جان پہچان والا تھا ہی نہیں۔ اسی دوران ایک خاتون بینک میں وارد ہوئیں، ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، جو گورڈن کالج کی طالبہ تھی۔ میں ڈڈیال کا پینڈو تھا۔ لڑکی کو کالج میں کئی بار دیکھا تھا، بلکہ یہ معمول تھا، کیونکہ ہوسٹل کے مارٹن ہال کی میری رہائش کی ڈارمیٹری طالبات کے پارک کے سامنے تھی، جہاں طالبات پر جھانکنے کے لئے اور بھی کئی منچلے وہاں آ جاتے۔ خاتون نے چیک کیش کروانے کے لئے ابھی پیش کیا ہی تھا، کہ میں نے بے صبری میں بلا تکلف ان سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے، اپنا مدعا بیان کیا۔ لڑکی میری

کلاس فیلو نہ تھی، وہ مجھے تو جانتی ہی نہ تھی۔ خاتون نے لڑکی کی طرف توجہ کی، تو اس نے اشارہ میں ناواقفیت کا اظہار کیا۔ میں نے فوراً شناختی کارڈ دکھایا، تو محترمہ نے ایک بھرپور نگاہ سے میرا جائزہ لیا اور احسان مندی و شفقت سے، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ، اکونٹ فارم پر اپنا اکونٹ نمبر لکھا اور دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد پوچھا، کہ میں کہاں کا ہوں اور کس کلاس میں ہوں۔ میں نے متعدد بار ان کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ بینک بک اور چیک بک لے کر ہوسٹل آیا، تو میری چال ہی بدلی ہوئی تھی اور رعب و دبدبہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جس خاتون نے مجھ پر احسان کیا تھا، ان کی بیٹی خوبصورت تو بہت تھی، مگر وہ قد آور بھی تھی، جس وجہ سے کالج میں بریگیڈیئر کا لقب، اس کو دیا گیا تھا اور اسی نام سے اس کا حوالہ دیا جاتا تھا۔

کالج سے فرار

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔ بدنصیبی نے پھر تعاقب کیا اور دماغ میں فتور نے جنم لیا۔ گھر سے کالج واپس جا رہا تھا، مولوی الطاف ہم سفر تھا، اس نے ایف۔ اے سے بی۔ اے کرنے کا شارٹ کٹ یوں بتایا، کہ سکول ٹیچر بن کر، منشی فاضل و ادیب عالم کا امتحان پاس کر کے، صرف انگریزی کا امتحان دے کر، گریجویٹ کی ڈگری حاصل کرنا، کالج کی تعلیم کی نسبت بہت آسان ہے۔ ڈڈیال سکول میں ٹیچر کی آسامی خالی تھی۔ جہلم پہنچنے تک مولوی الطاف نے مجھے اپنی حکمتِ عملی سے قطعی قائل کر لیا۔ میں بجائے کالج کے گھر واپس آ گیا۔ امی جان نے واپسی کی وجہ پوچھی، تو میں نے سیکھا ہوا فلسفہ بیان کر دیا، مگر وہ مجھ سے متفق نہ ہوئیں اور کالج واپس جانے کے لئے کہا۔ دوسرے ہی روز میں نے سکول میں ملازمت کی درخواست دے دی۔ رتیال صاحب، ہیڈ ماسٹر نے، مجھے بہت سمجھایا کہ مجھے کسی نے گمراہ کیا تھا اور جو کچھ بتایا وہ ٹھیک نہ تھا، مگر میں اپنی بات پر بضد ہو گیا۔ گھر میں امی جان سخت ناراض تھیں، وہ میرے غلط رویہ پر اکثر رو پڑتیں۔ مگر میں نہ جانے کیوں اتنا بضد ہو گیا، کہ اپنی رائے کے خلاف کوئی بات، سننے کو تیار نہ تھا۔ آخر تنگ آ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے تحریری ٹیسٹ مقرر کیا۔ تین اور امیدوار بھی تھے، انھوں نے خود مشکل ترین پچاس نمبروں کا امتحانی پرچہ تیار کیا اور اپنی ٹرے میں خفیہ خانہ میں محفوظ کر لیا۔ اس میں پندرہ نمبر ہندسوں میں لکی رقمیں، جو عربی طرز کی ہیں، کا ایک سوال، دوسرا پندرہ نمبر کا سوال غالب کا کلکتہ کا سفر، تیسرا سوال دس نمبر کا، آیت اور نص کی تعریف اور دس نمبر کا، انگریزی کا مضمون شامل تھے۔ چوہدری محمد عالم سیکنڈ ماسٹر تھے، وہ میری مدد کر رہے تھے۔ انھوں نے کسی طریقہ سے امتحانی پرچہ دیکھ لیا تھا۔ میں امتحان کے مقررہ وقت سے، ایک گھنٹہ پہلے سکول پہنچا، تو چوہدری محمد عالم صاحب نے مجھے چاروں سوال بتا دیئے۔ اتفاق سے ماسوائے ہندسوں کی عربی رقموں کے، باقی سوالات کے جواب مجھے معلوم تھے۔ میں نے اسی وقت بازار میں کتابوں کی دوکان سے پہاڑہ کی کتاب خرید کر ،ہندسوں کی رقمیں یاد کر لیں۔ امتحان ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی نگرانی میں لیا۔ میں نے تمام سوالات کے جوابات ایک گھنٹہ کے اندر ہی، مکمل تحریر کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سپرد کر دیئے، اس پر وہ بہت حیران رہ گئے۔ دوسرے روز

ڈڈیال میں صدر حکومت کا دورہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا، کہ وہ صدر حکومت کے حکم کے تحت ،تقرری کریں گے۔ دراصل وہ مجھے ٹال رہے تھے اور میں آزمائشوں سے گذر رہا تھا۔ سید علی احمد شاہ صدر حکومت تھے، ان کا تعلق میر پور سے تھا، ان کا ایک ہی بیٹا شرافت حسین تھا، وہ میرا دوست اور کالج میں کلاس فیلو تھا۔ شاہ صاحب میرے نانا جان کے دوست تھے، وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ دوسرے دن جب وہ ڈڈیال پہنچے، تو استقبال کے فوراً بعد، میں درخواست لے کر، ان کے سامنے پیش ہو گیا۔ درخواست پڑھ کر، صدر صاحب غصہ میں کھڑے ہو گئے۔ درخواست دور پھینک دی اور مجھے خوب ڈانٹ ڈپٹ کر کے حکم دیا، کہ فوراً کالج واپس جاؤ۔ میرے نانا جان کو بلوایا اور ان سے کہا، کہ اگر اس بچے کی تعلیم کے لئے مالی کمی ہے، تو وہ تمام اخراجات کی خود ذمہ داری لینے کو تیار ہیں۔ نانا جان نے ان کے سامنے حامی بھر لی۔ صدر صاحب وفود کی ملاقاتوں اور جلسہ کے اختتام پر واپس جانے کو تیار ہوئے، تو میں نے پھر درخواست پیش کر دی۔ انھوں نے بہت پیار اور سنجیدگی سے، مجھے کالج واپس جانے اور تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی۔ میں نے کہا آپ میری شرط پوری کر دیں، تو واپس چلا جاؤں گا، انھوں نے میری تقرری کا حکم کر دیا۔ رات بھر میں سو نہ سکا اور تمام رات سوچ بچار میں کروٹیں بدل بدل کر گذار دی۔ صبح کی نماز کے بعد، امی جان سے کالج جانے کی اجازت لی۔ امی جان نے گلے لگا کر بوسہ دیا، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ کا وہ حسین منظر، میرے لئے متاع حیات بن گیا۔ سکول گیا صدر صاحب کا تقرری کا حکم، ہیڈ ماسٹر صاحب کے سپرد کیا اور ساتھ اپنا فیصلہ بھی بتا دیا۔ ہیڈ ماسٹر رتیال صاحب، بہت خوش ہوئے اور میری کامیابی کی دعا کی۔ واپس کالج پہنچا، تو سب دوست، بہت خوش ہوئے۔ ہماری محفلوں کی بہار لوٹ آئی، مگر اس دفعہ بھٹکنے کے بعد تعلیم کے حصول کے لئے مجھ میں خاص سنجیدگی آ گئی اور میں نے آئندہ کے لئے نصب العین طے کر لیا۔ اس کو کیا کہا جائے، کہ یہ مقدر کی کرامت نہیں تو اور کیا تھا، کہ دو دفعہ سکول سے فرار اور ایک دفعہ کالج سے بھاگنے کے باوجود، ماں کی دعا، بزرگوں کی ہدایت کی برکت نے، گمراہی کے راستہ سے سیدھے راستہ پر لایا اور ایک بھگوڑا نوجوان سیدھے راستہ پر آ گیا اور تعلیم پر، سنجیدگی سے توجہ دینا شروع کر دی۔

انجمن احباب

کالج میں ادبی و علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ، جسمانی ورزش اور ہر قسم کی کھیلوں کی سہولت میسر تھی۔ بحث، مباحثہ اور تقاریر کی تربیت کے لئے، طلباء، بار کلب اور منروا کلب میں تقسیم تھے۔ سالانہ تقریب میں دونوں کلبوں میں، مضمون نویسی اور مخصوص علمی معلوماتی موضوع پر، مباحثہ منعقد ہوتا اور خوب مقابلہ ہوتا، آخر میں انعامات دیئے جاتے۔ کبھی کبھی ملکی اور غیر ملکی، عالمی شہرت کی حامل شخصیات کو دعوت دی جاتی۔ ڈرامہ کلب اور میوزک کلب کے پروگرام بہت رنگین ہوتے۔ ہوسٹل میں طلباء پر شام کے بعد باہر جانے پر سخت پابندی تھی۔ ہم مختلف راستوں سے، چوری چھپے سینما جاتے اور کئی بار پکڑے جاتے، کبھی تنبیہ اور کبھی جرمانہ ادا کر کے جان بخشی ہوتی۔ ہوسٹل میں

سردی کے موسم میں غسل خانہ کا پانی یخ ٹھنڈا ہوتا۔ دانت دبا کر اور آنکھیں بند کر کے، ٹونٹی کھولتے۔ پہلے فوارہ سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور کپکپی طاری ہو جاتی۔ دوسرا مشکل معاملہ، صبح سویرے یونس وہاب، انچارج جسمانی ورزش کی سیٹی تھی۔ بنیان اور نکر میں، راولپنڈی میں کوہ مری کی برفانی ہوائیں، ہم کمروں سے بھاگتے ہوئے نکلتے۔ گراؤنڈ کے پانچ چکر لگانے ضروری تھے۔ گو کہ یونس وہاب کی بائیں آنکھ ٹیڑھی اور قدرے کمزور تھی، مگر لڑکوں پر سخت نگرانی ہوتی، اگر کوئی ہوشیاری سے ایک چکر کم لگاتا، تو بطور سزا مزید چکر لگانا پڑتا۔ ہم لمبے قد والے تو نمایاں ہوتے، مگر چھوٹے قد والے کبھی کبھی ایک چکر کا چکمادے جاتے۔

میرے دوست

میرے دوستوں کی فہرست طویل ہے، مگر صرف مخصوص احباب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ آئندہ پیش آنے والے واقعات میں، ان کا کم و بیش تذکرہ ہوگا، لہٰذا ان کا تعارف مناسب ہوگا۔ شیر زمان چوہدری، جو چیف جسٹس ہائی کورٹ رہ چکے ہیں، اتفاق سے ہم خاندانی طور پر تعلق رکھتے ہیں اور سکول میں پہلی کلاس سے لے کر کالج میں ایف۔ اے تک ہم مثالی کلاس فیلو رہے۔ بی۔ اے میں، میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گیا، اس طرح ہم الگ ہو گئے۔

راجہ محمد صدیق، سینئر ایڈووکیٹ و سابق جج سپریم کورٹ، ہم ایس کے ایس کالج میرپور میں چھ ماہ تک کلاس فیلو رہے۔ اس کے بعد گورڈن کالج میں ایف۔ اے تک اکٹھے تھے، جس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ بشیر احمد میر، چارٹرڈ اکوٹینٹ برمنگھم انگلینڈ، ان کا تعلق ڈڈیال کے گاؤں انب سے ہے، چوہدری خان محمد کا تعلق نومہال میرپور سے تھا، چوہدری عبدالرشید اور چوہدری اسماعیل کا تعلق کلیال شہر و میرپور سے تھا۔ چوہدری رشید، ٹھیکیدار چوہدری عبداللہ کے بیٹے تھے۔ سید شرافت حسین، گوڑہ سیداں کے اور سابق صدر حکومت سید علی احمد شاہ صاحب کے فرزند تھے۔ میاں اصغر دربار کھڑی شریف کے کیپٹن سردار علی کے فرزند، ظفر درانی، سرینگر، طالب حسین شاہ، سرہوٹہ کوٹلی، فیض میر، چوکی موہنگ کوٹلی، سردار عبدالرحمن، سردار محمد انور، ڈی آئی جی پولیس، سردار خان ایڈووکیٹ، سردار محمد اعظم ایس پی، سردار اسماعیل، سردار خلیل، راولاکوٹ، سردار محمد یوسف، باغ، محمد انور، جموں، راجہ اختر کیانی المعروف کنگ کیری و ملک محمد مسعود، راولپنڈی، عبدالرشید پگانوالہ، گجرات کے تھے۔ یہ تمام گورڈن کالج میں میرے ساتھی تھے۔

آرمی کمشن کی پیشکش

جہلم سے راولپنڈی کے لئے، پنجاب گورنمنٹ بس کی، اپر کلاس میں سوار ہوا، بس لاہور سے آ رہی تھی۔ دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے، کچھ سفر طے کرنے کے بعد، اپنا تعارف کیپٹن سراج کے نام سے کروایا اور باتوں باتوں میں، مجھے آرمی کمشن کے امتحان میں شامل ہونے کی تجویز دی۔ میں ملازمت کو پسند نہ کرتا تھا، میری

دلچسپی بیرسٹر بننے میں تھی۔ میرے سامنے رول ماڈل قائداعظم تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شامل، تقریباً تمام قائدین بیرسٹر تھے، مگر کیپٹن سراج مجھے تمام سفر میں، آرمی کمشن کے امتحان میں شامل ہونے کی تبلیغ کرتے رہے۔ غالباً وہ قد اور وضع قطع سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ منزل پر پہنچ کر الوداع کہا۔ دوسرے روز قریب دس بجے، سراج یونیفارم میں سائیکل پر کالج آ گئے۔ انھوں نے امتحان کے داخلہ فارم تکمیل کروائے اور پرنسپل کے آفس میں اس وقت موجود نہ ہونے کی وجہ سے، بتایا کہ پرنسپل کالج سے تصدیق کروا کر درخواست مع فوٹو جی ایچ کیو راولپنڈی، بذریعہ رجسٹری ارسال کر دوں اور یہ بھی بتایا، کہ درخواستوں کی وصولی کے صرف دو دن باقی ہیں۔ سراج ان دنوں جی ایچ کیو میں ہی تعینات تھے۔ ان کی اس قدر دلچسپی سے میں بہت متاثر ہوا اور اپنے آپ کو آرمی کمشن کے امتحان میں شامل ہونے کے لئے، تیار کر لیا۔ دوسرے روز پرنسپل صاحب سے فارم تصدیق کروا کر، ڈاکخانہ میں رجسٹری کرنے جا رہا تھا، کہ آگے سے شیر زمان آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں کاغذات اور لفافہ دیکھ کر پوچھا، کدھر جا رہے ہو اور یہ ہاتھ میں کیا ہے؟ میں نے اسے فخریہ انداز میں بتایا، کہ فوج میں شامل ہو رہا ہوں۔ اس نے لفافہ مجھ سے لیا، کاغذات کھول کر دیکھے اور فوراً سب پھاڑ دیئے۔ میں نے غصہ میں کہا تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے ہنستے ہوئے بغلگیر ہو کر کہا، کہ دیکھو یار، اگر تم چلے گئے، تو میں یہاں اکیلا نہ رہ سکوں گا۔ درخواست مع دیگر متعلقہ کاغذات ٹکڑوں کی شکل میں، میرے ہاتھ میں تھما دیئے اور بازو پکڑ کر ہوسٹل لے گیا۔ اب میرے پاس سراج کا پتہ تھا، نہ ٹیلی فون، تا کہ اس سے دوسرا فارم منگواؤں۔ دو دن کے بعد سراج، پھر سائیکل لئے کالج پہنچا اور ملتے ہی سوال کیا، کہ تمہاری رجسٹری نہیں پہنچی؟ جب میں نے اس کو تمام واقعہ صاف صاف بتایا، تو اس نے خفگی میں اپنے ماتھے پر، افسوس سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا، کہ مجید ملک تمہارے دوست نے، بہترین موقع ضائع کروا دیا۔ سراج افسوس کرتا ہوا چلا گیا۔ کالج کے تین لڑکے امتحان میں شامل ہوئے، تینوں سلیکٹ ہوئے اور جرنیل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، مگر میرا مستقبل کچھ اور تھا۔

جموں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن

سردار محمد یوسف، مجھے اپنے ہمراہ مسلم کانفرنس کے دفتر لے گئے اور بتایا کہ وہاں جموں کشمیر طلبا کی فیڈریشن کے عہدیداران کا انتخاب ہونا ہے۔ انتخاب کیا تھا، پچاس کے قریب طلباء تھے، اکثریت پونچھ کی تھی۔ تمام عہدیدار طے شدہ فیصلہ کے تحت، بلا مقابلہ کامیاب قرار دے دیئے گئے۔ سارا رنگ ڈھنگ مسلم کانفرنس کا سا تھا۔ معلوم ہوا کہ کالج میں جموں کشمیر کے طلباء کو ٹیوشن فیس وغیرہ معاف تھی۔ وزارت امور کشمیر اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے، ہر کلاس کے لئے الگ الگ شرح ماہوار وظیفہ مقرر تھا۔ پنجاب یونیورسٹی نے جموں جیل سے رہا ہو کر آنے پر، چوہدری غلام عباس خان کو یہ اعزاز بخشا، کہ ان کی سفارش پر جن طلباء نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا، ان کو بلا امتحان سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جاتا۔ ان معاملات کا مجھے قطعی علم نہ تھا۔ میں نے کالج میں پورے سال کی ٹیوشن

فیس جمع کروادی تھی۔ دوسرے ہی روز میں نے کالج میں اداشدہ فیس واپس لینے کی درخواست دی، ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وظیفہ کی درخواست دے دی۔ فیس کی رقم واپس مل گئی، ساتھ ہی وظیفہ کی رقم بھی یکمشت مل گئی۔ خرچہ گھر سے حسب کو بدستور مل رہا تھا۔ اس لئے وظیفہ کی رقم کا مصرف، مسئلہ بن گیا۔ ہم نے دو دو تین تین سوٹ خریدے، مگر پھر بھی کافی رقم بچی ہوئی تھی۔ راجہ صدیق، میر بشیر نے ایک ماہ فلیشمین ہوٹل، جوان دنوں فائیوسٹار ہوٹل تھا، وہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل گئے مگر کمرے خالی نہ تھے۔ اس کے دوسرے نمبر پر صدر میں ہی ہوٹل ڈان پر گئے۔ ہم نے منیجر سے ملاقات کر کے مدعا بیان کیا۔ منیجر نے سوالات کیے، تو ہم نے بتایا کہ ہمارا تعلق، میرپور آزاد کشمیر سے ہے اور گورڈن کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ منیجر بہت عقل مند تھا، اس نے ہمیں چائے پیش کی اور ساتھ ہی کالج پرنسپل کو فون کر کے ہمارے عزائم سے آگاہ کیا۔ پرنسپل صاحب نے فون پر، ہمیں کالج واپس آنے کا حکم دیا۔ اس طرح ہم ایک ماہ شاہانہ زندگی گذارنے سے محروم رہے۔

فیڈریشن کا صدارتی الیکشن

میں نے آئندہ سال فیڈریشن کے صدر کے عہدہ کا، الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ پونچھ کی اجارہ داری کو پہلی بار چیلنج کیا گیا تھا۔ چوہدری غلام عباس خان صاحب سے میرے نانا جان کے مراسم تھے، ڈوگرہ دور اور آزاد کشمیر کے قیام کے بعد، ڈڈیال کے دورہ پر ان کی دعوت ہمارے ہاں ہی ہوتی۔ ان کے چھوٹے بھائی، ایس پی چوہدری عبدالغفور، میرے ماموں عبدالعزیز پولیس انسپکٹر کے دوست تھے۔ چوہدری صاحب کے ہاں، میورروڈ صدر میں، ہمارا آنا جانا بھی تھا۔ ان کے پاس ہی صدر حکومت، علی احمد شاہ صاحب کی رہائش گاہ تھی، وہاں شرافت کے پاس جاتا۔ اسی طرح سردار ابراہیم خان صاحب کے بنگلہ پر بھی آنا جانا تھا۔ سیاسی قائدین سے ملتے رہنا، میرے مشاغل میں شامل تھا۔ کالج روڈ پر واقع مکان چوہدری نور حسین صاحب، کے لنگر میں کئی بار چائے پی تھی۔ صدارت کا امیدوار بننے پر، پونچھ کے طلباء کی مخالفت کی وجہ تو معلوم تھی، مگر میرپور کے طلباء کی مخالفت کا دُکھ تھا، کہ نہ خود کچھ کرنے کے لئے متحرک ہوتے، نہ دوسروں کو کچھ کرنے دیتے۔ اب میں سیکنڈ ایئر میں تھا اور میرا رابطہ وسیع تر ہو چکا تھا۔ پونچھ کے طلباء کے مطالبہ پر، سردار ابراہیم صاحب نے مجھے طلب کیا اور سمجھوتہ کے تحت، صدارت سردار ذاکر حسین کو اور سیکریٹری جنرل کے عہدہ کی مجھے پیشکش کی۔ سردار صاحب کا بہت احترام تھا، انھیں یقین تھا، کہ میں ان کی بات کا احترام کروں گا۔ میں نے ادب سے کہا، کہ اب صدارت کا حق میرپور کا ہے، مگر فیصلہ نہ ہو سکا۔ انھوں نے میرپور کے لڑکوں کو میرے خلاف سیکریٹری جنرل کے عہدے پر راضی کر لیا، اس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ میرپور کے راجہ اعظم نے سازش کے تحت، ہمیں الیکشن میں بائیکاٹ پر اُکسایا۔ ہم نے بائیکاٹ کا اعلان کیا، تو انھوں نے بلا مقابلہ عہدے بانٹ لیے۔ یہ سیاست میں پہلا دھوکہ تھا، جس پر میں پریشان ہوا۔ مگر میں رات بھر طلباء سے رابطہ کر کے، دوسرے

روز مارٹن ہال کے سرسبز لان میں، اجلاس منعقد کر کے، بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گیا۔ جنرل سیکریٹری سرینگر، سینئر نائب صدر پونچھ اور نائب صدر کا عہدہ جموں شہر کے حصہ میں آیا۔ اسی روز ریڈیو تراڑکھل سے اس کی خبر نشر ہوئی۔ راولپنڈی میں واحد روزنامہ 'تعمیر' تھا، اس کا ایڈیٹر محمد فاضل، میرا شناسا تھا۔ اس نے خبر کے ساتھ میرا فوٹو بھی شائع کر دیا۔ دو روز بعد راضی نامہ کے تحت، مجھے صدر تسلیم کر لیا گیا۔ میرپور سے راجہ صدیق اور میر بشیر نے ڈٹ کر میرا ساتھ دیا۔

مشتاق احمد گورمانی سے جھگڑا

مشتاق احمد گورمانی، وزیر بے محکمہ وزارت امور کشمیر تھا۔ دارالخلافہ تو کراچی تھا، مگر اس کا آفس شہزادہ کوٹھی، صدر راولپنڈی میں تھا۔ ملتان کا یہ وڈیرہ، بہت ہی چالاک اور سازشی تھا۔ چوہدری غلام عباس، جب مارچ ۱۹۴۸ء میں، جموں جیل سے رہا ہو کر سیالکوٹ پہنچے، تو قائداعظم نے، انہیں ملاقات کی دعوت دی اور پورے پروٹوکول کے ساتھ، بحیثیت گورنر جنرل، ان کا دروازے پر خود استقبال کیا، مگر قائداعظم کی رحلت کے بعد، جب یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جموں کشمیر میں، رائے شماری کروانے کے لئے، سکیورٹی کونسل نے جنگ بندی کا معاہدہ نافذ کیا، تو حکومت آزاد کشمیر سے، تمام اختیارات لے کر، اس کو بے اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ گورمانی نے، صدر حکومت آزاد کشمیر، سردار ابراہیم خان اور سپریم ہیڈ و صدر مسلم کانفرنس، چوہدری غلام عباس سے ۲۸ را پریل ۱۹۴۹ء کو، آزاد حکومت سے، آزاد افواج، گلگت بلتستان کے جملہ انتظامی اختیارات، حتیٰ کہ تحریک آزادی کا کنٹرول، دیگر شعبہ جات کے اختیارات بھی حاصل کر لئے اور ۱۹۵۰ء میں رولز آف بزنس نافذ کیے۔ جن کے تحت، رہے سہے اختیارات پر نگرانی کے علاوہ، مسلم کانفرنس، تسلیم شدہ وزارت امور کشمیر کی، جنرل کونسل کی قرارداد اور سفارش پر، آزاد حکومت نامزد کرنے اور معزول کرنے کا اختیار بھی حاصل کر لیا۔ آزاد خطہ مع گلگت بلتستان، بدترین غلامی کے گمنام، پسماندگی کے اندھیروں میں کھو گیا، لوگ ڈوگرہ نظام کو بھی بھول گئے، مگر پاکستان سے لگن اور عشق نے، عوام کے منہ پر خاموشی کی مہر لگا دی اور زبان بندی، فطرت اور عادت میں بدل گئی۔ گورمانی نے، اپنے جوہر اور گر کشمیریوں کو دکھانے شروع کیے، جہاں مسلم کانفرنس تین دھڑوں میں بٹ کر، دست و گریبان ہو رہی تھی، وہاں لاء کالج کے طلباء کے وظائف بند کر دیئے گئے۔ جب وظیفہ بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا، تو جواب دیا، کہ جموں کشمیر میں وکیل پیدا نہیں کرنے ہیں، وکیل مستقبل میں مسائل پیدا کریں گے۔ لاکالج لاہور کے ریاستی طلباء کا وفد، چوہدری غلام عباس، سردار ابراہیم، علی احمد شاہ صاحب، سب سے ملا مگر گورمانی نے کسی کی سفارش نہ مانی، کسی نے ان کو ہمارے پاس بھیج دیا۔ میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی، مگر وہ بہت پریشان تھے۔ میرپور کے راجہ نجیب، ان کی قیادت کر رہے تھے، ان دنوں عبدالخالق انصاری بھی ایل ایل بی میں تھے، انھوں نے بھی سفارش کی۔ ہماری تنظیم نے گورمانی کے خلاف جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا، مگر کوئی پرنٹنگ پریس، گورمانی کے خلاف اشتہار چھاپنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ہم طلباء نے اپنی قلمی اشتہار لکھنا شروع کیے،

چار سو پوسٹر تیار کر لئے اور راولپنڈی کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے۔ ایجنسی والے ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ ایس پی عباس علی شاہ، کشمیر کے شعبہ میں تعینات تھے، چکوال کے ملک نواز انسپکٹر تھے۔ ان دنوں راولپنڈی میں اسلام لیگ کے نام سے، سیاسی جماعت قائم ہوئی تھی، فوارہ چوک کے قریب ان کا آفس تھا، جموں کشمیر کے ساتھ ان کا لگاؤ تھا۔ میں نے ان سے منادی کے لئے لاؤڈ سپیکر اور گاڑی کی استدعا کی۔ انھوں نے کنورٹیبل سرخ رنگ کی مرسڈیز کار پر، لاؤڈ سپیکر لگا کر، پٹرول کی ٹینکی بھر کر، ڈرائیور میرے سپرد کر دیا۔ میں نے پورا دن، شہزادہ کوٹھی پر، گورمانی کے آفس راولپنڈی میں، احتجاجی جلوس کیلئے منادی کی۔ کالج کے طلباء نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا، عوام بھی جلوس میں شامل ہو گئے۔ گورمانی نے صدر آزاد کشمیر کو طلب کر لیا اور پنجاب کنسٹیبلری کی نفری بھی طلب کر لی۔ ہم نے بہت سخت تنقیدی تقریریں کیں۔ گورمانی نے علی احمد شاہ صاحب کو میرے متعلق کہا، کہ مجید ملک میرپور کا ہے، اسے سمجھائیں کہ احتجاج ختم کرے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ وہ لڑکا بہت ضدی اور غصہ والا ہے، وہ مطالبہ تسلیم ہوئے بغیر نہیں مانے گا۔ یہ شاہ صاحب نے بعد میں بتایا۔ ہم نے آخر میں بھوک ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ کوٹلی چوکی موہنگ کے فیض میر، راولاکوٹ کے سردار خلیل اور سردار اسماعیل نے اور غالباً باغ کے جان محمد اعوان نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ دوسرے روز پھر جلوس نکالا، جو پہلے دن سے بھی بڑا تھا۔ شہزادہ کوٹھی پر اس روز گورمانی نے بجائے پی سی کے فوج طلب کر لی۔ ایک بجے دن گورمانی نے مطالبہ مان لیا اور لا کالج میں جموں کشمیر کے طلباء کے حق میں وظیفہ بحال کر دیا، نوٹیفکیشن جاری کروا کر راجہ نجیب کے سپرد کیا۔ ہمارے لیڈر جو گورمانی سے نالاں تھے، وہ بہت خوش ہوئے، مجھے بلا کر بہت شاباش دی، مگر دوسری طرف گورمانی اور عباس علی شاہ نے مجھے بلیک لسٹ کر دیا۔ پاکستان سے محبت، مگر حق کے لئے جدوجہد کرنے پر بلیک لسٹ کرنا، پہلا انعام تھا۔

میری شادی

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اولاد کی پیدائش کی مسرت کے بعد، والدین بالخصوص ماں کو بچوں کی شادی کا شدت سے، شوق کے ساتھ انتظار ہوتا ہے۔ گاؤں کی خواتین بھی ہر وقت جب ملتی ہیں، بچوں کی شادی کے جوڑ بناتی رہتی ہیں۔ گرمیوں کی تعطیلات ختم ہونے کو تھیں۔ کوٹلی دوستوں کے ساتھ دو دن گذار کر واپس گاؤں میں داخل ہوا ہی تھا، کہ حسب روایت خواتین نے مبارک دی! خیر مبارک کہہ کر پوچھا، کہ کس خوشی میں مبارک دی جا رہی ہے۔ جواب ملا کہ میری شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ یقین نہ آیا کہ اچانک یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ معلوم نہ تھا کہ زندگی میں کچھ فیصلے اچانک معرض وجود میں آتے ہیں۔ گھر پہنچا تو امی جان نے ڈانٹ دیا، کہ اتنے دن کوٹلی آوارگی میں ضائع کر دیئے۔ تمھاری شادی کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔ تیاری کے لئے وقت کم ہے! جب امی جان کی کھٹی میٹھی تقریر ختم ہوئی تو آہستہ سے پوچھا، کہ خوش نصیب دلہن کون ہے، تو امی نے کہا بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے، ملک نور محمد صاحب

سے۔ کچھ اطمینان ہوا، کہ لڑکی تعلیم یافتہ اور خوبصورت تو ہے، وگرنہ گاؤں اور خاندان میں زیادہ تر، ان پڑھ اور جاہل لڑکیاں تھیں۔ ایک دو ایسے ہی رشتے والد صاحب نامنظور کر چکے تھے۔ خالہ زاد تو ہم تھے ہی، مگر شادی کا قطعاً گمان نہ تھا۔ بلقیس فاطمہ اور میں نانی جان کے بہت چہیتے تھے۔ جس قدر دودھ مکھن نانی جان نے بچپن میں ہم دونوں کو کھلایا تھا، باقی نواسوں نواسیوں کو نصیب نہ ہوا۔ میں نہ جانتا تھا، کہ شادی کا والد صاحب کو علم ہی نہ تھا، وہ انگلینڈ تھے، صرف خط سے رابطہ تھا۔ مجھے تاثر تھا، کہ امی جان نے والد صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہوگی۔ ۱۶ ستمبر میرا یوم پیدائش تھا، اتفاق سے وہی تاریخ شادی کی مقرر ہو چکی تھی۔ میں نے کالج کے دوستوں کو پیغام کے ذریعہ، دعوت دی، مگر کسی نے بھی شرکت نہ کی، ان کو یقین ہی نہ آیا۔

میرے دوستوں نے شادی منعقد ہونے کا اعتبار نہ کیا، مگر جب میں کالج ایک ہفتہ تاخیر سے پہنچا، تو تب اُن کو یقین ہوا۔ ایک ہفتہ میں شادی کی تمام رسومات مکمل ہوئیں۔ ان دنوں پہلی رسم مانیاں کی ہوتی، بارات سے ایک دو رات قبل مہندی کی رسم اور دولہا بنانے کی رسم تھی، جس میں دولہا کو صحن میں بڑی چوکی پر بٹھا کر نہلایا جاتا۔ چوکی سے اتارنے کے لئے، دولہا کو لاگ (انعام) کا ماں باپ کی طرف سے اعلان ہوتا، جس کو قبول کرنا یا مزید لاگ طلب کرنا، دولہا کی صوابدید ہوتا۔ مجھے امی جان نے صرف یہ کہہ کر، کہ یہ گھر اور اس میں موجود سب کچھ تمہارا ہے، ٹرخا دیا۔ یوں بھی ماں باپ کے حکم اور فیصلہ کے تابع عمل ہونے کی وجہ سے، گاؤں میں سرگوشیاں تھیں، کہ شاید میں اپنی پسند کی شادی کروں گا، مگر ماں کی پسند پر خوش رہ کر سرنگوں ہونے پر، کچھ لوگوں کو حیرت بھی ہوئی۔ اس دور میں تو بچے شادی خود پسندی کے تحت، کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور والدین کو بیشتر اوقات بادل نخواستہ، اولاد کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے، جس کے نتیجہ میں ماضی کا متحد اور مشترکہ خاندانی نظام، بکھر کر رہ گیا ہے۔ بوڑھے والدین اولاد کے پیار کا درد سمیٹے، ان کی جھلک اور منہ کے بول کو ترستے ہوئے، تنہائیوں میں سسک سسک کر، دنیا سے پردہ کر جاتے ہیں اور جب والدین کا سر سے سایہ اُٹھ جاتا ہے، تب ان کی کمی کا شدت سے احساس بڑھنے لگتا ہے، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ میرے دماغ میں یہ الجھن تھی، کہ کیا وجہ ہے کہ جتنی لگن والدین کو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے، اس کے برعکس، اولاد کی ویسی لگن اور توجہ والدین کے بجائے اپنی اولاد کی طرف ہوتی ہے۔ ایک مدت کے بعد علم ہوا، کہ حضرت آدم اور اماں حوا کے والدین نہ تھے اور ان کی اولاد تھی، جس پر ان کی توجہ اور اُن سے لگن تھی، جس بنا پر یہ عمل فطرتاً اور طبعی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ابا جان کو جب میری شادی کا علم ہوا، تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ ان کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی، کہ ایک تو میری تعلیم متاثر ہوگی، دوسرا اُس عمر کی شادی مستقبل میں شاید کامیاب بھی ہوگی یا نہیں۔ تاہم میں نے ان کو خط میں، امی جان کے دفاع میں، تمام ذمہ داری اپنے سر پر لے کر یقین دلایا، کہ تعلیم میں کوئی لغزش یا کوتاہی نہیں ہوگی۔ پھر ایسا ہی ہوا، ہماری شادی خالصتاً دیہاتی ماحول میں۔ سادہ روائتی انداز میں منائی گئی۔ سُرخ

بروگ بوٹ، سفید شلوار، ہلکے گلابی رنگ کی لکیردار قمیض، سنہری باریک پھولدار شیروانی اور کیسری رنگ کی پگڑی، جس کا چھ انچ کا شملہ تھا، سر پر سنہری سہرا، منہ پر گلابی رومال، شادی کا لباس زیب تن تھا۔ چالیس پچاس مرد بارات میں شامل تھے۔ گھوڑی پر سوار بینڈ اور ڈھولوں کی گونج اور گیتوں کی سروں میں، ڈڈیال شہر سے گذر کر محلہ ملکاں میں بارات رونق افروز ہوئی۔ رات بھر گیت گانے گائے جاتے رہے، سحری کے وقت چوری کھلانے کی رسم ادا ہوئی، اور صبح ۹ بجے نکاح ہوا، وہی تاریخ میرا یوم پیدائش بھی تھی۔ دن گیارہ بجے رخصتی ہوئی۔ دو دن مزید بتھ ویرا کی رسم میں لگ گئے اور تیسرے روز میں دلہن کو خدا حافظ کہہ کر کالج چلا گیا۔

میرے قتل کی سازش

انسان تو معصوم پیدا ہوتا ہے، مگر معاشرہ میں جوں جوں انسان کی پہچان اور شناخت بسبب بڑھنا شروع ہوتی ہے، انسان میں نئی صفت جنم لیتی ہے، جس کو شہرت کہا جاتا ہے۔ شہرت کے آغاز کے ساتھ ہی، معاشرتی قوتوں میں ہلچل پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے، کیوں کہ ان کے اثر و رسوخ، وقار اور تمکنت کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہمعصر طبقہ، اپنے میں سے کسی کو مقبولیت اور شہرت میں سبقت لے جانے کو، پسند نہیں کرتا۔ کالج میں طلباء کی قیادت و سیاسی قیادت سے تعلق واسطہ اور سوشل معاملات میں پیش پیش رہنے سے، مقامی طور پر میری شہرت، ایک طبقہ میں حسد کی شکل اختیار کر رہی تھی، جس کا مجھے احساس نہ تھا۔ میں تو ہر ایک سے گھل مل جاتا اور سب کو ہمدرد سمجھتا۔ ان دنوں ہم چند طلباء اس خطہ سے کالج میں زیر تعلیم ہونے کی وجہ سے نمایاں تھے۔ پہلی سازش اس انداز میں ہوئی، کہ ڈڈیال میں ایک کیمسٹ کے پاس حسب معمول بیٹھا، گپ شپ میں مصروف تھا، اس نے اعتماد میں بتایا، کہ اس کے پاس یونانی علاج کی گولیاں ہیں، جو طلباء کا حافظہ اور ذہانت بڑھانے میں، بہت ہی مجرب ہیں۔ ایک شیشی میں بند گولیاں بطور تحفہ پیش کرتے ہوئے کہا، کہ ان کا استعمال صرف رات کو سونے سے پہلے کرنا ہے، اس نے تعداد بھی بتائی۔ میں طبعاً ادویات بہت کم استعمال کرتا ہوں، دو روز میں نے وہ گولیاں استعمال نہ کیں۔ تیسرے دن اس کیمسٹ سے ملاقات ہوئی، تو اس نے دوائی کے استعمال کے بارے میں دریافت کیا اور استعمال کے لئے اصرار کیا۔ نماز عشا کے بعد، میں نے بتائی گئی تعداد سے، نصف سے بھی کم گولیاں کھالیں، گھر میں سب ابھی بیدار تھے، ماموں عبدالغنی میرے پاس بیٹھے تھے۔ چند منٹ کے بعد میرا منہ خشک ہو گیا اور حلق سکڑنے لگا اور آواز کمزور ہونی شروع ہو گئی۔ میں نے شور کیا، کہ میں نے غلط گولیاں کھالی ہیں اور حلق بند ہو رہا ہے۔ ماموں بھاگتے ہوئے ڈڈیال گئے اور ڈاکٹر اظہار الحق کو ساتھ لائے۔ تب تک میری آواز نحیف ہو چکی تھی اور جسم میں عجیب بے چینی سی تھی۔ ڈاکٹر نے شیشی دیکھی اور کہا کہ وہ کچلہ کی گولیاں تھیں، جو زہر تھا۔ اس نے مجھے فوراً دودھ کے دو تین گلاس پلائے، اس سے سخت الٹی ہوئی اور تمام زہر نکل گیا۔ دو دن سوائے دودھ کے، کوئی چیز بھی کھانے پینے سے مکمل پرہیز

کیا۔ معدہ مکمل صاف ہونے کے بعد، غذا شروع کی۔ اگر بروقت ڈاکٹر نہ ملتا اور معدہ صاف نہ ہوتا، تو زہر اثر کر جاتا۔ جب اس کیمسٹ سے ڈاکٹر نے اور میں نے شیشی دکھا کر دریافت کیا، تو وہ قسم کھا کر معافی مانگنے لگا، کہ غلطی سے اس نے، غلط شیشی اور گولیاں دے دیں، جس پر ڈاکٹر کے کہنے پر اس کو معاف کر دیا۔ اب وہ دنیا میں نہیں اس کا نام اب ظاہر کرنا، مناسب نہ ہے۔

دوسرا حملہ دسمبر میں کالج میں تعطیلات تھیں، اتوار کا دن تھا۔ سورج بادلوں کی اوٹ میں غائب تھا اور سخت سردی تھی۔ میں کمبل لپیٹ کر کتاب میں محو مطالعہ تھا، کہ ایک لڑکا آیا، اس نے پیغام دیا کہ فلاں لوگ آپ کو بلا رہے ہیں، باہر گیا، تو تین لوگ، تعلق والے جن میں سے، ایک گہرے دوست تھے، جن کا نام لکھنا مناسب نہیں ہے۔ اتنی عمر کا حصہ گذر گیا، میں نے صبر سے کام لیا اور پردہ پڑا رہنے دیا اور فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، جس نے زندگی دی اور تحفظ بھی دیا۔ انھوں نے کہا، کہ موسم بہت اچھا ہے چلتے ہیں، ہم بھی تیتر کا شکار کرتے ہیں۔ یہ ۲۶ ردسمبر ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے، دو کے پاس ۱۲ بور بندوقیں تھیں، ایک خالی ہاتھ تھا۔ میں گھر میں اطلاع دیئے بغیر، وہاں سے ہی ان کے ساتھ چلا گیا۔ جہاں اب نیا ڈڈیال شہر تعمیر ہوا ہے، یہ جگہ اس وقت ویران ہی تھی، اس میں صرف کانٹے دار جھاڑیاں ہی تھیں۔ اس سے قبل میں اس طرف نہ گیا تھا، حالانکہ اس کے قریب جنوب میں ہماری اراضی تھی، جو اب بھی موجود ہے۔ ہم چل رہے تھے، کوئی تیتر تو کیا ادھر فاختہ بھی نہ تھی۔ ایک جگہ پر ایک بندوق بردار، جو کچھ مدت فوج میں رہ چکے تھے، کندھے پر بندوق رکھے بیرل پیچھے کیے ہوئے، اچانک میرے آگے نکلے۔ ان کا رخ مشرق کی جانب اور بندوق کا منہ بالکل میری طرف، عین میرے چہرے اور سر کے زاویہ پر تھا۔ جب وہ آگے ہوئے، تو میں قدرے پیچھے تھا، اچانک میری شلوار جھاڑی کے کانٹوں سے الجھ گئی، میں فوراً بیٹھ گیا اور شلوار ٹھیک کرنے لگا۔ عین اسی وقت اس نے مجھ پر فائر کیا، جو میرے سر کے اوپر سے گذر گیا۔ تینوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا، تو میں صحیح سلامت تھا۔ وہ مجھ سے معافی مانگنے لگے، کہ فائر غلطی سے خود بخود ہو گیا ہے۔ میں تمام سازش سمجھ گیا، مگر بجائے الجھنے اور الزام تراشی کے، میں ان سے الگ ہو کر گھر آ گیا۔ میں سوچتا رہ گیا، کہ لوگ تو زندگی بھر پھولوں کی تمنا کرتے ہیں، مگر مجھے تو کانٹوں نے شلوار سے الجھ کر نئی زندگی دی۔ کانٹوں کا الجھنا پھولوں کی مہک سے کہیں زیادہ باعث استراحت ثابت ہوا۔ یہ درست کہاوت ہے، کہ انسان دشمن سے مار نہیں کھاتا، دھوکہ وہی دیتا ہے، جس پر اعتماد ہوتا ہے۔

تیسری سازش تیسری سازش کا انکشاف ملتان خان پٹھان نے، چوہدری عزیز کلروڑی والے سے کیا۔
ایک آدمی ڈڈیال میں تھا، عمر میں دو تین سال مجھ سے بڑا تھا، بظاہر بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ تجارت کرتا تھا، کسی معاملہ میں ہماری دشمنی نہ تھی، سوائے میرے خلاف حسد کے۔ ملتان خان پٹھان آزاد قبائلی علاقہ کا رہنے والا تھا، وہ اسلحہ وغیرہ فروخت کرتا تھا، اس کو پیش کش کی گئی، کہ وہ جتنی رقم لینا چاہے، لے کر مجھے قتل کر دے یا کروا دے۔ وہ مجھے

اچھی طرح جانتا تھا، مگر عزیز کا دوست تھا اور عزیز میرا دوست تھا۔ اس نے عزیز کو نہایت رازداری میں بتایا، کہ ملک کو کہو کہ فلاں آدمی اس سے، سخت حسد کرتا ہے اور اس کو جان سے ختم کروانا چاہتا ہے، اس لئے محتاط رہے۔ بعد میں وہ آدمی انگلینڈ چلا گیا اور کبھی واپس نہ آیا، اب قطعی لاپتہ ہے۔ میری شہرت کس طرح دشمنی کی شکل اختیار کر گئی، اس کا اندازہ نہ تھا۔ پسماندہ اور دقیانوسی معاشرہ، ہمیشہ قومی اور انفرادی ترقی میں رکاوٹ رہا ہے، چہ جائیکہ میرے حسن اخلاق اور اچھی شہرت سے خوش ہوتے، حاسد قوتوں نے مجھے قتل کرنے کی سازش کی، میں نے ان واقعات کو مخفی رکھا۔ میری امی جان ہمیشہ مجھے محتاط رہنے کی ہدایت کرتیں اور میرے حفظ وامان کے لئے، متواتر دعا کے علاوہ، اکثر صدقہ اور خیرایت کرتیں۔ یہی کیفیت ابا جان کی تھی، وہ بھی ہر خط میں جان کی احتیاط کی تاکید کرتے۔ میرے چھوٹے بھائی، محمد یعقوب اور محمد ایوب اور چھوٹی بہن زبیدہ سے، بھی والدین کو پیار تھا، مگر میری خوش قسمتی، کہ ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کو میرے ساتھ والہانہ عشق رہا۔ یہی کیفیت اب میری بیگم کی تھی۔ مجھے جب کبھی کسی قسم کی پریشانی ہوتی، ان کو فوراً الہامی طور پر اشارہ مل جاتا اور وہ فوری رابطہ کر کے دریافت کرتیں، ایسی ہی کیفیت میری بیٹیوں اور بیٹوں میں ہے۔ اس پس منظر کے تحت ان واقعات کو پردہ میں رکھا، تاکہ والدین اور بچے پریشان نہ ہوں۔ اس میں میرے صبر کی بھی آزمائش تھی۔

لیاقت علی خان کا قتل

سال ۱۹۵۱ء، بہت ہی آزمائشوں کا سال تھا، پہلے جن واقعات کا تذکرہ ہوا، وہ تمام واقعات اسی سال پیش آئے تھے۔ قائداعظم ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو رحلت فرما گئے، اسی روز بھارت نے جونا گڑھ ریاست، جس کا الحاق پاکستان سے ہو چکا تھا اور ریاست حیدرآباد دکن، جس کے حکمران نظام نے، آزاد خود مختار مملکت کا اعلان کر کے، اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے، سفیر مامور کر کے ارسال کر دیا تھا اور پاکستان، جس نے اس کی خود مختار حیثیت تسلیم کر لی تھی اور اس کا سفیر کراچی میں تعینات ہو چکا تھا۔ ہر دو ریاستوں پر حملہ کر کے غاصبانہ فوجی قبضہ کر لیا تھا۔ جموں کشمیر میں تو ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے فوج اتار کر جبری قبضہ کیے ہوئے تھا۔ تحریک پاکستان میں قائداعظم کے بعد، قائد ملت لیاقت علی خان، بحیثیت وزیراعظم قوم کی امیدوں کا مرکز تھے۔ ان دنوں مسئلہ کشمیر پر، ہندوستان پاکستان کے درمیان چپقلش تھی۔ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تھی، جس کا لیاقت علی خان نے مکہ بنا کر جواب دیا تھا، کہ پاکستان کی طرف جو میلی آنکھ اٹھے گی، وہ آنکھ نکال دی جائے گی۔ جو ناپاک قدم بڑھے گا، وہ کچل دیا جائے گا اور دشمن کو خس وخاشاک کی طرح مٹا دیا جائے گا۔ لیاقت علی خان کا مکہ، پاکستان کی جرأت اور بہادری کا قومی امتیازی نشان بن گیا تھا۔ وزیراعظم راولپنڈی دورہ پر آ رہے تھے، ان دنوں مرکز میں پنجاب کے سیاستدانوں کی ان سے اندرونی کشیدگی تھی، دوسرا پنجاب کے اندر بھی ممدوٹ دولتانہ گروپوں میں، خاصی محاذ آرائی

کی کیفیت تھی۔ ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو، وزیر اعظم نے ظہر کے وقت، کمپنی باغ راولپنڈی کے وسیع وعریض میدان میں، عوام سے جلسہ عام میں خطاب کرنا تھا۔ کالج کے طلباء وقت سے پہلے ہی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ ہم سٹیج سے بیس فٹ کے فاصلہ پر، شمال کی جانب پہلی قطار میں تھے۔ سٹیج پر خلاف توقع اور خلاف معمول، صرف ایک کرسی اور مائیک تھا۔ وزراء اور افسران کی کرسیاں سٹیج کے پیچھے ۲۰ فٹ کے فاصلہ پر مغرب کی جانب تھیں۔ شیخ مسعود صادق، جس کا سابق امرتسر سے تعلق تھا، پنجاب مسلم لیگ کے صدر اور صوبائی وزیر بھی تھے، انھوں نے دیگر کے ساتھ وزیر اعظم کا استقبال کیا اور سٹیج پر لائے۔ جلسہ گاہ میں جم غفیر تھا، تمام لوگ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مری روڈ، کالج روڈ اور قریب کی عمارات کی چھتوں پر، بے شمار لوگ کھڑے تھے۔ کمپنی باغ کے میدان میں، اتنا بڑا اجتماع، اس سے قبل یا بعد میں کبھی ہمیں دیکھنے کو نہ ملا۔ وزیر اعظم نعروں کی گونج میں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ سٹیج کی دائیں طرف کالج کے سینئر طالب علم، افضل ملک، وزیر اعظم کا فوٹو لے رہے تھے۔ مجمع میں مکمل خاموشی تھی، وزیر اعظم مائیک کے قریب ہوئے اور ابھی صرف اتنا کہا، کہ برادران ملت، حرف ت آدھا ہی بولا تھا، کہ سٹیج کے سامنے بیٹھے ہوئے عوام میں، ایک پولیس انسپکٹر وردی میں کھڑا تھا۔ اس کے پاس سے سفید شلوار قمیض اور پگڑی میں ملبوس، ایک آدمی اچانک کھڑا ہوا اور اس نے سیدھا نشانہ لے کر، بڑے سائز کے پستول سے، یکے بعد دیگرے دو تین فائر کیے۔ وزیر اعظم کو دل پر دو فائر لگے، وہ زمین پر لڑھک گئے، ملک افضل نے دوڑ کر ان کو سہارا دیا۔ پولیس انسپکٹر نے وہاں پر ہی حملہ آور کو اپنے پستول سے فائر کر کے ختم کر دیا۔ شیخ مسعود وغیرہ سٹیج پر آئے اور وزیر اعظم کو اٹھا کر، پاس کھڑی ان کی گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے۔ معلوم ہوا، کہ وزیر اعظم صاحب نے اتنا کہا کہ ''پاکستان کا خدا حافظ'' اور وفات پا گئے۔ فائرنگ کے وقت لوگ خوف وہراس میں اس طرح بھاگے، کہ بھگدڑ مچ گئی، لوگوں کے جوتے وغیرہ وہاں ہی رہ گئے۔ اس قدر شور اور ہنگامہ ہوا کہ لوگ پریشان، یوں ہی بھاگ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان جو فائرنگ سے قبل صاف شفاف تھا، سرخ ہو گیا۔ فضا میں کوے، چیلیں چیخ وپکار کرتے اُڑ رہے تھے اور جلد ہی اس انداز میں اندھیرا چھا گیا جیسا کہ تمام پاکستان اندھیرے میں ڈوب گیا ہو۔ ہم تمام طلباء نے رات کا کھانا کھایا، نہ ہی دوسرے روز ناشتہ کیا۔ تمام رات جاگتے رہے، کہ کہیں ہندوستان پاکستان پر حملہ نہ کر دے۔ وہ شام اور رات قیامت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا، کہ سید اکبر نامی شخص کو، قائد ملت کے قتل کے لئے، صدر کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا اور منصوبہ کے تحت، وزیر اعظم پر، گولی چلانے کے بعد، سید اکبر کو موقع پر پولیس انسپکٹر، جو اس کے پاس پہلے سے موجود تھا، اس نے گولی مار کر ختم کر دیا۔ اس سے قبل آزادی کے بعد، ۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء کو ایک متعصب ہندو جنونی نے، مہاتما گاندھی کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا، قاتل گوڈسے کا تعلق، راشٹریہ سیوک سنگھ سے تھا۔ لیاقت علی خان کا قتل، دوسرے بڑے سیاستدان کا قتل تھا۔ ہندوستان میں اندرا گاندھی قتل ہوئیں اور اسی لیاقت باغ کی سڑک پر قریباً ۵۶

سال ۲ ماہ بعد بے نظیر صاحبہ، دوسری سابق وزیراعظم کو جلسۂ عام کے اختتام کے بعد قتل کر دیا گیا۔ برصغیر کی سیاست میں سفاکی کے، یہ انمٹ نشان ہیں۔

کیپٹن جنرل سید علی احمد شاہ

سید علی احمد شاہ ڈوگرہ فوج میں میجر کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد، مسلم کانفرنس میں شامل ہوئے اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ مئی ۱۹۴۴ء میں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی دعوت پر، قائداعظم براستہ جموں جب سری نگر گئے، تو بانہال قاضی کنڈ سے لے کر سری نگر تک، سڑک کے دونوں جانب کھڑے ہو کر، قطار در قطار ریاستی عوام نے، جم غفیر کی شکل میں ان کا جو شاہانہ استقبال کیا، وہ کشمیر کی تاریخ کا انمول سنہری باب ہے۔ بقول ان کے، قائداعظم کی خدمت میں مسلم کانفرنس کے فنکشن میں خطبہ استقبالیہ پیش کرنے کا اعزاز، انہیں حاصل ہوا۔ ڈوگرہ استعماریت کے خلاف تحریک کے دوران، جولائی ۱۹۴۷ء میں حکومت نے، ان کو ضلع میرپور بدر کر دیا۔ انھوں نے جہلم شہر میں دریا کنارے، تحریک کا ہیڈکوارٹر قائم کیا اور ڈوگرہ فوج کے قبضہ سے میرپور آزاد کروایا، حالانکہ ہندوستان کی فوج اور ائیر فورس کی، ڈوگرہ فوج کو بھرپور حمایت حاصل تھی۔ میرپور، ڈڈیال اور بھمبر کے سابق فوجیوں کو منظم کر کے فتح حاصل کی گئی، اسی دوران قبائلی پٹھانوں کی بھی مدد حاصل ہوئی۔ سید باقر شاہ، ان کے بزرگ، میرپور کی معروف شخصیت تھے، جن کو جموں دربار میں کرسی نشین کا مقام حاصل تھا۔ شاہ صاحب آزاد کشمیر حکومت جو ۲۴ر اکتوبر کے بعد ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دوبارہ قائم ہوئی، اس میں وہ وزیر دفاع تھے۔ آزاد کشمیر ریگولر فورس میں انھوں نے، کیپٹن جنرل کا عہدہ اختیار کیا، یہ عہدہ جرمنی کی فوج میں استعمال ہوتا تھا۔ جب آزاد حکومت کے صدر مقرر ہوئے، تو میں گورڈن کالج میں طالب علم تھا۔ راولپنڈی صدر میں ان کی رہائش شہزادہ کوٹھی، دفتر وزارت امور کشمیر کے پاس ہی تھی۔ ایک دن کالج سے فارغ ہو کر، شرافت، ان کے بیٹے کے ساتھ میں ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ شاہ صاحب شہزادہ کوٹھی میں مشتاق گورمانی کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھے۔ صدر حکومت کے پاس ان دنوں سواری کے لئے جیپ ہوتی تھی۔ مرسڈیز کار پہلی دفعہ صدر حکومت کو ۱۹۵۷ء میں حاصل ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کی جیپ پالش ہو کر صحن میں کھڑی تھی۔ مجھے اچانک جیپ میں بیٹھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا، کہ شاہ صاحب کی جیپ میں کچہری چوک تک چکر لگوائے۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی اور انکار کر دیا۔ شرافت نے بھی مجھے منع کیا۔ وہ خود کالج، سائیکل پر جاتا تھا اور جیپ کے پرائیویٹ استعمال پر سخت پابندی تھی، مگر میں بدستور ڈرائیور کی منت اور خوشامد کرتا رہا۔ بالآخر اس کو میری طرف سے صدر صاحب کی ذمہ داری اٹھانے پر، ترس آ گیا، شرافت پھر بھی خوف کے مارے کترا رہا تھا۔ میں نے اسے زبردستی جیپ میں بٹھایا۔ ہم کچہری چوک سے مال روڈ، فلیشمین ہوٹل تک جا کر واپس ہوئے۔ اس دوران شومئی قسمت کہ صدر صاحب گھر پہنچ چکے تھے، انہیں دیکھ کر ڈرائیور

اور شرافت پر کپکپی طاری ہوگئی، میں بھی پریشان ہوگیا۔ صدر صاحب اس خلاف ورزی پر غصہ میں لال پیلے ہوگئے، شرافت اور ڈرائیور کی ناقابل بیان درگت بنی۔ میں نے تمام ذمہ داری اپنے سر لی، مگر صدر صاحب نے غصہ میں مجھے کہا، یو ڈیم فول، تم مت بولو، مگر میں بولتا رہا۔ بالآخر انھوں نے جیپ کے سفر کا فاصلہ نکلوایا۔ پٹرول کی قیمت کے علاوہ، ویئر ٹیئر کی اضافی رقم، حکومت کے خزانہ میں جمع کروانے کے لئے دی اور حکم دیا، کہ اس کی رسید لاکران کو پیش کی جائے۔ بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا، مگر ہم نئی نسل کے لئے امانت اور دیانت کا عمدہ اور سبق آموز کردار، کا نمونہ تھا۔ اس دور میں ایسے ایماندار اور دیانتدار حکمران کہاں نظر آتے ہیں۔

چوہدری غلام عباس کو، پنجاب یونیورسٹی کا اختیار

جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے بڑے راہنما، چوہدری غلام عباس خان، پاکستان کے قیام کے بعد، مارچ ۱۹۴۸ء کو جموں جیل سے آزاد ہوکر، سیالکوٹ قیام پذیر ہوئے۔ قائداعظم سے کراچی ملاقات کے دوران، مہاجرین جموں کشمیر کی آبادکاری کے لئے ،ایک کروڑ روپیہ طلب کیا، جو اُن کے سپرد ہوا۔ انھوں نے مہاجرین ریاست کی کونسل تشکیل دی اور اس کے چیئرمین بنے۔ مہاجرین میں بھاری اکثریت کا تعلق جموں شہر، کٹھوعہ، اکھنور، اودھم پور، راجوری، مینڈھر اور نوشہرہ وغیرہ صوبہ جموں سے تھا، سری نگر اور بارہ مولہ سے مہاجرین کی تعداد کم تھی۔ سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب تھے اور چانسلر یونیورسٹی بھی تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا، کہ جموں کشمیر کے طلبا نقل مکانی اور تحریک آزادی میں متحرک اور شامل ہونے کے سبب، تعلیمی کیریئر میں نقصان نہ اٹھائیں، اس لئے انھوں نے چوہدری غلام عباس صاحب کو اختیار دیا، کہ ان کی سفارش پر طلباء کو پنجاب یونیورسٹی سے متعلقہ امتحان پاس کرنے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جائے گا۔ چوہدری صاحب سیالکوٹ سے میورو ڈ صدر راولپنڈی میں رہائش پذیر ہوئے۔ جن طلباء یا ان کے والدین کو علم ہوا، انھوں نے فی الفور سفارشی خط لیے اور بدوں امتحان پاس کیے، یونیورسٹی سے سرٹیفکیٹ حاصل کرکے بی۔ اے، ایم۔ اے اور ایل ایل بی کلاسوں میں داخل ہوگئے۔ ریاست میں جنگ کی وجہ سے ایک سال ہمارا بھی ضائع ہوگیا تھا، مگر ہمیں چوہدری صاحب کے اختیار کا علم ہی نہ ہوا۔ ہم میٹرک پاس کرکے کالج میں داخل ہوئے، تو میرپور کالج میں ۱۹۴۷ء میں میٹرک میں میرے چند کلاس فیلو سیکنڈ ائیر میں تھے اور کچھ جونیئر جو تھے، وہ ہمارے کلاس فیلو ہوگئے۔ یہ سلسلہ دو سال چلتا رہا۔ میرپور کے چھ لڑکے ہمارے ساتھ بدوں میٹرک پاس کیے، پڑھتے رہے۔ جب ایف۔ اے فائنل کے امتحان کا مرحلہ آیا، تو میٹرک پاس کے سرٹیفکیٹ اور یونیورسٹی رجسٹریشن نمبر طلب کیا گیا، ہم نے تو پیش کردیئے، مگر وہ چھ طلبا بھاگ کر چوہدری صاحب سے سفارشی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے گئے، اس وقت تک ان کا اختیار ختم ہو چکا تھا۔ البتہ دو سال کی مدت میں، جب تک ان کو اختیار حاصل رہا، واقف کار طلباء نے خوب فائدہ اٹھایا۔ لاہور میں تو پنجاب کے کچھ پرانے کشمیری خاندان کے لڑکوں نے،

میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں جموں کشمیر کے طلبا کے لئے مختص سیٹوں پر داخلہ لے لیا، وزارت امور کشمیر سے وظیفہ بھی حاصل کرتے رہے اور ٹیوشن فیس کے استثنیٰ کا فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔ میرپور کے طلبا جنھوں نے چوہدری صاحب کا اختیار دائمی سمجھا تھا، ان کو بہت پریشانی اور ندامت ہوئی اور تعلیمی مستقبل بھی تباہ ہوا۔ ان کی بھاگ دوڑ کے سبب، ہم کو چوہدری غلام عباس خان کے خصوصی اختیار کا علم ہوا۔ ایک پہلو یہ بھی ہے، کشمیر کی تصویر کا، دوسرا پہلو، سیاست کے باب میں۔

حکومت پاکستان اور مسلم لیگ کی اس وقت کی قیادت نے، خلوص اور پیار کے ساتھ، جموں کشمیر کے مہاجرین کی آبادکاری اور حصول تعلیم میں جائز سہولتیں فراہم کیں۔ مسلم کانفرنس کی تمام قیادت اور مرکز سے نچلی سطح کے کارکنوں کو، ماہوار وظیفہ ملتا تھا، جس کا ریکارڈ، وزارت امور کشمیر میں محفوظ ہے۔ ہم نوجوان مسلم کانفرنس کو وظیفہ خور کانفرنس اور طفیلی کانفرنس کہتے۔ اس پالیسی کے نتیجہ میں، آزاد کشمیر کے عوام سیاسی حقوق سے محروم رہے۔ آزاد کشمیر کی بے اختیار حکومت، سیاسی کشمکش کا اکھاڑہ بن گئی اور تحریک آزادی کی حیثیت بھارت اور پاکستان کے درمیان زمین کے تنازعہ کا مسئلہ بن گئی، جو اب شملہ معاہدہ کے تحت جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت سے محروم ہونے، استصواب رائے کے بجائے دوطرفہ مذاکرات کی یرغمالی تعطل کا شکار ہے۔ تحریک آزادی اب صرف جموں کشمیر کے عوام کی اپنی قیادت کی سربراہی میں ہی، منطقی انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری بن چکی ہے۔ پاکستان معاہدہ شملہ، اعلان لاہور اور اعلان اسلام آباد کے بعد، سیکیورٹی کونسل میں رائے شماری کا نکتہ اٹھانے کی بجائے، صرف دوطرفہ مذاکرات کے مطالبہ کر کے، عوام کو مطمئن کیے ہوئے ہے۔ عملاً دونوں ممالک اپنے اپنے زیر قبضہ علاقہ کو، اپنے ملک میں مستقل مدغم کرنے کی بتدریج حکمت عملی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور کی کشش

انسان اپنی سوچ اور فکر کے مطابق ہی، آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کرتا ہے، مگر قدرت نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا ہوتا ہے، جس کے لئے انجانے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ تو شروع سے کچھ ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اچانک دو دفعہ سکول سے بھاگا، گورڈن کالج سے بھاگ گیا اور سکول ٹیچر کی ملازمت کے لئے بضد ہو گیا۔ تقرری کا حکم حاصل کرنے کے بعد دوسرے روز کالج لوٹ گیا۔ معمول کے مطابق تعلیم پر توجہ دینے کی بجائے، جموں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کی دھن میں، طلبا کی سیاست میں الجھ گیا۔ مدعا تو حاصل ہوا، مگر اپنے خلاف حکومت اور خفیہ اداروں کی مخالفت کی قیمت پر۔ ایسا ہی ایک سبب، راولپنڈی سے لاہور منتقل ہونے کا بنا۔ میں نے ایف اے کا امتحان دیا، تو نتیجہ التوا میں ڈال دیا گیا، جس کے لئے لاہور یونیورسٹی سے معلومات حاصل کرنے کے لئے گیا۔ نانا جان نے لاہور جانا تھا، وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ کسکمہ کے راجہ محمد افضل خان، سابق گورنر جموں کشمیر،

نانا جان کے دوست تھے، اُن دنوں کمشنر گوجرانوالہ ڈویژن تعینات تھے،ان سے ملنے کے لئے رُکے اور شام کو لاہور پہنچے۔ وسنپورہ میں چورہ شریف کے پیر صاحب کے ہاں قیام کیا۔ دوسرے دن سردار اقبال صاحب کو ملے۔ سردار اقبال صاحب کے خاندان کا تعلق میرپور سے تھا، محلّہ لوہاراں میں ان کی رہائش تھی،ان کے والد پونچھ شہر میں تحصیلدار کے عہدہ پر فائز تھے، چنانچہ مستقلاً وہاں منتقل ہو گئے تھے۔ سردار اقبال بعد میں چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اور وفاقی محتسب اعلیٰ کے عہدوں پر فائز رہے، ہمارا قبیلہ ایک ہی ہے۔ وہ اُن دنوں وکالت کرتے تھے اور پنجاب یونیورسٹی کے قانونی مشیر بھی تھے، وہ مجھے پنجاب یونیورسٹی لے گئے، وہاں سے رزلٹ حاصل کیا، جو محض ایک پرچہ بروقت واپس موصول نہ ہونے کی وجہ سے، روک لیا گیا تھا۔ مزید دو دن ہم نے سردار صاحب کے گھر قیام کیا۔ ان ہی دنوں سردار صاحب نے نئی کار ہلمین خریدی تھی۔ مجھے ساتھ لے کر لاہور کی مال روڈ کی سیر کروائی۔ ان دنوں مال روڈ لاہور کا دل تھا۔ سردار صاحب نے مجھے، راولپنڈی سے لاہور کالج میں داخل ہونے کی ترغیب دی، بلکہ فیصلہ ہی ہو گیا کہ لاہور گورنمنٹ کالج میں، بی۔اے تھرڈ ایئر کلاس میں داخل ہونا ہے۔ میں نے جب گورنمنٹ کالج دیکھا، تو وہاں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ داخلہ میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں میرپور واپس آیا، تو راجہ صدیق اور بشیر احمد میر، جو گورڈن کالج میں کلاس فیلو تھے، ان کو بھی تیار کیا اور تینوں لاہور پہنچے۔ آخری دن داخلہ درخواست کا تھا، کالج میں بی۔اے، بی۔ایس سی میں دو صد کے قریب سیٹیں تھیں، وہاں اس دن تک بارہ سو ساٹھ طلباء درخواستیں جمع کروا چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ داخلہ ایف۔اے میں حاصل کردہ نمبروں اور ڈویژن کے میرٹ کے مطابق ہوگا اور کالج کا بورڈ انٹرویو کے بعد، داخلہ کا فیصلہ میرٹ پر کرے گا۔ طلباء کی تعداد اور میرٹ پر داخلہ کی اطلاع ملنے پر، راجہ صدیق اور بشیر احمد میر واپس راولپنڈی چلے گئے۔ گو میں نے انٹرویو میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا، مگر بہت فکر مند بھی ہو گیا، کہ داخلہ نہ ملا، تو راولپنڈی دوستوں کو منہ کیسے دکھاؤں گا۔ سردار اقبال لاہور سے باہر تھے۔ میر اسحاق صاحب، اباجی کے دوست انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے اور مال روڈ پر کافی ہاؤس چلا رہے تھے۔ ان سے ملا، وہاں ان کے پاس ایک پروفیسر صاحب، کافی پی رہے تھے۔ میں نے میر صاحب سے کالج میں داخلہ کا ذکر کیا، تو ساتھ بیٹھے پروفیسر صاحب نے کہا، کہ داخلہ صرف میرٹ پر ہوگا، میں رات بھر پریشان رہا۔ صبح اس ارادہ سے، کہ داخلہ ملنا تو مشکل تھا، مگر انٹرویو اعتماد سے دوں گا۔ کالج پہنچا، طلبا کا جم غفیر تھا، کچھ لڑکے بڑی بڑی امریکن کاروں میں کالج آ رہے تھے۔ میرے لئے یہ ماحول غیر مانوس تو تھا ہی، مگر بہت دلچسپ اور معلوماتی بھی تھا۔ میرا تجربہ تو صرف ڈوگرہ دور کے انٹر کالج میرپور اور گورڈن کالج کا تھا، جہاں صرف داخلہ فارم پیش کر کے، کالج میں داخلہ مل گیا تھا، مگر گورنمنٹ کالج میں نظام بالکل مختلف تھا۔ میرے ذہن میں یہ احساس پہلی دفعہ پیدا ہوا، کہ قابلیت اور اہلیت کی کتنی اہمیت اور قدر و قیمت ہوتی ہے۔ کاش کہ اس کا علم، ایک سال قبل ہوا ہوتا، تو اور محنت کرتا اور امتحان میں امتیازی

نمبروں سے پاس ہوتا، مگر وہ لمحات تو گزر چکے تھے، اب سوائے پچھتانے کے کیا حل تھا۔ کچھ طلباء کتابیں لئے ورق گردانی کر رہے تھے۔ مجھے کتابی مشق سے بے نیاز پا کر ان کو تعجب بھی ہو رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہال میں نام کی ترتیب کے ساتھ طلباء نظم وضبط سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ سبھی اپنے اپنے مستقبل کے خوابوں میں گم، اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔ میں لباس کے معاملہ میں شروع سے محتاط رہنے کا عادی تھا۔ قد وقامت تو قدرت نے مناسب دے رکھی تھی، اچھے لباس سے اس میں جاذبیت اور نکھار آ جانا فطری تھا۔ میں بہترین پتلون اور بوشرٹ زیب تن کر کے گیا تھا۔ ساتھ بیٹھے طلباء نے مجھ سے یکے بعد دیگرے کئی سوالات کیے، نمبر کتنے تھے؟ ڈویژن کیا تھی؟ میری خوداعتمادی سے وہ کچھ زیادہ ہی متاثر تھے اور بالآخر پوچھ ہی لیا، کہ کیا مجھے یقین ہے، کہ مجھے داخلہ مل جائے گا؟ میرے مثبت جواب پر ایک نے فی الفور روایتی جملہ بولا، کوئی بڑی سفارش ہی ہوگی؟ اس پر میں مسکرایا، تو دوسرا بولا کس کی سفارش ہے؟ جواب دیا، اللہ میاں کی اور امی جان کی، اسی دوران میری باری آ گئی۔ میرا نام پہلے بیس طلبا میں تھا۔ بورڈ کی صدارت کالج پرنسپل، ڈاکٹر سراج فرمارہے تھے، ان کے دائیں بائیں چھ چھ، کل بارہ پروفیسر کرسی نشین تھے۔ مشرق کی سمت باہر جانے والے دروازہ کے ساتھ، پرنسپل صاحب نے غور سے دیکھتے ہوئے، انگلش میں سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ میں باوقار طریقہ سے بیٹھا ہی تھا، کہ پرنسپل صاحب مخاطب ہوئے، کہاں سے آئے ہو؟ جواب دیا، ریاست جموں کشمیر سے! کس حصہ سے؟ میرپور آزاد کشمیر سے! داخلہ فارم میں وظیفہ والا کالم دیکھ کر۔ کون سا وظیفہ ملتا تھا؟ وزارت امور کشمیر سے! اگر آئندہ وظیفہ نہ ملا تو؟ پرواہ نہیں، میرے اپنے وسائل ہیں! اس کالج میں کیوں داخل ہونا چاہتے ہو؟ میرے والد صاحب کی خواہش ہے! وہ کیا کام کرتے ہیں؟ وہ انگلینڈ میں ہیں! پرنسپل کے دائیں بیٹھے، سفید سر والے پروفیسر ڈاکٹر محمد صادق، جن کا نام بعد میں معلوم ہوا، بولے، تم گورڈن کالج میں پڑھتے تھے؟ جی ہاں! وہ کالج بہت اچھا ہے، وہاں داخل کیوں نہیں ہوئے؟ بتا چکا ہوں، کہ والد صاحب کی خواہش کے تحت، اس کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں! مگر تمہارے لئے اس کالج میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ٹھیک ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں (آئی ڈیم کیئر فار اٹ)۔ اس پر وہ بولے (گو آؤٹ)، تم چلے جاؤ! شکریہ! یہ تھا میرا انٹرویو۔ باہر نکلا، تو وہ طلباء جو سوالات کی کھوج میں باہر کان لگائے سن رہے تھے، وہ پیچھے پڑ گئے، کہ میں نے یہ کیوں کہا، کہ آئی ڈیم کیئر فار اٹ۔ میں نے جواب دیا، کہ داخلہ تو ملنا نہیں، تو خوشامد کیا کرتا۔ دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں واپس ہوا، مایوس اور پریشان تھا کہ اب راولپنڈی میں طعنے سننے پڑیں گے۔ دوستوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ہوٹل میں سامان پیک کیا، بل ادا کیا۔ اچانک خیال آیا، کہ تین بجے داخلہ کا رزلٹ بتایا جانا ہے، لہٰذا رزلٹ تک انتظار کر لیا جائے۔ تین بجے سے چند منٹ قبل کالج پہنچا، طلباء کی بھیڑ تھی۔ تین بجے سلیکٹ ہونے والے طلباء کی فہرست، نوٹس بورڈ پر چسپاں کر کے بورڈ باہر آویزاں کر دیئے گئے۔ طلباء بے صبری سے نوٹس بورڈ پر ٹوٹ پڑے، میں پیچھے فاصلے پر منتظر کھڑا تھا۔ میرے پاس

ایک دبلا پتلا کمزور لڑکا آیا اور چٹ دی کہ فہرست میں اس کا نام دیکھنے میں اس کی مدد کروں۔ میں نے اس کے نام اور نمبر کی سلپ لی اور ہجوم کو کہنیوں سے چیرتا ہوا نوٹس بورڈ کے پاس پہنچا، تو میری نگاہ اپنے نام پر پڑی ہی تھی، کہ میں سرور و بے خودی کی انتہائی بلندیوں میں پرواز کرنے لگا۔ ہوش میں آیا، تو پیچھے دھکیلا جا چکا تھا۔ اس لڑکے کی چٹ غائب تھی اور لڑکا بھی غائب تھا، میں خوشی میں پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔ میری زندگی میں وہ خوشی اور مسرت کی معراج کی ساعت تھی۔ کالج میں خلاف توقع داخلہ ملنے کی کامیابی کے سرور میں، تصوراتی بلند پروازی سے، زمین پر قدم رکھتے ہوئے، بھاگ کر نیو ہوسٹل ہانپتا ہوا پہنچا۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ، پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، دفتر میں موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر انھوں نے، مجھے پانی کا گلاس پیش کرنے کے لئے کہا۔ میں نے کمرہ کا مطالبہ کیا، کمرہ نمبر ۵ تیسری منزل میں الاٹ کیا گیا، اسلم نامی ملازم نے کمرہ تک پہنچایا۔ اس کے بعد، ہوٹل سے سامان لا کر دو نفل شکرانہ ادا کیے اور فاتحانہ انداز میں بستر پر دراز ہو گیا۔ بظاہر اس معمولی واقعہ نے، میرے اندر خود اعتمادی اور مسلسل جدوجہد کی نئی روح اور نئے عزم کو جنم دیا۔ اس واقعہ کا سبب، میرا ایف۔اے کے رزلٹ کا التوا میں رکھا جانا اور لاہور آنے کے علاوہ سردار اقبال صاحب کی ترغیب سے، عملی تعلق ضرور ہے، مگر اس کا تعلق جو میرے طے شدہ مقدر سے تھا، اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ راولپنڈی جیسے چھوٹے شہر کے محدود ماحول کے مقابلہ میں، میری جونشو و نما لاہور جیسے علم و ادب اور سیاست کے گہوارہ میں ہوئی، وہاں ناممکن تھی۔ میرے ساتھ ہوسٹل اور کالج میں، ذہین ترین، گولڈ میڈلسٹ اور وزیروں، سفیروں، سیاستدانوں اور پروفیسروں کے بیٹے، کراچی سے پشاور تک رہنے والے، میرے ہم عصر تھے، جن سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ لندن کی طرح ایشیا میں لاہور کے پتھروں سے بھی تہذیب و تمدن، علم و ادب کی روشنی حاصل ہوتی تھی۔

میں نیو ہوسٹل میں بالکل تنہا تھا۔ گورڈن کالج کے مارٹن ہال میں دوستوں کا ہنگامہ تھا، مگر نیو ہوسٹل میں طلباء کے جنگل میں تنہائی، ویرانی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ لڑکوں کی ٹولیاں ڈائننگ ہال میں خوش گپیوں اور قہقہوں میں بہت خوش تھیں، مجھے صرف غیب سے آوازیں سنائی دے رہیں تھیں۔ اس کے باوجود میں کالج میں داخلہ کی وجہ سے طمانیت، خود اعتمادی اور اپنے مستقبل کے خیالات اور امیدوں کی انجمن میں انوکھے انداز میں، لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گورڈن کالج میں سائیکل کا ہونا سوشل سٹیٹس کا سمبل تھا۔ یہاں اس کے برعکس طلباء اپنا سامان بیوک، شیورلٹ، کیڈلک وغیرہ جیسی بڑی بڑی امریکن کاروں میں لا رہے تھے۔ ہوسٹل کے میس کا ماحول بھی مختلف تھا۔ وہاں میس میں ملازم باغ اور راولاکوٹ کے تھے، جو کھانا تول اور تنگی کر کے دیتے تھے۔ آدھی بھوک چھوڑ کر میس سے نکلتے۔ لاہور میں ملازم گجرات کے تھے، کھانا حسب ضرورت ملتا۔ پاکستان بھر کے طلباء تھے۔ مشرقی پاکستان، کراچی کے علاوہ پنجاب کے جاگیردار، نواب، وزراء اور سفیروں کے بیٹے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھے۔ پاکستان کے حکمران اور

شاہانہ طبقہ کا روپ پہلی دفعہ میرے سامنے آیا تھا۔

کالج کی کلاسیں شروع ہوتے ہی، شب وروز کے ماحول میں نئی تبدیلی، میرے لئے بالکل نئی دنیا کی طرح تھی، جیسے ایک جزیرہ کا باسی وسیع وعریض ملک کی دلفریب وادیوں میں داخل ہو کر، زمین کی وسعت سے ششدر رہ گیا ہو۔ میں نے معاشیات کے علاوہ پولیٹیکل سائینس کا مضمون اور ساتھ ہی معاشیات میں آنرز کا چناؤ کیا تھا۔ یہ میرا اپنا چناؤ اور فیصلہ تھا۔ اب میرے مستقبل کا نقشہ، بلکہ خاکہ میرے سامنے تھا۔ کالج میں پہلے روز پہلا پیریڈ پولیٹیکل سائینس کا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید، نئے سوٹ میں ملبوس، عینک لگائے بروقت کلاس روم میں داخل ہوئے۔ آتے ہی فرمایا، کہ تمام طلباء اپنا اپنا تعارف کروائیں۔ میں پہلی لائن میں تیسرے نمبر پہ بیٹھا تھا، میں نے تعارف کروایا، تو پروفیسر صاحب نے میرے متعلق از خود مزید کہا، کہ جموں کشمیر میں، پرنس آف ویلز کالج جموں، بہت معیار کا کالج ہے، اگر جموں کشمیر تقسیم نہ ہوا ہوتا، تو شاید آپ کے اس ساتھی کی منزل، اپنا کالج ہوتی۔ انھوں نے پانچ منٹ میں ریاست کی جو تعریف کی، اس سے جو فخر ہوا، اس سے میری اجنبیت ختم ہوگئی۔ آخر میں انھوں نے کہا، کہ ایک دن آپ کا یہ کلاس فیلو، جموں کشمیر حکومت کا صدر بنے گا۔ اس پر تمام کلاس مجھ پر متوجہ ہوگئی۔ پیریڈ ختم ہوا تو طلباء مجھ سے اس طرح مل رہے تھے، جیسے پرانے شناسا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کی پیش گوئی، اس حد تک ضرور درست ثابت ہوئی، کہ بجائے صدر حکومت کے، میں چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ پر گیارہ سال فائز رہا۔ کالج میں طلباء کی اکثریت لاہور شہر کے علاوہ، جنوبی پنجاب اور گوجرانوالہ، سیالکوٹ، سرگودھا اور ملتان سے تھی، چند طلباء ڈھاکہ اور جنوبی افریقہ سے بھی تھے، جموں کشمیر سے ان دنوں میں اکیلا ہی تھا۔

خالد حسن سے تعارف

چند دنوں کے بعد ہوسٹل کے ملازم نے بتایا، کہ خالد حسن نام کا طالب علم مجھ سے، ملنا چاہتا ہے، میں نے اجازت دے دی۔ پانچ منٹ بعد وہ تشریف لائے۔ گذشتہ سال وہ مرے کالج سیالکوٹ کی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ، میچ کھیلنے گورڈن کالج، بطور کپتان آیا تھا، میں نے شکل سے پہچان لیا۔ اس نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا، کہ اس کا تعلق جموں شہر سے ہے، اب سیالکوٹ میں سکونت اختیار کر رکھی ہے اور ایم۔ اے سال اول میں داخل ہوا ہے۔ میرے متعلق وہ پہلے ہی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ ہوسٹل میں یہ پہلی ملاقات تھی۔ طبعی طور پر میں بہت سوشل اور انجمن کا شیدائی تھا، مگر لوگوں کے پیچھے بھاگنے سے سخت ضد تھی۔ خالد حسن، ڈاکٹر نور حسین، مہاراجہ ہری سنگھ کے خصوصی معالج کا بیٹا اور کے ایچ خورشید کا چچا زاد اور برادر نسبتی تھا۔ بہت ہی ذہین، ملنسار اور ہنس مکھ تھا، بعد میں وزیر اعظم بھٹو کا مشیر مقرر ہوا۔ بھٹو حکومت کے ختم ہونے کے بعد وہ امریکہ چلا گیا، وہاں وہ صحافت سے منسلک ہو گیا تھا۔ تین ماہ کے بعد وہ مائیگریشن کروا کر مرے کالج واپس چلا گیا، تین ماہ ہم دونوں اکٹھے رہے، ان تین ماہ میں

میرے روابط بہت وسیع ہو گئے تھے۔ انگلینڈ میں ابا جان بہت خوش تھے۔ پروفیسر محمود ہاشمی ''کشمیر اداس ہے'' کے مصنف، ڈڈیال پونچھ کے رہنے والے تھے۔ وہ ایس پی کالج سرینگر میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ کچھ عرصہ میر پور کالج میں تعینات رہ کر، انگلینڈ چلے گئے تھے اور برمنگھم میں مقیم تھے، وہاں انھوں نے اردو قاعدہ متعارف کروایا اور اردو میں ہفت روزہ اخبار مشرق نکالا۔ ابا جان سے ان کی دوستی تھی۔ گورنمنٹ کالج میں میرے داخل ہونے پر ہاشمی صاحب بہت خوش تھے۔ وہ اس کالج کے علمی و ادبی اور تعلیمی معیار اور مقام سے واقف تھے۔ انھوں نے ابا جان سے میرے متعلق بہت تعریف کی۔ وہ میرے ساتھ خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ ہاشمی صاحب نے وہاں میری خوب تعریف کی۔ اس کا مجھے فائدہ یہ ہوا، کہ وہاں سے انگلش سوٹ، شوز، قمیض اور نیک ٹائیاں ابا جان نے ارسال کرنی شروع کر دیں۔ کالج اور ہوسٹل میں میرا اسٹیٹس اور مکمل امتیازی ہو گیا۔ احباب کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ کتابوں کے مطالعہ کا شروع سے شوق تھا۔ ادبی رسالے اور اخبار بھی میرے زیر مطالعہ تھے۔ پاک ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس، چائنیز لنچ ہوم، سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ، شیزان ریسٹورنٹ ہماری نشست گاہیں تھیں۔ اتوار کو دن کے وقت دہلی مسلم ہوٹل اور شام کو سردار اقبال صاحب کو سلام کرنے جاتا۔

نیا اعزاز

کالج میں تین ماہ کے بعد ٹیسٹ منعقد ہوا۔ پولیٹکل سائنس کے مضمون میں میری پوزیشن اول آئی۔ کلاس روم میں نتیجہ کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کاپیوں کا بنڈل اٹھوائے کلاس روم میں داخل ہوئے۔ میرا نام پکارا، میں کھڑا ہوا، تو انھوں نے میری اول پوزیشن آنے کا اعلان کیا اور میرا پرچہ لہراتے ہوئے طلباء سے کہا، کہ مجید کا پرچہ سب ملاحظہ کرو اور اپنے اپنے جوابات کے پرچوں سے، موازنہ اور تقابل کر کے دیکھو۔ ہماری کلاس میں سب طلباء فسٹ ڈویژن پاس کر کے آئے تھے، تین لڑکے گولڈ میڈلسٹ تھے، جن کا خاندانی تعلیمی پس منظر تھا، میں نے محنت ضرور کی تھی، مگر اول پوزیشن حاصل کرنا، میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ پروفیسر صاحب نے چند جملے جب میری تعریف میں کہے، تو میرا سر مسرت میں بلند ہو گیا اور خود اعتماری میں میرے گال سرخ ہو گئے۔ عین اس مرحلہ پر، میری طرف دیکھتے ہوئے، انھوں نے طلباء سے کہا کہ ''سی ہز فیس اینڈ گیٹ انسپریشن فرام ہم''۔ اس کے بعد پیریڈ ختم ہوتے ہی، میرا جوابی پرچہ اڑا لیا گیا اور کئی دنوں بعد سب کے معائنہ اور ملاحظہ کے بعد واپس ملا۔ طالبات کو خصوصی حسد ہوا، کیوں کہ ان کو اپنی قابلیت پر ناز تھا۔ اب میں کالج میں اور ہوسٹل میں جانا پہچانا جاتا تھا۔

انگلینڈ کے مہمانوں کی پریشانی

ابا جان کے پڑوس سے چوہدری محمد علی اور چوہدری بہادر برمنگھم سے اپنے گاؤں موہڑہ کنیال آئے، تو ان کو میرے لئے قمیض اور دو تین کتابیں دیں۔ وہ کالج آئے اور میرے نام سائیں، جو گاؤں میں بچپن سے معروف

تھا، اس نام سے دریافت کرنا شروع کیا، وہ نام کالج میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ پریشان حالت میں ایک بینچ پر بیٹھ کر شکل پہچاننے میں مصروف ہو گئے، مگر کالج میں سب طلباء نے سرخ بلیزر پہن رکھے تھے، اس لئے ان کو شکل سے پہچاننا بھی مشکل تھا۔ اسی دوران میں ہوسٹل سے کالج آیا اور میں نے بنچ پر بیٹھے گورے چٹے ولایتی چہرے دیکھے، تو شک کی بنا پر ان کے پاس گیا اور پوچھا، کہ کس سے ملنا ہے تو انھوں نے میرا نام لیا۔ جب میں نے تعارف کروایا، تو ان کے چہرے چمک اٹھے اور فوراً بغلگیر ہو گئے۔ ان کو کالج کنٹین سے چائے وغیرہ پلائی اور گھنٹہ بھر گپ شپ رہی۔ اباجان نے ان کو تاکید کی تھی، کہ میرے بیٹے کو مل کر آنا ہے۔ اب ان کو واپس جانا تھا، اس لئے ملاقات کرنا ضروری تھا۔ اباجان نے جو اُن کو میری شکل وصورت اور لباس بتایا تھا، اس سے مجھے پہچاننا، ان کے لئے مشکل تھا، کیوں کہ کالج میں زیادہ تر لڑکے بلیزر پہنے ہوئے تھے اور میں نے بھی بلیزر پہن رکھا تھا۔ واپس جا کر اباجان کے سامنے، انھوں نے میری بہت تعریف کی، جس سے ان کو مزید خوشی ہوئی اور محمود ہاشمی صاحب نے، جو گورنمنٹ کالج کا نمونہ اور نقشہ پیش کیا ہوا تھا، اس کی تائید ہوئی۔

ٹیوٹوریل گروپ وقصہ محبت کے پھول

کالج کے دیگر ادبی شعبوں میں ٹیوٹوریل گروپ بھی شامل تھا۔ انگلش کے پروفیسر اشفاق علی خان اس کے چیئرمین تھے۔ وائس چیئرمین کا انتخاب طلباء میں سے ہوتا تھا۔ پروفیسر صاحب کا رجحان، احسن زئی کی طرف تھا، مگر طلباء نے میرا نام پیش کر دیا۔ احسن زئی نے طلباء کی مجھ میں دلچسپی دیکھتے ہوئے، اپنا نام واپس لے لیا اور میں بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔ انتخابی مہم میں حمایتیوں کا گروہ وجود میں آ گیا۔ اس طرح کالج میں شناسائی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ محمد بشیر بھٹی کالج میگزین راوی کے ایڈیٹر تھے، وہ گولڈ میڈلسٹ تھے، ڈھاکہ کے اکبر علی بھی گولڈ میڈلسٹ تھے۔ ہم تینوں کے ہوسٹل میں کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ یہ دونوں مل کر سحری کے وقت مطالعہ کرتے۔ انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ سحری کے وقت ۴ بجے چائے کا پیالہ پی کر صبح نماز کے وقت تک مطالعہ کرتے، یہ ہمارا معمول تھا۔ مجھے شام کو سینما جانے اور ریسٹورنٹ جانے کا بھی شوق تھا اور اس دوران پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس بھی جانا ہوتا۔ شیخ آفتاب ملتان کے بڑے صنعت کار تھے، وہ میرے دوست بن گئے۔ ہم چند اور احباب کے ساتھ شام کے معمولات میں شریک ہوتے۔ میں ادبی دنیا، نقوش، نئی سحر، چٹان وغیرہ کا مستقل مطالعہ کرتا۔ اسی طرح انگریزی میگزین ٹائمز، لائف، ریڈرز ڈائجسٹ، نیوز ویک کا مستقل مطالعہ کرتا۔ بشیر بھٹی، ہفت روزہ کالج میگزین کے بھی مدیر تھے۔ کالج میگزین انگلش میں شائع ہوتا تھا۔ بشیر بھٹی کے اصرار پر میں نے ایک تصوراتی، مختصر افسانوی طرز کی کہانی لکھی۔ عنوان تھا 'دی مسٹریس فلاور' بشیر کو میرے آبائی علاقہ کا علم تھا۔ اس نے اس میں اضافہ کر دیا۔ "دی مسٹریس فلاور آف ڈڈیال" بس پھر کیا تھا کہانی شائع ہونے پر کالج میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کہانی کا متن تھا کہ

کشمیر میں ایک وادی عشق کی وادی کے نام سے مشہور ہے، جس میں بہار اور اکتوبر میں چاندنی چودھویں رات، جب چاندنی جوبن پر آتی ہے، عین اس وقت، ایک پودے سے پھول کھل اٹھتا تھا۔ جس کی سرخ و سنہری پتیوں سے چاند کی شعاعوں کے اثر میں، سرخ و سفید چمک اور لشکار آشکار ہوتی ہے۔ اہلِ عشق پہلی نگاہ پڑتے ہی جس معشوق کا تصور کرتے ہیں، ان کے محبوب سے ملاقات اور جزوی عشق کا، وہ پھول ضمانت ہے۔ ان لمحات کی تلاش میں، عشاق وادی میں اُس مسٹریس پھول کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ چونکہ پھول کے پودے خال خال ہوتے ہیں، اس لئے صرف چند لوگ ہی اس کی تلاش میں، کامیاب لوٹ کر، عشق و محبت کی کٹھن جدوجہد میں محبوب کے وصل اور جلوہ کو، دائمی طور حاصل کرنے میں سرخرو ہوتے ہیں۔ کالج کی عمر رومان پروری اور عشق کے جنون سے لبریز ہوتی ہے، لہٰذا جس طرح فلم دیکھنے کے لمحات میں، فلم بین اپنے آپ کو، ہیرو کے روپ میں تصور کرتا ہے، اسی طرح نفسیاتی طور پر کالج کے طلباء اور طالبات۔ چند ساعتوں کے لئے تخیلاتی طور پر پھول کے متلاشی بن گئے۔

لاہور میں انجمن طلباء

راولپنڈی کی طرح لاہور میں بھی جموں کشمیر کے نام پر، جموں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم تھی، جس کے صدر محمد اعظم بٹ تھے۔ کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی، برائے نام تنظیم تھی، جس کا صرف ایک رکن تھا، جو صدر کے عہدہ کے نام پر چند سالوں سے وظائف کی رقوم ہڑپ کر رہا تھا۔ قریب چار ماہ لاہور میں قیام کے بعد، اسلامیہ کالج، ایف سی اور میڈیکل کالج، ایم۔ اے۔ او کالج، ہیلے کالج آف کامرس، انجینئرنگ اور پنجاب یونیورسٹی میں جموں کشمیر کے طلباء سے رابطہ کر کے، باقاعدہ تنظیم سازی کی مہم کا آغاز کیا۔ جوں ہی اعظم بٹ کو اس بات کا علم ہوا، اس نے میرے ساتھ رابطہ کر کے، اشتراکِ عمل کی پیش کش کی۔ میں نے اسے کہا، کہ یہ ایسی ہی پیش کش ہے جیسا کہ، ہندوستان پاکستان کو جموں کشمیر کو تقسیم کرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ وہ امرتسر سے نقل مکانی کر کے لاہور آباد ہوا تھا۔ اس کا جموں کشمیر سے وہی تعلق تھا، جو باقی پاکستان کے عوام کا تھا، لہٰذا سمجھوتا کرنا ناممکن تھا۔ اس وقت مسلم لیگ پنجاب کا ہیڈ آفس، میکلوڈ روڈ پر لکشمی بلڈنگ میں تھا۔ احمد سعید کرمانی، مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل تھے اور جموں کے شیخ منظر مسعود، جو بعد میں آزاد جموں کشمیر اسمبلی کے سپیکر اور سردار عبدالقیوم کے خلاف عدم اعتماد ہونے پر، حکومت کے قائمقام صدر بنے، وہ مسلم لیگ کے دفتر میں بطور کلرک تعینات تھے۔ میں نے کرمانی صاحب سے لکشمی بلڈنگ میں طلباء کے انتخابی اور دستور ساز اجلاس منعقد کرنے کی اجازت لی۔ میں اعظم بٹ کی سازش اور تخریب کاری پر پہلے سے ہی چوکس تھا۔ میں نے ہاکیوں اور ڈنڈوں کا انتظام کر لیا ہوا تھا۔ ہم ساٹھ کے قریب طلباء جمع ہوئے۔ تنظیم کا دستور اتفاق رائے سے منظور کیا گیا اور انتخاب میں مجھے بلا مقابلہ صدر منتخب کیا گیا۔ باقی عہدیداران کے چناؤ اور جنرل کونسل کی نامزدگی کے بعد، میں تقریر کر رہا تھا، کہ اعظم بٹ کے کرایہ کے لوگوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم نے ان

کی خوب پٹائی کی، مسلم لیگ آفس کا عملہ اور شیخ منظر مسعود وہاں موجود تھے۔ انھوں نے ہمارے طلباء کا ایکشن دیکھا اور خوب داد دی۔ ہم نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ لاہور کے پریس سے میں نے پہلے سے رابطہ کر رکھا تھا، پریس نے ہمیں صحیح کوریج دی۔ اس طرح لاہور میں پہلی دفعہ جائز جموں کشمیر طلبا تنظیم قائم ہوئی۔ اعظم بٹ کا مجھ سے قبل ازیں بھی راولپنڈی میں ٹکراؤ ہو چکا تھا، جب وہاں انتخابات میں اختلاف پر تصفیہ کے لئے، سردار ابراہیم خان صاحب کے طلب کرنے پر، وہ بطور ثالث آیا تھا اور اس نے خطرناک نتائج کی، دھمکی بھی دی تھی۔ اب لاہور میں براہ راست مقابلہ تھا۔ لاہور میں پونچھ کے برعکس جموں شہر اور اردگرد کے علاقوں سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ، گوجرانوالہ، وزیرآباد اور دوسرے ملحقہ علاقوں میں سکونت اختیار کرنے والے زیادہ تھے۔ وہ اعظم بٹ کی غاصبانہ اجارہ داری سے، آگاہ تو تھے، مگر اتحاد و اتفاق میں کمزوری اور پیش قدمی کرنے والی قیادت سے محرومی کی وجہ سے، بے بس تھے۔ ہم نے غاصبانہ اجارہ داری ہمیشہ کے لئے ختم کر دی۔

سوشلزم کی دھن

دولت کی غیر مساوی تقسیم، سوسائٹی کی طبقات میں تقسیم، آجر اور مزدور میں پیداوار کی غیر منصفانہ تفاوت، نادار اور غریب طبقہ کی تعلیم، حفظان صحت اور روزگار کے حقوق سے محرومی، نظام حکومت، عدل و انصاف اور قومی جمہوری اداروں میں غربا اور وسائل سے محروم طبقہ کی نمائندگی سے قطعی محرومی اور انگریزی استعماریت کے انعام یافتہ اور پروردہ طبقہ کی زرعی جاگیروں، صنعتوں اور پیداوار کے اداروں اور وسائل پر جوں کی توں اجارہ داری اور تسلط، تحریک آزادی اور آزاد مملکت کے قیام کے نظریہ اور نصب العین کی، عملاً نفی تھی۔ ایسے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے، اسلامی اقدار کی بھی مکمل نفی ہو رہی تھی، جبکہ اسلام کی دعویدار سیاسی تنظیمیں اور قوتیں بھی منتشر اور مسلکی اختلافات کا شکار تھیں۔ اس پس منظر میں روس اور چین کے کمیونسٹ انقلاب کے اثرات، جنوبی ایشیاء میں بھی ظاہر اور مرتب ہو رہے تھے۔ راولپنڈی میں دادا امیر حیدر اور لاہور میں شیخ رشید اور محمد اسلم وغیرہ نوجوانوں کو کمیونزم کی ترغیب دینے میں بہت متحرک تھے۔ گو کہ میری پرورش اور تربیت شروع سے اسلامی اقدار اور نظریات کے تحت ہوئی تھی اور صوم و صلوٰۃ پر پابندی سے قائم تھا، تاہم جدیدیت کا نظریہ بھی اثر انداز ہو گیا۔ سوشلسٹ گروپ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع ہو گیا اور بطور تحقیق و تجزیہ میں بھی متحرک ہو گیا اور طلباء میں بحث مباحثہ اور تبلیغ شروع کر دی۔ میرے دل و دماغ میں سوشلزم کا ایک مخصوص خاکہ قائم ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں طلباء کی سوشلسٹ قیادت کو سوشلزم کے نامور سیاستدان، سوشلسٹ لیڈر میاں افتخار الدین نے، اپنی رہائش گاہ پر مغلپورہ میں دعوت دی، جس میں، میں بھی مدعو تھا۔ ایک درجن طلباء کا گروپ تانگوں میں وہاں پہنچا۔ ایک بہت بڑی کوٹھی کا بہت بڑا لوہے کا گیٹ، آدھا کھلا ہوا۔ ہم بڑے لان کے ساتھ کے راستہ سے، بڑے ڈرائنگ روم میں لے جائے گئے۔ ریشمی صوفوں، ایرانی قالینوں اور کھڑکیوں، دروازوں پر، خوبصورت دل کش رنگوں کے پردوں کو آویزاں دیکھ کر، سوشلزم کی کسمپرسی پر رونا آیا۔ البتہ

میاں صاحب کھدر کے لباس میں جناح کیپ پہنے، بہت شفقت اور پیار سے ملے۔ اس ماحول کو دیکھ کر، میرا دل پاکستانی سوشلزم کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گیا۔ میں آہستہ سے باہر آ گیا اور تانگہ لے کر ہوسٹل واپس آ گیا۔

صوفی تبسم فوج کی قید میں

لاہور میں ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کے نام پر، زبردست احتجاجی تحریک چلی، جس کا مرکز مسجد وزیر خان تھا۔ تحریک میں عوام کے ساتھ طلباء بھی شامل تھے، چنانچہ مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ ایک فوجی چوکی ہمارے کالج کے باہر بھی قائم ہو گئی۔ جلسے جلوسوں پر مکمل پابندی لگ گئی اور لاہور میں کرفیو نافذ ہو گیا۔ تیسری رات کو، ہم درجن کے قریب طلباء ہوسٹل کی چھت سے، شہر میں خموشی اور سناٹے کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس دوران دو گاڑیوں میں سوار فوجی افسران، کچہری چوک میں گول باغ، جس کو ناصر باغ کہتے ہیں، کی طرف سے نمودار ہوئے۔ ہم نے چھت سے زور زور سے آوازے کسے، کہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں کو گرفتار کرو اور زور زور سے تالیاں بھی بجائیں۔ اس پر دونوں گاڑیاں ہوسٹل کے بڑے گیٹ پر آ گئیں، گیٹ بند تھا، اندر سے کرفیو کی وجہ سے تالا لگا ہوا تھا۔ انھوں نے پہلے زور زور سے گیٹ کھٹکھٹایا، جب گیٹ نہ کھولا گیا، تو انھوں نے گیٹ توڑنا شروع کر دیا۔ ہم بھاگ کر کمروں کی لائیٹ بند کر کے، اندر سے کنڈی لگا کر، بستروں میں گھس گئے۔ نچلی منزل میں طلباء مطالعہ میں مصروف تھے۔ فوجی گیٹ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور درجن کے قریب طلباء کو زبردستی گھسیٹ کر فوجی چوکی پر لے جا کر، گرفتار کر لیا۔ جب وہ طلباء گرفتار کر لیے گئے، تو ہم نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب وارڈن کو اس کی اطلاع دی۔ وہ تین چار سینئر طلباء کو ساتھ لے جا کر، چوکی پر گئے، تو دیکھا کہ طلباء پر تشدد ہو رہا تھا، صوفی صاحب نے تشدد کرنے سے منع کیا، تو فوجیوں نے ان کو بھی حراست میں لے لیا۔ جب کافی وقت گذرنے کے باوصف، صوفی صاحب اور طلباء واپس نہ آئے، تو ہم نے کالج کے پرنسپل صاحب، جو کالج کے احاطہ میں ہی رہائش پذیر تھے، ان کو فون پر اس واقعہ کی اطلاع کی۔ پرنسپل صاحب نے متعلقہ افسران سے رابطہ کیا، مگر ان کی بات نہ مانی گئی اور صوفی صاحب اور طلبا کو رات چوکی پر حراست میں ہی گذارنی پڑی۔ صوفی تبسم صاحب، پروفیسر کے علاوہ برصغیر کے معروف شاعر بھی تھے، ان کا فارسی، اردو اور پنجابی کلام بہت معروف تھا۔ ایس اے بخاری اور ذوالفقار بخاری (زیڈ اے بخاری) کے وہ بہت قریب تھے۔ ذوالفقار بخاری مشاعروں میں صوفی صاحب کے پاس ہوسٹل میں ہی ٹھہرتے تھے۔ صوفی صاحب کا تعلق، امرتسر کے کشمیری خاندان سے تھا، وہ لاہور کی شان اور جان تھے۔ دوسرے روز ان کی حراست کا لاہور میں شور پڑ گیا۔ پرنسپل صاحب نے حکومت سے رابطہ کیا، تو صوفی صاحب کو دوسرے دن اور طلباء کو تیسرے دن رہا کیا گیا۔ اس واقعہ کی لاہور میں بہت مذمت ہوئی، مگر فوج والے جو لاہور میں مارشل لاء کی دھاک اور رعب قائم کر رہے تھے، ان پر کوئی اثر نہ ہوا، البتہ جب تک کرفیو رہا طلباء نے دوبارہ ایسی حرکت نہ کی۔

نوکر شاہی کا مزاج

گورنمنٹ کالج میں بی-اے فائنل میں تھا۔ میں نے ابا جان سے مشاورت کے بعد، لنکنز ان، لنڈن میں بارایٹ لاء کے لئے، داخلہ کی درخواست ارسال کی۔ داخلہ منظوری کی اطلاع ملنے پر، لاہور پاسپورٹ آفس میں درخواست دی۔ پاسپورٹ آفس، لاہور سول سیکریٹریٹ المعروف دفتر لاٹ (لارڈ) صاحب، میں واقع تھا جو کہ ہمارے ہوسٹل سے فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ حصول پاسپورٹ کیلئے گیا، تو مرکزی گیٹ پر لوگ داخلہ کے منتظر تھے، مگر چوکیدار جو پٹھان تھا، وہ بضد تھا کہ متعلقہ آفس سے اجازت کے بغیر، سائلان متعلقہ آفس میں نہ جاسکتے تھے۔ اس رویہ میں رکاوٹ یہ تھی، کہ جب تک متعلقہ آفس تک رسائی نہ ہو، تو اجازت کیسے حاصل کی جاتی۔ یہی بحث چوکیدار اور سائلان میں، ہو رہی تھی، چوکیدار غالباً ہدایت کے تحت بضد تھا، مگر جو لوگ کار یا ٹیکسی میں آتے، ان کو قطعاً نہ روکا جاتا۔ چند منٹ گیٹ پر رکنے کے بعد میں نے واپس لوٹ کر ٹیکسی لی، حالانکہ ڈرائیور نے کہا بھی، کہ اتنے کم فاصلے کے لئے ٹیکسی کی ضرورت نہ تھی، مگر میں نے اصرار کیا۔ چوکیدار نے فوراً گیٹ کھول دیا اور سلام بھی کیا۔ یہ قوم کی نفسیات اور طبقاتی احترام اور عدم احترام کا عملی تجربہ تھا۔ مستقبل میں یہ نفسیاتی تجربہ بہت مفید ثابت ہوتا رہا۔ عام طور پر دیکھا کہ انسان اور انسانیت پر لباس اور ظاہری نمود کو فوقیت اور عزت ملتی ہے۔

پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار

لندن لنکنز انز نے، بارایٹ لا میں حصول تعلیم کے لئے، ایک ماہ کے اندر داخلہ دے دیا، جس پر حصول پاسپورٹ بغرض تعلیم کے لئے، لاہور آفس میں درخواست ۱۹۵۴ء میں پیش کی، دو سال تک دفتر کا چکر لگاتا رہا، مگر یہی بتایا جاتا رہا، کہ جموں کشمیر کے شہری ہونے کی وجہ سے مختلف ایجنسیوں کی رپورٹ حاصل کرنی ہے۔ میں طالب علم تھا، تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے اخراجات پر، بدوں مطالبہ زرمبادلہ جارہا تھا، اس میں حکومت اور ملک پاکستان پر کوئی بوجھ اور ذمہ داری نہ تھی، مگر اس کے باوصف، دو سال ضائع کرنے کے بعد، پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا گیا اور ہدایت ہوئی کہ مرکزی ہیڈ آفس کراچی میں درخواست دوں۔ استدعا کی کہ یہی درخواست فارورڈ کر دیں یا واپس کر دیں، کیوں کہ درخواست کے ساتھ مطلوبہ دستاویزات شامل تھیں، مگر انکار کر دیا گیا اور ہدایت ہوئی کہ مرکزی ہیڈ آفس کراچی میں نئی درخواست دوں۔ دوسری درخواست کراچی ہیڈ آفس میں دی۔ اس دوران بی اے آنرز پاس کر کے، احتیاط کے طور پر یونیورسٹی لاء کالج میں داخل ہو گیا۔ ہر دو ماہ بعد حصول پاسپورٹ کے لئے کراچی جاتا، مگر جواب ملتا کہ راولپنڈی، وزارت امور کشمیر سے، مطلوبہ رپورٹ موصول نہیں ہوئی۔ یاددہانی کا خط لکھواتا مگر جواب نہ ملتا۔ دو سال مزید گذر گئے اور میں نے ایل ایل بی بھی کر لی۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں کراچی گیا۔ ایک دوست کی ہدایت کے مطابق، چیف پاسپورٹ آفیسر کے پاس پیش ہو کر سارے واقعات بیان کیے، انھوں نے

بہت شفقت سے، دردبھری داستان سنی، چائے پیش کی اور میری فائل طلب کر کے، آفس سپرنٹنڈنٹ، مسٹر زین کو کہا، کہ میرا پاسپورٹ تیار کیا جائے۔ اس روز ہفتہ تھا، مجھے سوموار کو آنے کا کہا اور یقین دلایا کہ پاسپورٹ ضرور جاری کر دیا جائے گا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے اجازت لی۔ میں جناح کورٹس ہوسٹل میں اپنے دوست، عجائب حسین چوہان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا، اس کا تعلق سیالکوٹ سے تھا اور وہ کراچی ایس ایم لاء کالج کا طالب علم تھا۔ کراچی میں ان دنوں میرے سکول کے کلاس فیلو، خادم حسین بخاری، لائف انشورنس کمپنی میں ملازم تھے، ان کی رہائش سٹیٹ ہوٹل زیب النساء سٹریٹ، جو پہلے ایلفنسٹن سٹریٹ کہلاتی تھی، اس میں تھی۔ بخاری صاحب نے مجھے ناشتہ پر مدعو کیا ہوا تھا، جہاں سے واپس پیدل ہی آ رہا تھا، کہ راستہ میں دوکان پر بیٹھے ایک آدمی نے، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، کہ بھئی آپ میرے پاس بیٹھیں، میں آپ کو بہت اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ ان دنوں کالج میں، دست شناسی پر میں نے کیرو اور ایک دو اور دست شناسوں کی کتابیں پڑھ کر، اس مشغلہ میں شوق آزمائی شروع کر رکھی تھی۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی، مگر اس نے کہا کہ وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہے اور نہ ہی مجھ سے اجرت طلب کرے گا۔ میں اس میں سنجیدگی پا کر، اسے اپنے ساتھ جناح کورٹس ہوسٹل لے گیا۔

اجنبی سے دلچسپ مکالمہ

ہم دونوں جناح کورٹس ہوسٹل پہنچے، تو عجائب چوہان کے ساتھ دو سندھی طلباء صبح کا فلم شو دیکھنے جانے کے لئے، میرے منتظر تھے۔ میں نے اپنے اجنبی ساتھی کے متعلق صرف اتنا بتایا، کہ یہ مستقبل کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔ الہ دین نامی لڑکے نے، یہ سنتے ہی نجومیوں اور دست شناسوں کے خلاف، تقریر شروع کر دی۔ جب اس نے تنقید ختم کی، تو ابھی ہم اس پر ہنس ہی رہے تھے، کہ اجنبی شخص بولا، کہ بھائی مجھے جو کچھ تم سمجھ رہے ہو، میں وہ نہیں ہوں، البتہ تم کو تمہارے متعلق بتاتا ہوں، کہ تم نے اس عمر میں شادی کی ہوئی ہے اور تمہارے دو بچے بھی ہیں، جو تم نے اپنے دوستوں سے چھپا رکھا ہے۔ اس پر الہ دین کا چہرہ نیلا پیلا ہو گیا اور اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی۔ اجنبی نے مزید کہا کہ الہ دین کی بائیں ران پر کالا تل ہے، جس کے اثر میں، یہ ہر دوسرے آدمی کی بات پر شک کرنے کا عادی ہے، اس کی یہ بات بھی درست تھی۔ ہم نے اس کی ران دیکھی، واقعی اس پر کالا تل تھا۔ اب سب لڑکوں نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر، احوال زندگی کے متعلق سوالات پوچھنے شروع کر دیئے، مگر اس نے کہا کہ وہ نجومی یا دست شناس نہیں ہے اور میرے متعلق کہا، کہ صرف میرے متعلق وہ اہم باتیں بتا کر چلا جائے گا۔ میں نے آزمائش کے طور پر، اس سے سوال کیا، کہ وہ بتائے کہ میں کیا کام کرتا ہوں اور کراچی میں کیوں رہتا ہوں؟ اس نے مجھے کہا تمہارے پاس ڈائری ہے، وہ نکالو اور جو کچھ میں بتاؤں لکھتے جاؤ۔ ان دنوں میں روزانہ واقعات کو ڈائری میں لکھتا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ، اس کو ڈائری کا علم کیسے ہوا۔ اس نے بتایا کہ تم قانون کے طالب علم ہو اور تم قانون میں مزید تعلیم کے لئے، بیرون ملک جانا

چاہتے ہو۔ مگر زندگی میں ضرورت کے مطابق، تمہاری تعلیم مکمل ہو چکی ہے، مزید کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہا، کہ تم ابھی باہر جانا چاہتے ہو، مگر فی الحال تمہارا کوئی بیرون ملک سفر نہیں ہے۔ گو کہ کچھ عرصہ کے بعد ملکی اور قومی معاملات کے سلسلہ میں، متعدد بار دوسرے ممالک میں جانا ہوگا۔ جب اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا، کہ تم جس کام سے کراچی آئے ہو، وہ نہیں ہوگا، تو میں نے اس کو چیلنج کر دیا، کہ اس معاملہ میں اس کی رائے درست نہ تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، بے شک اس وقت میں اس کے ساتھ اتفاق نہ کروں، مگر بات نوٹ کر لو۔ اس نے ماضی کے بجائے، مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اور جن جن لوگوں سے واسطہ پڑے گا، ان کی تفصیل، ان کے میرے ساتھ سلوک، رویہ اور انتقامی اقدامات کی نشاندہی بھی کی، مگر تلقین کی کہ ایسی تمام آزمائشوں میں صبر تحمل اور جرأت کا مظاہرہ میری کامیابی کا ضامن ہوگا۔ یہ بھی بتایا، کہ دو خواتین کے رویہ کی وجہ سے صدمہ کی شدت میں، جان کو خطرہ لاحق ہوگا، مگر صبر و تحمل کی وہ بڑی سخت آزمائش ہوگی، جس میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ اُس نے کہا، کہ وکالت کا شعبہ تمہاری زندگی کی روشن مشعل ہے، مگر ایک لمحہ ایسا آئے گا، جب تمہاری طرف سے تمام تر انکار اور کوشش کے باوجود متحرک قوتیں، تمہیں زندگی میں نئے مقام اور بڑی آزمائشی شہرت کے میدان میں لا کھڑا کریں گی۔ حسد اور رقابت کا صبح و شام چیلنج ہوگا، جس میں صبر اور جرأت تمہیں سرخرو کریں گے۔

تفصیل بیان کرتے ہوئے، یہ تک بتا دیا، کہ میری موت کیسے ہوگی۔ جب اس کی گفتگو ختم ہوئی، تو میں نے سوال کیا کہ مجھے کار کب ملے گی؟ اس پر ایک بار وہ پھر مسکرایا اور کہا، کہ کار کا بہت شوق ہے؟ میں نے ہاں میں جواب دیا، تو اس نے کہا کہ نوٹ کر لو، کہ دسمبر ۱۹۵۸ء کے آخری ہفتہ کے آخر میں، مجھ کو کار مل جائے گی اور ساتھ ہی کہا کہ کار کے رجسٹریشن نمبر میں سات کا ہندسہ ضرور ہوگا۔ ساتھی طلباء نے بہت اصرار کیا، مگر اس نے کسی کو بھی کچھ نہ بتایا، نہ چائے پی نہ پیسہ لیا۔ سفید پاجامہ اور کرتہ میں ملبوس، پچاس سال کے لگ بھگ ظاہری عمر، نہایت سنجیدہ انسان، آہستہ سے سرگوشی میں، اپنا نام عنایت اللہ بتایا اور ہدایت کی، کہ اپنا ہاتھ کبھی بھی کسی کو مت دکھانا، اور کہا کہ اس کے بعد تم مجھے تلاش کرو گے، مگر آج کے بعد میں تم کو نہیں ملوں گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کراچی میں انسانوں کے جنگل میں گم ہو گیا۔ ہم سب اس کی نہایت سنجیدہ گفتگو سے، جو اس نے بدوں میرا ہاتھ دیکھے اور احوال پوچھے فی البدیہہ کی تھی، بہت متاثر ہوئے، خاص کر الٰہ دین کی شادی، بچوں اور بن دیکھے ران پر کالے تل کے متعلق، اس کے اظہار نے سب کو مبہوت کر دیا۔ وہ کون تھا؟ نجومی، دست شناس، ماہر نفسیات، مجذوب یا کوئی اللہ والا، علم لدنی کی دولت سے مالا مال۔ یہ اور بہت سے دیگر سوالات کی یلغار میں، ہم انگشت بدنداں ہی رہے۔

سوموار صبح دس بجے میں چیف پاسپورٹ آفس میں، حسب ہدایت پاسپورٹ حاصل کرنے گیا، دیکھا کہ آفس مقفل تھا۔ ساتھ ہی پاسپورٹ آفیسر کے آفس گیا، مسٹر بریگیزا، پارسی پاسپورٹ آفیسر سے مل کر اپنا مدعا بیان

گیا۔ اس نے بتایا کہ محمد احمد چیف پاسپورٹ آفیسر بمبئی کے مہاجر تھے، وہ تین ماہ کی رخصت پر بمبئی گئے ہیں۔ تاہم اس نے میری تقریر بہت غور سے سنی، جس میں غصہ اور تنقید تھی۔ مجھے بٹھایا، چائے پیش کی اور آفس سپرنٹنڈنٹ مسٹر زین کو بلایا اور میری فائل لانے کا کہا۔ زین فائل اور پاسپورٹ لایا اور کہا کہ چیف صاحب کے حکم کے مطابق پاسپورٹ تو تیار تھا، مگر اسی صبح ڈاک میں وزارت امور کشمیر راولپنڈی سے رپورٹ وصول ہوئی، جس میں کہا گیا تھا، کہ میرا نام بلیک لسٹ میں شامل ہے، لہٰذا پاسپورٹ جاری نہ کیا جائے۔ زین نے وضاحت کی کہ وزارت کی رپورٹ کی روشنی میں، صرف چیف آفیسر ہی پاسپورٹ جاری کر سکتے تھے۔ اس پر مسٹر بریگینزا نے معذرت کرتے ہوئے کہا، کہ مجھے تین ماہ چیف کے واپس آنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ بہت افسردہ اور مایوس جناح کورٹس پہنچا۔ وزارت کشمیر کے خلاف غیبت کی اور واپسی کا پروگرام بنایا۔ عنایت اللہ کی پہلی بات دوسرے ہی دن درست ثابت ہوئی۔ واپسی پر لاہور رکا اور سردار محمد اقبال صاحب سے ملا۔ انھوں نے ملتے ہی مجھ پر چڑھائی کر دی، کہ ایل ایل بی کا رزلٹ تین ماہ قبل آ چکا تھا اور میں نے کام شروع نہ کیا تھا۔ وہ بار ایٹ لاکرنے کے حق میں نہ تھے، ان کی ہدایت پر ہی میں نے، لا کالج میں داخلہ لیا تھا۔ تاہم ابا جان کی انگلینڈ میں رہائش کا استفادہ کر کے، بار ایٹ لا کرنا چاہتا تھا۔ سردار صاحب نے حکم دیا، کہ ان کے چیمبر میں وکالت شروع کر دوں۔

زندگی کے پہلے مرحلہ، بچپن اور طالب علمی کے دور کے اختتام اور عملی ذمہ دار زندگی کے دوسرے مرحلہ کے آغاز پر، عجیب ذہنی الجھن اور کشمکش کے غبار میں، روشن راہ کی تلاش میں، امید و ناامیدی کی زیر و بم خیالات و احساسات کے سمندر میں غوطہ زن رہا۔ اب تک میری تمام خواہشات وضروریات کا بوجھ اور ذمہ داری والدین پر تھی۔ والد کی دولت پر خوشحال زندگی بسر کی اور بے فکری میں شب و روز خوب گذرے تھے۔ مختصر عمر کے دھارے میں والدین کی عمدہ اور احسن تربیت کے ساتھ سکول اور کالج میں علمی کمال واضافہ میرا عظیم سرمایہ بن چکا تھا، بالخصوص گورڈن کالج میں، بہترین ابتدائی تربیت اور گورنمنٹ کالج کے اعلیٰ علمی، ادبی اور تہذیبی ماحول نے میری تربیت میں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ لاہور کی آب و ہوا نے، خود اعتمادی اور استقلال کو نئی جلا دی تھی۔ موہڑہ ملکاں کی گلیوں میں، گلی ڈنڈا، بلور اور چوپڑ کے کھیل میں مگن، سکول سے فرار ہونیوالے چینڈو، سائیں کا گاؤں کے ماحول سے نکل کر، پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا کے دل اور مرکز، لاہور کے کلچر کی چھاپ کا پیکر، خوش لباس عبدالمجید ملک کی شناخت میں، وکیل بن چکا تھا۔ سکول ماسٹر کی نوکری اور کالج سے بھاگ کر ضد اور ہٹ دھرمی میں اڑنے کی چھوٹی سی دنیا کو خیر باد کہہ کر، اب ملکی اور عالمی سطح پر اپنے ہنر اور عقل کی بلندی کو چھونے کا عزم اور جذبہ جنم لے چکا تھا۔ اسی خواب کی انوکھی تعبیر کے لئے لندن میں، بیرسٹری کا ڈپلومہ بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، مگر میری بہتری جس میں تھی، میں اسی تک محدود رہا۔ میری والدہ چاہتی تھیں، کہ میں ان کی نظر سے اوجھل نہ ہوں اور میری بیگم کی شب بیداری و دعا انگلینڈ

کے آزاد ماحول کے اثرات سے میرے تحفظ کے لئے کارگر اور مقبول ثابت ہوئی۔ لہٰذا یا وصف کوشش کے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ اس مرحلہ پر پیچھے مڑ کر دیکھا، تو انسانوں کے کثیر ہجوم سے الگ ہو چکا تھا۔ گاؤں میں بچپن کے ساتھی، جن سے گھر کے صحنوں، کھیتوں، کھلیانوں میں کھیلتے، لڑتے جھگڑتے، کبھی خوش، کبھی ناراض، بیریوں کے بیر چنتے اور آپس میں بانٹتے، آموں کے پیڑ سے آم توڑتے اور مزہ لے لے کر آم چوستے تھے، وہ ساتھی اب جوان ہو چکے تھے اور روزگار کی تلاش میں تھے۔ ساتھ کی لڑکیاں شادی کر کے مائیں بن چکی تھیں۔ سکول کے ساتھی بھی، الگ ہو کر زندگی کی راہوں میں، منتشر ہو چکے تھے۔ گورڈن کالج کے طلباء میں، پشاور سے جہلم، گجرات تک اور گلگت بلتستان سے آزاد کشمیر تک، سیکڑوں ساتھی بچھڑ کر، نہ جانے کہاں کہاں زندگی کے مزے لے رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج کی دنیا میں وسعت تھی، مشرقی ومغربی پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں تعینات سفیروں کے بیٹے اور بیٹیاں بھی میرے ساتھ تھے۔ نیو ہوسٹل کے کامن روم کی محفلوں میں، لاجواب رونق رہتی۔ ان ڈور کھیلوں کے مقابلوں میں بھی ہنگامہ رہتا۔ سرگودھا سے مخدوم نواز اور غلام نبی رانجھا کے گھروں سے موسمی، مالٹوں اور کینوؤں کے بڑے بڑے تھیلے آتے اور ملتان سے شیخ آفتاب کے مختلف آموں کے پیکٹ آتے، جو سب دوستوں میں تقسیم ہوتے۔ کالج کی الوداعی تقریب میں گروپ فوٹو ہوئے۔ مال روڈ لاہور کے معروف فوٹو گرافر، بھٹی نے فوٹو بنائے اور نام دیا'' اے جولی ٹیم''۔ یہ گروپ فوٹو ہماری دو سال کی محنت بھری زندگی کا عظیم سرمایہ ہے۔ اس ٹیم سے کچھ ساتھی اللہ تعالیٰ نے اٹھا لیے، باقی بچوں اور پوتوں، نواسوں کی محفل کا حصہ بن چکے ہیں۔ لاہور یونیورسٹی اور کالج میں اور بالخصوص ہوسٹل میں، زیادہ تر پنجاب کے بڑے جاگیردار، زمیندار، سرمایہ دار اور حکمران طبقہ سے تعلق رکھنے والے طلباء تھے، جن کے مشاغل بھی مختلف النوع تھے۔ کچھ شاہی محلہ میں ناچ گانے کے رسیا، کچھ فلموں کے عادی اور اسی طرح کے مشاغل میں وقت گذارتے۔ علمی و ادبی ذوق شوق والے بھی چند ایک تھے، جن کی سنگت حبیب جالب سے بھی تھی۔ ان دنوں حبیب جالب اکثر ہوسٹل میں محفل جماتے۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد، بچپن اور نوجوانی کا سنہری دور رخصت ہو چکا تھا۔ اب زندگی کے نئے اجنبی اور غیر مانوس دھارے میں داخل ہونا تھا۔ نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے، پُرعزم اور پُراعتماد تو تھا، مگر سفر انجانا تھا۔

باب دوم

وکالت کا آغاز

یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں، ملک عبدالقیوم بیرسٹر، پرنسپل تھے، وہ کشمیر سے نقل مکانی کر کے، کئی سال پہلے سے لاہور میں مقیم تھے۔ وائس پرنسپل شیخ امتیاز احمد، ایل ایل ایم بھی پرانے کشمیری تھے۔ سینئر پروفیسر محمد رفیق میر بھی کشمیری تھے۔ ان کے علاوہ وکالت سے منسلک جزوقتی پروفیسروں میں، سردار اقبال اور نسیم حسن شاہ کا تعلق بھی جموں کشمیر سے تھا۔ میں لاہور میں چار سال سے حصول تعلیم کے لئے مقیم تھا، جس وجہ سے لاہور کے ماحول اور ثقافت کا حصہ بن چکا تھا۔ سردار اقبال صاحب ان دنوں لاہور میں وکالت کی معراج پر تھے، بلکہ ان کے شاگرد بھی صف اول میں تھے۔ اُن کی مہربان والدہ کے سنہری الفاظ میری زندگی کا ورثہ ہیں، جب انھوں نے سردار صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "مجید تم اقبال کے ساتھ فوراً وکالت شروع کر دو، میرا بیٹا اقبال پارس ہے، جو بھی اس کے ساتھ کام کرتا ہے، وہ سونا بن جاتا ہے"۔ ایک عظیم ماں کا بیٹے کے لئے، جب ایسا خیال اور خواہش ہو، تو وہ پارس کیوں نہ کہلائے۔ لاہور سے ڈڈیال پہنچا، تو امی جان کو جب بتایا، کہ پاسپورٹ نہیں مل سکا، لہٰذا لاہور میں وکالت شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تو وہ خوشی میں کھل اٹھیں اور فی البدیہہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا، کہ انہیں، تو شروع سے ہی میرے انگلینڈ جانے کے پروگرام سے اختلاف تھا، مگر اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ تب مجھ پر یہ افشاء ہوا، کہ جب میری ماں ہی نہ چاہتی تھیں، کہ میں انگلینڈ جاؤں، تو پھر مجھے پاسپورٹ کیسے ملتا۔ ماں کی دلی تمنا کے مقابلہ میں میری تمام کاوش اور جدوجہد کو بے نتیجہ ہونا ہی تھا اور وہ ہو گیا۔

لاہور جانے سے قبل میں نے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں، میرپور میں وکالت کا لائسنس احتیاطاً حاصل کیا ہوا تھا۔ یہ احساس کیوں ہوا، اس کی سمجھ نہ آئی۔ ایک ہفتہ بعد لاہور پہنچا، وہاں بھی لائسنس حاصل کیا اور ۴۔ مزنگ روڈ پر واقع، سردار صاحب کے چیمبر میں حاضری دی، وہ بہت خوش ہوئے۔ اپنے چیمبر میں سٹاف اور معاون وکلا سے تعارف کروایا، جن کو سردار اقبال سے ملاقات کا موقع ملا ہے، وہ میری تائید کریں گے، کہ سردار اقبال جتنے خوبصورت، خوش لباس اور بلا کے ذہین تھے، اس سے کئی گنا زیادہ بااخلاق، ہنس مکھ اور خوش گفتار بھی تھے۔ ان کی ہر موضوع پر، گفتگو سنجیدگی اور عقل و دانش سے مرصع اور منطقی دلائل پر مبنی ہوتی۔ انھوں نے میرا تعارف کرواتے ہوئے، جو میری تعریف کی اور مستقبل میں بلند پایہ وکیل ہونے اور میری کامیابی کی، جس انداز میں پیشن گوئی کی، اس سے مجھے نیا عزم اور اعلیٰ حوصلہ ملا اور دل ہی دل میں پیشہ وکالت کی بلندیوں کو، چھونے کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے وکالت کی یونیفارم یا لباس لاہور کے معروف ٹیلر، ایم اسماعیل واقع مال روڈ سے پہلے ہی سلوا رکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج

کے وقت سے ہی، لباس کی سلائی وہاں سے کرواتا تھا۔ لاہور میں وہ بہترین سلائی کے لئے مشہور تھے۔ شام کو سردار صاحب نے، وکالت میں اخلاق کی اعلیٰ اقدار، محنت اور اہلِ مقدمات سے رویہ، حسنِ اخلاق اور عدالت کے آداب پر مفصل لیکچر دیا۔ سردار صاحب صرف ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ چند دن ان کے ساتھ رہ کر، ان کے دیگر سینئر وکلا کی بحث سننے، آداب، تخاطب اور طرز دلائل سیکھنے کے بعد، اپیل، مقدمات، انسانی حقوق اور دیگر آئینی خلاف ورزیوں سے متعلق مقدمات کے متعلق قوانین کی متعلقہ شقوں پر، لاء کو نظیروں کی تحقیق اور تلاش میں کام کیا، دیوانی اور قتل کی اپیلوں، ابتدائی عدالت کی فائلوں کے معائنہ اور متعلقہ دستاویزات کے نوٹ لینے کی مہارت میں، کئی ہفتے صرف کیے۔

میڈم نور جہاں سے ملاقات

سردار اقبال کے ساتھ کام شروع کرنے کی وجہ سے، پاکستان اور بالخصوص لاہور کے، شیخ منظور قادر، میاں محمود علی قصوری، مسٹر ایم انور، چوہدری نذیر حسین، ایم بی زمان، ملک محمد اکرم، کرم الٰہی چوہان، نسیم حسن شاہ، اعجاز بٹالوی، میاں بشیر احمد اور کراچی سے مسٹر اے کے بروہی اور بہت سے دیگر سینئر وکلاء کو، ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ میں بحث کرتے سنا، مگر بڑا اعزاز یہ تھا، کہ فارغ اوقات میں ہائی کورٹ کینٹین میں، سردار صاحب کی وجہ سے، سینئر وکلاء کے ساتھ کافی اور چائے پینے کے ساتھ ساتھ، ان کی محفل میں قانونی نقاط، سیاسی اور سوشل معاملات کے علاوہ، نہایت شائستہ اور مہذب اسلوب میں، ہلکے پھلکے مذاق کا بھی تبادلہ ہوتا اور کبھی کبھی قہقہے بھی بلند ہوتے، یہ سب دیکھنے کا موقع ملا۔ قصوری صاحب کی بلند آواز میں گفتگو اور بحث سے متعلق بہت لطیفے بھی مشہور تھے۔ میڈم نور جہاں کا تعلق قصور سے تھا، ان دنوں میڈم اور ان کے پہلے خاوند شوکت رضوی کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی اور بچوں کی حضانت کا مقدمہ، ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ سردار اقبال، میڈیم نور جہاں کی طرف سے وکیل تھے۔ سردار صاحب سے ملاقات سے قبل، ان کے مؤکل، جونیئر وکلاء سے ملتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے جاگیردار، زمیندار، صنعت کار اور حکومت کے اہلکار شامل ہوتے تھے۔ ایک شام میں سردار صاحب کی والدہ محترمہ کے ہاں، سلام پیش کرنے اور خیریت معلوم کرنے بیٹھا تھا، کہ اسی دوران میڈم نور جہاں وہاں تشریف لائیں۔ سادہ لباس، بدوں میک اپ، اصل چہرہ میں قدرتی معصومیت کے روپ میں، ان کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی، وہ قریب ہی بیٹھ گئیں۔ بچوں کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔ جب اُن کو معلوم ہوا، کہ میں سردار صاحب کے ساتھ کام کرتا ہوں، تو بہت خوش ہوئیں۔ کچھ وقت ان کی ذاتی معاملات سے متعلق گفتگو، لاہوری پنجابی میں، سن کر لطف اندوز ہوتا رہا، کیوں کہ اس وقت وہ اپنی پریشان کن زندگی کا کردار ادا کر رہی تھیں، جس میں تصنع اور بناوٹ کا کوئی شائبہ نہ تھا، بلکہ حقیقی داستان تھی۔ جب بالآخر فیصلہ ان کے حق میں ہوا، تو میں موجود نہ تھا، اس لئے خوشی کے تاثرات کا علم نہیں۔

سیّد محمد ظفر کی رفاقت

جنوری ۱۹۵۷ء کی ایک شام کو آفس پہنچا، تو سردار صاحب نے حسب معمول شفقت سے بلایا اور پاس بٹھا کر مسکراتے ہوئے، دریافت کیا، کہ وکالت کے شعبہ سے متعلق کیا محسوس کرتے ہو؟ میں نے روائتی انداز میں تعریف کرتے ہوئے کہا، کہ وکالت بہت دلچسپ پیشہ اور زندگی کی تجربہ گاہ ہے، اس میں انسانی معاشرہ میں پیش آمدہ مسائل سے علیت، ان مسائل کے پیدا ہونے کے محرکات اور ان کے سدباب سے آگاہی کے لئے وکالت صحیح ذریعہ ہے۔ سردار صاحب نے میرے اظہار کی توثیق کرتے ہوئے کہا، کہ ان کے پاس ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے مقدمات ہیں، جن کی پیروی اور عدالت کے آداب کا علم اور تجربہ تین ماہ میں حاصل کرلیا ہے۔ اب مجھے ابتدائی عدالتوں میں، مقدمات کے ضابطہ اور دیوانی مقدمات میں، دعوی، جواب دعویٰ اور فوجداری مقدمات میں استغاثہ، دفاع اور متعلقہ شہادت پیش کرنے اور گواہان پر جرح کرنے کا اسلوب جاننا اور تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے اس کے لئے مجھے ایس ایم ظفر، جو اُن کے شاگرد تھے، کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، میں ابھی خاموش ہی تھا، کہ انھوں نے ظفر صاحب سے فون پر میرے متعلق بات کی اور اپنے بڑے منشی، خادم حسین کو بلا کر، مجھے ظفر صاحب کے پاس لے جانے کو کہا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا، کہ مجھے کچھ بات کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ ہم ٹیمپل روڈ پر واقع ظفر صاحب کے آفس پہنچے۔ خادم حسین نے مجھے بطور امانت، ظفر صاحب کے سپرد کیا۔ نہایت خوش پوش، خوش شکل نوجوان وکیل، ایس ایم ظفر، نے اپنے منشی کو بلا کر کہا، کہ میں نے ان کے ساتھ کام کرنا ہے، لہٰذا ان کے آفس میں کام کرنے والے جونیئر وکلا سے متعارف کروائے۔ محمد ابراہیم، باقی وکلاء سے سینئر تھے۔ شیخ عبدالمنان، محمد آصف رانجھا، عبدالرشید بٹ اور آصف میرے کلاس فیلو تھے۔ انھوں نے مجھے شناخت کرلیا، مگر میں ان سے شناسا نہ تھا۔ وہ تعارف کے بعد، دوسرے روز سماعت ہونے والے مقدمات کی فائلیں پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد، ایک وکیل صاحب کے مطالعہ کے بعد، ایک فائل مجھے بھی دی گئی۔ میں نے چند منٹ میں، دعویٰ، جواب دعویٰ اور منسلکہ دستاویزات کا ملاحظہ کیا، اور کوئی فائل نہ ملی، لہٰذا اسی فائل کو دوسری اور تیسری بار پڑھ کر رکھ دیا۔ مصروفیت نہ ہونے کی وجہ سے، دفتر کے ماحول کا جائزہ لیتا رہا، جیسے کسی خاندان میں پہلی بیوی بچوں کی موجودگی میں، دوسری خاتون شادی کر کے لائی جاتی ہے، تو پہلی خاتون اور اس کے بچے دوسری خاتون کو ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں، مجھے بالکل ایسا ہی احساس ہوا۔ سردار اقبال کے آفس کے برعکس، ابتدائی طور پر مجھے نئی درس گاہ میں وہ اپنائیت محسوس نہ ہوئی۔ قدرے گھٹن اور ناپسندیدہ ہونے کا احساس ہوا، مگر اسی ماحول میں کام کرنے کا عزم کرلیا۔ ظفر صاحب دوسروں کی نسبت، شیخ عبدالمنان کو زیادہ وقعت دیتے، حتیٰ کہ ماتحت عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات میں، ظفر صاحب کی ذمہ داری بھی، اسی کے سپرد تھی۔ تب تک میری رہائش، دہلی مسلم ہوٹل میں ہی تھی۔ تلاش کے

باوجود، کرایہ پر رہائش نہ مل رہی تھی۔ میرا کچھ وقت لاہور کے گلی کوچوں میں، رہائش کی تلاش میں گذرتا اور باقی کچہری اور دفتر میں۔ ایک ماہ مزید اسی آزمائش میں گذر گیا۔ اب مجھ پر نفسیاتی دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا۔ اس عرصہ میں جیب سے تمام خرچ کرنا پڑا، مقدمہ ملا ہی نہ تھا۔ جن سینئر وکلاء کے ساتھ کام کرتا تھا، ان کا یہی بڑا احسان تھا، کہ ان کے ساتھ کچہری اور آفس میں تربیت حاصل کر رہا تھا۔ یہ ایسی کڑی آزمائش تھی، جو وہم وگمان میں نہ تھی۔ ظفر صاحب کا سینئر منشی جعفر، ان کے چیمبر کا کرتا دھرتا تھا۔ دوسرا منشی ریاض، صرف ماتحت عدالتوں میں زیر کار مقدمات تک محدود تھا۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے علاوہ، ماتحت عدالتوں میں، شہادت پیش ہونے اور بحث کے مرحلہ پر ظفر صاحب خود پیش ہوتے۔ جونیئر وکلاء، تاریخ گردانی میں یا چھوٹے مقدمات میں پیروی کرتے۔ میں نے سارے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد، نتیجہ اخذ کیا، کہ رواں سسٹم میں سب سے جونیئر ہوتے ہوئے، کئی سال تک ایسے ہی شب وروز گذارنا بہت مشکل ہو گا۔ حکمت عملی کے تحت، اگلے روز سب سے پہلے آفس میں پہنچا۔ جوں ہی منشی جعفر دفتر آیا، میں قریب واقع کیفے میں اس کو چائے کے لئے لے گیا۔ وہ میری طرف سے پر تکلف دعوت پر حیران، مگر خوش تھا۔ شامی کباب، کیک کے علاوہ اس کی پسند کے اعلیٰ کوالٹی تھری کیسلز سگریٹ کی تین ڈبیاں پیش کیں۔ وہ بہت ہوشیار منشی تھا، اتنی تواضع دیکھ کر بولا، کہ یہ اس قدر خدمت کس خوشی میں ہو رہی ہے؟ میں نے بہت سنجیدہ ہو کر ادب سے کہا، کہ جعفر صاحب میرا تعلق پسماندہ خطہ سے ہے، میں جلد سے جلد اچھا وکیل بننا چاہتا ہوں، آپ میری اس میں راہنمائی اور مدد کریں۔ اس نے کہا واقعی؟ میں نے جواب میں کہا واقعی۔ اس نے کہا کہ، آپ کے لباس، انگلش سوٹ اور سٹائل سے دفتر میں سب کو یہ تاثر ہے، کہ آپ امیر ترین آدمی ہیں اور وکالت محض شغل کے طور پر، اختیار کی ہے اور اسی وجہ سے آپ پر سب کی توجہ کم ہے۔ اس پر میں حیران ہوا، کہ محض میرے لباس اور وضع قطع سے کس قدر، غلط تاثر قائم کیا گیا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ غالب کا مصرعہ نکلا ''ڈبویا مجھ کو ہونے نے''۔ جعفر نے اسی وقت کہا، کہ آج کے بعد تمام مقدموں کی فائلیں، سب سے پہلے آپ کے سپرد ہوں گی۔ ہم دفتر واپس پہنچے، تو ابھی ظفر صاحب نہ آئے تھے، باقی وکلا آ چکے تھے۔ جعفر منشی نے پہنچتے ہی کہا، کہ ظفر صاحب کا حکم ہے، کہ تمام مقدموں کی فائلیں ملک صاحب کے بعد، دوسرے وکلاء پڑھیں گے۔ مجھے میز کی سامنے والی کرسی پر بٹھا کر، تمام فائلیں میرے سپرد کیں۔ میں نے اپنی طرف سے، ایک ایک فائل دوسروں کے سپرد کی۔ ظفر صاحب کو شاید ہی اُس نے بتایا ہو، لیکن میری حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی۔

پہلی کامیابی

چند دنوں میں دوسرا قدم یہ اٹھایا، کہ ایک دیوانی اپیل اول، ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں زیر سماعت تھی، ایک ہفتہ قبل اپیل فائل میں ساتھ لے گیا اور ہفتہ بھر واقعات مقدمہ اور قانونی نقطوں پر، میں نے محنت کر کے تیاری

کر لی۔ محمد غنی چیمہ جن کو ایم جی چیمہ کہا جاتا تھا، اُن کی عدالت میں اپیل زیر سماعت تھی۔ عدالت ماتحت کا فیصلہ ہمارے فریق کے خلاف تھا۔ چیمہ صاحب بہت ذہین، تیز طرار جج تھے۔ ان کی عدالت میں سب وکلا تیار ہو کر جاتے، کیوں کہ وہ بلا معقول وجہ مقدمہ ملتوی نہ کرتے۔ بسا اوقات بحث ہونے پر، اسی روز مقدمہ کا فیصلہ بھی کر دیتے، جس وجہ سے عرف عام میں ایم جی چیمہ کے بجائے وکلا اور عوام ان کو مشین گن چیمہ کہتے۔ مقدمہ بلانے پر میں پیش ہو گیا اور بحث شروع کر دی۔ ابتدائی واقعات بتانے کے بعد قانونی نکتہ پر میں نے ابتدا ہی کی تھی، کہ جج صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر میرا نام پوچھا اور سوال کیا، کہ اس ماہ کا پی ایل ڈی میگزین پڑھا ہے؟ میرے جواب پر کہا، کہ تم اس ماہ کا پی ایل ڈی پڑھ کر کل بحث کرو۔ میرا نام لکھاتے ہوئے، میری یونیفارم اور وضع قطع دیکھ کر نام کے ساتھ، بیرسٹر لکھایا۔ میں نے کہا کہ جناب میں بیرسٹر نہیں، بلکہ پلیڈر ہوں، تو مسکراتے ہوئے کہا، مسٹر ملک مذاق مت کرو، تم بیرسٹر ہو۔ رات کو میں نے پی ایل ڈی میگزین میں، چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ، جسٹس ایس اے رحمٰن، کا فیصلہ نوٹ کیا، جو میرے مقدمہ کے واقعات کے مطابق، ہمارے حق میں تھا۔ میں نے اس فیصلہ میں واقعات اور متعلقہ قوانین کو ازبر کر لیا اور کتاب بھی ساتھ لے گیا۔ دوسرے روز جب مقدمہ پیش ہوا، تو حسب ہدایت موکل ظفر صاحب کو بلا لایا، جب ظفر صاحب عدالت میں پہنچے، تو میں بحث کر رہا تھا۔ جب جج نے قانونی نکتہ پر وضاحت طلب کی اور میں نے چیف جسٹس صاحب کے فیصلہ کا حوالہ دے کر، وضاحت پیش کی، تو فاضل جج نے مخالف وکیل سے سوال کیا، کہ چیف جسٹس کے فیصلہ کی روشنی میں کیا کہنا ہے؟ انھوں نے میرے موقف کو تسلیم کر لیا، جس پر چیمہ صاحب نے، اسی وقت ہمارے حق میں فیصلہ سنا دیا اور میری محنت کی تعریف کی۔ ظفر صاحب اس وقت تک عدالت میں پہنچ چکے تھے۔ شام کو وہ لوگ جن کے حق میں فیصلہ ہوا تھا، مٹھائی کی ٹوکری، پھولوں کے ہار اور ایک سو روپیہ میرے لئے بطور انعام لے کر آفس آئے اور فیصلہ پر مبارک پیش کی۔ ظفر صاحب بہت خوش تھے۔ یہ میرے لئے وکالت کا نیا مرحلہ تھا، اس کے بعد میں باقاعدہ دفتر کا انچارج بن گیا اور ظفر صاحب نے مجھ پر اعتماد کا رویہ اختیار کر لیا۔

اسلامیہ پارک میں رہائش

رہائش کے لئے بہت تگ و دو کے بعد، اسلامیہ پارک میں تین بیڈ روم کا مکان، ٹھیکیدار عبدالکریم کی ملکیت ملا۔ کرایہ گو زیادہ مقرر ہوا، مگر ہوٹل کی نسبت ایک چوتھائی تھا۔ مالک مکان سے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی، تو باتوں باتوں میں، میں نے اپنی مشکل کا اظہار کیا، تو انھوں نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ چند یوم کے بعد دیکھا، کہ پڑوس میں خواتین آپس میں شور شرابہ میں لڑ رہی تھیں۔ اسی دوران ٹھیکیدار صاحب میرے پاس آئے، میں نے خواتین میں لڑائی کے متعلق ان سے دریافت کیا، تو وہ بولے چھوڑو جی وکیل صاحب ان کی لڑائی کو، یہ ککے زئی ملک آپس میں لڑتے رہتے ہیں، ان میں لڑائی جھگڑا کئی کئی دن جاری رہتا ہے، ان کی اس رائے پر میں ہنس پڑا۔ وہ

بولے اس پر آپ ہنسے کیوں ہیں؟ یہ بات تو سارے لاہور میں مشہور ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیکیدار صاحب میں اس لئے ہنسا ہوں، کہ میں بھی ککے زئی ہوں، اس پر وہ بھی ہنس پڑے۔

پنجابی شیخ، احسان کا بدلہ شر

گورنمنٹ کالج میں ملتان کے شیخ آفتاب احمد، میرے کلاس فیلو تھے۔ اس کے بھائی مقصود احمد کی شادی میں ملتان گیا، تو وہاں آفتاب کے دوست، شیخ انور سے ملاقات ہوئی۔ وہ لاہور جب بھی آفتاب کے پاس آتا، تو اس سے ملاقات ہوتی رہتی۔ آفتاب کا تعلق صنعت کار خاندان سے تھا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد، اس نے نوشہرہ میں ایف پی ٹیکسٹائل مل لگا کر، وہاں صنعت کاری شروع کردی تھی۔ شیخ انور سے ایک ہوٹل میں ملاقات ہوئی، اس کی پنجاب یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے شعبہ میں، بطور لیکچرر تعیناتی ہوئی تھی اور ایک ہفتہ قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ رہائش کی تلاش میں پریشان تھا، میں چونکہ اس قسم کی پریشانی سے گذر چکا تھا، اس لئے ازراہِ انسانی ہمدردی، اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کردی، کہ جب تک اسے مکان ملتا ہے، وہ میرے ساتھ رہے۔ وہ دوسرے ہی روز اپنی بیگم اور ایک بکس کے ساتھ، میرے پاس آگیا۔ میں نے بڑا بیڈروم، ان کے سپرد کردیا۔ مکان ملتے ہی، میں نے تمام فرنیچر اور برتن وغیرہ خرید لیے تھے، کیوں کہ میں نے لاہور میں ہی رہنا تھا۔ فرنیچر وغیرہ، ہر چیز اعلیٰ کوالٹی کی تھی۔ انور اور اس کی بیگم بہت خوش ہوئے۔ اسی دوران گاؤں میں، میرے خالہ زاد اور بہنوئی کی اچانک وفات کی اطلاع آئی، میں مکان ان کے سپرد کر کے ڈڈیال آگیا۔ دس روز کے بعد واپس لاہور، اسلامیہ پارک پہنچا، تو مکان پر تالا لگا تھا۔ ٹھیکیدار مالک مکان، ساتھ والے مکان میں رہتے تھے۔ ان سے ملا، تو وہ غصہ میں لال پیلے ہو رہے تھے، کہ ان کو بتائے بغیر ہم مکان خالی کر کے چلے گئے تھے۔ میں نے ان کو، اپنی پریشانی بتائی، تو ان کو تسلی ہوئی، مگر مکان تو خالی تھا اور میرا تمام سامان کپڑے، کتابیں، فرنیچر، برتن وغیرہ شیخ انور اور اس کی بیگم ساتھ لے گئے تھے۔ مکان بالکل خالی دیکھ کر میں حیران رہ گیا، اب کیا کیا جائے۔ ٹھیکیدار صاحب ناراض ہوئے، کہ میں نے، ان پر احسان کیا اور مشکل میں ان کو پناہ دی۔ ٹھیکیدار صاحب بولے، کہ وکیل صاحب یہ پنجابی اور پھر شیخ، بہت احسان فراموش، دھوکہ باز اور ٹھگ قسم کے لوگ ہیں، ان پر کبھی بھی اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے حضرت علیؓ کا قول سنایا "جس پر احسان کرو اس کے شر سے ڈرو"۔ ٹھیکیدار صاحب بہت غصہ میں تھے، وہ بار بار کہتے "تم آزاد کشمیر کے لوگ شریف اور سادہ ہو، پنجابی کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتے"۔ میں نے کہا، آپ بھی تو پنجابی ہیں۔ وہ چلا کر بولے، ہاں میں پنجابی ہوں، اسی لئے تو کہتا ہوں، کہ پنجابی خود غرض اور دھوکہ باز ہیں اور یہ شیخ تو، باپ کو بھی ٹانکہ لگانے سے نہیں ٹلتے۔ میرپور کے محمد اسحاق بھٹی، ایم ایس سی سوشیالوجی کے فائنل ایئر میں طالب علم تھے، وہ انور شیخ سے میری وجہ سے واقف تھے، مگر انور کو یہ علم نہ تھا، کہ وہ میرپور کے ہیں، وہ ایوننگ ہال ہوسٹل میں رہتا تھا۔ میں اس کے پاس دوسرے

دن یونیورسٹی گیا اور اس کو انور کا سارا واقعہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ انور کافی دنوں سے رخصت پر تھا، تاہم اسحاق نے انور کے قریبی دوست لیکچرر سے، اس کی نئی رہائش کا پتہ معلوم کرلیا۔ ہم دونوں نے قلعہ گوجر سنگھ میں، اس کے مکان پر پہنچ کر گھنٹی بجائی، تو انور کی بیگم نے دروازہ کھولا، مجھے دیکھتے ہی پریشان ہوکر کانپنے لگی۔ میرا سامان سامنے کمرہ میں پڑا تھا، البتہ فرنیچر، صرف بیڈ اور چند کرسیاں تھیں۔ اس کی بیگم نے بتایا کہ انور ملتان گیا ہوا تھا، وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اسحاق اسی دوران دو مزدور لے آیا، جنھوں نے سامان اور بیڈ باہر نکالے۔ خاتون نے بتایا، کہ میری کتابیں، کچھ فرنیچر اور کچھ جوڑے انگلش شوز، انور کا بھائی جو ملتان میں وکیل تھا، وہ ملتان لے گیا تھا۔ وہ مجھ سے بار بار معافی مانگتی اور کہتی، کہ انور اور اس کے بھائی نے زیادتی کی اور یہ ان کی غلطی تھی، کہ میرا سامان اور فرنیچر اٹھا لائے۔ میں اپنی جگہ خوش تھا، کہ جو گیا سو گیا، چلو بکس جو مقفل تھے اور کچھ فرنیچر تو مل گیا تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوا، کہ انور شیخ ملازمت چھوڑ کر واپس ملتان چلا گیا تھا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا، کہ احسان کا بدلہ پریشانی اور فرنیچر والا ئبریری کے نقصان کی شکل میں، شر میں ملا۔

متروکہ جائیداد اور کلیم کے مقدمات کی پیشکش

پاکستان کے قیام اور برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں، ہندوستان سے نقل مکانی کر کے آنے والے مہاجرین سے، ہندوستان میں متروکہ جائیداد کے کلیم، طلب کیے گئے اور وہاں چھوڑ کر آنے والی جائیداد کے عوض، پاکستان سے نقل مکانی کر کے ہندوستان میں آباد ہونے والے غیر مسلموں کی جائیدادیں، مستقل طور دیئے جانے کے عمل میں، کلیم افسروں پر مشتمل ٹربیونل یا عدالتیں قائم کی گئیں۔ میرے چند ایک کلاس فیلو وکلاء، جو اُن کلیم افسران کے پاس مقدمات کی پیروی کرتے تھے، وہ مہینوں میں امیر ہو گئے، کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن گئے اور بڑے بڑے چیمبر قائم کر لیے۔ مجھے ان کی اس پریکٹس کا صحیح علم نہ تھا۔ ہفتہ کی شام میں چند دوستوں کے ساتھ شیزان میں کافی پی رہا تھا، کہ گورنمنٹ کالج کا ایک دوست ریسٹورنٹ میں داخل ہوا، وہ دیکھتے ہی بغلگیر ہو گیا اور بازو سے پکڑ کر الگ لے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں پریکٹس کرتا ہوں، اس نے بتایا، کہ ان دنوں وہ کلیم افسر تعینات تھا اور مجھے دعوت دی کہ میں دوسرے دن اس کے آفس میں ملوں۔ چنانچہ دوسرے دن اس سے ملا، اس نے مجھے کہا، کہ میں کلیم کے مقدمات میں، پریکٹس شروع کردوں۔ اس نے مجھے طریقہ کار بتایا، کہ کس طرح کلیم طے کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام سسٹم واقعات اور صوابدید کا تھا، جس میں حقائق کا تعلق کم مگر جھوٹ اور جعلسازی زیادہ کارفرما تھی۔ متروکہ جائیداد کے حاصل کرنے والے یقیناً جائز حق دار بھی ہوں گے، مگر جعلی اور غیر مستحق دعوے داروں کی بہتات تھی۔ دو تین گھنٹے میں اس کے پاس رہا اور تمام کارروائی کا جائزہ لیتا رہا۔ ان مقدمات میں قانون کا کوئی تعلق نہ تھا، زیادہ تر ٹھیکے طے ہوتے۔ وکیل ان ٹھیکوں میں ایجنٹ کا کردار ادا کرتا۔ اس میں راتوں رات دولت جمع کرنے کی وسیع گنجائش تھی۔ شام کو دفتر پہنچا، تو وضاحت طلبی ہو گئی، کہ دن بھر کہاں غائب رہا تھا۔ وضاحت پیش ہی کی تھی، کہ ظفر صاحب نے جھاڑ پلا دی۔ انھوں

نے صاف الفاظ میں مجھے کہا، کہ تم نے اگر وکیل بننا ہے، تو کلیم کے مقدمات کا مت سوچو اور ابھی فیصلہ کر لو، بلکہ حکم دیا کہ آئندہ کسی کلیم آفیسر سے ملنا ہی نہیں ہے، میں نے آمین کر کے، حسب معمول کام شروع کر دیا۔

سمن آباد میں منتقلی

اسلامیہ پارک کی نسبت سمن آباد ایک جدید اور پوش بستی وجود میں آئی تھی۔ ایک دوست کی وساطت سے، ڈونگی گراؤنڈ کے جنوب میں، دو بیڈ روم کا مکان جس کے سامنے چھوٹا سا خوبصورت لان اور عقب میں کشادہ صحن تھا، کرایہ پر مل گیا۔ یہ ایک باغبان کی ملکیت تھا، جس نے سامنے لان میں پھولوں کی دیدہ زیب کیاریاں بنا کر، مختلف اقسام اور رنگ کے پھول اگا رکھے تھے اور ہر ہفتہ وہ خود پھولدار پودوں کی دیکھ بھال کرنے آتا۔ پڑوس میں آغا گل، فلم ایکٹرس زیاسمین، نغمہ اور کچھ دیگر افراد رہائش پذیر تھے، شام کو وہاں بہت رونق ہوتی۔ نوجوان مرد خواتین باہر سیر کو نکلتے۔ ان دنوں ٹریفک بھی بہت کم تھی۔ میرا ملازم خورشید ڈڈیال کا رہنے والا تھا، وہ میرے لئے کھانا تیار کرتا، مگر تھوڑے عرصہ بعد پڑوس میں بھی اس نے راہ و رسم پیدا کر لی۔ اکثر اوقات پڑوس سے کھانا، بطور پڑوسی آجاتا۔ حالانکہ میں دن عدالت میں اور شام کو دفتر میں وقت گذارتا، صرف آتے جاتے پڑوسیوں سے سلام دعا ہوتی۔ تاہم سمن آباد میں رہائش پذیر، اشرافیہ کا اُس وقت اعلیٰ اور امیر طبقہ سے تعلق تھا۔ گلبرگ ان دنوں زیر تعمیر نہ تھا، گلبرگ کی تعمیر کے بعد، وہ لوگ گلبرگ میں منتقل ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد اقبال

ایس ایم ظفر اس وقت غیر شادی شدہ تھے۔ میکلیوڈ روڈ پر واقع کوٹھی میں چار کمروں پر مشتمل، ان کا آفس تھا۔ ایک کمرہ ظفر صاحب کے بڑے بھائی، ڈاکٹر اقبال صاحب کی زیر رہائش تھا۔ ڈاکٹر صاحب رہائشی کمرہ میں الگ راستہ سے آتے جاتے، وہ اپنی طبع کے انسان تھے، خوش لباس مگر الگ تھلگ۔ کبھی کبھی ظفر صاحب کو رات کے کھانے پر بلا لیتے۔ قریب دو ماہ بعد ظفر صاحب شفقت سے مجھے پہلے پہلے چائے پر اور بعد میں کھانے میں بھی شامل کر لیتے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ کرم مجھ پر پڑی اور وہ صرف مجھے چائے اور کھانے پر دعوت دیتے۔ وہ خوشبو پسند کرتے، ان کے کمرے میں اور لباس میں بہت دل لبھانے والی مست خوشبو ہوتی، کھانا بھی ذائقہ دار ہوتا، رات کو سفید چاول ضرور استعمال کرتے۔ ظفر صاحب بھی رات کو سفید چاول پسند کرتے۔ ڈاکٹر صاحب بھی تنہا تھے۔ شام کو بن ٹھن کر گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے باہر جاتے، مگر ان کے ہاں ماسوائے ظفر صاحب اور میرے، ڈیڑھ پونے دو سال، جو عرصہ میں وہاں رہا، میں نے کسی آدمی کو ان کے پاس آتے نہ دیکھا۔ بہت دلچسپ اور خوش کن گفتگو کرتے۔ ان کے ہاں یک طرفہ ٹریفک کا اصول کارفرما تھا۔ مجھ سے میرے متعلق اور ظفر صاحب کے متعلق گفتگو کرتے، مگر اپنی زندگی کے پنہاں گوشوں سے کبھی پردہ نہ اُٹھاتے اور ہر بار بات ٹال جاتے، البتہ اپنے خاندان کا بہت احترام کرتے۔ ان کی زندگی کا صرف یہ پہلو نمایاں تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کے ساتھ گذرا وقت ایک خوشبودار یاد ہے۔

ینگ لائیرز سرکل لاہور

لاہور میں نوجوان وکلاء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ ہوکر، وکالت اختیار کرنے والے نوجوان وکلا کو، پاکستان بلکہ برصغیر میں بہت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، بالخصوص مڈل کلاس اور مالی طور پر کمزور خاندان سے تعلق رکھنے والے وکلا سے، ان کا کنبہ قبیلہ جو محنت مزدوری کر کے اور کئی ایک کے والدین قرض لے کر ان کی تعلیم کے اخراجات کا بوجھ اٹھا کر، متوقع ہوتے ہیں، کہ بیٹا ان کی کفالت کا سہارا بنے گا۔ لہٰذا اس طبقہ میں شامل نوجوان وکلا روز اول سے رزق حاصل کرنے کے لئے، سرگرداں ہوتے ہیں۔ درمیانہ طبقہ جو ہمارے ملک میں اکثریتی طبقہ ہے، اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے وکلا کا بڑا حصّہ بھی، رزق کی تلاش کے لئے دباؤ کا شکار اور مجبور ہوتا ہے۔ اس کو ذاتی نمود و نمائش بھی لازمی رکھنی ہوتی ہے۔ وکالت کے لئے قانون کی مہنگی کتابیں حاصل کرنا، چار و ناچار دفتر کا ہونا، یہ ایسے معاملات ہیں، جن کی ابتداء ہی میں ضرورت رہتی ہے۔ اس کے بعد عملی طور پر نئے وکیل کو، خواہ وہ کتنا ہی ذہین و محنتی کیوں نہ ہو، مقدمہ ہی نہیں ملتا۔ عدالت میں جج اور مجسٹریٹ جن کو، ضمانت اور ابتداء میں حکم امتناعی وغیرہ جاری کرنے کا اختیار ہوتا ہے، وہ نئے وکیل کو مقدمہ میں اختیاری اور صوابدیدی دادرسی دینے میں، قدرے کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ وکلاء کا دوسرا طبقہ وہ ہے، جو تعلق یا سفارش کے تحت سینئر وکلاء کے ساتھ تربیت کے حصول کے لئے کام کرتا ہے۔ ان وکلاء سے کام تو لیا جاتا ہے، مگر ان کو گذارا الاؤنس بھی نہیں ملتا۔ یہ سب سے زیادہ قابل رحم اور ہمدردی کا مستحق طبقہ ہے۔ کئی ماہ بعد وہ مالی مدد کا مستحق قرار پاتا ہے، جس کا اضافی بوجھ، موکل پر ڈالا جاتا ہے۔ ان مشکلات کے پیش نظر دو تین سو وکلا نے، پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے نوجوان، وکلاء کی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کنونشن میں نوآموز وکلاء نے، زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ تنظیم کا دستور اتفاق رائے سے منظور کرنے کے بعد، عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ منصور علی ملک، جو ہم سب میں سینئر تھے، کو صدر، نوازش اسد نائب صدر اور مجھے سیکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ ہم نے تنظیم کو تھوڑی ہی مدت میں، بہت متحرک کیا۔ چند ماہ کے بعد ''قانون کی عمل داری میں وکلاء کا کردار'' کے موضوع پر ٹاؤن ہال میں سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں چیف جسٹس ہائی کورٹ ایس اے رحمٰن مہمان خصوصی تھے۔ لاہور کے تمام معروف وکلاء شامل ہوئے۔ ابتدائیہ میں، میں نے تنظیم کا نصب العین اور اغراض و مقاصد پیش کیے۔ سینئر وکلاء اور بالخصوص چیف جسٹس صاحب نے، تنظیم کے مقاصد کی بھرپور تائید کی، جس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ نوجوان وکلا کو ماتحت عدالتوں میں صوابدیدی اختیارات کے تحت، دادرسی ملنی شروع ہوگئی اور سینئر وکلاء کے ساتھ کام کرنے والے، معاونین کا مسئلہ آمدن بھی، کسی حد تک حل ہوا۔ جب تک لاہور میں وکالت کی، نوجوان وکلاء کی تنظیم کو خوب فعال اور متحرک رکھا۔

محترم اے کے بروہی سے تعارف

سردار اقبال صاحب کے ساتھ جن وکلاء نے بطور معاون یا جونیئر وکالت شروع کی اور تربیت کے بعد لاہور میں پریکٹس کی، ان میں فضل غنی خان، ایس ایم ظفر، راجہ انور، منیر حسین، شیخ سعید اختر وغیرہ شامل تھے۔ سردار صاحب مہینہ کے آخری ہفتہ کی شام اپنے تمام معاونین اور ان کے زیر تربیت وکلاء کو کھانے پر مدعو کرتے، جن کی تعداد بیس سے زیادہ ہی ہوتی۔ ایسا اجتماع مدعو کرنا سردار صاحب کا معمول تھا۔ اس میں خوب گپ شپ ہوتی۔ ان کے شاگردوں کو سردار اقبال گروپ کا نام دیا گیا تھا۔ ایسے ہی ایک شام کو سردار صاحب نے اے کے بروہی، معروف قانون دان کو بھی مدعو کیا تھا۔ ہم تمام نوجوان وکلاء سے الگ الگ تعارف کروایا اور ہم سب کی بہت تعریف کی، بروہی صاحب کا انداز گفتگو بھی بہت پیارا تھا۔ بہت شفقت سے ہم سے وکالت سے متعلق سوالات کیے اور اپنے تجربہ اور علم کی روشنی میں ہمیں محنت کرنے اور کام میں لگن پیدا کرنے، عدالت کے آداب، وکلاء اور اہل مقدمات سے حسنِ اخلاق اور اعلیٰ سلوک کی ہدایات دیں۔ اے کے بروہی صاحب کو قبل ازیں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں بحث کرتے سنا اور دیکھا تھا، مگر بالمشافہ ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ لامحالہ یہ ملاقات گو کہ باعث مسرت مگر مختصر تھی۔ سردار اقبال صاحب سے پہلے ہی بہت کچھ سیکھا ہوا تھا۔ ظفر صاحب کے ساتھ بھی بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ سردار صاحب اور ان میں بہت مماثلت تھی۔ ایس ایم ظفر اور فضل غنی خان میں گہری دوستی تھی۔ ہفتہ کی شام کو ہوٹل میں کھانا کھاتے اور سینما میں شو بھی دیکھتے۔ ان کے ساتھ شامیں گذارنے کا مجھے اعزاز حاصل تھا، بلکہ ظفر صاحب تمام عوامی تقریبات، جن میں شادی بیاہ بھی شامل تھا، مجھے ساتھ لے جاتے، یہ محض ان کی شفقت اور پیار تھا۔

میاں محمود علی قصوری صاحب کے ریمارکس

ضلع کچہری اور سول کورٹس میں مقدمات سے فارغ ہونے کے بعد، حسب ہدایت، میں سید ھا ظفر صاحب کے پاس ہائی کورٹ پہنچتا۔ ان کی بحث سنتا، فارغ ہو کر وہ ہائی کورٹ کنٹین جاتے، جہاں کافی یا چائے کا دور چلتا اور لذیذ فش کباب کھانے کو ملتے اور سینڈوچ کا چسکا لیا جاتا۔ فراغت کے وقت تمام سینئر وکلاء کینٹین کے ملحق کمرہ میں جمع ہوتے اور چائے کافی سے لطف اندوز ہوتے اور آپس میں خوب گپ شپ کرتے۔ ان میں میاں محمود علی قصوری، ملک اکرم، میاں بدیع الزمان، شیخ خورشید احمد، ایم انور بار ایٹ لاء، میاں بشیر صاحب، سردار اقبال صاحب، نسیم حسن شاہ، شیخ شوکت علی وغیرہ نمایاں تھے۔ حسب معمول میں ماتحت عدالتوں سے فارغ ہو کر، ہائی کورٹ گیا۔ منشی جعفر سے معلوم ہوا، کہ ظفر صاحب کینٹین سے ملحق بار روم میں ہیں۔ میں ان کے پاس ابھی کھڑا ہی ہوا تھا، کہ میاں محمود علی قصوری نے، ساتھ والے ٹیبل پر کافی لیتے ہوئے مخصوص بلند آواز میں کہا" ظفر جب میں تمہارے اس جونیئر کو دیکھتا ہوں، تو خیال آتا ہے، کہ اس کو شوکیس میں سجا دیا جائے۔ یہ خوب ویل ڈریسڈ ہے"۔ اس پر ظفر صاحب نے مسکراتے ہوئے تائید کی، مگر وہاں سب سینئر وکلاء کی توجہ کا میں مرکز بن گیا۔ میاں صاحب کے یہ الفاظ، میرے سنہری ورثہ کا حصہ بن

گئے۔ یہ اُن کے بڑے پن کا کمال اور اعلیٰ وصف کا اظہار تھا۔

ظفر صاحب اور ان کے آفس میں، شیخ عبدالمنان، محمد ابراہیم، محمد آصف رانجھا اور عبدالرشید بٹ، ہم سب آپس میں، ایک کنبہ کی طرح باہمی احترام، محبت اور پیار سے رہتے۔ ظفر صاحب کے بعد آصف سے مجھے بہت احترام ملا۔ آصف رانجھا، بیرسٹر خالد رانجھا کے بڑے بھائی ہیں۔ انھوں نے اور رشید بٹ نے گریجویشن گورنمنٹ کالج سے کی تھی وہ میرے کلاس فیلو تھے۔ ظفر صاحب اور ہم تینوں اولڈ راوین بھی تھے، جوانوکھا انمول رشتہ تھا۔ سردار اقبال صاحب کی تربیت میں، حُسنِ اخلاق اور معاشرتی اداب کے علاوہ، ہمیں یہ بھی سکھایا گیا تھا، کہ سوشل تقریبات میں، اپنے گروپ کے ساتھ منسلک رہنا چاہیے اور باہمی احترام کا نہایت مہذب انداز میں مظاہرہ کرنا چاہیے، یہی ترغیب وتدریس ایس ایم ظفر صاحب کی تھی۔ لہٰذا اظہار یکجہتی ہمارا شعار اور نصب العین بن چکا تھا۔ وہ وقت ناقابل فراموش ہے۔ ظفر صاحب شادی کی تقریبات اور عزیز و اقارب کی دعوتوں میں صرف مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان کے تمام دوستوں سے، مجھے قربت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے میں لاہوری کلچر کا حصہ ہی بن گیا تھا۔

سکھ مہمان کی ٹپ

میرا یہ معمول تھا کہ حالات جیسے بھی ہوں، میں عید کی تقریب گاؤں میں امی جان اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہی مناتا تھا اور یہ مجھے ماں جی کی ہدایت بھی تھی۔ اتفاق سے عیدالاضحیٰ کی تعطیلات سے پہلے، دو روز سے ظفر صاحب کے حکم کے مطابق، قصور میں قتل کے مقدمہ میں، شہادت کے مرحلہ پر، سلطان نامی ملزم کے وکیل کے طور پر، گواہان استغاثہ پر جرح کرنی تھی۔ مقدمہ کی تیاری اور قصور کے سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے، گاؤں نہ جاسکا۔ اس وقت یہ واحد عید تھی، کہ میں گاؤں نہ جاسکا۔ عید کی نماز کے بعد، اپنی رہائش پر رہا۔ البتہ شام کے کھانے کے لئے، میں مال روڈ پر واقع لارڈز ریسٹورنٹ میں گیا۔ میرے ٹیبل کے ملحق بڑے ٹیبل پر فلم ایکٹریس نیلو بیگم وغیرہ چار پانچ لوگ آکر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ایک سکھ مشرقی پنجاب کا مہمان تھا۔ میں کھانے کا بل ادا کررہا تھا، کہ وہ سکھ میرے ٹیبل پر آگیا۔ اس نے شراب پی ہوئی تھی اور خوب مستی میں تھا۔ پہلے تو وہ پرانے دوستوں کی طرح، بے تکلف بغلگیر ہو گیا اور اپنے میزبانوں اور مجھ سے، بیک وقت محوِ گفتگو ہو گیا۔ اسی دوران ریسٹورنٹ کا ویٹر، بقایا رقم لے کر آیا، تو سکھ سردار نے اسے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "جا اوئے لے جا سب نوٹ اور اس ٹپ نال آج توں وی عید کر، کی یاد کریں گا، تینوں کسے سردار نال پالا پیا سی۔" ویٹر خوش ہو کر نوٹ اُچک کر لے گیا۔ روپے میرے اور ویٹر نے شکریہ، سکھ سردار کا ادا کیا۔ اس پر نیلو بیگم اور اِن کے ساتھیوں نے بھی، قہقہہ لگایا اور میری عید ہو گئی۔ سکھ سردار پھر بغلگیر ہوا اور اپنے میزبانوں کے پاس چلا گیا۔ سکھ سردار میرا لباس دیکھ کر، شراب کے نشہ میں، شاید مجھے بھی ایکٹر ہی سمجھ کر، بغلگیر ہوا ہو۔ اُن دنوں نیلو فلمی دنیا میں عروج پر تھی، ان کا سکھ مہمان بھی یقیناً بالی وڈ کی دنیا سے ہوگا۔

میر پور منتقلی

اگست ۱۹۵۸ء میں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران گاؤں آیا۔ اُن دنوں منگلا ڈیم کی تعمیر کا کام شروع تھا۔ والد صاحب انگلینڈ میں تھے اور ماموں عبدالعزیز پولیس انسپکٹر کی تعیناتی مظفر آباد میں تھی۔ ہماری اراضی اور مکانات، منگلا ڈیم کی زد میں تھے۔ امی جان نے بتایا، کہ چند روز قبل مکانات کی پیمائش وغیرہ کی گئی تھی، نامعلوم معاوضہ کی رقم کا تعین ٹھیک کیا گیا تھا، کہ نہیں۔ دوسرے ہی دن میر پور کمشنر منگلا ڈیم، آغا عاشق حسین سے ملا اور ریکارڈ چیک کروانے پر معلوم ہوا، کہ مکانات کی پیمائش درست نہ ہوئی تھی، چنانچہ دوبارہ پیمائش کروائی۔ گاؤں کے باقی مکانات کی بھی از سرِ نو پیمائش کروانے کے لئے، متعدد بار میر پور آنا پڑا۔ اس دوران مقامی عدالتوں میں، جج صاحبان اور وکلاء سے بھی ملاقات ہوتی رہی۔ ہماری اراضی کا بڑا حصّہ بھی، منگلا ڈیم سے متاثر ہوا تھا، جس کے معاوضہ کے تعین کا بھی مسئلہ تھا۔ نانا جان کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ گاؤں کے تمام معاملات اِن کے سپرد ہوتے، مگر اب اِن کے لئے مشکل تھا۔ لہٰذا امی جان نے حکم کیا، کہ وکالت میر پور شروع کی جائے۔ میر پور میں جج صاحبان نے بھی یہی رائے دی، بصورت دیگر لاہور سے بار بار آنا پڑتا، جو کہ آسان نہ تھا۔ اِس صورتِ حال کے تحت، بہت سوچ و بچار کے بعد ایک مشکل فیصلہ کرنا پڑا۔ لاہور میں اب بطور وکیل میری کافی شناسائی ہو چکی تھی اور کام بھی ٹھیک تھا۔ لاہور میں ترقی کی وسیع گنجائش تھی، وہاں معروف ترین وکلاء کی رہنمائی بھی حاصل تھی، جس کے برعکس میر پور بہت چھوٹا اور محدود شہر تھا، جہاں گو کہ ہائی کورٹ سرکٹ قائم تھا، مگر وکالت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ تاہم منگلا ڈیم میں اراضی اور مکانات کے معاوضہ کے تعین اور متبادل آبادکاری کے لئے، موزوں مقام پر منتقلی کے معاملات کے حل کو، زیادہ اہمیت اور فوقیت حاصل تھی۔ میر پور منتقل ہونے کے فیصلہ پر، سردار اقبال صاحب، ایس ایم ظفر صاحب اور دیگر ساتھی، نالاں اور ناراض ہوئے۔ وہ کئی ماہ بعد تک لاہور واپس آجانے کے منتظر رہے، مگر میرا مسئلہ منگلا ڈیم کی وجہ سے، جائیداد کے معاوضہ کا حصول اور نئے ڈڈیال ٹاؤن میں اپنے لئے اور گاؤں کے لوگوں کے لئے پلاٹ حاصل کرنا اور انتقال آبادی تھا، وگرنہ لاہور چھوڑنا آسان نہ تھا۔ میر پور جیسی چھوٹی جگہ میں نئی وکالت شروع کرنا بھی نئی آزمائش تھی۔

شیر زمان چوہدری، لنکنز ان سے بیرسٹری کر کے آیا، تو اس نے لاہور میں کام شروع کیا۔ وہ میرے ساتھ ہی سمن آباد میں رہائش پذیر تھا۔ میں نے میر پور وکالت شروع کی، تو وہ بھی میر پور منتقل ہو گیا۔ ہم دونوں میر پور میں نو آموز تھے، مگر شیر زمان کو یہ سہولت حاصل تھی، کہ میر پور میں بھنبھی کے علاقہ میں، اِس کے قبیلہ کی کافی آبادی تھی اور عدالتوں میں اِن کے مقدمات بھی کافی تھے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ صرف مجھے ہی تھا، کیوں کہ میرا قبیلہ بہت کم تھا۔ گو میر پور میں وکلاء کی تعداد زیادہ نہ تھی، مگر سب وکلاء بہت قابل اور محنتی تھے، اِن میں، محمد یوسف صراف اور

محمد یحیٰ چیمہ کے پاس زیادہ کام تھا۔ دوسرے نمبر پر، سردار آفتاب احمد، چوہدری محمد حسین، عبدالخالق انصاری، راجہ لہراسب خان، راجہ محمد اسلم، چوہدری احسان الحق، قاضی عبدالغفور وغیرہ تھے۔ مولوی فضل دین بھٹی سب سے سینئر تھے۔ چوہدری لعل خان، بیرسٹر نذیر لودھی بھی کافی معروف تھے۔ اس ماحول میں، ہم دونوں کا اضافہ دلچسپ تھا۔ ہم دونوں لاہور کے سٹائل میں، یونیفارم میں عدالت میں وارد ہوتے، جب کہ دوسرے تمام وکلاء عام لباس میں، عدالتوں میں پیش ہوتے۔ اہل مقدمات اور عوام ہم کو کالے کوٹ پتلون میں دیکھ کر دیگر وکلاء سے ہمارے متعلق دریافت کرتے، تو اُن کو بتایا جاتا کہ "ہم دونوں انسپکٹر سی آئی ڈی ہیں"۔ اس کا ہم پر ایک ماہ بعد انکشاف ہوا۔

میرپور کچہری میں پہلا دِن

میرپور عدالتوں کا احاطہ شہر سے باہر، مشرقی جانب تھا، ڈوگرہ عہد حکومت سے ہی، عدالتی عمارات اور ان سے ملحق، ایک ایک کمرہ پر مشتمل، وکلاء کے دفاتر تھے۔ ڈوگرہ عہد میں، ماسوائے فضل دین بھٹی اور شیخ حبیب الٰہی کے، دیگر تمام وکلاء ہندو تھے۔ فوجداری قانون کے تحت، مقدموں میں جوتی رام اور ڈگیال اور دیوانی مقدمات میں سیتارام اور پھوہارام معروف تھے۔ آزاد دور میں فضل دین بھٹی اور راجہ لہراسب خان نے آغاز کیا۔ یوسف صراف کا تعلق بارہ مولہ، آغا عاشق حسین، سری نگر، محمد یحیٰ چیمہ، سامبہ جموں اور سردار آفتاب کا تعلق، پونچھ سے تھا، جب کہ دیگر وکلاء میرپور ضلع کے مختلف دیہاتوں کے رہنے والے تھے۔ اس ماحول میں ہماری شمولیت، وکلاء میں پسندیدہ نہ تھی۔ پہلے دن سیشن جج، سردار یار محمد خان، اے ڈی ایم / سب جج ظہور حسین نقوی، ڈپٹی کمشنر، اے ایچ سہروردی، ایس ڈی ایم سردار غلام نبی، افسر مال، شیخ نعمت اللہ کو تعارفی سلام کیا۔ سب نے ملاقات پر خوش آمدید کہا۔ بہت اپنائیت کا ماحول محسوس ہوا۔ قریب گیارہ بجے، میں راجہ اسلم ایڈووکیٹ کے پاس کھڑا تھا، کہ میرے پاس خواجہ فضل کریم آیا اور الگ کر کے اس نے کہا، کہ اس کے چار مقدمے ہیں، دو دیوانی اور دو فوجداری، وہ مجھے ان تمام مقدموں میں وکالت نامہ دینا چاہتا ہے۔ اس نے جیب سے ایک سو روپیہ نکال کر، بطور بیانہ پیش کیا اور آئندہ تاریخ سماعت پر، بقیہ فیس ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح آغاز تو بہت اچھا ہوا۔ مستقبل اللہ کے سپرد۔ ہم اسی وقت کینٹین میں گئے، راجہ اسلم، چوہدری احسان اور شیر زمان ہم نے مل کر، پہلا دن خوشی میں منایا۔ میرپور میں آفیسرز کلب تھا، انتظامی افسران، جج صاحبان تمام اس کے رکن تھے، ہم بھی کلب کے رکن بن گئے۔ شام کو، آفیسر کلب میں جج اور انتظامیہ کے افسران ٹینس، بیڈمنٹن کھیلتے اور تاش میں برج اور رمی وغیرہ اور کیرم بورڈ وغیرہ کھیلتے، ساتھ ہی کینٹین میں چائے کافی کا انتظام تھا۔ ہماری واقفیت، جو پہلے محدود حد تک تھی، وہ دوستی اور بے تکلفی میں بدل گئی، مگر دوسری طرف حسد اور سازشوں نے سر اُٹھانا شروع کر دیا، بالخصوص میرے سیاسی اور سوشل تعلقات کے سبب، ایک تو وکالت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور ساتھ ہی معاشرتی تعلقات میں وسعت شروع ہو گئی۔ شیر زمان میرے ساتھ ہی تمام تقریبات

میں شامل ہوتا۔ ہم دونوں کے تعلقات کا خاص پس منظر تھا۔ خاندانی تعلقات کے علاوہ، سکول میں کلاس اول سے میٹرک تک اور کالج میں ایف۔ اے تک ہم کلاس فیلو رہے۔ بی۔ اے میں، میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا، تب ہم الگ ہوئے۔ شیر زمان نے بیرسٹر کا امتحان پاس کیا، مجھے بھی لنکنز ان میں داخلہ ملا، مگر پاسپورٹ نہ مل سکا اور میں نے ایل ایل بی لاہور میں کر کے وہاں ہی وکالت شروع کر دی۔ شیر زمان نے بھی وکالت لاہور میں شروع کی، جہاں ہم دونوں کی رہائش اکٹھی تھی۔

میر پور میں میرے خلاف مقدمہ

میر پور میں بینس قبیلہ کے مقدموں کی پیروی، یوسف صراف کرتے تھے، مگر ہمارے یہاں پر آنے سے، ہم کو فوقیت ملنی شروع ہوئی، تو پیشہ ورانہ رقابت نے سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ ایک فوجداری مقدمہ جس میں، صراف وکیل ملزمان تھے، اس میں شیر زمان کو ملزمان نے وکیل مقرر کیا، اتفاق سے اسی روز استغاثہ کی شہادت ہونی تھی۔ صراف کے، متعلقہ عدالت کے جج اور وکیل استغاثہ و پراسیکیوٹر سے مراسم تھے، جس وجہ سے صراف کو چھوڑ کر، شیر زمان کو وکیل مقرر کرنا، ان کو اچھا نہ لگا۔ انھوں نے گواہان کی شہادت اسی روز ریکارڈ کروانے پر اصرار کیا۔ شیر زمان تیار نہ تھا، اس نے مجھے بھی وکیل مقرر کروا دیا۔ میں نے اسی روز وکیل مقرر ہونے اور گواہان کے پولیس بیانات کی نقل مہیا نہ ہونے کی بناء پر، التواء کی استدعا کی، مگر جج شہادت قلمبند کرنے پر بضد تھے، حتیٰ کہ غصہ میں گواہ کا بیان بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ہمارے پاس ریکارڈ وغیرہ کچھ نہ تھا، دونوں واقعات مقدمہ سے بھی ناواقف تھے، ہم نے بھی جرح کی حکمت عملی تیار کر لی۔ وقت عدالت ختم ہونے تک، ایک گواہ پر بھی جرح ختم نہ ہونے دی، مقدمہ ملتوی ہو گیا۔ دوسرے روز میں تھوڑا تاخیر سے آیا۔ جوں ہی پہنچا، عدالت کے پیادہ نے نوٹس عدالت، تعمیل کے لئے پیش کر دیا، جس میں الزام تھا، کہ اگلے روز فوجداری مقدمہ میں پیش کیے گئے وکالت نامہ پر، چسپاں ٹکٹ فرضی و جعلی تھا۔ اس پر وضاحت طلب کی گئی تھی، کہ کیوں نہ اس پر میرے خلاف دھوکہ دہی اور فورجری کا مقدمہ قائم کیا جائے اور ساتھ ہی وکالت کا لائسنس بھی منسوخ کرنے کی سفارش کی جائے۔ چپڑاسی نے سرگوشی میں کہا، کہ جناب آپ کے خلاف سازش ہوئی ہے۔ دس منٹ بعد روبکار عدالت بنام عبدالمجید ملک پکارا ہو گیا۔ میں عدالت میں پیش ہوا، تو لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ حکم ہوا کہ عذرات پیش کیے جائیں۔ میں نے ایک ہفتہ کی مہلت طلب کی، تو حکم ہوا کہ نہیں، ابھی اسی وقت عذرات پیش کرو۔ میں نے بہت ادب سے دو دن کی مہلت طلب کی، جواب پھر وہی۔ اس پر میں نے غصہ میں روش بدلتے ہوئے کہا، کہ اگر آپ نے مجھے جیل بھیجنے کا فیصلہ پہلے سے لکھ رکھا ہے، تو پھر پولیس جو پہلے ہی عدالت میں موجود ہے، اس کو حکم دیں مجھے گرفتار کر لے۔ تھوڑی تلخ کلامی کے نتیجہ میں ایک گھنٹہ کی مہلت ملی۔ عدالت سے باہر آیا، تو وکلاء سرگوشیاں کر کے مسکرا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ارد گرد کا ماحول بالکل بدلا بدلا

اور میرے خلاف تھا۔ اسی دوران عرضی نویس قاضی فیروز، میرے پاس آیا اور بتایا، کہ وکالت نامہ پر غلطی سے، اس نے دوسرے آدمی کے نام پر جاری ٹکٹ، چسپاں کر دیا تھا۔ اسی وقت وہ مقدمہ والا موکل بھی آ گیا، اس نے بھی قاضی فیروز کی تائید کی۔ اشٹام فروش نے بھی دونوں کی تائید کی۔ تینوں کے بیان حلفی لے کر میں نے مفصل عذرات، پیش عدالت کیے۔ اس پر جج نے اشٹام فروش اور عرائض نویس کو طلب کیا، کہ بیان حلفی واپس لو ورنہ دونوں کے لائسنس منسوخ کروا دیئے جائیں گے، مگر وہ سچائی پر ڈٹ گئے۔ سردار یار محمد، سیشن جج نے مجھے بلا کر تسلی دی، کہ فکر کی ضرورت نہیں ہے سارا معاملہ ان کے پاس آنے پر ٹھیک کر دیا جائے گا۔ اس سارے پریشان کن لمحہ کے دوران، راجہ اسلم، شیر زمان اور چوہدری احسان الحق کی ہمدردی میرے ساتھ تھی۔ باقی تمام وکلا تماش بین رہے اور کچھ اس سازش میں شریک تھے۔ جج نے دوبارہ طلب نہ کیا، میں منتظر ہی رہا۔ البتہ اس واقعہ نے، مجھے مستقبل کے لئے بہت چوکس کر دیا۔ حیران تھا، کہ اس قلیل مدت میں وکیل برادری میں اس درجہ میرے خلاف حسد اور بغض کیوں پیدا ہوا۔ میری نسبت شیر زمان کو زیادہ مقدمے ملے تھے، البتہ یہ ضرور تھا، کہ ہم دونوں نے الگ الگ خوبصورت چیمبر تعمیر کروائے، سینئر وکلاء سے بہتر فرنیچر ڈالا اور لوگوں کو باوقار بیٹھنے کی، سہولت حاصل ہوئی۔

سیّد زمان شاہ کی شفقت

میر پور میں ڈوگرہ عہد حکومت میں بھسین بس سروس، بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی تھی، جو بھسین ہندو خاندان کی ملکیت تھی۔ اسی کمپنی کو میر پور جموں، میر پور کوٹلی، پونچھ اور گھٹالیاں کے رُوٹ حاصل تھے۔ مسلمانوں میں، خان اسمٰعیل اور سیّد بدیع الزمان شاہ کی ملکیت ایک ایک بس تھی۔ آزاد دور میں اُن دونوں کی ٹرانسپورٹ کمپنیاں قائم ہوئیں۔ زمان شاہ کے پاس پینسٹھ بسیں تھیں اور آزاد کشمیر کے علاوہ پنجاب کے روٹ بھی حاصل تھے۔ ایک دن میں کورٹس سے واپس آتے ہوئے، زمان شاہ کے آفس کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے اندر بلوایا اور مجھے کمپنی کا لیگل ایڈوائزر مقرر کر کے، دو ماہ کی پیشگی فیس ادا کر دی۔ یہ خوش کن تعجب تھا۔ ان کی وفات تک ہمارے بہترین مراسم رہے۔ گو کہ شاہ صاحب کے لئے، یہ بڑی بات نہ ہو، مگر نئے وکیل کے لئے یہ بڑے احسان اور شفقت کا مظاہرہ تھا۔ میری ان سے شناسائی قطعی نہ تھی، ماسوائے اس کے، کہ ایک تو میں ان کے دفتر کے سامنے سے گذرتا تھا، دوسرے شاید ان کو میرا سیاہ لباس بھا گیا، یا چلنا پسند آ گیا اور کشش پیدا ہوئی، جو میری حوصلہ افزائی کا سبب بنا۔

کوٹلی عدالت میں پہلی پیروی

سردار آفتاب احمد سینئر وکیل تھے۔ انھوں نے مجھے ایک استغاثہ سپرد کیا، جو کوٹلی کی عدالت میں دائر کرنا تھا اور اس کی آئندہ پیروی انھوں نے کرنی تھی۔ استغاثہ ایک نوبیاہتہ خاتون کی جانب سے اپنے خسر، اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کے خلاف تھا۔ کوٹلی میں سب جج کو، مجسٹریٹ درجہ اول مع دفعہ ۳۰ ض ف کے، اختیارات بھی حاصل تھے۔

جس کی بعد میں ترمیم بھی ہوگئی اور سب جج کا عہدہ سینئر سول جج ہوگیا۔ استغاثہ پیش عدالت کرنے پر، مستغیثہ کا بیان کلرک کے پاس قلمبند کروانے کا حکم ملا۔ مجھے یہ علم نہ تھا، کہ اصل ملزم کوٹلی میں وکیل تھا۔ بیان قلمبند کرواتے وقت، دو سینئر وکلاء میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور انھوں نے بلاوجہ مداخلت شروع کر دی، جس پر کچھ تلخی بھی ہوئی۔ تاہم ابتدائی بیان کے بعد، فائل جج کے سامنے پیش ہوئی، تو جج نے مجھے کہا، کہ اس کو مطمئن کیا جائے، کہ بادی النظر میں ملزمان کی طلبی کا مقدمہ بنتا تھا۔ لاہور کے عدالت کے ضابطہ کے تحت، میں نے انگریزی میں بحث شروع کی، تو کمرہ عدالت لوگوں سے بھر گیا۔ دس منٹ سماعت کرنے کے بعد، مرد ملزمان کے نام طلبی کا حکم جاری ہوگیا، مگر دس منٹ کی بحث کا سامعین پر جو اثر ہوا، اس سے کوٹلی میں خوب شہرت ملی۔ میری مؤکلہ نے سردار آفتاب کو چھوڑ کر، پیروی مقدمہ مجھے سپرد کر دی۔ طلبی کے بعد علم ہوا، کہ اصل ملزم مقامی وکیل اور اس کے بیٹے تھے، جس پر مجھے افسوس بھی ہوا اور میں نے چند پیشیوں کے بعد فریقین میں راضی نامہ کروا دیا۔ مگر اس مقدمہ میں پیروی کے نتیجہ میں، کوٹلی کے اپیل میں مقدمے میرے پاس آنے شروع ہوگئے۔ جج/مجسٹریٹ راجہ امداد علی خان تھے، جو ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

کار کا تحفہ

لاہور میں وکالت کے دوران جب کام بڑھنے لگا، تو حسب معمول ابا جان جو میرے کام سے خوش اور مطمئن تھے، کی طرف رجوع کیا اور ان سے انگلینڈ سے کار بھیجنے کے لئے لکھا۔ مگر انھوں نے جواب میں لکھا، کہ اب تمہاری وکالت ٹھیک چل رہی ہے، لہٰذا مناسب ہوگا، کہ اپنی آمدن سے کار خرید لو۔ اسی دوران میں میرپور منتقل ہو گیا، مگر ابا جان کو اس کی جلدی میں اطلاع نہ دی۔ انھوں نے انگلینڈ میں میرے لئے فورڈ کمپنی کی پریفیکٹ سفید رنگ کی کار خرید کر لاہور کے پتہ پر خط ارسال کیا۔ میں لاہور میں نہ تھا، لہٰذا قریب ایک ماہ بعد خط میرپور میں ملا۔ خط میں بڑی خوشخبری یہ تھی، کہ ابا جان نے میرے لئے کار خرید لی تھی اور وہ بحری جہاز سے اپنے ساتھ کار لا رہے ہیں۔ میرے لئے وکالت کے اس مرحلہ پر اور جوان عمری میں کار کا حاصل ہونا، ایک نمایاں حیثیت حاصل ہونے کا واضح سبب تھا۔ میرپور میں کسی وکیل اور شہری کے پاس کار نہ تھی۔ صرف بدیع الزمان شاہ ٹرانسپوٹر کے پاس کار تھی، مگر کار کی ضرورت تو لاہور میں تھی، جہاں سے میں میرپور منتقل ہو چکا تھا۔ ابا جان ۲۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو بحری جہاز سے کراچی پہنچے اور ۲۸ دسمبر کو کار، کسٹم کی ادائیگی کے بعد ریلیز ہوگئی۔ میرپور میں کار کی سہولت سے، میری وکالت پر مثبت اثر پڑا اور شہری علاقوں سے تعلقات میں بہت اضافہ ہوگیا۔ پنجاب کے شہروں اور میرپور کے قرب و جوار میں ہونے والی شادی میں خاص دعوت ملتی اور دولہا کو بارات کے ساتھ اور دلہن دولہا کو رخصتی پر کار میں لانے کی فرمائش ہوتی۔ ڈرائیونگ میں خود ہی کرتا، اس لئے مصروفیت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ اور بہت سے احباب کے علاوہ سردار سکندر حیات، سابق وزیراعظم کی بارات میں گوجرانوالہ گیا اور دولہا دلہن کو اپنی کار میں لایا۔ اگرچہ کہ یہ واقعہ بہت پرانا تھا، مگر

عبدالمجید ملک ایڈووکیٹ ہمراہ
عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ (۱۹۷۷ء)

جسٹس مجید ملک بحیثیت سیکرٹری جنرل لبریشن لیگ مظفرآباد میں
ایک تقریب میں خطاب کے دوران (۱۹۷۰ء)

جسٹس عبدالمجید ملک اپنے کزن محمد بشیر ملک کے ہمراہ

جسٹس مجید ملک، کے ایچ خورشید، (صدر حکومت آزاد کشمیر) غازی الٰہی بخش ، راجہ محمد اسلم خان
۱۹۵۹ء میں میرپور کے ایک جلسہ عام کے دوران اسٹیج پر
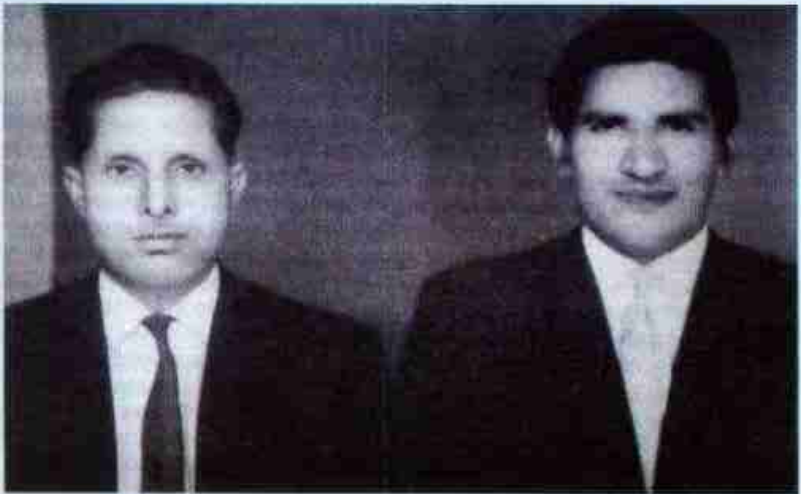
جسٹس مجید ملک، راجہ محمد اسلم ایڈووکیٹ کے ہمراہ ۱۹۶۸ء میں

مصنف بحیثیت جنرل سیکریٹری جموں و کشمیر لبریشن لیگ، خطاب کرتے ہوئے۔

مصنف جموں وکشمیر لبریشن لیگ کے پاکستان پیپلز پارٹی میں ادغام کے موقع پر جلال آباد گارڈن مظفر آباد میں
بحیثیت جنرل سیکرٹری لبریشن لیگ خطاب کرتے ہوئے، وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو، کے ایچ خورشید،
سردار ابراہیم خان صدر اور خان عبدالحمید خان وزیر اعظم آزاد کشمیر بھی سٹیج پر تشریف فرما ہیں۔

مصنف بحیثیت جنرل سیکریٹری جموں و کشمیر لبریشن لیگ، پیپلز پارٹی میں ادغام کے موقع پر
خطاب کے بعد وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو سے مصافحہ کرتے ہوئے۔

مصنف و جناب کے ایچ خورشید صدر لبریشن لیگ ۲۱ اپریل ۱۹۷۴ کو وزیر اعظم پاکستان
جناب ذوالفقار علی بھٹو کو منگلا قلعہ پر ایک استقبالیہ میں خوش آمدید کہتے ہوئے۔

دائیں سے مصنف کے علاوہ چوہدری بشیر ایڈووکیٹ، نذیر غوری ایڈووکیٹ، جناب اے کے بروہی، چوہدری عبدالمجید ایڈووکیٹ، فضل حسین ایڈووکیٹ اور جسٹس محمد یوسف صراف، جبکہ پچھلی رو میں محمد یونس سرکھوی ایڈووکیٹ، شریف طارق ایڈووکیٹ، راجہ محمد اسلم ایڈووکیٹ، راجہ لہراسب ایڈووکیٹ، مرزا زیداللہ سول جج، خواجہ عزیزالدین ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شامل ہیں۔

دائیں سے مصنف کے علاوہ برادر اصغر محمد یعقوب ملک، جناب کے ایچ خورشید، ملک محمد ایوب، ملک افتخار، چوہدری غلام نبی رچیال، دوسری رو میں چوہدری محمد اعظم، عبدالمجید بھولو، محمد طارق لون جبکہ تیسری رو میں محمد شفیق رٹوی ایڈووکیٹ، محمد عارف حسرت، ملک محمد زبیر و دیگر ڈڈیال کے مقام پر۔

جسٹس مجید ملک تقریب حلف برداری کے موقع پر ۱۸ مئی ۱۹۷۸ء کو
مظفر آباد ہائی کورٹ میں بائیں سے جسٹس جناب سردار محمد شریف،
چیف جسٹس جناب یوسف صراف، اور جسٹس جناب سید محمد خان بھی تشریف فرما ہیں۔

چیف جسٹس محمد یوسف صراف، جسٹس مجید ملک سے
بطور جج عدالت عالیہ آزاد جموں و کشمیر
حلف لیتے ہوئے (۱۸ مئی ۱۹۷۸ء)

دائیں سے مسٹر بخاری ایڈووکیٹ، جسٹس رحیم داد خان چیف جسٹس سپریم کورٹ، جسٹس شیر زمان چوہدری،
جسٹس سردار محمد اقبال خان وفاقی محتسب اعلیٰ، جسٹس راجہ خورشید کیانی، جسٹس مجید ملک، جسٹس سردار سید محمد خان
جسٹس سردار محمد اشرف خان و شیخ عبدالعزیز ایڈووکیٹ مظفر آباد میں ایک تقریب کے موقع پر۔

جسٹس مجید ملک، جنرل فیض علی چشتی وزیر امور کشمیر و جناب جسٹس یوسف صراف چیف جسٹس عدالت عالیہ
کے ہمراہ مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں دوران گفتگو
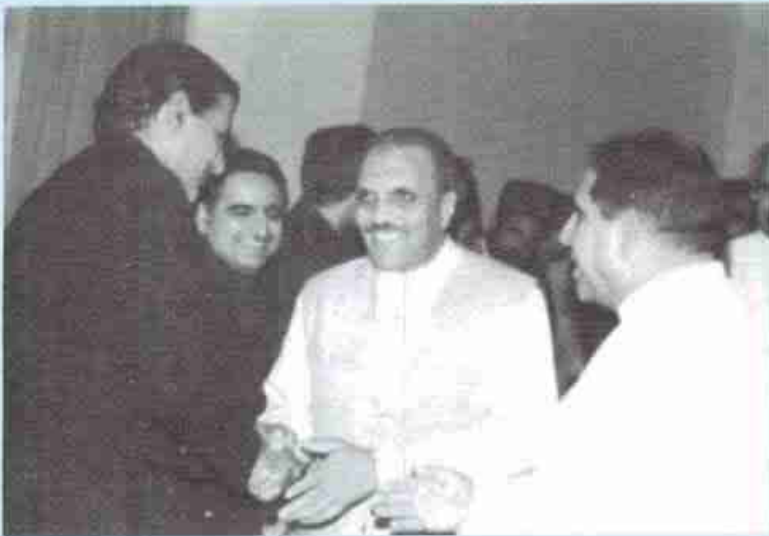
مصنف صدر پاکستان جناب ضیاء الحق سے مصافحہ کرتے ہوئے
جبکہ جسٹس خورشید کیانی اور جسٹس سردار سید محمد بھی ہمراہ ہیں۔

مصنف وزیراعظم پاکستان جناب محمد خان جونیجو کے ساتھ، ملاقات میں
جسٹس خورشید کیانی صاحب چیف جسٹس سپریم کورٹ آزاد کشمیر بھی موجود ہیں

جسٹس مجید ملک سے صدر آزاد جموں وکشمیر میجر جنرل عبدالرحمن بحیثیت چیف جسٹس
عدالت عالیہ حلف لیتے ہوئے (مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۸۳ء)

عدالت عالیہ آزاد و جموں کشمیر کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر جسٹس مجید ملک و میجر جنرل عبدالرحمن،
صدر آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر جبکہ بائیں سے جسٹس سردار سید محمد خان، جسٹس خورشید کیانی
چیف جسٹس سپریم کورٹ، جسٹس محمد اشرف وزکریا بھٹی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج / رجسٹرار عدالت عالیہ کا گروپ فوٹو
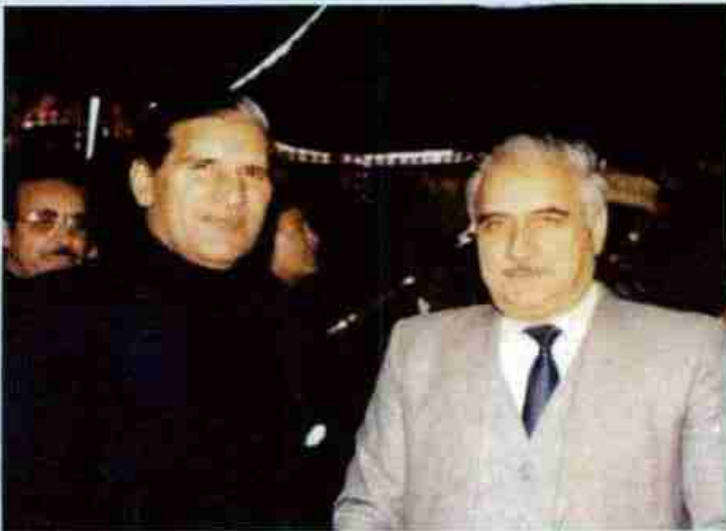
جسٹس مجید ملک، عدالت عالیہ آزاد وجموں کشمیر کی نئی بلڈنگ کے افتتاح کے موقع پر
مورخہ یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو سابق صدر جناب کے ایچ خورشید کے ہمراہ

جسٹس مجید ملک، جناب ایس ایم ظفر سابق وزیر قانون پاکستان کے ہمراہ

جسٹس مجید ملک وفاقی محتسب جناب سردار محمد اقبال کے ہمراہ ایک تقریب میں

پاکستان کے ممتاز دانشور و مفکر اور بیورو کریٹ جناب قدرت اللہ شہاب کے ہمراہ مظفرآباد میں

جسٹس مجید ملک، جسٹس راجہ محمد اکرم خان
شوکت مجید ملک اسسٹنٹ کمشنر مظفرآباد، ایک تقریب میں

جسٹس مجید ملک، محمد سعید نقشبندی ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے ہمراہ

دائیں سے جسٹس ریاض اختر چوہدری، جسٹس شیر زمان چوہدری، جسٹس مجید ملک، جسٹس خواجہ محمد سعید
۱۹۹۳ء، منگلا قلعہ، ایک فنکشن کے موقع پر لی گئی تصویر

بیگم سکندر حیات کی وفات پر، جنازہ میں شمولیت کے وقت، سکندر حیات نے مجھے یاد دلایا کہ ان کی دلہن میری کار میں لائی گئی تھی۔ لیکن دلچسپ واقعہ یہ ہے، کہ کار فورڈ پریفیکٹ سفید رنگ میں، جو کہ ان دنوں میں بہت خوبصورت کاروں میں شمار ہوتی تھی، کی میرپور میں رجسٹریشن کی لئے تحریک کی گئی، اُن دنوں شیخ غلام محی الدین ڈپٹی کلکٹر ایکسائز تھے، ان کا تعلق سرینگر کے معروف اعلیٰ خاندان سے ہے، وہ بہت ذہین اور خوبصورت افسر تھے۔ انھوں نے کار کا رجسٹریشن نمبر دیتے وقت کہا، کہ جس طرح تمہاری کار خوبصورت ہے اور تم سمارٹ ہو، اس کے مطابق نمبر بھی الاٹ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پسند کا نمبر اے کے سی ۷۷۷ الاٹ کیا۔ رجسٹریشن کی پلیٹ بابو محلہ صدر راولپنڈی سے بنوائی اور کاریگر نمبر پلیٹ کار پہ لگانے میں مصروف تھا۔ راجہ اسلم ایڈووکیٹ میرے دوست اور میں آپس میں گپ شپ لگا رہے تھے، کہ اتنے میں ایک پامسٹ ہمارے پاس آیا اور مجھے ہاتھ دکھانے کے لئے کہا۔ اسی وقت فوراً مجھے کراچی والا عنائیت اللہ یاد آ گیا، جس نے پیشن گوئی کی تھی کہ مجھے کار دسمبر کے آخر میں سال ۱۹۵۸ء میں ملے گی اور خصوصیت سے نوٹ کروایا تھا کہ کار کی نمبر پلیٹ میں سات کا ہندسہ ضرور ہوگا۔ اس پیشن گوئی میں حقیقت اور سچائی میں کمال یہ تھا، کہ مجھے کار ۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ملی اور اس کی رجسٹریشن نمبر میں نہ صرف ایک بلکہ تین ہندسے سات کے شامل تھے۔ یہ پیشن گوئی یاد آتے ہی میں اُچھل پڑا، جس پر راجہ اسلم نے حیران ہوکر پوچھا، کہ بھائی کیا ہوگیا ہے، کیوں اُچھل رہے ہو؟ جب میں نے اس کو وہ پیش گوئی سنائی تو راجہ اسلم بھی پیش گوئی پر متعجب ہوا اور ساتھ کھڑا دست شناس تو بضد ہی ہوگیا، کہ میرا ہاتھ ضرور دیکھنا ہے، مگر میں نے انکار کردیا اور اس کو دس روپے دے کر فارغ کردیا۔ عنائت اللہ نے میرا ہاتھ دیکھے بغیر ہی ہدایت کی تھی، کہ کبھی بھی کسی کو اپنا ہاتھ نہیں دکھانا۔ اس نے مستقبل میں پیش آنے والے اہم واقعات، مجھے نوٹ کروائے تھے۔

راشی جج کی برطرفی

میرپور میں میری وکالت میں دن بدن اضافہ ہونے لگا تھا۔ کار مل جانے کے بعد مشکل اور اہم مقدمات میں راہنمائی کے لئے اور بعض اوقات آخری ہفتہ گذارنے کے لئے میں، راجہ اسلم اور چوہدری احسان لاہور چلے جاتے۔ جج کو ہمارے لاہور جانے کا علم ہوا، تو انھوں نے چند اشیاء کی فہرست دی، کہ لاہور سے ان کے لئے خرید کر لائی جائیں۔ حسب فرمائش وہ اشیاء لاکر ان کے سپرد کردیں اور قیمت خرید کا بل بھی پیش کردیا۔ بل زیادہ نہ تھا، مگر وکیل ہونے اور جج کے مقدس منصب کے احساس کے تحت بل سپرد کیا۔ جج کو بل دینا ناگوار گذرا۔ دو دن کے بعد اشیاء مع بل مجھے واپس کرتے ہوئے کہا، کہ وہ اشیاء ان کی بیگم کو پسند نہ آئی ہیں، اس لئے واپس کرتے ہیں، میں نے بل اور اشیاء وصول کرلیں۔ فی الواقع مجھے جج سے واقفیت نہ تھی۔ وہ رشوت کا عادی تھا اور اگر علم ہوتا بھی، تو میں اِس گناہ کا کبھی مرتکب نہ ہوتا۔ چوہدری احسان اور راجہ اسلم نے بتایا، کہ وہ تمام اشیاء مفت لینا چاہتا تھا،

جس کی تائید عدالت کے بڑے چپراسی، خیرائت علی نے بھی کی۔ چند روز کے بعد اسلحہ ایکٹ کے تحت ضمانت کا مقدمہ ملا۔ درخواست ضمانت عدالت میں پیش کی۔ پولیس رپورٹ بھی ہوگئی۔ جرم قابل ضمانت تھا، مگر جج آخر وقت تک ٹالتا رہا۔ میں دوسری عدالت میں پیش تھا۔ اس دوران جج گھر چلا گیا۔ عملہ سے معلوم ہوا کہ درخواست ٹرے میں، ساتھ لے گیا ہے۔ میں اس کے گھر پہنچا اور درخواست واپس طلب کی۔ جج نے دھمکی بھی دی کہ میں توہین کا مرتکب ہو رہا تھا، اس دوران اس کی بیگم بھی آ گئیں۔ بڑی اچھی خاتون تھیں۔ مجھے وہ جانتی تھیں، انھوں نے درخواست مجھے واپس کروادی۔ میں دوسرے مجسٹریٹ کے پاس گیا جنھوں نے ضمانت کر دی۔ اب حالات زیادہ خراب اس وقت ہوئے، جب میرے مؤکل فضل کریم کو گھر بلوا کر، رشوت طلب کی اور میرے خلاف تو تھا ہی، مگر مؤکل کو بھی دھمکی دی۔ اس نے تمام واقعہ مجھے بتایا، میں نے اس کو صاف کہہ دیا، کہ اگر رشوت دے کر فیصلہ کروانا ہے، تو میں فیس واپس کرتا ہوں، آپ دوسرا وکیل کر لیں۔ صوفی فضل کریم نے کہا، کہ فیصلہ کچھ بھی ہو، نہ میری وکالت چھوڑے گا اور نہ ہی رشوت دے گا۔ اس نے جج کو صاف جواب دے دیا۔ زمین کے دو مقدموں میں فیصلہ ہمارے خلاف ہوگیا، مگر اپیل میں دونوں مقدموں کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگیا۔ میرے ساتھ جج کی مخاصمت منظر عام پر آ گئی، مگر میں حق اور سچائی کی جدوجہد اعلانیہ کرتا رہا۔ ڈسٹرکٹ وسیشن جج سردار یار محمد کو علم ہوا، تو انھوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی، مگر وکلاء میں اندر ہی اندر حسد اور رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اتفاق سے اسی دوران عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ کے مؤکلوں سے بھی رشوت طلب کی گئی اور رشوت نہ ملنے پر، دوسرے فریق جس کا مقدمہ کمزور تھا، اس سے رشوت لے کر فیصلہ اس کے حق میں کر دیا گیا۔ اس پر انصاری بہت سیخ پا ہوا اور مجھ سے مشورہ کیا، کہ اگر میں ساتھ دوں تو وہ جج کے خلاف ہائی کورٹ اور صدر حکومت کے پاس رشوت ستانی کی شکایت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے مؤکل صوفی فضل کریم سے مشورہ کیا، وہ شہادت دینے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں نے انصاری صاحب کو مکمل حمایت کی یقین دہانی کروادی۔ انصاری صاحب نے، مجھے اور فضل کریم کو گواہ نامزد کر کے، درخواست دے دی۔ کے ایچ خورشید حکومت کے صدر تھے، انھوں نے درخواست پیش ہوتے ہی جسٹس عبدالحمید خان، جج ہائی کورٹ کو انکوائری سپرد کر دی۔ خان صاحب کے جج کے سسرالی خاندان سے گہرے مراسم تھے اور ساتھ ہی میرے ماموں عبدالعزیز پولیس انسپکٹر اور نانا جان سے بھی مراسم تھے۔ انھوں نے مجھے بلا کر لمبی تقریر کی، کہ میں جج کو معاف کر دوں اور اس کے خلاف شہادت نہ دوں، مگر میں نہ مانا اور اپنے مؤقف پر قائم رہا، بلکہ میں نے ان کو دوٹوک بتادیا کہ اگر انصاری صاحب اب پیروی نہ بھی کریں، تو میں ہر صورت میں سچی شہادت دوں گا، بے شک ہائی کورٹ اور صدر حکومت کوئی کارروائی اور انسداد کریں یا نہ کریں۔ میرا مؤقف سن کر انصاری صاحب بھی ڈٹ گئے۔ ہمارے معاشرہ میں جب کوئی ظلم ہوتا ہے، تو سب کی ہمدردی مظلوم سے ہوتی ہے، مگر جب ظالم کے خلاف انسدادی اور تادیبی

کارروائی شروع کی جاتی ہے، تو ظالم ٹولہ، نرم، عاجزانہ اور خوشامدانہ رویہ اختیار کر کے، معافی تلافی کے لئے مستدعی ہو جاتا ہے اور صلح نامہ کی کوشش شروع کر دیتا ہے اور بااثر طبقہ کو ملوث کیا جاتا ہے۔ مظلوم جب جرم معاف کرنے یا اس میں صلح کرنے سے انکار کرتا ہے، تو بااثر طبقہ اس انکار کو انا کا مسئلہ بنا کر، مظلوم کا ساتھ دینے کے بجائے، ظالم کا ساتھ دینے پر تُل جاتا ہے۔ آج کل تو معاشرہ اتنا کمزور ہو چکا ہے، کہ ظالم اور مجرم کا دفاع خاندان اور قبیلہ، برادری کے نام اور وقار کا مسئلہ بنا کر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے رویہ اور طرزِ عمل کے تحت، ہم پر اثر انداز ہونے اور دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جج موصوف، میرے ماموں کے پاس بھی گیا اور مجھے شہادت دینے سے منع کرنے کے لئے گذارش کی۔ ماموں جان خود رشوت کے سخت خلاف تھے اور جس تھانہ میں ان کی تعیناتی ہوتی وہ علاقہ میں عوام کو اپنے حکم کے تحت، باجماعت نماز قائم کرواتے اور جمع کے وقت بازار اور کاروبار بند کروا دیتے۔ انھوں نے میرے پاس سفارش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہم نے دستاویزی ثبوت کے ساتھ صحیح شہادت دی۔ صوفی فضل کریم باوصف دباؤ کے، میرے ساتھ ڈٹا رہا۔ جسٹس حمید خان نے ہماری شہادت کی روشنی میں رپورٹ کی، حکومت نے جج کو، کرپشن کے ثبوت پر ملازمت سے برطرف کر دیا۔ آزاد جموں کشمیر کی عدلیہ میں، یہ پہلی سبکدوشی تھی۔ جج کی ملازمت سے برطرفی پر عدلیہ میں بہت اثر ہوا۔ عدالتوں میں ہمیں زیادہ احترام ملنا شروع ہو گیا۔

سات روز کی قید

جموں کشمیر میں آمریت کی بڑی قوت، جاگیرداری نظام تھا۔ جمہوریت کے قیام اور انسانی حقوق کی تحریک میں، زمین پر کسان کی ملکیت کے حق کا مطالبہ، بہت زور شور سے اُٹھایا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں سری نگر میں مسلم کانفرنس کے قیام کے وقت، اس کے نصب العین میں ذمہ دار نظامِ حکومت، زیرِ سایہ مہاراجہ بہادر کے ساتھ ساتھ، کاشتکاروں کی زمین پر، ملکیت کے حق کے حصول کو بھی، شامل کیا گیا تھا۔ مسلم کانفرنس کے پرچم پر ہل کا نشان، بطور علامت حقوقِ کسان، شامل کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا اور جماعت کا انقلابی نصب العین ترتیب دیا گیا، تو جماعت کا پرچم سبز رنگ سے سُرخ رنگ میں بدل دیا گیا، مگر کاشتکار کے زمین پر ملکیت کے حق کی علامت ہل کا نشان، سفید رنگ میں پرچم پر قائم رکھا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں جب جموں کشمیر میں، شیخ محمد عبداللہ صدر نیشنل کانفرنس، وزیرِاعظم بنا، تو اس نے تمام جاگیریں ختم کر کے، زمین کی ملکیت قابض کاشتکاروں کے حق میں منتقل کرنے کا قانون، زرعی اصلاحات کے نام سے نافذ کر دیا اور نیشنل کانفرنس کے نصب العین کو عملی جامہ پہنایا۔ اُس کے برعکس آزاد جموں کشمیر میں جہاں مسلم کانفرنس اقتدار میں تھی، یہاں نہ ہی جمہوریت قائم ہوئی اور نہ ہی جاگیرداری ختم ہوئی۔ جب میں میرپور منتقل ہوا، تو یہاں جاگیریں ختم کرنے کی تحریک چل رہی تھی۔ چنانچہ محروم اور مظلوم طبقہ کے حق میں، منعقد ہونے والے احتجاجی اجتماعات میں، میں بھی شامل ہوا اور کسانوں کے

حقوق ملکیت کے حصول کے حق میں، پُر جوش خطاب کیا، البتہ لاٹھی چارج اور گرفتاری سے وکیل ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔ مئی ۱۹۵۹ء میں کے ایچ خورشید حکومت کے صدر بنے، تو انھوں نے ۱۹۶۰ء میں جاگیریں ختم کرنے اور زمین کی ملکیت قابض کاشتکاروں کو منتقل کرنے کا، زرعی اصلاحات کا قانون نافذ کر دیا۔ اس طرح کسانوں کی تحریک کامیاب ہوگئی۔

میرپور میں منگلا ڈیم کی تعمیر کے خلاف، مسلم کانفرنس اور دیگر مقامی سیاسی جماعتوں کی قیادت نے، ڈیم کی تعمیر کے خلاف وسیع تر کمیٹی بنائی ہوئی تھی۔ کمیٹی نے ہر سطح پر رائے شماری میں ایک لاکھ آبادی کے منتقل ہونے، ووٹ کے حق سے محروم ہونے، ریاست کی سابق حیثیت تبدیل ہونے اور اسی طرح کے دیگر قانونی، سیاسی اور اخلاقی نقاط پر مشتمل اعتراضات پر تحریک شروع کر رکھی تھی۔ میرے میرپور میں منتقل ہونے سے پہلے سے، یہ تنظیم کام کر رہی تھی اور کسی مرحلہ پر اقوام متحدہ میں قرارداد بھی ارسال کی ہوئی تھی، جس پر پاکستان کی جواب طلبی بھی ہوچکی تھی۔ اس کمیٹی میں مسلم کانفرنس کے مقامی صدر، غازی الٰہی بخش، آغا عاشق حسین ایڈووکیٹ، پیر علی جان شاہ، راجہ محمد نجیب، میجر نیک عالم، سابق صدر حکومت، سید علی احمد شاہ، عوامی کانفرنس کے عبدالخالق انصاری، صوفی محمد زمان، بشیر تبسم، میجر راجہ عباس خان وغیرہ شامل تھے۔ اینٹی منگلا ڈیم کمیٹی بہت متحرک تھی، مگر اس کی تمام کارگذاری اس کے اراکین تک محدود تھی۔ ایک اجتماع میں اتفاق سے، مجھے کچھ دوست ہمراہ لے گئے اور تقریر کے لئے مجھے بھی سٹیج پر بلا لیا گیا، میں نے مختصر تقریر کی۔ کمیٹی نے ۹ر اگست ۱۹۶۰ء کو چک ہریام گاؤں، جو میرپور شہر سے ایک میل مشرق میں تھا، میں جمع کی نماز کے بعد، تمام علاقہ کے عوام کا جلسۂ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس کی بہت تشہیر کی گئی، حکومت پاکستان بہت پریشان ہوگئی، کیوں کہ متاثرہ عوام نے انخلا سے انکار کر دیا تھا اور عوام میں کافی اشتعال پیدا ہوگیا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر، حکومت آزاد کشمیر نے فوج اور پنجاب کنسٹیبلری کی نفری طلب کر لی تھی۔ آزاد حکومت کے صدر، کے ایچ خورشید، چیف سیکریٹری، آئی جی، کمشنر وغیرہ تمام عملہ دو دن پہلے سے میرپور میں موجود تھے اور جلسہ ملتوی کروانے کی کوشش میں تھے۔ حکومت کی حمایت کچھ سینئر وکلاء اور مقامی لیڈر بھی کر رہے تھے۔ حکومت پاکستان نے بہت سخت رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ پاکستان میں ایوب خان کا مارشل لاء نافذ تھا، ان کے سامنے آزاد کشمیر کے عوام کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی

میں حسب معمول عدالتوں میں گیا اور ایک دو مقدموں میں پیش ہوا، مگر ہر جگہ ڈیم کے خلاف ہونے والے جلسہ پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ شیر زمان اور راجہ اسلم کے پاس میں ابھی کھڑا ہوا ہی تھا، کہ غازی الٰہی بخش صاحب، جو تانگہ میں چک ہریام جا رہے تھے، انھوں نے تانگہ روکا اور مجھے اور شیر زمان کو ساتھ چلنے کو کہا، میں نے انکار کیا، مگر ان کے اصرار پر، ہم دونوں بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ چک ہریام میں ایک لاکھ کے قریب عوام کا اجتماع تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ نماز جمع کے بعد، اجتماع میرپور شہر کا چکر لگا کر، کالج گراؤنڈ جلسہ گاہ میں پہنچے گا، جہاں جلسۂ عام میں تقاریر کے بعد مستقبل کے متعلق لائحہ عمل کا اعلان ہوگا۔ جلوس اتنا بڑا تھا، کہ چک ہریام سے میرپور تک عوام کا ریلا تھا۔ حکومت نے جب اتنا

بڑا جلوس دیکھا، تو پریشان ہوگئی۔ اتفاق سے اچانک بارش شروع ہوگئی، مگر جلسہ گاہ میں پہنچتے تک موسم صاف ہوگیا۔ پنجاب کنسٹیبلری نے جلسہ گاہ کو گھیر رکھا تھا۔ مجھے پولیس سے اطلاع ملی، کہ جلسہ میں عوام پر گولی چلانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ میں نے غازی الٰہی بخش اور علی احمد شاہ صاحب کو اطلاع دی، جس پر دو تین تقریروں کے بعد، جلسہ ختم ہوگیا اور گولی چلانے کے مرحلہ سے پہلے ہی لوگ منتشر ہوگئے۔

ہم جلسہ گاہ سے نکل کر قریب ہی راجہ اسلم صاحب کے گھر پہنچے اور چائے پی رہے تھے، کہ اطلاع ملی کہ غازی الٰہی بخش، راجہ نجیب اور عبدالخالق انصاری وغیرہ گرفتار ہوگئے ہیں۔ میری رہائش پر ماموں جان نے، جو اُن دنوں میرپورسٹی تھانہ میں تعینات تھے، دو بار پولیس نفری کے ہمراہ، گرفتاری کے لئے چھاپہ مارا اور گھر کی تلاشی لی۔ گھر پر چھوٹا بھائی محمد یعقوب کالج سٹوڈنٹ اور چھ سال عمر کا بیٹا شوکت مجید تھے۔ وہ پریشان تو ہوئے، مگر حوصلہ نہ چھوڑا۔ راجہ اسلم کے گھر سے شیر زمان، مرزا محمد حسین اور میں، نکل کر سڑک پر پہنچے تو سامنے ریسٹ ہاؤس کے لان میں، صدر حکومت کے ایچ خورشید، چیف سیکریٹری ایس ایچ قریشی، انسپکٹر جنرل پولیس راؤ عبدالرشید اور دیگر افسران کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا، کہ وہ مجید ملک آ رہا ہے۔ غالباً میرے گھر پر نہ ملنے پر خیال کرلیا گیا تھا، کہ میں روپوش ہوگیا ہوں۔ اسی وقت ڈپٹی کمشنر کی جیپ میں، محمد صادق سوز، اے ایس آئی ہمارے پاس آیا اور سلیوٹ کر کے، مجھے کہا کہ جناب، جیپ میں تشریف رکھیں آپ کی تلاش تھی۔ ساتھ ہی شیر زمان اور مرزا محمد حسین جو مسلم کانفرنس کا کارکن تھا، ان دونوں کو بھی بٹھالیا۔ جیپ ریسٹ ہاؤس میں لے گئے۔ سوز نے صدر صاحب کو سلیوٹ کر کے کہا، سر مجید ملک کو گرفتار کر کے لے آیا ہوں۔ اسے حکم ملا کہ ان کو پولیس لائن لے جاؤ۔ ہم تینوں پولیس لائن پہنچائے گئے، وہاں سردار حمید اللہ ڈی آئی جی ہماری گرفتاری پر مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں وکیل نے، صدر حکومت کو تمہارے اور تمہارے ماموں پولیس انسپکٹر کے خلاف، خوب کانا پھوسی کی اور تمہاری وجہ سے شیر زمان بھی بلاوجہ گرفتار کرلیا گیا ہے۔ حمید اللہ ریسٹ ہاؤس میں موجود تھا، جب صدر حکومت نے ہماری گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ ہمیں تعجب ہوا، کہ ہم نہ تو کمیٹی کے رکن، نہ کبھی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی۔ میں نے بہت پہلے ایک جلسہ میں مختصر سی تقریر کی تھی۔ اس کے علاوہ اس تحریک کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا، تو پھر کمیٹی میں صف اول کے ممبران اور جلسہ جلوس کے منتظمین کے بجائے، ہمیں کیوں گرفتار کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اصل وجہ وکالت کی رقابت اور حسد تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ "ڈبویا مجھ کو ہونے نے"۔ رات کو تھانہ حوالات پہنچایا گیا۔ ماموں جان کی رہائش تھانہ میں ہی تھی۔ وہاں میرا بیٹا شوکت مجید، بھائی محمد یعقوب، ماموں زاد، محمد عارف پہلے سے موجود تھے۔ شیر زمان اور میں صبح سے ناشتہ اور راجہ اسلم کے ہاں ایک ایک پیالہ چائے پر تھے اور بھوک سے سخت کوفت میں تھے۔ ہم سے قبل دوسرے گرفتار لوگ حوالات میں بند تھے۔ اسی دوران ماموں جان کا، تھانہ ہجیرہ، پونچھ میں تبادلہ کر دیا گیا اور وہاں فوراً رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔ وہ اس تبادلہ سے ہرگز پریشان نہ تھے، البتہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہونے والا تھا، وہ اس پہ

ضرور فکر مند تھے۔ وہاں موجود نتھو خان سپاہی، جو ماموں جان کا باورچی تھا، اس سے میں نے کہا، کہ بھوک سخت ستا رہی ہے، جو کچھ موجود ہے وہ کھانے کیلئے لاؤ۔

ماموں جان نے جون ۱۹۵۵ء میں نانا جان کے ساتھ حج کیا تھا۔ جس وجہ سے وہ حاجی پولیس انسپکٹر کے نام سے مشہور تھے۔ جرأت، دیانت داری اور محکمانہ معاملات میں مہارت و عبور اور کامیابی کی وجہ سے محکمہ اور انسپکٹر جنرل پولیس کے پسندیدہ افسر تھے۔ ان کے ہاں کھانے میں دال ہی پکائی جاتی تھی۔ نتھو خان دال اور چپاتیاں لے آیا، مگر غازی الٰہی بخش اور انصاری صاحب نے یہ کہہ کر "ہم سیاسی قیدی ہیں، ہمیں اول کلاس کے قیدی کا کھانا پیش کیا جائے"۔ کھانا واپس کر دیا اور ہمیں کہا، کہ حوالات میں آپس میں اتفاق اور اتحاد سے رہنا ہوگا۔ ماموں جان نے بہت اصرار کیا، کہ ہم دونوں کو، دال روٹی جو اپنے ذاتی باورچی خانہ سے لائی گئی تھی، وہ کھانے دیں۔ مگر انھوں نے نہ مانا، بارش پھر شروع ہو گئی۔ اس دوران ایک بس آئی، جس میں پنجاب کانسٹیبلری سوار تھی۔ ہمیں باہر نکال کر ہتھکڑی لگائی گئی اور ماسوائے غازی الٰہی بخش، جن کو آزاد کر دیا گیا تھا، باقی سب کو بس میں سوار کیا گیا۔ بس کی چھت سے سیٹوں پر بارش کا پانی گر رہا تھا۔ ہمارے لباس پہلے ہی بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔ اب مزید مسئلہ پیدا ہو گیا۔ شیر زمان اور میرا نام پکار کر، ہم دونوں کو ایک ہتھکڑی لگائی گئی۔ جب بس تھانہ سے روانہ ہوئی، تو ہم نے خوب نعرے لگائے، مگر ماسوائے میرپور پولیس کے پریشان چہروں کے، شہر کے لوگوں سے کوئی چہرہ نظر نہ آیا۔ اہم بات یہ تھی، کہ پانچ بجے شام ہم گرفتار ہوئے اور گیارہ بجے رات تک تھانہ میں رہے۔ اس دوران میرپور شہر سے کوئی آدمی ہمیں ملنے نہ آیا۔ غازی الٰہی بخش، راجہ نجیب، میجر عباس، عبدالخالق انصاری کی سیاسی جماعتیں تھیں اور ان کا بڑے بڑے قبیلوں سے تعلق تھا اور ان کو بڑی توقع بھی تھی، کہ ان کی گرفتاری پر سخت ردعمل ہوگا، شہر کے لوگ اُمڈ کر سڑکوں پر نکلیں گے، مگر شہر میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ ہماری بس جب بسوں کے اڈہ سے گذری، تو ہم نے زور و شور سے نعرے لگائے، تا کہ عوام کو اطلاع ہو، مگر ہمارے نعروں پر صرف آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں کے سوا، میرپور شہر سے کوئی آواز نہ سنائی دی۔ میرپور سے براستہ کینال روڈ، سرائے عالمگیر، جہلم سے گذرنے کے بعد بس دینہ میں کی، وہاں پولیس والوں نے چائے پی، جس وجہ سے ہم کو بھی چائے پینے کا موقع ملا۔ ساتھ کھانے کو کچھ نہ تھا، کیوں کہ قریب رات دو بجے کا وقت تھا، البتہ ٹھنڈی چپاتی کے دو ٹکڑے ملے، تو ہم دونوں نے ایک ایک ٹکڑا کھایا۔ دوپہر کے وقت دولائی پہنچے، جہاں شیر زمان اور مجھے بس سے اتارا گیا، بعد میں راجہ نجیب کو بھی اتار کر ہمارے ساتھ شامل کیا گیا اور دوسری بس میں آزاد کشمیر پولیس کے سپرد کیا گیا۔ ہمیں مظفرآباد تھانہ میں لا کر، شیر زمان کو مردانہ حوالات میں اور راجہ نجیب کو زنانہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور تھوڑی دیر بعد تھانیدار نے، مجھے ساتھ والے کمرہ میں جانے کو کہا۔

اللہ تعالیٰ غیب سے رزق دیتا ہے

اس سے قبل میں صرف کوہ مری تک ہی گیا تھا، اس سے آگے سفر نہ کیا تھا۔ کوہالہ جہاں ۱۹۴۶ء میں

پنڈت نہرو کو گرفتار کیا گیا تھا اور مظفرآباد، جہاں ۱۹۳۱ء میں سکول ماسٹر عبداللہ کا، سری نگر کے سکول سے مظفرآباد تبادلہ کیا گیا تھا، جس پر سکول ماسٹر عبداللہ نے، بطور احتجاج، ملازمت چھوڑ کر ڈوگرہ حکمران کے خلاف، سیاسی حقوق کی تحریک میں حصہ لیا اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی حیثیت سے قومی لیڈر کی شہرت حاصل کی۔ وہ مظفرآباد میں نے پہلی بار ہتھکڑی لگے ہوئے، تھانہ میں قیدی کی حیثیت میں دیکھا۔ تھانیدار چوہدری فیروز مالہ کا تعلق بھمبر سے تھا، وہ میرے حسب نسب سے واقف تھا۔ اس کی رہائش تھانہ ہی میں تھی، اس نے مجھے اپنا کمرہ دیا۔ دو دن کی تھکاوٹ اور بھوک سے نیم مردہ حالت میں، چارپائی پر گرتے ہی نیند کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ رات آٹھ بجے چوہدری عبدالعزیز، اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس، جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا تشریف لائے، کوائف معلوم کیے اور چلے گئے۔ اسی دوران دس سال کی عمر کا لڑکا، ایک ٹرے میں سفید چاول گوشت کا سالن، پانی اور دہی سفید جالی دار رومال میں ڈھانپے، تھانہ میں داخل ہوا اور میرا نام لے کر پولیس سے کہا، کہ ملک صاحب کے لئے کھانا لایا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کس مہربان کے گھر سے کھانا آیا ہے، تو اس نے نام بتانے سے انکار کر دیا۔ تھانیدار کے پوچھنے پر بھی انکار کر دیا۔ میں نے کھانا تین حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصہ شیر زمان، دوسرا راجہ نجیب اور ایک حصہ خود لیا، البتہ پلیٹ ایک ہی تھی، لہٰذا باری باری تینوں نے کھانا لیا۔ رات گیارہ بجے کے قریب، آفس میں فون کی گھنٹی بجی۔ میرپور سے صدر حکومت کا حکم تھا، کہ ان کو اطلاع ملی ہے کہ مجید ملک کو چارپائی ملی ہے، چارپائی اٹھالی جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد اے آئی جی خود چیک کرنے آئے، تب میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ بہت تکلیف دہ تجربہ تھا، مگر نیند تو پھانسی کے تختہ پر بھی آ جاتی ہے۔ دوسری صبح جسم سخت اکڑا ہوا، درد کر رہا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نے، راجہ نجیب کے اصرار پر، تھانیدار سے کہا کہ میرپور فون کر کے وہاں کے حالات معلوم کرے۔ اس نے فون کرنے کے بعد بتایا، کہ اُس وقت میرپور کالج کے ہال میں، صدر حکومت کی صدارت میں جلسہ ہو رہا تھا، جس میں شہر کے لوگ اور وکلاء ہمارے خلاف اور گرفتاری کی حمایت میں تقاریر کر رہے تھے۔ یہ معلوم ہونے پر راجہ نجیب پریشان ہو گئے۔ ہمیں مظفرآباد میں پانچ روز رکھا گیا۔ میرے لئے ہر روز ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا حسب معمول آتا رہا، مگر باوجود کوشش کے میزبان کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ مظفرآباد میں پہلی بار آنا ہوا تھا اور وہ بھی گرفتار ہو کر۔ ناواقف اور اجنبی تھا، نہ جانے کس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس احسان کا احساس پیدا کیا اور حد تو یہ تھی کہ اس نمائش اور چرچا کے دور میں، میزبان نے اپنے آپ کو قطعاً ظاہر نہ کیا۔ بعد میں جتنی دفعہ مظفرآباد جانا ہوا، حتیٰ کہ بحیثیت جج اور چیف جسٹس سولہ سال چار ماہ سترہ دن، مظفرآباد میں رہا اور مصیبت اور آزمائش کے وقت، احسان کرنے والے میزبان کی، تلاش اور جستجو رہی، مگر آج تک انجانے مہربان میزبان کا سراغ نہ مل سکا۔ یہ احسان کی ایسی خلش ہے، جو اکثر مجھے احسان مندی میں بے چین کر دیتی ہے، سوچتا ہوں کہ میرے کشمیر کی خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی ہیں۔ وطن کی

دھرتی میں پوشیدہ جواہرات کی ہمیشہ تلاش رہی، کچھ مل پائے بیشتر پوشیدہ ہی رہے۔

مظفرآباد سے رات ایک بجے ہمیں بس میں سوار کیا گیا۔ دولائی سے مرزا محمد حسین کو بھی ہمارے ساتھ شامل کیا گیا اور دوسرے دن قریب عصر کے وقت، علی بیگ گردوارہ کے ایک بوسیدہ کمرہ میں ہمیں بند کر دیا گیا۔ ان چھ دنوں میں ہمارا حلیہ بالکل بگڑ چکا تھا۔ اگست کی گرمی میں پتلون قمیض، جو گھر سے پہن کر نکلے تھے، نہایت گندی اور بدبودار ہو چکی تھیں۔ داڑھی بھی بڑھ کر جانگلی آدمی کا سا حلیہ بن چکا تھا۔ علی بیگ میں ہمارے جانے پہچانے لوگ تھے، مگر وہ ہمیں پہچان ہی نہ سکے۔ ان کو رات گئے علم ہوا، وہ کھانا لائے۔ دوسری صبح باؤ سرور سینئر کلرک عدالت، ہمارے لئے شیونگ کٹ اور تین جوڑے لباس لائے۔ ایک ہفتہ کے بعد ہم نے غسل کیا، شیو کی، لباس بدلا۔ دوپہر کو میر عبدالواحد پرتکلف کھانا لائے۔ اسی دوران راجہ اسلم خان ہماری رہائی کا حکم لائے۔ انھوں نے بتایا کہ انسپکٹر جنرل پولیس، راؤ عبدالرشید نے ہماری رہائی میں کردار ادا کیا تھا، وگرنہ شاید قفس کی تنہائی میں کچھ وقت اور گذارنا پڑتا۔ اس سارے واقعہ میں فکرانگیز پہلو یہ ہے، کہ ہماری گرفتاری کے بعد، منگلا ڈیم کمیٹی کے تمام ارکان حکومت سے مل گئے۔ انصاری صاحب تنہا دولائی جیل میں قید تھے۔ ان کو صرف میں ملنے کے لئے گیا۔ ان کو تین ماہ بعد آزاد کیا گیا۔ اپنی رہائی کے بعد میں سیدھا امی جان کے پاس گیا، کیوں کہ ان کی پریشانی کا شدت سے احساس تھا۔ ان کو میری رہائی کا علم نہ تھا۔ جب گھر پہنچا تو حسب معمول امی جان ہاتھ بلند کیے جائے نماز پر دعا میں منہمک تھیں۔ میں نے بازوؤں میں لیا تو امی جان نے چونک کر بے ساختہ میرا نام لیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرا تھام کر بے شمار بوسے دیئے۔ ان کے آنسو موتیوں کی طرح میرے چہرے پر چمک رہے تھے۔ امی جان نے خوشی میں مجھے جھاڑ پلا دی، کہ تمھیں کئی بار منع کیا تھا، کہ حکومت کے خلاف تقریر مت کرو، مگر تم باز نہیں آتے۔ تمھیں کیا معلوم میں نے سات دن اور سات راتیں، کس طرح سُولی پر گذاری ہیں۔ میں نے معافی مانگ کر ماں کی تسلی کی۔ امی جان ماموں جان کے خلاف غصہ میں ناراض تھیں۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ ماموں جان نے مجھے گرفتار کیا تھا، مگر میں نے ان کو جب بتایا کہ ماموں جان نے مجھے گرفتار نہ کیا تھا، تب ان کا غصہ ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کا رشتہ کیا بنایا ہے اور کس قدر اس کے اندر اولاد کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں ماں کائنات میں انمول تحفہ ہے۔

میرے خلاف انکوائری

اب وکالت میں میرا کام بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا، مگر جوں جوں کام میں ترقی ہو رہی تھی، میرپور ایک چھوٹی جگہ ہونے کی وجہ سے رقابت اور حسد میں اندر ہی اندر اضافہ ہو رہا تھا، جس کا مجھے احساس نہ تھا۔ جو وکیل صدر حکومت کے قریب تھے، انھوں نے سازش سے صدر کو یقین دہانی کروائی، کہ میرے ماموں جن کی دوبارہ تعیناتی تھانہ افضل پور میں ہو چکی تھی، وہ تھانہ میں اپنے اثر کے تحت علاقہ کے مقدمات میں مجھے وکیل کرواتے ہیں۔ اس شکایت کی

روشنی میں، شکایت کنندہ کی صوابدید کے تحت، خواجہ اقبال انسپکٹر، جن کا تعلق جموں شہر سے تھا اور مرزائی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، کو انکوائری سپرد ہوئی۔ انکوائری خفیہ رکھی گئی تھی لیکن جن حلقوں نے انکوائری قائم کروائی تھی، ان میں خوشی تھی اور سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ میں اس سے لاعلم تھا اور بالفرض علم ہوتا بھی، تو میں حقائق تو نہ چھپا سکتا تھا۔ خواجہ اقبال نے سیشن جج اور اے ڈی ایم عدالت میں، جن مقدمات میں، میں وکیل تھا، ان کی فہرستیں حاصل کیں۔ اس مرحلہ پر عدالت کے عملہ سے اس قدر علم ہوا، کہ میرے مقدموں کے متعلق تحقیقات ہو رہی ہے۔ تمام تحقیقات دو ماہ میں مکمل ہو کر رپورٹ پیش ہوئی، تو مخالفین کو سوائے پشیمانی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس تھانہ کے تمام مقدمات میں، میں ماموں جان کی تعیناتی سے قبل سے ہی وکیل مقرر تھا۔ اس طرح یہ حربہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

پہلا قتل کا مقدمہ

میرپور میں منتقل ہونے کے دو ماہ بعد ہی، مجھے ہائی کورٹ کا لائسنس جاری ہو گیا تھا۔ جلد ہی چکسواری میں وقوعہ قتل کا مقدمہ مجھے ملا۔ میں ملزم کی طرف سے پیروی کے لئے وکیل مقرر ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے سینئر وکیل مقرر تھے۔ دن کا واقعہ تھا، چشم دید گواہان غیر جانبدار تھے۔ میں لاہور ظفر صاحب کے پاس، مشاورت کے لئے گیا۔ ہم نے سیلف ڈیفنس کی حکمت عملی طے کی، گو کہ ملزم کے جسم پر خراش تک نہ آئی تھی۔ شہادت کے مرحلہ پر بھی میں شام کو لاہور جاتا۔ رات کو جرح کی حکمت عملی تیار کر کے، صبح لاہور سے آ کر گواہان پر جرح کرتا۔ میں نے اُس کیس میں حتی المقدور محنت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملزم کو صرف سات سال سزا ہوئی۔ ہائی کورٹ اپیل میں دو سال مزید کم ہو گئی۔ اس کے بعد قتل کے مقدمے ملنا شروع ہو گئے۔

میاں محمود علی قصوری کے مدمقابل

میرپور تھانہ کے گاؤں پنیام میں عبدالرحمٰن، نوعمر قتل ہو گیا۔ قاتل لالہ موسیٰ کا، ملزم اس کا اپنا سالا تھا۔ عبدالرحمٰن متاثرہ منگلا ڈیم تھا، اس نے لالہ موسیٰ میں زمین خرید کی تھی، وہاں ایک خاتون سے محبت ہو گئی۔ دونوں نے شادی کر لی، مگر لڑکی کے خاندان کی ناراضگی کی وجہ سے، وہ پنیام میں واپس آ گئے۔ لڑکی کی ماں عیدالفطر پر بیٹی کے پاس آئی اور راضی ہو جانے کی یقین دہانی کروائی۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر لڑکی کا بھائی آیا۔ عید کی دوسری رات تینوں ایک کمرہ میں سوئے تھے۔ تین بجے رات کو، لیاقت ملزم نے عبدالرحمٰن کے سر پر ٹوکہ کا وار کیا، عبدالرحمٰن کی چیخ پر ارشاد بیگم بیدار ہو گئی اور لیاقت ٹوکہ سر کی ہڈی سے نکال کر دوسرا وار کرنا ہی چاہتا تھا، کہ لڑکی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور شور کیا، جس پر لیاقت اندھیرے میں باہر نکل کر غائب ہو گیا۔ دوسرے مکان میں عبدالرحمٰن کا بھائی اور ماں سوئے تھے، وہ شور پر بھاگ کر آئے، تو دیکھا کہ کمرہ میں لڑکی رو رہی تھی اور اس کا بھائی غائب تھا۔ انھوں نے قتل کی رپورٹ میں دونوں بہن بھائیوں کو ملزم نامزد کر دیا، کہ دونوں نے مل کر قتل کیا تھا۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ ملزم لیاقت

کی طرف سے سرگودھا کے مشہور وکیل، ملک اقبال کو وکیل مقرر کیا گیا تھا اور مستغیث پارٹی نے مجھے وکالت نامہ دیا۔ ابھی چالان پیش نہیں ہوا تھا، البتہ تفتیش مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے سارے ریکارڈ کا جائزہ لینے کے بعد، فیصلہ کیا کہ لڑکی کو گواہ بنایا جائے، مگر پولیس افسران اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ میں نے حوالات میں لڑکی سے ملاقات کی۔ اس نے یقین دہانی کروائی، کہ وہ بھائی کے خلاف شہادت دے گی۔ میں نے پولیس سے کہا، کہ لڑکی آزاد کر کے بطور گواہ چشم دید، اس کا بیان لیا جائے۔ میں نے مجسٹریٹ کے پاس بھی لڑکی کا بیان نہ کروایا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ ایک ہفتہ میں شہادت مکمل کر کے بحث ہو کر، راجہ امداد علی سیشن جج نے فیصلہ سنا دیا۔ لڑکی نے خاوند کے حق میں اور بھائی کے خلاف صحیح شہادت دی۔ ملک اقبال نے اشتعال کا پہلو پیش کیا، جس پر ملزم کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ ہائی کورٹ میں، اپیل میں میاں محمود علی قصوری پاکستان کے نامور وکیل، لاہور سے تشریف لائے تھے۔ اس روز پاکستان کے نامور وکیل اے کے بروہی صاحب، کسی دوسرے مقدمہ میں میرپور آئے ہوئے تھے، عدالت میں وہ بھی موجود تھے۔ کمرہ عدالت وکلاء اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ قصوری صاحب نے ایک ہی دلیل پیش کی، کہ ملزم کے خلاف صرف ایک گواہ، اس کی بہن پیش ہوئی ہے اور وہ چونکہ ملزمہ نامزد تھی اور گرفتار ہو کر بند حوالات بھی رہی تھی، اس طرح ملزمہ کی شہادت کی قانون میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ انھوں نے ایک فیصلہ بھی اپنی دلیل کی تائید میں پیش کیا۔ جج صاحبان فوراً قائل ہو گئے۔ انھوں نے ایڈووکیٹ جنرل سے سوال کیا، اس نے بھی قصوری صاحب کی دلیل کی تائید کر دی۔ میں سب سے آخر میں بیٹھا تھا، میں نے کہا کہ میں مستغیث کی طرف سے وکیل ہوں اور قصوری صاحب کے اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ جج صاحبان نے مجھے کوئی خاص وقعت نہ دی، اور رسمی طور پر کہا، کہ آپ کیا اضافہ کریں گے؟ بحث انگلش میں تھی، قصوری صاحب کی وکالت میں مسلمہ حیثیت، شخصی وجاہت، بلند آواز اور دانش کے سامنے میں نوعمر، ناتجربہ کار، عام قد و قامت، میانہ عقل و دانش کا حامل وکیل، سب نے سمجھ رکھا تھا، کہ میں نے محض رسمی بات کر کے، فیس حلال کرنی ہے، ورنہ فیصلہ تو ہو چکا۔ میں نے بہت تحمل اور اعتماد کے ساتھ ابتداء کی، کہ خاتون کی شہادت قانون کے تحت نہایت اہم ہے، جو کہ وجہ سزائے موت کے لئے جائز اور کافی ہے، اس کی تائید میں دلیل پیش کی، کہ ضابطہ کے تحت کسی کو ملزم گردانے کے تین مرحلے ہیں۔ اول مرحلہ، رپورٹ ابتدائی میں ملزم نامزد ہونا، دوسرا مرحلہ، گرفتار ہو کر شامل تفتیش رہنا، جس میں مجسٹریٹ کا پولیس کو ریمانڈ دینا شامل ہے اور تیسرا اور آخری مرحلہ ہے، عدالت میں چالان ہو کر ٹرائیل ہونا۔ میں نے بتایا کہ میاں صاحب نے جو دلیل پیش کی اور اس کی تائید میں، جس فیصلہ کا بطور نظیر حوالہ دیا ہے، اس کا اطلاق تیسرے اور آخری مرحلہ کے ملزم پر ہوتا ہے، جب کہ مقدمہ زیر بحث میں، چشم دید گواہ کو پولیس نے چالان عدالت میں پیش کرنے سے قبل ہی، بے گناہ قرار دے کر گواہ رکھا ہے۔ اپنی دلیل کی تائید میں اے آئی آر ۱۹۳۲ء کے فیصلہ کا حوالہ دے کر، متعلقہ حصہ پڑھ کر سنایا اور بحث ختم کر دی۔ عدالت برخاست ہوتے ہی، بروہی صاحب نے مجمع میں بغلگیر ہو کر مجھے بوسہ دیا اور برملا کہا، مجید تمہاری جگہ میرپور

نہیں، بلکہ کراچی یا لاہور میں ہے اور تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ قصوری صاحب کا بڑا پن تھا، کہ انھوں نے مجھے بہترین دلائل پر مبارک باد دی۔ میرپور کے وکلاء اور عوام کے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔ اسی دوران جج صاحبان چوہدری رحیم داد، ملک محمد اسلم اور محمد یوسف صراف نے مجھے، ریٹائرنگ روم میں طلب کیا اور خلاف توقع گلے لگا لیا اور برجستہ کہا، کہ مجید ملک آج تم نے جموں کشمیر کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ یہ ان کی شفقت و بندہ پروری تھی۔ میری یہ شہرت قصوری صاحب کے ذریعہ لاہور اور بروہی صاحب کے ذریعہ کراچی تک جا پہنچی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، جس نے شعور عطا کیا اور زبان میں روانی اور دل میں جرأت کی نعمت عطا فرمائی۔ علم انسان کی طاقت اور محنت صلہ ہے۔ ایسے ہی کئی عدالتی معرکے ہیں، جن کی اس تصنیف میں کم گنجائش ہے، البتہ چند مقدموں کا ذکر ضروری ہے۔ ابتدائی عدالت میں ڈڈیال کی ایک معروف اور متمول خاندان کی خاتون کا تنسیخ نکاح کا مقدمہ چلا۔ خاوند کی طرف سے میں وکیل تھا اور بیگم کی طرف سے، یوسف صراف صاحب تھے۔ ماتحت عدالتوں سے فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تھا۔ ہائی کورٹ میں سردار ابراہیم خان صاحب کو خاتون کی طرف سے وکیل کیا گیا۔ سردار صاحب کا مقام بہت بڑا تھا۔ وہ سابق صدر حکومت اور بیرسٹر تھے، ان کا احترام بھی تھا۔ اپنے مؤکل کو میں نے کہا، کہ وہ باہر سے کوئی وکیل لانا چاہتے ہیں تو ضرور لے آئے، مگر وہ نہ مانا اور اس نے کہا، کہ فیصلہ جو بھی ہو، مگر بحث آپ نے ہی کرنی ہے۔ سماعت کے روز کمرہ عدالت وکلاء، طلباء اور عوام سے بھر چکا تھا۔ تمام دن بحث ہوئی۔ اسلامی فقہ اور فیصلہ جات بطور نظیر پیش کیے گئے۔ فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔ عوام میں اس فیصلہ کا بہت چرچا ہوا۔

عدالت میں سول اپیل میں بحث کے دوران، کمرہ عدالت وکلا اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ کافی طویل بحث کے بعد فارغ ہو کر، بار روم میں پہنچا ہی تھا، کہ چند لوگ آئے اور انھوں نے بتایا، کہ وہ لاہور سے تعلق رکھتے تھے، ان کا ہائی کورٹ میں مقدمہ تھا اور وہ لاہور سے کسی آدمی کا، چیمہ صاحب کے نام سفارشی خط لائے تھے، مگر ابھی ابھی عدالت میں آپ کی بحث سننے کے بعد، انھوں نے چیمہ صاحب کے بجائے، مجھے وکیل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ محمد یحییٰ چیمہ صاحب، بہت قابل اور سینئر وکیل تھے، جن کا احترام تھا اور یوں بھی دوسرے وکیل کا مقدمہ اس طرح لینا خلاف اخلاق تھا، لہٰذا میں نے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چیمہ صاحب ان کو ساتھ لئے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے، کہ ان لوگوں نے انھیں سب بات بتائی ہے، کہ آپ نے ان کا مقدمہ لینے سے انکار کیا ہے۔ مگر ان کی خواہش ہے کہ آپ ہی ان کے مقدمہ میں پیروی کریں۔ اس لئے میں خود سفارش کرنے آیا ہوں۔ چیمہ صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ مقدمہ کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا، مگر اس سے تجربہ یہ ہوا، کہ وکیل جب عدالت میں مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں، تو عدالت میں موجود لوگ، وکلاء کے انداز وکالت اور عدالت کے رویہ وغیرہ، ہر چیز کو غور سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور وہ خود، فیصلہ کرتے ہیں، کہ انھوں نے کس کو اپنا مقدمہ سپرد کرنا ہے۔ لہٰذا وکلا کو عدالت کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اپنا مؤقف، صحیح طور پر، پورے اعتماد اور جرأت سے پیش کرنا چاہیے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی الجھن

میں حسب عادت سحری کے وقت اُٹھتا ہوں۔ ایک رات زور زور سے دستک ہوئی۔ سحری سے بھی پہلا وقت تھا۔ دیکھا کہ دلہن اور دولہا شادی کے لباس میں، دو اور لوگوں کے ہمراہ، پریشان حال کار سے اُتر کر آئے ہیں۔ اُس غیر متوقع وقت میں آنے کی وجہ بیان کی، کہ دولہا بارات لے کر سسرال پہنچا، تو رات کو ان کو اطلاع ملی، کہ مخالف گروپ کے لوگ پولیس کے پاس رپورٹ کر رہے تھے، کہ دلہن پہلے سے ان کی منکوحہ ہے اور دولہا نکاح پر دوسرے نکاح کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے، لہٰذا دوسرا نکاح روکا جائے۔ بقول لڑکی کے اس کا پہلے کوئی نکاح نہ ہوا تھا اور مخالف پارٹی شادی کی تقریب خراب کرنے کی غرض سے جھوٹی رپورٹ کر رہی تھی، لہٰذا پولیس کارروائی سے قبل ہی، وہ مجسٹریٹ کے پاس اپنا بیان قلمبند کروانا چاہتی تھی۔ گاؤں میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ دلہن مخصوص لباس میں ویسے ہی، خوبصورت معلوم ہوتی ہے، مگر گاؤں کی بچیاں شہروں کی بچیوں کے برعکس، جدید میک اَپ سے آشنا نہ تھیں اور نہ ہی اُن دنوں میرپور میں بیوٹی پارلر قائم ہوئے تھے۔ دیہات میں خداداد حُسن پر تکیہ ہوتا تھا۔ دلہن کے لباس اور تازہ حنا کی خوشبو بہت بھلی اور دلکش تھی اور حُسن میں قدرتی نکھار اور دلفریبی تھی۔ اتفاق سے اس روز، ماسوائے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے، اور کوئی مجسٹریٹ موجود نہ تھا۔ دلہن کو بیان کیلئے ان کی عدالت میں پیش کیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دلہن کی طرف دیکھتے ہوئے، نام دریافت کیا تو بجائے نام بتانے کے، اُس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے ہنسنے سے منع کیا اور کہا، اپنا نام بتاؤ۔ وہ قدرے سنجیدہ ہوئی اور نام بتایا۔ میں نے اس کے والد کا نام اور سکونت وغیرہ لکھوائی۔ مجسٹریٹ نے پھر اس سے مخاطب ہو کر بیان دریافت کیا، تو وہ منہ بند کر کے پھر ہنس پڑی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنجیدہ ہو کر، مجھ سے مخاطب ہوئے اور انگریزی میں دریافت کیا، کہ بجائے بیان دینے کے، لڑکی ان کی طرف دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتی ہے، میں نے لڑکی کو تنبیہ کی کہ وہ ہنسنا بند کرے اور اپنا بیان لکھوائے۔ اس نے بیان دیا اور کچھ میں نے مکمل کروایا۔ وہ پرائمری تک پڑھی تھی۔ اس نے بیان پر دستخط کیے اور میرے آفس میں پہنچ کر خوب ہنسی۔ اس کی بار بار ہنسی پر مجھے، بہت تعجب تھا، پوچھا کہ وہ کس بات پر ہنستی ہے۔ جس پر اُس نے کہا وکیل صاحب آپ نے دیکھا نہیں، کہ بیان لینے والا افسر بار بار مجھے آنکھ مار رہا تھا، حالانکہ میں دلہن تھی، اُس کو مجھے آنکھ نہیں مارنی چاہیے تھی۔ اس پر بات میں ہنستی تھی، کہ اس افسر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُس کی وضاحت پر میں بھی خوب ہنسا۔ میرپور میں لڑکی کو آنکھ سے اشارہ کرنا، آنکھ مارنا کہا جاتا ہے، جو بُری نظر یا بدچلنی کے زمرہ میں آتا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو، آنکھیں جھپکنے کی نفسیاتی عادت تھی، جب وہ لڑکی سے مخاطب ہوا اور پلکیں جھپکیں، تو لڑکی نے اس کو آنکھ مارنا سمجھا۔ میں نے اس کو بتایا، کہ مجسٹریٹ کو آنکھیں جھپکنے کی عادت تھی، تو وہ پریشان ہو کر معافی مانگنے لگی۔ میں نے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، جو ڈپٹی کمشنر بھی تھے، کو لڑکی کی غلط فہمی بتائی، تو اس پر وہ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہا، کہ اس سے پیشتر بھی کئی خواتین کو، اُن کے متعلق غلط فہمی ہوئی تھی اور اُن کو ندامت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ایس ڈی ایم کا شکوہ

ایک صاحب میر پور میں ایس ڈی ایم تعینات تھے، ہم عمر تھے، ان سے بہت بے تکلفی بھی تھی اور وہ تھے بھی کنوارے۔ ماہ اگست کی بات ہے، کہ عدالت کا وقت ختم ہونے کو تھا، کہ ایک صاحب برقعہ پوش خاتون کو ساتھ لے کر آئے، کہ اس خاتون کا نکاح ہونا ہے، مگر کچھ لوگ رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ لہٰذا حفظِ ماتقدم کے طور پر بیان کروانا ہے، کہ خاتون بالغ ہے اور رضامندی سے شادی کر رہی ہے۔ ایسے بیان کو عدالتی یا کورٹ میرج کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کام تو صرف ایک پیشی کا ہوتا ہے، مگر وکیل کو فیس کافی ملتی ہے۔ میں پہلے دیکھنے کے لئے گیا، کہ کوئی مجسٹریٹ موجود بھی ہے کہ نہیں۔ اتفاق سے ایس ڈی ایم کام ختم کر کے اُٹھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ایک خاتون کا ضروری بیان کروانا ہے، اس کا بیان قلمبند کر لیں۔ انھوں نے کہا، اب عدالتی وقت ختم ہو گیا ہے، لہٰذا دوسرے روز پیش کریں۔ میں نے کہا کہ خاتون اتنی خوبصورت ہے، کہ کبھی بھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ سُن کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا اچھا ایسی بات ہے، تو پھر اس کو پیش کرو۔ میں نے پہلے لڑکی کا چہرہ نہ دیکھا تھا، کیوں کہ وہ برقعہ میں تھی اور خوبصورتی کا اظہار بغیر دیکھے کیا، تا کہ ایس ڈی ایم خوش ہو کر بیان ریکارڈ کر لے۔ مگر جب اس لڑکی کو میں نے دیکھا، تو سیاہ رنگ، پسینہ سے شرابور بدن اور اتنی بدصورت اور بدشکل کہ اسے دیکھ کر خوف آ گیا۔ میں نے یہ دیکھ کر سوچا، کہ ایس ڈی ایم خاتون کا خوفناک چہرہ دیکھ کر، بجائے بیان قلمبند کرنے کے، بھاگ جائے گا۔ میں نے لڑکی سے کہا، کہ بیان دینے سے قبل یا بیان دیتے وقت، مجسٹریٹ کے اصرار اور حکم کے باوجود، چہرہ نہ دکھانا۔ البتہ بیان قلمبند ہونے کے بعد، جب میں کہوں تب چہرہ دکھانا ہوگا اور بہانہ یا عذر پیش کرنا، کہ باپردہ خاندان کی خاتون ہوں، اس لئے چہرہ نہیں دکھا سکتی، ایسا ہی اس نے کیا۔ ایس ڈی ایم نے بیان لینے سے قبل بہت اصرار کیا، کہ چہرہ دکھاؤ، مگر لڑکی نے وہی عذر پیش کیا۔ میں نے ضمانت دی، کہ آپ بیان قلمبند کر لیں، لڑکی چہرہ ضرور دکھائے گی، مگر ایس ڈی ایم بہت بے قرار اور بے صبر تھا۔ تاہم میری یقین دہانی پر اس نے حسب اظہار، بیان قلمبند کر لیا اور دستخط بھی کر دیئے۔ اس پر میں نے لڑکی سے کہا، اپنی شناخت کے لئے صاحب کو چہرہ دکھادو۔ لڑکی نے ڈرامائی انداز میں میری سمجھ سے بھی بڑھ کر کہا، کہ وکیل صاحب آپ کے اور مجسٹریٹ صاحب کے حکم پر، پردہ اُٹھا رہی ہوں اور ساتھ ہی برقعہ اُٹھایا، تو وہ مرحلہ ناقابل فراموش ہے، کہ ایس ڈی ایم نے چہرہ کی جھلک پڑتے ہی زور سے چیخ کر کہا، اوہ اللہ، یہ چڑیل کہاں سے لائے ہو اور کرسی چھوڑ کر کمرہ عدالت سے بھاگ گئے اور مستقبل میں بھی شکایت کرتے رہے۔ بعد میں سیکریٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، مگر جب بھی ملے یہی کہا ''او ملک شی واز ہاریبل، مائی گاڈ''۔

خواب میں وکیل کرنے کا حکم

میرے ساتھ چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ، راجہ اسلم اور چند دیگر وکلاء چائے پی رہے تھے، کہ ایک

دیہاتی، سادہ لباس میں وہاں قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے کہا بھائی جان، ملک عبدالمجید وکیل کا دفتر کہاں ہے؟ میں نے بتایا کہ یہی دفتر ہے، کیوں کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں نے اُن کو وکیل کرنا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس عدالت میں مقدمہ ہے؟ اس نے بتایا، کہ ہائی کورٹ میں اپیل دائر ہے اور فلاں وکیل صاحب کو مقدمہ سپرد کیا ہے، مگر مجھ کو تسلی نہیں ہے۔ میں نے بتایا کہ میں ہی ملک عبدالمجید ہوں، مگر تمہارا پہلا وکیل بہت قابل ہے، لہٰذا میں ان کا مقدمہ نہیں لے سکتا۔ اس نے بہت منت سماجت کی مگر میں نہ مانا۔ شام کے وقت وہ دیہاتی میرے گھر آ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ نماز اور نفل ادا کرنے کا پابند ہے، جاٹ قبیلہ سے اِس کا تعلق ہے اور سماہنی کا رہنے والا ہے۔ ایک مقامی راجپوت جو بہت بااثر تھا، اس نے اس کی زمین کی ملکیت کا دعویٰ کیا تھا اور ماتحت دو عدالتوں نے، مخالف فریق کے حق میں فیصلہ کیا تھا، اس کے پاس اور کوئی اراضی نہ تھی اور نہ ہی کوئی دیگر ذریعہ معاش تھا۔ اس نے دلچسپ بات بتائی، کہ اس نے استخارہ بھی کیا اور رات سونے سے پہلے دعا کی، کہ اللہ تعالیٰ میری مدد کرے اور مشکل آسان کرے۔ چنانچہ تین راتوں کو دعا کا عمل خشوع وخضوع سے دہرایا، تو تینوں دفعہ سحری کے وقت، تہجد کی نماز سے قبل، خواب میں سبز چوغہ پہنے ایک بزرگ نے مخاطب ہو کر کہا، کہ میر پور میں ملک عبدالمجید کو وکیل مقرر کرو، فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ پہلا وکیل بھی رہے گا، مگر ہائی کورٹ میں بحث آپ کریں، جتنی فیس آپ طلب کریں گے اس سے زیادہ فیس دینے کو تیار ہوں۔ اس مرحلہ پر پریشانی میں، اس کے آنسو بہہ نکلے۔ اس پر میں نے مشروط حامی بھری، کہ اگر پہلے سے مقرر کیا ہوا وکیل، مجھ سے کہے تو میں بحث کر دوں گا۔ دوسرے روز سینئر وکیل نے سفارش کی اور میں نے مقدمہ لے لیا۔ بہت محنت کر کے بحث کی، تو فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا، مگر اس آدمی کو خواب میں آنے والے بزرگ کی ہدایت پر اتنا یقین تھا، جو ناقابل بیان ہے۔ اس نے مجھے کہا، آپ صرف عدالت میں پیش ہوں، فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا۔ اس نے فیصلہ ہونے کے بعد، خواب کا واقعہ بار بار سنایا۔

سردار بلور کا خواب

سہنسہ میں سدھن قبیلہ کا، راجوری کے مہاجر خاندان سے، متروکہ اراضی پر قبضہ کا تنازعہ تھا۔ لڑائی میں تین آدمی قتل ہو گئے اور ایک دو زخمی بھی ہوئے۔ مقدمہ رجسٹر ہوا، چھ ملزمان چالان ہوئے۔ ملزمان سدھن قبیلہ کے تھے اور ان کے وکیل راولپنڈی کے معروف وکیل، سردار اسحاق خان تھے۔ ہم چند وکلا بار روم میں گپ شپ لگا رہے تھے، کہ سیشن جج خواجہ علی محمد نے طلب کیا اور کہا، کہ ایک ملزم، بلور خان، بار بار کہہ رہا ہے، کہ اس کے وکیل ملک صاحب ہیں اور آپ پیش نہیں ہو رہے۔ مجھے تعجب ہوا، کیوں کہ میں اس مقدمہ میں وکیل ہی نہ تھا۔ خواجہ علی محمد کا تعلق محلہ مائسومہ، سرینگر سے تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان دنوں کوٹلی ضلع نہ بنا تھا، بلکہ میر پور کی تحصیل تھی اور وہاں کے قتل کے مقدموں کی سماعت، میر پور سیشن کورٹ میں ہوتی تھی، اس وقت اسلامی قوانین کا نفاذ بھی نہ ہوا تھا۔ میں

نے خواجہ صاحب کو بتایا، کہ میں اس مقدمہ میں وکیل نہ تھا۔ اس پر ایک ملزم بلور خان نے درخواست کی، اس کے کہنے پر مجھے طلب کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں اس کی طرف سے پیروی کروں۔ مقدمہ دوسرے روز کے لئے ملتوی ہوگیا، کیوں کہ سماعت شہادت کے مرحلہ پر تھی، گواہ حاضر تھے۔ جب میں بلور خان سے علیحدگی میں اس سے ہدایات لینے اور صفائی کا موقف اختیار کرنے کے لئے، مشاورت کے لئے ملا، تو اس نے کلمہ طیبہ پڑھ کر حلف پر کہا، کہ وہ قطعی بیگناہ تھا، وہ صاف گو اور کھری کھری بات میں تنقید کرتا تھا، اس وجہ سے مخالف گروپ کی ترغیب پر، اس کو ملوث کیا گیا تھا۔ مزید بتایا کہ وہ تلاوت اور نماز کا پابند تھا، اپنی معصومیت اور بیگناہی پر، رات بیداری اور عبادت میں گذارتا تھا۔ چنانچہ سحری کے وقت، ایک نورانی چہرہ والے بزرگ نے اُونگھ میں مجھے کہا، تم بیگناہ ہو، ملک عبدالمجید کو وکیل مقرر کرو، تم سرخرو ہو جاؤ گے۔ اس نے کہا، میں نے دوسرے ملزمان کے ساتھ سردار اسحاق، جو سدھن قبیلہ کا مشہور اور قابل وکیل ہے، کو مقرر کیا تھا، مگر دو دفعہ خواب میں بزرگ شخص نے آپ کا نام لے کر، تاکید کرتے ہوئے کہا، کہ آپ کو وکیل کروں، حالانکہ آپ سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ لہٰذا دوسرے ملزمان اور سردار اسحاق کو، ناراض کرکے، آپ کو وکیل کیا ہے۔ ہم نے محنت سے، مقدمہ میں بلور خان کا دفاع کیا۔ تین ملزموں کو سزائے موت، دو کو عمر قید ہوئی اور بلور خان بری ہوگیا۔ ہائی کورٹ میں سزائے موت کے مجرموں نے، سردار ابراہیم کو اور عمر قید سزا کے مجرموں نے، مجھے وکیل کیا۔ عمر قید والے دونوں بری ہوگئے اور بلور خان کی بریت بحال رہی۔ سزا موت کے دو مجرمان کو عمر قید اور ایک ملزم خان محمد کی سزائے موت کی توثیق ہوگئی۔ بلور خان کی خواب میں، وکیل بدلنے اور مجھے وکیل کرنے کی، کسی بزرگ شخصیت کی ہدایت یا حکم کا واقعہ بہت مشہور ہوا۔ بلور خان واقعی وقوعہ قتل میں شامل ہی نہ تھا، جس کا علم علاقہ کے عوام کو بھی تھا، اسی وجہ سے اس کا چرچا بھی ہوا۔

جس کو اللہ رکھے

راجہ محمد خان، بہت خوبصورت اور زیرک نوجوان تھا۔ کھوئیرٹہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بڑے بھائی سے قتل ہوگیا۔ رپورٹ میں مستغیث پارٹی نے، دونوں بھائیوں کو فائرنگ میں منسوب کرکے ملوث کردیا۔ یوسف صراف سیشن کورٹ میں ان کے وکیل تھے، جس بھائی کے فائر سے مقتول زخمی ہوا تھا، وہ بری ہوگیا اور جو بیگناہ تھا، اس کو سزائے موت ہوگئی۔ یوسف صراف ہائی کورٹ میں جج بن گئے۔ محمد خان نے ہائی کورٹ میں، اپیل دائر کی اور بعد میں مجھے وکیل مقرر کیا۔ اسی دوران ۱۹۷۰ء کے صدر حکومت کے انتخاب میں، سردار عبدالقیوم صاحب، صدر کے عہدہ پر فائز ہوگئے تھے۔ ابھی اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہوا تھا اور صدر کو مروجہ عبوری دستور کے تحت، سزائے قید یا موت معاف کرنے اختیار حاصل تھا۔ اس وقت سپریم کورٹ بھی قائم نہ ہوئی تھی۔ سہنسہ کے تہرے قتل کے مقدمہ میں، خان محمد نامی شخص کو سزائے موت ہوئی تھی، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ خان محمد کی طرف سے صدر حکومت کے

پاس سزائے موت کی معافی / رحم کی درخواست دائر تھی۔ اس کا تعلق سدھن قبیلہ سے تھا اور سردار محمد ابراہیم، اس کے ہائی کورٹ میں وکیل بھی تھے۔ سردار ابراہیم خان نے، سردار عبدالقیوم صدر حکومت کے پاس، سزائے موت معاف کرنے کی سفارش کی، جو منظور ہوئی، مگر رحم کی درخواست کی منظوری اور سزائے موت کی معافی کا حکمنامہ، جو سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل میرپور کے نام جاری ہوا تھا، اس میں مجرم کا نام خان محمد خان کے بجائے، صرف محمد خان لکھا گیا۔ یہ دونوں مجرم ایک ہی جیل میں تھے۔ دونوں کو سزائے موت ہوئی تھی۔ حکومت کی طرف سے جاری حکم میں، مجرم کی ولدیت، قومیت، سکونت مقدمہ کا نمبر، فیصلہ کی تاریخ وغیرہ کچھ بھی درج نہ تھا، صرف نام، جرم اور سزائے موت کا اندراج تھا۔ جس روز ہائی کورٹ میں راجہ محمد خان کی بحث تھی، اسی دن میرپور جیل نگران کو صدر کی جانب سے، سزائے موت کی معافی کا حکم ملا۔ میں ہائی کورٹ میں بحث کر رہا تھا اور اپنے حق میں مختلف فیصلوں کا بطور نظیر حوالہ دے رہا تھا، کہ محمد خان آزاد حالت میں، کمرہ عدالت میں داخل ہوا اور حیران کن اطلاع دی، کہ صدر کے حکم کے تحت، اس کی سزا معاف ہو گئی ہے۔ بعد میں جب خان محمد خان کے حق میں، صدر کا دوسرا حکم درست نام سے موصول ہوا اور اس کی سزائے موت معاف ہوئی، تو تب علم ہوا، کہ خان محمد خان نام حکم معافی میں تحریر کرنے کے بجائے، سہواً صرف محمد خان کے طور پر معافی نامہ میں لکھا گیا تھا، جس کا فائدہ محمد خان کو مل گیا۔ اس طرح قدرت کے کرشمہ کے زیر اثر، ایک معصوم اور بے گناہ انسان پھانسی کے پھندے سے بچ گیا، جبکہ ناقص عدالتی نظام عدل، رائج الوقت کے نتیجہ میں قاتل کو عدالت نے بے گناہ قرار دے کر بری کر دیا اور معصوم انسان کو قتل کا مجرم قرار دے کر سزا موت کا فیصلہ دے دیا۔

مروجہ نظامِ عدل کی خامیوں، سوسائٹی اور معاشرہ میں سچ میں جھوٹ شامل کرنے، پولیس کی تفتیش میں اثر رسوخ اور رشوت کا دخل، شہادت میں اغماز اور بے شمار دیگر امور قابل اصلاح کی نشاندہی پر، بہت کچھ لکھا اور تجویز کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عدالت میں ابتداء سے اعلیٰ عدلیہ تک، جج صاحبان کی تقرری میں اعلیٰ اوصاف، علمیت، اہلیت، دیانت، شہرت اور شخصیت کے معیار اور ماتحت عملہ کی تقرری میں بھی، اعلیٰ اوصاف اور معیار کی ضرورت و اہمیت توجہ کی متقاضی ہے، جس کی بہترین کسوٹی اسلام کے وضع کردہ اور تجویز کردہ اصول ہیں۔ ان پر عمل سے ہی، صحیح نظام عدل و انصاف قائم اور رائج کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی معاشرہ میں عدل و انصاف زندگی کے تمام شعبوں میں فائق تر مقام رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے جس قدر خوراک کی اہمیت ہوتی ہے، اس سے بھی کئی گنا زیادہ، عدل و انصاف کو اہمیت حاصل ہے اور یہ انسان کی تخلیق میں شامل ہے۔ یہ کسی تلقین اور ہدایت کے تابع نہ ہے، بلکہ اس پر جتنا تدبر کیا جائے، اس کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں، جن میں بہت وسعت ہے۔

ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ کی پیشکش

میرپور میں منتقل ہونے کے ایک سال بعد، سید فیاض حسین شاہ، چیف جسٹس جن کا تعلق، لاہور کے

معروف خاندان سے تھا، انہوں نے میرے ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ پر، تقرری کی حکومت کو پُرزور سفارش کی۔ دوسرے جج صاحبان خان عبدالحمید خان اور خواجہ محمد شریف نے بھی مجھے کہا، کہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے، مگر میں نے ادب سے معذرت کر دی۔ انھوں نے ماموں جان کو بھی کہا، مگر میں ملازمت کے طبعاً ہی خلاف تھا۔ میں نے ماموں جان سے بھی معذرت کر لی۔ دوسری دفعہ راجہ خورشید، جو ایڈووکیٹ جنرل تھے اور ان کی بطور جج تقرری زیر تجویز تھی، انھوں نے بھی حکومت کی طرف سے پیشکش کی، مگر میں نے حسب معمول معذرت کر لی۔ درحقیقت آزاد جموں کشمیر میں، کسی عہدہ پر سروس کرنا، میری نظر میں باعث اعزاز نہ تھا۔ آزاد کشمیر پر، وزارت امور کشمیر کا مکمل تسلط تھا اور آزاد حکومت ہر معاملہ میں، وزارت امور کشمیر کی محتاج تھی، جبکہ آزاد جموں کشمیر کے عوام میں، شدت سے احساس محرومی تھا۔ ایسے ماحول میں ملازمت غلامی تھی نہ کہ خدمت عوام۔

میرپور بار کی صدارت

میرپور بار میں صف اول کے وکلاء تھے، جو شعبہ وکالت میں پاکستان کے وکلاء سے، معیار میں کسی طرح کم نہ تھے۔ پاکستان کے نامور وکلا سردار محمد اقبال، اے کے بروہی، شیخ منظور قادر، میاں محمود علی قصوری، ایم انور بارایٹ لاء، ایس ایم ظفر، راجہ انور، حکیم چراغ اور دیگر کئی وکلاء، جو وقتاً فوقتاً آزاد کشمیر کی اعلیٰ عدالتوں میں پیش ہوتے رہے، ان کے مد مقابل پیش ہونے اور بیشتر مقدموں میں، کامیابی حاصل کرنے کا، میرپور بار کو اعزاز حاصل رہا ہے۔ اس بار سے بہت نامور چیف جسٹس اور جج، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے عہدہ جلیلہ پر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں مجھے میرپور بار کے صدر کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس وقت تک عبوری دستور میں، بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے، ہائی کورٹ کو رٹ سماعت کرنے کا اختیار نہ تھا۔ چنانچہ مسلسل مطالبہ کے تحت ۱۹۷۲ء میں عبوری ایکٹ ۱۹۷۰ء میں ترمیم کے تحت، ہائی کورٹ کے اختیارات میں اضافہ ہوا۔ دوسری بار بلا مقابلہ ۱۹۷۸ء میں صدر بار منتخب کیا گیا، جبکہ ۲۸ رمئی ۱۹۷۸ء کو میری تقرری، بطور جج ہائی کورٹ ہوگئی، جس کا پس منظر اور پیش آمدہ واقعات کی تفصیل، الگ حصہ میں زیر ذکر آئے گی۔

جیورسٹ کانفرنس میں بروہی صاحب کا تبصرہ

پاکستان میں انقلابی تبدیلی، بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں رونما ہوئی۔ فوج نے اس عظیم سانحہ کے نتیجہ میں اقتدار اکثریتی منتخب پارٹی عوامی لیگ، کی بجائے دوسری اکثریتی پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کیا۔ شیخ مجیب الرحمن کو براستہ انگلینڈ، بنگلہ دیش بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد بنگلہ دیش کو بحیثیت آزاد ریاست تسلیم کرنے کا معاملہ تھا۔ اسلامی ممالک کی کانفرنس کا اجلاس، ۱۹۷۴ء میں لاہور میں منعقد کیا گیا، جس میں پاکستان کو کانفرنس کا سربراہ مقرر کیا گیا اور بنگلہ دیش کو، آزاد و خودمختار ملک تسلیم کیا گیا۔ کانفرنس میں شاہ فیصل، بومدین، معمر قذافی،

انورالسادات، حافظ الاسد، یاسر عرفات اور اسلامی ممالک کے دیگر سربراہان شامل ہوئے۔ کانفرنس کے انعقاد سے، مایوس وافسردہ پاکستان کا اعتماد بحال ہوا اور مشرقی پاکستان میں شکست کے سانحہ کی، کسر نفسی بحال ہونے میں مدد ملی۔ اسلامی ممالک کی کانفرنس سے قبل نیا دستور، ۲۳ر مارچ ۱۹۷۳ کو نافذ کر کے، پاکستان وفاقی اسلامی جمہوری ملک کی حیثیت میں شناخت ہوا۔ چنانچہ اسی تناظر میں مارچ ۱۹۷۴ء میں، لاہور ہی میں، واپڈا ہاؤس کی عمارت میں، بین الاقوامی جیورسٹ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کا افتتاح ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم نے کیا۔ کانفرنس میں دولت مشترکہ کے رکن ممالک کے علاوہ امریکہ، فرانس اور اسلامی ممالک کے چیف جسٹس اور جج صاحبان بھی مدعو تھے۔ کانفرنس تین ایام پر محیط تھی۔ افتتاحی تقریب کے بعد چائے کا وقفہ تھا۔ سب مہمان چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرپور بار سے صرف مجھے مدعو کیا گیا تھا، البتہ مظفر آباد سے خواجہ سعید اور شیخ عبدالعزیز شامل تھے۔ کانفرنس میں معروف جیورسٹ، اے کے بروہی کو، اعلیٰ منتظم مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ چائے کے وقفہ میں، وہ تمام مہمانوں کی دیکھ بھال کے لئے گھوم رہے تھے۔ اس گشت میں جب وہ ہماری ٹیبل پر پہنچے، جہاں میں آزاد کشمیر کے چیف جسٹس اور جج صاحبان کے ہمراہ چائے لے رہا تھا۔ بروہی صاحب نے علیک سلیک کے ساتھ ہی، مجھے کھڑا کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر، تمام جیورسٹ کو بلند آواز سے متوجہ کر کے کہا ''محترم خواتین و حضرات، معزز جیورسٹ صاحبان، میں آپ کو عدل وانصاف اور قانون کے شعبہ میں، نئے ابھرتے ہوئے روشن ستارے سے متعارف کروانا چاہتا ہوں اور پھر انھوں نے میرا نام لے کر کہا، کہ آزاد جموں کشمیر کے خوبصورت ملک کے مردم خیز خطہ، میرپور سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان، قانون کی دنیا میں انمول اضافہ ہے، جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہوگا۔ مہربانی کر کے اپنی صف میں اس ذہین، نوعمر قانون دان کو خوش آمدید کہنے میں میرا ساتھ دیں۔ اس نوجوان کے چہرہ میں خوداعتمادی کا روشن نور دیکھئے اور اس کے روشن مستقبل کی دعا کیجئے''۔ اے کے بروہی، معروف دانشور کا اچانک ہمارے قریب آنا اور پانچ صد سے زائد عالمی دانشوروں اور پاکستان کے قانون دانوں کے مجمع میں فی البدیہہ، تعریفی کلمات کے ساتھ، مجھے متعارف کروانا، اللہ تعالیٰ کا انعام اور جناب اے کے بروہی صاحب کا احسان اور بڑاپن تھا، جو میری زندگی کا سرمایہ بن گیا۔ لوگ متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، البتہ میرے لئے نیک خواہشات کا اظہار بھی ہوا۔ آزاد کشمیر کے چیف جسٹس اور جج صاحبان، بہت خوش ہوئے۔

جانبدار جج سے نجات

میرپور کی تحصیل کوٹلی کو ضلع کا درجہ دیا گیا، جس کے نتیجہ میں انتظامیہ کے ساتھ ساتھ عدلیہ کے ادارہ، ڈسٹرکٹ وسیشن جج کی عدالت کا قیام بھی عمل میں لایا گیا اور قتل کے مقدمات کی سماعت بھی وہاں شروع ہوئی۔ کوٹلی بار کے وکیل، محمد حنیف چوہدری کے قریبی رشتہ دار قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ استغاثہ نے وقوعہ کے وقت ہی،

خواجہ منظور سینئر وکیل کی خدمات حاصل کرلیں۔ چنانچہ رپورٹ ابتدائی کی تحریر سے لے کر، تفتیش کی تکمیل تک، جملہ کارروائی ان کی ہدایات اور نگرانی میں ہوئی اور چالان پیش عدالت ہوا۔ چوہدری حنیف نے پیروی کے لئے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں میرپور میں بہت مصروف تھا، لیکن تعلقات کی وجہ سے انکار بھی مشکل تھا، میں نے پیروی کی حامی بھر لی۔ کوٹلی سیشن جج کی کورٹ زیر تعمیر تھی، اس وجہ سے ریسٹ ہاؤس کے ایک حصّہ میں، مقدموں کی سماعت ہوتی تھی۔ قتل کا وقوعہ دن ایک بجے، گاؤں کے عام راستہ میں، ہونا ظاہر کیا گیا تھا۔ رپورٹ، مقتول کی بیٹی نے دی تھی۔ جج کی شہرت اچھی نہ تھی، رشوت لینے میں بدنام تھے۔ مجھے بتایا گیا، کہ موقع پر ظاہر کیے گئے، گواہان موقع پر موجود ہی نہ تھے اور رشتہ داری کے علاوہ، گروہ بندی اور سابق عداوت ہمراہ ملزمان کی بناپر، چشم دید گواہ نامزد ہوئے تھے۔ جائے وقوعہ ایک گہرے نالہ سے گاؤں کے سامنے ہونا ظاہر کیا گیا، اسی طرح کے دیگر کمزور پہلوؤں کو فرضی شہادت کی مدد سے چھپایا گیا۔ جج کی رہائش گاہ، سڑک شارع عام پر تھی، جو ریسٹ ہاؤس کی قریب ہی واقع تھی۔ میں نے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا تھا۔ رات کو ہم مقدمہ میں ڈیفنس اور گواہان پر جرح کی حکمت عملی تیار کرنے میں، دیر تک مصروف رہے۔ جب حنیف چوہدری اور اس کے رشتہ دار، ریسٹ ہاؤس سے نکل کر گھر جارہے تھے، تو عین اس وقت مستغیثہ مقدمہ، ایک مرد کے ساتھ، سیشن جج کے گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے انھوں نے دیکھ لی۔ وہ اس کے واپس باہر آنے تک، ایک برآمدہ کی اوٹ میں منتظر رہے۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کے قریب، جج کے گھر میں ٹھہر، کر وہ خاتون واپس باہر آ گئی۔ دوسری صبح حنیف نے بتایا، کہ رات کو جج کو رشوت کی رقم دے دی گئی ہے اور سودا بازی طے ہوگئی ہے۔ اُس نے کہا کہ اب ضروری ہوگیا ہے، کہ انتقال مقدمہ کی جوازیت پیدا کی جائے۔ خواجہ منظور ایڈووکیٹ سے میری بہت بے تکلفی تھی اور وہ سیدھی بات کرنے والا انسان تھا، ملاقات ہوتے ہی، میں نے اس سے ہنسی مذاق میں کہا، کہ میرے لئے اس مقدمہ کی پیروی مشکل ہوگئی ہے۔ اُس نے پوچھا، کیوں مشکل ہوگئی ہے؟ میں نے جواب میں کہا، کہ آپ اکیلے ہی کافی تھے، مگر میں نے سُنا ہے، کہ خاتون مستغیثہ نے رات کو جج کو بھی، استغاثہ کی جانب سے وکیل کرلیا ہے۔ اس پر خواجہ منظور نے حسب عادت، زوردار قہقہہ لگایا۔ مرزا نثار پبلک پراسیکیوٹر تھا، وہ دونوں گہرے دوست تھے، مرزا نثار میرے ساتھ بھی بے تکلف تھا۔ ان دونوں نے سرگوشی کی، کہ ملک کو رشوت دینے کا علم ہوگیا ہے۔ اُن دنوں موسم سرما تھا، لہٰذا ریسٹ ہاؤس کے صحن میں، دھوپ میں سماعت مقدمہ شروع ہوئی۔ شہادت میں میرا طریق کار شروع سے ہی تھا، کہ میں چشم دید گواہ پر، صرف چار پہلوؤں سے جرح کرتا تھا، جو مجموعی طور پر مختصر ہوتی تھی۔ اول:- گواہ کی، استغاثہ سے واسطہ داری اور ملزم سے دشمنی۔ دوم:- وقوعہ کے کوائف اور وقوعہ پر موجود ہونے کی جوازیت، سوم:- پولیس کی تفتیش، چوتھا اور آخری نکتہ، ملزم کے مجوزہ ڈیفنس یا صفائی کے متعلق۔ البتہ جرح میں گواہ سے سوال کی ترکیب میں، الفاظ کا چناؤ اور سوال کی نوعیت ایسی ہوتی، کہ گواہ جو بھی جواب دے، وہ ملزم کے حق

میں ہو۔ مقدمہ میں مستغیثہ، رپورٹ دہندہ کی حیثیت میں پہلی گواہ تھی۔ اس گواہ کے متعلق دوہری حکمت عملی اختیار کرنا پڑی تھی۔ وقوعہ میں ملزمان کی صفائی کے علاوہ، جج سے مقدمہ کی منتقلی کی جوازیت بھی پیدا کرنی تھی۔ اس حکمت عملی کے تحت، میں نے طویل جرح کا انداز اپنایا، حالانکہ وہ انداز میرے عمومی طریقہ کار کے خلاف تھا۔ میں نے جج کو ازخود تجویز کیا، کہ گواہ خاتون ہے، لہٰذا کرسی پر بٹھا کر شہادت لی جائے۔ میرے مؤکل تو اس جذبہ خیر سگالی پر ناراض ہوئے، مگر جج اور خاتون بہت خوش ہوئے۔ البتہ حنیف کو مجھ پر مکمل اعتماد تھا۔ جرح کا آغاز گواہ کے بظاہر تعریفی انداز میں کیا۔ خاتون بہت چالاک اور ہوشیار تھی، مگر ضرورت سے زیادہ باتونی بھی تھی اور یہی اس کا کمزور پہلو تھا۔ دس منٹ کے بعد، ہرایک سوال کے جواب میں، وہ نئی نئی باتیں کہہ دیتی، جس پر میرا کام آسان ہورہا تھا، بات سے بات نکل رہی تھی، مگر وکلا، استغاثہ کے بجائے، جج پریشان ہورہا تھا۔ اس نے خاتون کو جواب دینے میں راہنمائی بھی کی، جس پر میں خاموش رہا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد، جب اصل وقوعہ پر میرے سوالات کا جواب، اس نے ہمارے حق میں دیا، تو جج نے بجائے جواب لکھنے کے، اسے مشورہ دینا شروع کر دیا۔ اس مرحلہ پر میں نے کہا، کہ گواہ کا جواب لکھا جائے اور ساتھ ہی، عدالت کی طرف سے گواہ کو مشورہ دینے کا نوٹ لکھا جائے، اس پر تلخی پیدا ہوگئی۔ میں نے یہ بھی نوٹ کرنے پر اصرار کیا، مگر جج نے انکار کر دیا۔ میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے فوراً تمام وقعات لکھ کر، درخواست شامل ریکارڈ کروادی۔ اس پر جج نے دھمکی دی، کہ ملک تم ٹھیک نہیں کررہے ہو، میں نے دھمکی دینے کی بھی درخواست شامل ریکارڈ کرادی۔ ماحول بہت تلخ ہوگیا۔ جج نے شہادت لکھنی بند کردی اور رویہ بالکل بدل کر، منت کے انداز میں کہنے لگا، کہ دونوں درخواستیں واپس لو، مگر میں نہ مانا۔ ہماری تکرار جاری تھی، کہ جج کا آٹھ سال عمر کا بیٹا وہاں آگیا۔ اس خاتون نے لپک کر اس کو گود میں بٹھا کر، بوسے دینا شروع کر دیئے اور بچہ، اس انداز سے اس کی گود میں جا بیٹھا، جیسے کسی قریبی رشتہ دار سے مانوس ہونے کی وجہ سے، آرام سے بوسہ لیتا ہے۔ اس پر میں نے جلدی سے تیسری درخواست لکھ کر پیش کردی اور ساتھ ہی مقدمہ میں سماعت ملتوی کرنے کی استدعا کردی، کہ ملزمان انتقال مقدمہ کروانے کے لئے، ہائی کورٹ میں درخواست دینا چاہتے ہیں، اس لئے سماعت ملتوی کی جائے۔ اب سوائے کارروائی ملتوی کرنے کے، کوئی چارہ نہ تھا۔ اس دوران کوٹلی کے وکلا، اور عوام بڑی تعداد میں جمع ہوچکے تھے، جو سب تماش بین تھے، مگر جج کی حالت، باعث عبرت تھی۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے میری طرف سے پیش کی گئیں، درخواستیں دیکھتے ہی وکیل مخالف سے کہا، کہ انتقال مقدمہ کے لئے، مزید کیا جوازیت چاہیے؟ اور مقدمہ دوسرے جج کے پاس منتقل کردیا۔ جانبدار رشوت خور جج، کی عدالت سے مقدمہ منتقل ہونے کے ساتھ ہی حالات بدل گئے۔ وکیل کے فرائض میں شامل ہے، کہ وہ اعتماد اور جرأت کے ساتھ، اپنے مؤکل کے حقوق کا دفاع کرے۔ مگر یہ تب ہی ممکن ہے، جب وکیل کو قانون میں دسترس حاصل ہو اور مہارت ہو کہ متعلقہ قانون کس مرحلہ پر بروئے کار لاتا ہے۔ وکیل

کی قوت، قانون کا علم ہے اور علم کتب کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ وکلا کے لئے احترام عدالت لازم ہے، جس میں کسی صورت کوتاہی اور لغزش کی گنجائش نہیں ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اہل مقدمات کے حقوق کا تحفظ حصول انصاف کی ذمہ داری اور فرض وکلاء پر ہے۔ وکلاء نے اس دوہرے فرض کی بجا آوری میں، بہت نازک حد کو نہایت احتیاط سے قائم رکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں جج نے معروف مسلمہ اصولوں کے تابع عدل کرنا ہوتا ہے، وہاں وکیل نے ادب واحترام کی حدود قائم رکھتے ہوئے، صحیح صحیح انصاف کرنے میں، عدالت کی معاونت اور فریقین کی راہنمائی کرنی ہوتی ہے۔

میرپور کے وکلاء جیل میں

منگلا ڈیم کی تعمیر کے باعث، ایک سو سے زائد گاؤں، میرپور شہر، ڈڈیال کا قصبہ اور کئی چھوٹے بازار زیرآب آ گئے۔ ایک لاکھ کے قریب صدیوں سے آباد لوگوں کو جبر اور حکومت کی سختی کے تحت نقل مکانی کرنی پڑی۔ برصغیر ہندوستان کی آزادی کے وقت پنجاب و بنگال کی تقسیم اور قیام پاکستان پر نسلی اور مذہبی فسادات کی قیامت خیز دہشت گردی، قتل وغارت، گھیراؤ جلاؤ اور لوٹ مار کے نتیجہ میں، نقل مکانی کے سیلاب کے بعد، میرپور کے خطہ میں یہ دوسری بڑی انسانی نقل مکانی تھی۔ پُررونق، آباد، ہنستی کھیلتی پُرامن بستیوں کو غیرآباد، اجڑتے، اپنے ہاتھوں کھنڈرات میں بدلتے اور ملیامیٹ ہوتے دیکھ کر، کئی حساس لوگ تڑپ تڑپ کر جان دے بیٹھے۔ زرخیز سونا اگلنے والی کھیتیاں، جو لوگوں کی کفالت اور معاش کا ذریعہ تھیں، اونے پونے سستے داموں تحویل میں لے لی گئیں۔ نئے شہر اور کالونیوں کی تعمیر کے لئے بنجر، پتھریلی، ناہموار زمینیں تجویز کی گئیں، جو بڑی بڑی کھائیوں کی شکل میں تھیں۔ زمینوں اور مکانات کے ادا کیے گئے معاوضہ کی رقم سے، سنگلاخ زمین پر ایک کمرہ تعمیر کرنا بھی ناممکن تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کا رزق مقرر کر رکھا ہے۔ اس کی حکمت کے نتیجہ میں، ڈیم کی تعمیر سے بہت پہلے سے، میرپور اور ڈڈیال کے لوگ انگلینڈ، یورپ اور امریکہ میں مزدوری اور کاروبار کرتے تھے، وہاں سے کمائی ہوئی دولت سے انھوں نے، نئے شہر اور جدید طرز کی بستیاں تعمیر کر لیں۔ آزاد کشمیر اور پاکستان حکومت نے جو جدید رہائش، تعلیم، صحت، تجارت، صنعت وحرفت کی سہولتیں فراہم کرنے کے عہد اور وعدے کیے تھے، ان پر عملدرآمد نہ کیا گیا، بلکہ اس کے برعکس، میرپور پر ۱۹۷۳ء میں جائیداد ٹیکس نافذ کر دیا گیا، جس کے خلاف میرپور میں سخت ردعمل اور غصہ تھا۔ صدر حکومت سردار عبدالقیوم نے، پہلی دفعہ، مارچ میں، میرپور ٹاؤن ہال میں اسمبلی اجلاس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ ان دنوں خواجہ شریف صاحب چیف جسٹس ہائی کورٹ تھے اور چوہدری رحیم داد اور محمد یوسف صراف ہائی کورٹ کے جج تھے۔ نظام حکومت صدارتی تھا۔ اسمبلی اجلاس کے دن ساری حکومت میرپور میں موجود تھی۔ عدالت میں پہنچتے ہی میں نے جائیداد ٹیکس کے نفاذ کے خلاف، احتجاج کرنے کے لیے وکلاء کی میٹنگ کے لئے تحریک کی۔ چوہدری محمد تاج، جو بعد میں جج ہائی کورٹ بنے، وہ بار کے صدر تھے۔ میٹنگ میں اتفاق رائے سے، ٹیکس کے خلاف قرارداد منظور ہوئی۔ میں نے اسمبلی ہال تک

احتجاجی جلوس لے جانے اور ٹیکس ختم کرنے کا مطالبہ کرنے کی تجویز دی۔ بار روم سے اسمبلی ہال/ ٹاؤن ہال تک جلوس پُرامن مگر ٹیکس کے خلاف نعرہ بازی کرتے ہوئے، جب امان اللہ پٹرول پمپ تک پہنچا، تو پولیس نے جلوس روک لیا۔ مذاکرات کے بعد، ہمارا مطالبہ صدر اور اسمبلی ممبران تک پہنچایا گیا۔ ٹیکس منسوخ کرنے کا وعدہ ہوا، دوسری طرف سے طلباء کا جلوس بھی سڑک پر آ گیا۔ طلباء اور پولیس میں پتھراؤ شروع ہو گیا۔

وکلاء واپس بار روم میں داخل ہو رہے تھے، کہ پولیس نے دو گروپوں میں، کالج کے طلباء اور بار روم کی طرف وکلاء پر، نشانہ لے کر فائرنگ شروع کر دی، چند طلباء زخمی ہو گئے۔ اسی دوران شور پڑ گیا۔ طلباء اور عوام نے نعرہ بازی شروع کر دی، جس پر پولیس واپس ہو گئی۔ دکانیں وغیرہ بھی بند ہو گئیں۔ میر پور شہر کے لوگ کالج اور ہسپتال کے درمیان جمع ہو گئے اور سڑک طلباء، عوام اور پولیس کے درمیان میدان جنگ بن گئی۔ دو گھنٹے کے بعد امن بحال ہوا۔ مزید دو گھنٹے بعد وکلاء کو ان کے گھروں سے گرفتار کرنا شروع کر دیا گیا۔ شام تک، تمام وکلاء ماسوائے میرے اور راجہ اسلم کے، جو جلوس میں شامل تھے، سب کو جیل پہنچا دیا گیا۔ رات بھر میں نے شہر کے معززین سے رابطہ کیا اور وکلاء کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کا فیصلہ کیا۔ صبح تمام دکانیں بند تھیں۔ اس دن شہر کے علاوہ، دیہات سے بھی عوام جمع ہو گئے۔ چوک شہیداں سے ٹاؤن ہال تک، عوام کا اتنا بڑا اجتماع، میر پور کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ صدر حکومت کو میرے متعلق ہر لمحہ کی رپورٹ مل رہی تھی۔ عوام میں بہت جوش اور غصہ تھا، صدر حکومت کو میری فوری گرفتاری کا مشورہ دیا گیا۔ اس وقت آزاد کشمیر میں لبریشن لیگ دوسری بڑی سیاسی جماعت تھی، جس کا میں سیکریٹری جنرل تھا۔ میر پور شہر میں ہماری بھاری اکثریت تھی۔ صدارتی انتخاب میں ہم نے، میر پور شہر اور تحصیل میں اکثریت حاصل کی تھی۔ اس دوران چوہدری نور حسین اور پیر علی جان شاہ، ممبران اسمبلی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ حکومت سخت پریشان ہو گئی اور اسمبلی کا اجلاس ختم کر دیا۔ کالج کے طلباء نے الگ جلوس نکالا اور سخت نعرہ بازی کی۔ کے ایچ خورشید لاہور میں تھے، انھوں نے وہاں پریس کانفرنس کر کے، ہمارے مطالبات کی حمایت کی اور وکلاء کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ صدر حکومت دن بھر مشوروں میں مصروف رہے۔ میری گرفتاری کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا تھا، مگر اس کے لئے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا، کہ ملک محمد اسلم سیکریٹری قانون، جو بعد میں جج ہائی کورٹ ہوئے، ایڈووکیٹ جنرل اور سینئر مظفر آبادی وکیل خواجہ محمد شفیع، جو حال ہی میں میر پور منتقل ہوئے تھے اور جج ہائی کورٹ بننے کے امیدوار تھے، وزیر قانون سکندر حیات سے رات بھر مل کر رپورٹ مقدمہ تیار کرنے میں مصروف رہے، مگر صبح تک رپورٹ رجسٹرڈ نہ ہوئی تھی۔ اس روز چیف جسٹس ہائی کورٹ اور ایک جج میر پور میں ہی تھے۔ میں نے اطلاع ملتے ہی، فی الفور ہائی کورٹ میں گرفتار وکلاء کی حبس بیجا کی پٹیشن پیش کر دی۔ حکومت نے اسی وقت، اگلے روز کے واقعہ پر انکوائری کمشن

مقرر کردیا، جس کا چیئرمین چیف جسٹس کو مقرر کردیا۔ خواجہ محمد شریف چیف جسٹس نے ہماری پٹیشن جسٹس رحیم داد کے سپرد کردی۔ جب ان کے پاس پیش ہوا، تو انھوں نے پہلے مجھ سے، پھر چیف جسٹس سے ناراضگی کا اظہار کیا، کہ پٹیشن ان کے سپرد کیوں کی، خود کیوں نہیں سنتے۔ جب میں نے وجہ بتائی، تو بادل نخواستہ انھوں نے ایس پی اور ایڈووکیٹ جنرل کو طلب کر کے کہا، کہ مقدمہ رجسٹر کرنے کی رپورٹ پیش کریں۔ دونوں نے کہا، کہ رپورٹ ابھی تک رجسٹر نہیں ہوئی، البتہ لکھی جارہی ہے، اس پر میں نے اصرار کیا، کہ وکلا کی گرفتاری حبس بیجا میں آتی ہے، وکلا کو آزاد کیا جائے۔ مگر جج صاحب نے ایس پی کو ایک گھنٹہ کی مہلت دی، کہ رپورٹ ہائی کورٹ میں پیش کی جائے۔ حکم سناتے ہی اُٹھ کر ریٹائرنگ روم میں چلے گئے۔ میرا شور شرابہ، قہر درویش بر جان درویش، ثابت ہوا۔ رپورٹ پیش ہوئی تو پٹیشن خارج کردی گئی۔

دن گیارہ بجے، ہوٹل کلیال جو اُن دنوں واحد درجہ اول ہوٹل تھا میں، ہماری میٹنگ تھی۔ تمام شہر بند تھا اور سنسان ماحول تھا۔ اُس میٹنگ میں چوہدری نور حسین، خصوصی طور پر راولپنڈی سے آئے تھے۔ جہاں دو دن کے احتجاج کی ہنگامی خبریں، پیپلز پارٹی کی حکومت کے پاس لمحہ بہ لحظہ پہنچ رہی تھیں۔ جموں سے مہاجر، خورشید حسن میر، وفاقی وزیر، آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کو منظم کرنے کے لئے، پہلے سے ہی متحرک تھے۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے آزاد حکومت برطرف ہونے کی افواہ پھیلا دی تھی۔ چوہدری نور حسین افواہ سُن کر آئے تھے۔ وہ شہر کے حلقہ کے منتخب ممبر اسمبلی بھی تھے۔ پیر علی جان شاہ، ڈڈیال سے رکن اسمبلی تھے۔ سردار عبدالقیوم میرپور میں رہ کر، تمام معاملات کی خود نگرانی کررہے تھے۔ چوہدری نور حسین، جو راولپنڈی سے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کا سُن کر آئے تھے۔ اِس کی روشنی میں، جب میٹنگ میں اگلے روز شہر میں ہڑتال اور احتجاجی جلوس کی تجویز، پر تبادلہ خیال شروع ہوا تو، چوہدری صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ، پہلے یہ فیصلہ کیا جائے، کہ سردار عبدالقیوم کی حکومت ختم ہونے پر، نئی حکومت میں، اُن کا اور اُن کی جماعت کا کتنا حصہ ہوگا؟ اِس پر پیر علی جان شاہ صاحب نے غالبؔ کے شعر کا مصرع کہہ دیا۔ "ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا"! جس پر میٹنگ میں، زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ قدرے خفت میں، چوہدری نور حسین نے، پیر علی جان شاہ صاحب کو مخاطب ہو کر، دھمکی کے انداز میں زوردار آواز میں کہا "چپ کر اوئے شیخ چلی نیا پڑا"۔ اس پر پھر قہقہہ بلند ہوا، میں نے سوچا کہ چوہدری نور حسین شیخ سعدی کہنا چاہتے تھے اور شیخ چلی کہہ گئے۔ پیر علی جان شاہ، صاحب علم و دانش تھے، ہمارے ساتھ وہ بھی ہنس پڑے اور حکومت میں شراکت اور حصہ داری کا معاملہ، ختم ہوگیا۔

نماز مغرب کے بعد، ہوٹل کلیال میں، ہم اگلے روز کے احتجاج کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے، کہ چوہدری سعید انسپکٹر اور محمد رفیق نوابی سب انسپکٹر نے بھاری نفری کے ہمراہ ہوٹل کا محاصرہ کرلیا اور مجھے گرفتار کرلیا۔ پولیس رپورٹ میں مجھے، تمام احتجاجی تحریک کا سرغنہ، بڑا ملزم نمبر ایک، رکھا گیا تھا، کہ تمام ہنگامے اور ہڑتال و جلوس

میری ترغیب پر ہوئے تھے۔ میری گرفتاری کے وقت موجود لوگوں نے خوب جوش وخروش سے میرے لئے زندہ باد اور سردار عبدالقیوم مردہ باد اور پولیس کے خلاف نعرے بلند کیے، جس پر کالج کے طلباء اور شہری اکٹھے ہو گئے۔ میں نے، احتجاج جاری رکھنے کا پیغام دیا، کہ جب تک وکلاء آزاد نہیں ہوتے اور پراپرٹی ٹیکس کا قانون ختم نہیں کیا جاتا، تحریک جاری رہے گی۔ پولیس مجھے تھانہ لے گئی اور حوالات میں بند کر گئے، صدر حکومت کو رپورٹ کر دی۔ دوسرے دن غازی الٰہی بخش کے مکان پر، صدر حکومت کی صدارت میں جلسہ ہوا، جس میں میرپور کی ہنگامہ آرائی اور ہڑتال واحتجاجی جلوس کی تمام تر کارروائی، میرے ذمہ ڈالی گئی۔ سردار صاحب نے بار بار میرا نام لے کر مجھ پر تنقید کی اور میرپور کے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، شوشہ چھوڑ اگیا اور مسلسل پراپیگنڈا مہم چلائی گئی، کہ چھ ماہ کے لئے اسمبلی اجلاس میرپور میں منعقد کیے جانے تھے مگر حکومت نے، مجبوراً احتجاج کی تحریک کی وجہ سے، فیصلہ تبدیل کر دیا، جس کا ذمہ دار صرف عبدالمجید ملک تھا۔ ہماری گرفتاری اور احتجاج کی خبر، ہمارے پاکستان میں پھیل گئی، جس کی گونج، ہندوستان کے زیر تسلط جموں کشمیر اور انگلینڈ تک جا پہنچی۔ حکومت پاکستان نے اس کا نوٹس لیا۔ کے ایچ خورشید نے وزیر اعظم پاکستان کو فون پر، میرپور کے عوام کے مطالبات سے آگاہ کیا اور وکلا کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ دوسرے روز وکلا کی رہائی اور پراپرٹی ٹیکس قانون واپس لینے کا حکم جاری کیا گیا۔ وکلا کی جیل سے رہائی کے بعد، استقبال کے لئے میرپور شہر اور مضافات کے لوگ سڑکوں پر آ گئے۔ تھانہ سے مجھے بھی رہا کیا گیا۔ جیل سے میرپور شہر تک جلوس دیکھنے کے قابل تھا، علامہ اقبال روڈ پر اتنا بڑا جلوس نئے میرپور شہر میں اس کے بعد، اس وقت تک تاریخ کے لمحات نے نہیں دیکھا۔ دو دن بعد، وزیر اعظم پاکستان نے، مشیر خصوصی رفیع رضا کو، وکلاء سے ملاقات اور مطالبات جاننے کی ذمہ داریاں سونپیں۔ میرپور کے وکلا کی تحریک، عوام اور میرپور کے طلبا کے اتحاد سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور سردار عبدالقیوم کی صدارت کے خلاف، ان کے اپنے ممبران اسمبلی کے عدم اعتماد پر منتج ہوئی۔ مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر، الیکشن میں کامیاب ہونے والے ممبران اسمبلی ہی منحرف ہو گئے، "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"۔ بالآخر سردار صاحب کے ساتھیوں نے، پیپلز پارٹی قائم کر لی اور اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ شیخ منظر مسعود، سپیکر اسمبلی کو نیا صدر حکومت منتخب کیا گیا، مگر اس سے قبل بھٹو صاحب نے، عبوری دستور میں ترمیم کے ذریعے، صدارتی کے بجائے پارلیمانی نظام کے قیام کا فیصلہ کروالیا تھا۔ ایکٹ ۱۹۷۰ء کے تحت حاصل شدہ اختیارات، تقسیم ہو کر، کونسل، جس کے چیئرمین وزیر اعظم پاکستان بنے، اس کو منتقل ہو گئے۔ یہ فیصلہ سردار قیوم کی صدارت کے دور میں ہوا اور ایکٹ ۱۹۷۴ء نافذ ہوا۔

پیر ظہیر الدین کی پیش گوئی

میرپور سے خورشید صاحب سے ملاقات کے لئے لاہور پہنچے، میرے ساتھ راجہ اسلم اور محمد یونس سرکھوی

وکیل بھی تھے۔ سردار رحمت اللہ مظفرآباد سے آئے ہوئے تھے۔ شیزان اوریئنٹل میں لنچ کیا۔ اس دوران خورشید صاحب نے، مجھ سے مخاطب ہوکر کہا، کہ آج آپ کی، اے کے بروہی صاحب کے پیر صاحب، سے ملاقات کروانی ہے۔ یہ ۱۶ رجون ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے۔ شیزان سے نکل کر، مال روڈ کراس کر کے، سامنے ایک کیمسٹ شاپ کے مشرقی سائیڈ دروازہ سے اجازت لے کر اندر داخل ہوئے، تو کوٹ پتلون میں ملبوس مضبوط جسم کے حامل شخص سے تعارف ہوا، پیر ظہیر الدین۔ دیواروں پر دنیا کے ممالک کے بڑے سائیز کے نقشے آویزاں تھے، ایئر کنڈیشنر نے کمرہ کا درجہ حرارت، بہت کم کر رکھا تھا۔ کمرہ کے ماحول میں بہت ہلکی سی، خوش کن خوشبو کی، آمیزش تھی۔ پیر صاحب سے گفتگو انگریزی اور اردو میں ہوئی، مگر اُن کو عالمی حالات کے علاوہ قرآن حکیم اور حدیث پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اسی طرح عربی اور فارسی زبان میں بھی دسترس حاصل تھی۔ امریکہ چین، روس اور یورپ کی ایشیا اور وسط ایشیا، جنوبی ایشیا سے متعلق، مستقبل اور حال کی پالیسیوں سے متعلق، ان کی سوچ اور رائے سنتے رہے۔ جس کے بعد ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی اور پاکستان میں وزیراعظم بھٹو، کا تذکرہ کرتے ہوئے، انھوں نے ازخود کہا، کہ ان دونوں کی موت غیر طبعی ہوگی، کیوں کہ اندرا گاندھی نے نس بندی کے ذریعہ انسانی پیدائش کنٹرول کرنے کا منصوبہ شروع کر کے، اللہ تعالی کے نظامِ پیدائش مخلوق، میں دخل اندازی کی ہے۔ اسی طرح یہ جانتے ہوئے بھی، کہ ہر انسان کا رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، ذوالفقار علی بھٹو نے روٹی کپڑا اور مکان کا دعویٰ کر کے، اللہ تعالی کے اختیار میں مداخلت کی ہے۔ ان دنوں بھٹو صاحب کا اقتدار پورے عروج پر تھا۔ پاکستان کی سیاست میں بہت گھٹن تھی۔ میں نے، پیر صاحب سے سوال کیا، کہ بھٹو صاحب کے اقتدار کی، کتنی مدت باقی ہے؟ پیر صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا اور قدرے توقف کے ساتھ، منہ اوپر کی طرف کر کے بولے کہ،" اگلے سال کے شروع میں، بھٹو اچانک، قبل از وقت پارلیمنٹ کے جنرل الیکشن منعقد کروائے گا، اور الیکشن جیت کر، ہار جائے گا"۔ سردار رحمت اللہ، کو عالمی معاملات اور دیگر باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسی سال اپریل کے مہینہ میں، مظفرآباد کے دورہ کے دوران، بھٹو نے خورشید صاحب کو پیش کش کی تھی، کہ اپنی پارٹی لبریشن لیگ کو، پیپلز پارٹی میں ضم کردو، تو آزاد کشمیر میں وزیراعظم کے عہدہ پر آپ کو فائز کر دیا جائے گا۔ اس وقت پیپلز پارٹی آزاد کشمیر میں بھی اقتدار میں تھی۔ جو لوگ جلد بازی میں، جماعت کو پیپلز پارٹی میں ضم کر کے، خورشید صاحب کو وزیراعظم بنوانے کے خواہش مند تھے، ان میں سردار رحمت اللہ پیش پیش تھے اور اسی مہم کے سلسلہ میں، لاہور خورشید صاحب کو ملنے گئے تھے۔ چنانچہ وہ بہت بے صبری سے، پیر صاحب کی گفتگو سنتے رہے۔ اس مرحلہ پر سردار صاحب نے، پیر صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا کہ، "بتائیں کہ خورشید صاحب، اگر اپنی جماعت کو بھٹو کی پیپلز پارٹی میں ضم کر دیں، تو ان کو وزیراعظم بنائے جانے کا امکان ہے؟" اور کیا کشمیر کی آزادی کی تحریک کو، فائدہ ہوگا؟ پیر صاحب نے بہت تحمل سے، خورشید صاحب کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا، کہ اس کا کوئی فائدہ اور تبدیلی نظر نہیں آتی۔اس جواب کے بعد سردار صاحب نے سوال کیا کہ، کشمیر کی آزادی کی تحریک میں، خورشید صاحب کا کردار کیا ہے اور جموں کشمیر کا مستقبل کیا ہے؟ پیر صاحب نے خورشید صاحب کی طرف دیکھا، اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا، خورشید کا مزید رول کم ہے، البتہ میرے متعلق، نام لے کر اور اشارہ کر کے کہا، ان کا کشمیر کی تحریک میں رول زیادہ ہوگا۔دو گھنٹے کی ملاقات میں، پیر صاحب کی علمی اور معلوماتی گفتگو کے دوران، چائے اور مٹھائی میں، برفی پیش کی گئی۔چائے کا فلیور اتنا اچھا تھا، کہ مولانا ابوالکلام کی تصنیف، ''غبار خاطر'' میں چائے کی چاشنی کا ذکر یاد آ گیا اور برفی بھی خاصی ذائقہ دار تھی۔

اندرا گاندھی کا اقتدار، اپنے سکھ محافظوں کے ہاتھوں قتل اور بھٹو صاحب کا، مارچ ۱۹۷۷ء میں، اچانک قبل از وقت اسمبلی کے الیکشن میں واضح اکثریت، حاصل کر کے کامیابی کے بعد، چند سیٹوں میں دھاندلی، کے الزام کے خلاف احتجاجی تحریک و مارشل لاء کے نفاذ اور حکومت کی برطرفی کے بعد، قید اور پھانسی تک پہنچ کر، ختم ہو گیا۔اسی طرح ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۶ء کو، مظفر آباد میں لبریشن لیگ، پیپلز پارٹی میں ضم اور مدغم ہو گئی، مگر خورشید صاحب، آزاد کشمیر کے وزیراعظم نہ بن پائے اور ۱۱ر مارچ ۱۹۸۸ء کی شام سڑک پر، ایک حادثہ میں وفات پا گئے۔اپریل ۱۹۷۸ء کی شام، اے کے بروہی صاحب نے، مجھے اسلام آباد میں، اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا۔دوران گفتگو مجھے ظہیر صاحب کی پیش گوئی یاد آ گئی۔میں نے بروہی صاحب سے کہا، کہ آپ کے پیر، ظہیر صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔پیر صاحب کا نام سنتے ہی بروہی صاحب ، احترام میں کھڑے ہو گئے اور پوچھا کہ تم کیسے ملے؟ وہ تو کسی سے ملتے ہی نہیں۔میں نے خورشید صاحب کا بتایا، تو کہنے لگے ہاں ٹھیک ہے، خورشید کا تعارف پیر صاحب سے میں نے ہی کروایا تھا۔بروہی صاحب نے بتایا، کہ پیر صاحب نے ان کو لکھ کر دیا تھا، کہ بھٹو صاحب کے اقتدار کا ستارہ، ۷ر جولائی ۱۹۷۷ء کو غروب ہو جائے گا۔مگر ان کو تعجب تھا کہ ۷ر جولائی کی بجائے، ۵ر جولائی کو کیوں ہوا وہ اس کی وضاحت پیر صاحب سے حاصل کریں گے۔اس پر میں نے ان کو بتایا، کہ مارشل لاء تو ۵ر جولائی کو نافذ ہوا تھا، مگر ضیاء الحق صاحب اور بھٹو صاحب کی اہم ترین میٹنگ کوہ مری میں ہوئی تھی، وہ میٹنگ کچھ تلخ ماحول میں ہوئی تھی۔عام تاثر یہ ہے کہ اس میٹنگ کی روشنی میں ہی، بھٹو صاحب کے مستقبل کے متعلق، جرنیلوں نے فیصلہ کیا تھا۔اس پر بروہی صاحب نے میری وضاحت سے اتفاق کرتے ہوئے، شکریہ ادا کیا۔کوہ مری میں میٹنگ ۷ر جولائی کو ہی ہوئی تھی، لہٰذا پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

آزاد جموں کشمیر جمہوریت کانفرنس-نیا تنازعہ

آزاد حکومت کے وزیراعظم، سابق چیف جسٹس، خان عبدالحمید خان اور صدر سردار ابراہیم خان کی مشاورت سے، چیف جسٹس ہائی کورٹ، خواجہ یوسف صراف نے، میرپور میں، آزاد جموں کشمیر جمہوریت کانفرنس، منعقد کروانے کا فیصلہ کیا، جس کا افتتاح وزیراعظم نے اور اختتامی اجلاس سے، صدر حکومت نے خطاب کرنا تھا۔میں

میرپور بار کا صدر تھا، اس حیثیت میں استقبالیہ کمیٹی کا چیئرمین، مجھے نامزد کیا گیا اور بحیثیت سینئر وکیل، آخری اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے فرائض بھی سونپے گئے۔ کانفرنس کا دوروزہ پروگرام اور دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔ پاکستان سے اے کے بروہی معروف جیورسٹ اور کے ایچ خورشید، سابق صدر حکومت، بطور مہمانان خصوصی مدعو کیے گئے۔ آزاد کشمیر کے تمام وکلاء اور عدلیہ کو مدعو کیا گیا۔ ان دنوں، چیف جسٹس سپریم کورٹ چوہدری رحیم داد اور چیف جسٹس یوسف صراف کے، ذاتی اختلافات کی وجہ سے، تعلقات ناخوشگوار تھے۔ لہٰذا ذاتی ناچاقی کی بناء پر، چیف جسٹس رحیم داد کو مدعو نہ کیا گیا، کانفرنس سے دوروز قبل یہ معاملہ میرے نوٹس میں آیا۔ اس سنگین کوتاہی کو، ذاتی اختلاف کا سبب، نہیں بننا چاہیے تھا۔ اس پر ہنگامی اجلاس طلب کرکے، بار کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا۔ ممبران بار نے، بہت سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد، اتفاق رائے سے قرار دیا، کہ میزبان کانفرنس، چیف جسٹس کو مشورہ دیا جاتا ہے، کہ وہ، ملک کی عدلیہ کے سربراہ، چیف جسٹس کو پورے اعزاز اور احترام کے ساتھ کانفرنس میں مدعو کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے، تو آزاد کشمیر کی سب سے بڑی، میرپور بار کانفرنس کا مکمل بائیکاٹ کرے گی اور اس فیصلہ سے، متعلقین کو فی الفور آگاہ کیا جائے۔ بار کی میٹنگ کی اطلاع پاتے ہی، صراف صاحب، اجلاس سے قبل ہی افراتفری میں، میرے گھر پہنچے اور بار کا اجلاس منسوخ کرنے پر، بہت زور دیا۔ ہم پرانے میرپور شہر میں پڑوسی تھے۔ فیملی کے بھی تعلقات تھے، ایک ہی سیاسی جماعت میں بھی رہ چکے تھے اور بار ممبر کی حیثیت میں تعلق اور روابط بھی تھے، لہٰذا تمام تعلقات کے واسطے سے، وہ بضد رہے اور بار کا اجلاس منسوخ کرنے پر زور دیا۔ اُن کے نزدیک، بار ممبران کی ایما اور آخری مرحلہ پر، چیف جسٹس کو کانفرنس میں دعوت دینا، اُن کی ذاتی شکست اور بے عزتی تھی۔ جبکہ میری رائے اس کے برعکس تھی، کہ ذاتی ناچاقی کی بنا پر قومی کانفرنس میں، چیف جسٹس کو دعوت نہ دینا، چھوٹا پن ہوگا، جس سے ملک اور قوم میں، ہم پر حرف آئے گا اور جگ ہنسائی ہوگی۔ ہم میں اتفاق نہ ہوسکا۔ بار کے فیصلہ پر انھوں نے، چیف جسٹس کو ایک جج کے ذریعہ دعوت نامہ پہنچایا، جس کی اطلاع چیف جسٹس رحیم داد نے مجھے دی اور ساتھ ہی میرپور بار کے ممبران اور میرا شکریہ ادا کیا۔ مگر اس مرحلہ پر دعوت ملنے کی وجہ سے، اپنی اور ساتھی فاضل جج صاحبان، راجہ خورشید اور ملک اسلم کی طرف سے شرکت نہ کرنے پر، معذرت کر دی۔ دوسری جانب چیف جسٹس صراف، مجھ سے ناراض ہو گئے اور اختتامی اجلاس کی صدارت، میری بجائے چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ کو سونپی۔ وکلا اس رویہ پر بھی احتجاج کر رہے تھے، مگر میں نے منع کر دیا، کیونکہ کانفرنس کے باعزت اختتام میں ہی سب کا وقار تھا۔ کانفرنس میں، اے کے بروہی اور کے ایچ خورشید کی شمولیت، عدل وانصاف کی معاشرہ میں اہمیت، عوام کو جلد انصاف ملنے اور فوری حق رسی کے نظام کے قیام کی بہترین تجاویز کو، بہت سراہا گیا، مگر قیمتی و دانشمندانہ تجاویز کا بڑا حصہ، تشنہ تکمیل ہی رہا۔

وکالت میرا پسندیدہ شعبہ تھا، اگر وکیل نہ بنتا تو دوسرا انتخاب شعبہ تعلیم تھا، پروفیسر بنتا۔ وکالت میں

اگر محنت اور ذہانت سے کام لیا جائے، تو ملک اور قوم کی بہترین خدمت کرنے میں، اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ انصاف، اللہ تعالیٰ کا خصوصی وصف ہے۔ انصاف پرمبنی معاشرہ کا قیام، انصاف کرنا اور انصاف حاصل کرنے میں راہنمائی، مدد اور معاونت، افضل عبادت کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس شعبہ میں تنگدستی کی ابتدائی آزمائش، صبر کی طلبگار ہوتی ہے، جس کے بعد، قدرت ہر وکیل کو، کامیابی حاصل کرنے کا موقع اور سہولت ضرور مہیا کرتی ہے۔ جس کی جستجو اور تلاش ہوتی ہے، وہ کامیابی ضرور ملتی ہے، مگر اس کا احساس جن خوش نصیب وکلا کو ہوتا ہے، وہ مخصوص لوگ زیادہ محنت، زیادہ توجہ اور دلچسپی سے اس شعبہ میں، مقام معراج حاصل کر لیتے ہیں اور بیشتر ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ خوش قسمتی سے، پاکستان اور ہندوستان کے کئی معروف وکلاء سے ملاقات ہوئی اور ان کی زندگی سے متعلق معلومات بھی حاصل ہوئیں، مگر میری رائے میں، مجموعی اوصاف کے لحاظ سے، میرے رول ماڈل، سردار محمد اقبال، ایس ایم ظفر اور اے کے بروہی ہی رہے ہیں۔ میں نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں بطور وکیل، کتنا کامیاب رہا! میرپور چھوٹا شہر ہے، محنت کرنے اور شہرت حاصل کرنے کے امکانات اور اسباب محدود تھے، البتہ اگر لاہور یا کراچی میں، اعلیٰ سطح پر مقابلہ اور محنت کا موقع حاصل ہوتا، تو شاید بقول ڈاکٹر کرن سنگھ کے، صف اول میں شہرت حاصل کر لیتا۔ دہلی میں اگست ۲۰۰۵ء کو، مہاراجہ ہری سنگھ کے اکلوتے بیٹے سے، اس کے گھر میں ملاقات کے دوران، اس نے شکوہ کیا، کہ مجھے لاہور سے وکالت ترک کر کے، میرپور نہیں آنا چاہیے تھا۔ لاہور میں رہ کر، میں زیادہ بڑا مقام حاصل کرتا۔ تاہم مجھے اپنے مقام اور حیثیت میں، مکمل قناعت اور اطمینان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آزمائشی انعام، اور ماں باپ کی دعا کے بعد، چیف جسٹس بننے کا اعزاز اور شہرت، مقامی قوتوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود، حاصل ہونا کسی طرح بھی کم مقام نہ ہے۔ اب صرف یہی دعا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

باب سوم

جج ہائی کورٹ

ریاست جموں کشمیر میں، پہلی بار عدالت العالیہ کا قیام ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء کو عمل میں لایا گیا اور مخصوص نوعیت اور مالیت کے مقدمات میں، فیصلہ ہائی کورٹ کے خلاف، جوڈیشل بورڈ میں اپیل کی اجازت حاصل تھی۔ جموں اور سری نگر میں ہائی کورٹ کے اجلاس منعقد ہوتے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آزاد جموں کشمیر کے قیام پر، حکومت کے دیگر اداروں کے ساتھ ساتھ عدلیہ کا ادارہ بھی قائم ہوا۔ ہائی کورٹ کا قیام عمل میں آنے پر اس کا ہیڈ آفس اور رجسٹری، دارالحکومت مظفر آباد میں قائم ہوئی۔ میر پور اور راولا کوٹ پونچھ میں، یکے بعد دیگرے سرکٹ قائم ہوئے۔ ازاں بعد ان میں کوٹلی سرکٹ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں جوڈیشل بورڈ کے متبادل، سپریم کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔ ہائی کورٹ کے جج اور چیف جسٹس کی تقرری کا اختیار، وزارت امور کشمیر اور بعد میں جموں کشمیر کونسل کے چیئرمین، وزیراعظم یا چیف ایگزیکٹو پاکستان کے پاس ہے، البتہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیان، ایکٹ ۱۹۷۰ء کے تحت تقرری کا اختیار، صدر آزاد کشمیر کے پاس تھا۔

۱۹۷۴ء میں، سردار عبدالقیوم صدر حکومت کے خلاف، مسلم کانفرنس کے ممبران اسمبلی جو پیپلز پارٹی قائم کر کے اس میں شامل ہو گئے تھے، انھوں نے عدم اعتماد کر کے، سردار قیوم کی بجائے، شیخ منظر مسعود، سپیکر اسمبلی کو صدر حکومت منتخب کر لیا۔ بشارت احمد شیخ، سردار قیوم کی حکومت میں صدر کے مشیر تھے اور بعد میں ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں سپریم کورٹ کے قیام پر، ہائی کورٹ میں ایک آسامی خالی تھی۔ صدر حکومت شیخ منظر مسعود نے، بشارت شیخ کو، جج ہائی کورٹ تعینات کرنے کی سفارش، ہمراہ سفارش چیف جسٹس صاحبان، چیئرمین جموں کشمیر کونسل، ذوالفقار علی بھٹو کو ارسال کی، جس پر تقرری کی منظوری دے دی گئی۔ دوسرے روز حلف ہونا تھا۔ شام کے وقت چیف جسٹس صراف نے، فون کر کے، ریسٹ ہاؤس میں مجھے بلایا۔ راجہ اسلم اور میں ان کے پاس گئے، وہ بہت خوش تھے۔ ملتے ہی مجھے کہا، کہ دیکھو مجید ملک، ہائی کورٹ جج بننے کا اصل حق تمہارا تھا، مگر تمہارے رویہ اور تمہاری سیاست کی وجہ سے، ہم نے بشارت شیخ کی تقرری کروادی ہے اور اس کے حلف کی تقریب بجائے مظفر آباد کے، میر پور میں رکھی ہے اور چائے کا انتظام آپ نے کرنا ہے۔ میں نے ان کو مبارک دی اور بتایا کہ میں تو سیاست میں ہوں اور جج بننے کی نہ کبھی خواہش کی اور نہ ہی کبھی آپ کو سفارش کرنے کے لئے کہا، تو آپ نے مجھے جج بننے کا امیدوار کیسے بنا لیا۔ بہرحال میں نے تمام مہمانوں کے لئے چائے کا انتظام کروالیا۔ دوسرے روز، حلف کی تقریب میں شامل ہونے کیلئے، ہائی کورٹ پہنچے، تو صراف صاحب موجود ہی نہ تھے۔ سٹاف سے معلوم ہوا، کہ وہ رات ہی کو

اسلام آباد، کشمیر ہاؤس طلب کر لئے گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سردار ابراہیم خان صدر حکومت بھی، جو پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے، ان کی مداخلت اور مخالفت کی وجہ سے، بشارت شیخ کی تقرری کا حکم، منسوخ کر دیا گیا تھا۔ بشارت شیخ، اچھے قانون دان، باخلاق اور باکردار انسان ہیں، غالباً ان کی تقرری کا حکم سیاسی وجوہات یا اور قسم کے تحفظات، کی بنا پر منسوخ ہوا ہوگا، تاہم وہ اہلیت کی بنا پر کئی سال بعد، جج ہائی کورٹ بنے اور بحیثیت جج سپریم کورٹ ریٹائر ہوئے۔

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو، بھٹو کی حکومت معزول کر کے، جنرل ضیا الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور تین ماہ کے اندر، انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔ اور ساتھ ہی سیاستدانوں سے مذاکرات کی مشق بھی شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں آزاد کشمیر کے سیاستدان بھی مدعو کیے گئے۔ لبریشن لیگ کے وفد میں، کے ایچ خورشید صدر جماعت کے ساتھ، حسن شاہ گردیزی سینئر نائب صدر اور میں، بحیثیت سیکریٹری جنرل شامل تھے۔ کور ہیڈکوارٹر میں ملاقات تھی۔ جنرل ضیا الحق کے ساتھ، جنرل فیض علی چشتی، جنرل احسان، غلام اسحاق خان، تین اور جرنیل اور جموں کشمیر کونسل کے سیکریٹری، بریگیڈئر بشیر میٹنگ میں شامل تھے۔ میٹنگ کے بعد، بریگیڈئیر بشیر نے ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لنچ کی دعوت دی اور چند ضروری امور پر بات کرنے کا بھی عندیہ دیا۔ بشیر نے چند ایک قومی اہمیت کے حامل معاملات پر، گفتگو کرنے کے بعد، سابق وزیر امور کشمیر اور چیف جسٹس صاحبان کی تجویز اور سفارش پر، بحیثیت چیئرمین کشمیر کونسل، بھٹو کے دستخط سے، میرے بطور جج ہائی کورٹ تقرری کا حکم دکھایا، جو التوا میں رکھا گیا تھا۔ محمد حنیف خان کا تعلق ہزارہ سے تھا، وہ وکیل تھے اور پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔ ان کو امور کشمیر اور شمالی علاقہ جات کی وزارت سونپی گئی تھی۔ حنیف خان سے منگلا ریسٹ ہاؤس میں ایک عشائیہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے دیکھا اور ملاقات کے لئے بلوایا۔ آدھ گھنٹہ مسئلہ کشمیر پر بات کی۔ بعدازاں از خود ہائی کورٹ کی خالی اسامی کے لئے تجویز مرتب کروائی۔ میری اہلیت، کردار اور دیانت کے حق میں، بھرپور تعریف کی، جو نصف صفحہ پر محیط تھی اور میری تقرری کی سفارش کی، جس کی توثیق، بھٹو صاحب نے کی تھی اور ساتھ ہی نوٹ لکھا تھا، ''کہ ابھی ابھی صدر حکومت، ابراہیم خان نے فون پر کہا، کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا بات ہونے تک، حکم التواء میں رہے''۔ بشیر نے بتایا کہ ابراہیم خان کی بھٹو صاحب سے بات ہونے سے پیشتر ہی، مارشل لاء نافذ ہو گیا، جس وجہ سے حکم التواء ہی میں رہا اور بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہو گئی۔ مارشل لاء کے نتیجہ میں، آزاد کشمیر حکومت اور اسمبلی ختم کر کے، جنرل حیات چیف ایگزیکٹو مقرر کیے گئے، البتہ سردار ابراہیم خان، صدر کے عہدہ پر ایک سال فائز رہے۔

ایہہ روشنی طبع تو بر من بلا شدی

صدر میرپور بار کی حیثیت میں، ڈپٹی کمشنر، چوہدری محمد رشید نے مجھے اطلاع دی کہ تین دن بعد،

جنرل فیض علی چشتی، وزیرامور کشمیر، میرپور میں ٹیکسٹائل ملز کا افتتاح کرنے کے لئے آرہے ہیں اور وہ پہلے، میرپور بار میں خطاب کریں گے۔ میں نے ڈپٹی کمشنر کو صاف صاف بتادیا، کہ ہم مارشل لاء کے خلاف ہیں، ہم نے تو جنرل چشتی کو دعوت ہی نہیں دی اور نہ ہی ہم ان کو بار میں آنے دیں گے۔ ڈپٹی کمشنر نے جنرل چشتی کو میرا پیغام پہنچایا، تو وہ پریشانی میں کہنے لگے، کہ ان سے میرپور کے چند وکلا نے ملاقات کی درخواست کی تھی، جس وجہ سے بار میں خطاب کا پروگرام شامل کیا تھا۔ چشتی صاحب نے مزید کہا، کہ میڈیا میں خبر نشر اور شائع ہو چکی ہے، اس لئے صدر بار، ملک کو کسی طرح منواؤ۔ اس پر میں نے ڈپٹی کمشنر کو بتایا، کہ ہم تو قطعاً مدعو نہیں کریں گے، البتہ جنرل چشتی وکلاء سے ملنے کی استدعا کریں اور وکلاء اُن کی استدعا قبول کریں، تو اُس صورت میں وہ بارروم میں آسکتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جنرل چشتی نے، بذریعہ ٹیلی گرام وکلا سے ملاقات کی استدعا کی۔ ڈپٹی کمشنر جس کا تعلق، میرپور بار اور میرپور شہر سے تھا، اس نے فرداً فرداً وکلا سے رابطہ کر کے فضا ہموار کی، جس پر بار نے ہنگامی اجلاس میں، جنرل چشتی کو بارروم میں وکلا سے ملاقات کی اجازت دی۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد، صدر بار کی طرف سے استقبالیہ خطاب میں اہم ترین مسائل پر بات کرنے کے لئے دس وکلاء کا پینل بنا، جس میں استقبالیہ خطبہ کو ترتیب دیا گیا۔

وقت مقررہ پر، جنرل چشتی اور ان کے ہمراہ تین دیگر جرنیل، جنرل حیات اور چیف سیکریٹری حسن ظہیر، انسپکٹر جنرل پولیس اور دیگر سکیورٹی کے لوگ پہنچنے پر، کورٹس کا میدان عوام کے جم غفیر سے بھر گیا۔ تلاوت کے بعد میں نے استقبالیہ خطاب میں، قائداعظم کے نظریۂ قیام پاکستان سے آغاز کر کے، تحریک آزادی اور حقِ خودارادیت کی وقعت اور اہمیت کا احاطہ کر کے، آمریت اور مارشل لاء کو اس کی ضد اور نفی قرار دے کر، ماضی کے ایوب خان اور یحیٰی خان کے نافذ کردہ مارشل لاء کے، مسئلہ کشمیر پر، اعلان تاشقند و معاہدہ شملہ کے اثرات کے تحت، سکیورٹی کونسل کے دائرہ کار کے مغائر، دوطرفہ مذاکرات تک محدود کر دینے اور جموں کشمیر کو، تقسیم کی سطح پر لانے کے خدشات کو، واضح دلائل اور بیباکی سے پیش کیا، تو کچھ وکلا کے چہرے خوف سے، لٹک گئے اور رنگ پیلے پڑ گئے کہ مجید ملک گیا جیل میں، مگر سب نے تالیاں بجا کر مجھے خوب داد بھی دی۔ تمام جرنیل ٹکٹکی باندھ کر میرے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتے رہے۔ جنرل فیض علی چشتی نے نہایت متانت، سنجیدگی اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے، میرے تلخ، تُرش اور مشتعل جملوں کا جواب دینے کی بجائے، پاکستان کے سیاستدانوں کی باہمی کشیدگی، عوامی فلاح و بہبود سے مسلسل چشم پوشی اور غفلت کی نشاندہی کر کے، ہنگامی طور پر ملکی سکیورٹی کے تحفظات کی روشنی میں، مارشل لاء کے نفاذ کا جواز پیش کیا۔ ہم نے چائے کے ساتھ عام استعمال کے بسکٹ پیش کیے۔ پُرتکلف چائے کا عمداً انتظام نہ کیا گیا تھا۔

تقدیر کا فیصلہ

جنرل چشتی نے، بارروم سے نکلتے ہی جنرل حیات اور حسن ظہیر، چیف سیکریٹری کو اپنی کار میں بٹھالیا۔

حسن ظہیر نے جو ہمیں بعد میں بتایا، اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا، کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی جنرل چشتی نے حیات خان سے کہا، کہ ہائی کورٹ میں جج کی ایک پوسٹ خالی ہے، عبدالمجید ملک، جج بننے کے لئے موزوں ترین جوان ہے، اس کی تقرری کرتے ہیں، کیا خیال ہے؟ جنرل حیات نے کہا کہ یہ سیاستدان ہے، اور اس کی تقریر کا انداز بھی آپ نے دیکھ لیا ہے، یہ تو خودمختار کشمیر کا نظریہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد جنرل چشتی نے حسن ظہیر سے پوچھا، آپ کی رائے کیا ہے؟ حسن ظہیر نے کہا، کہ وہ دو سال سے آزاد کشمیر میں تعینات ہیں، آزاد کشمیر کے وکلاء میں، مجید ملک سب سے زیادہ قابل، محنتی اور اعلیٰ اہلیت رکھتا ہے، اور سیاستدانوں میں سب سے اچھی شہرت کا مالک ہے۔ میرے پاس تمام سیاستدان سفارش کرنے آتے ہیں، مگر یہ کبھی بھی، کسی ذاتی کام کے لئے یا کسی کی سفارش کے لئے نہیں آیا اور نہ دوسرے سیاستدانوں کی طرح، اس کے خلاف کوئی شکایت سنی ہے۔ اس پر جنرل چشتی نے کہا، کہ ٹھیک ہے، اس کی بطور جج ہائی کورٹ، تقرری کرنی ہے۔ اس گفتگو کے ختم ہوتے ہی، وہ ٹیکسٹائل ملز کے افتتاح کے فنکشن میں شامل ہو گئے۔ چوہدری یوسف، نے کشمیر ٹیکسٹائل ملز کے افتتاح کے لئے، بطور مہمان خصوصی، جنرل فیض علی چشتی کو مدعو کیا ہوا تھا۔ دیگر مہمانوں میں کے ایچ خورشید، جنرل حیات اور ہم سب وکلا بھی مدعو تھے، ملز کے اجتماع میں پراپیگنڈا یہ چل رہا تھا، کہ مارشل لاء کے نفاذ کے خلاف تقریر اور وہ بھی جرنیلوں کے منہ پر، اس پر تو مجید ملک گرفتار ہونے اور جیل جانے سے بچ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس، جرنیلوں کے سامنے جرأت سے بات کرنے اور مافی الضمیر ظاہر کرنے پر، کچھ حق پرست، داد بھی دے رہے تھے۔ تاہم شہر میں بات چل نکلی اور ہر ایک، اپنی اپنی سوچ اور نکتۂ نظر کے دائرے میں، خیالات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ میں اپنے حال میں معمول کے مطابق، اپنے کہے اور کیے پر مطمئن گھر لوٹ آیا۔ شام کو اچانک، ڈپٹی کمشنر آ نکلے۔ میرا ماتھا ٹھنکا، کہ ضرور شکایت کرنے آیا ہوگا۔ مگر میرے اندازہ کے قطعی برعکس، اس نے ڈرائنگ روم میں وارد ہوتے ہی اعلان کیا، کہ چائے کے ساتھ خوشخبری پر مٹھائی بھی کھانی ہے اور قہقہہ لگا کر پھٹ پڑا، کہ ملک صاحب! آج تو بہت ہی مبارک اور کامیاب دن رہا ہے۔ میرا دھیان پھر تقریر کی طرف تھا، میں نے نہایت انکساری سے کہا، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اچھی تقریر کروا کر، میرپور کی لاج رکھ لی۔ وہ بولے، وہ تو ٹھیک ہے، مگر خوش خبری اور ہے اور وہ یہ، کہ آپ کو جج ہائی کورٹ بنانے کا، فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس پر مجھے تعجب سا ہوا اور میں نے پوچھا وہ کیسے ہوا؟ جس پر اس کو حسن ظہیر، چیف سیکریٹری نے جنرل چشتی کا فیصلہ، جس انداز اور الفاظ میں بتایا تھا، رشید چوہدری نے وہ ساری تفصیل بیان کی۔ میں نے اس کو صرف اتنا کہا، کہ اس سہانے خواب کو اپنے تک ہی محدود رکھنا، وگرنہ بڑا فساد برپا ہوگا، اور اسے بتایا کہ موجودہ ماحول میں، میرا جج مقرر ہونا، شاید میرے لئے مناسب نہیں ہوگا۔ اس پر وہ ہمدردی میں سنجیدہ ہو کر بولا، ماحول جیسا بھی ہے، یہ میرپور کے لئے اعزاز ہے اور آپ نے چوں چراں نہیں کرنی۔ چائے کے بعد وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ اس کی مہربانی کہ اس نے یہ بات اپنے تک ہی راز میں رکھی۔

سردار ابراہیم خان سے وعدہ

چند دن کے بعد، سردار ابراہیم خان، صدر حکومت کا فون آیا کہ منگلا ریسٹ ہاؤس میں شام پانچ بجے ان کے ساتھ چائے میں شامل ہوں۔ سردار صاحب کی مجھ پر ہمیشہ شفقت رہی تھی، مجھے ان کا ہمیشہ احترام رہا۔ سیاستدان تو وہ تھے ہی، مگر ان کی عادات واطوار اور سلیقہ منفرد تھا، خوش شکل، خوش لباس اور خوش گفتار اور ظرافت میں انوکھے پن کے حامل تھے۔ دن کو، انھوں نے کسی فنکشن میں شرکت کی تھی۔ عبداللطیف دت وکیل، میرے ساتھ وکالت کرتے تھے، ہم دونوں بروقت منگلا پہنچے، کیوں کہ سردار صاحب وقت کے بہت پابند تھے۔ لطیف دت سے الگ، وہ مجھے بیڈ روم میں لے گئے اور کہا، ملک صاحب آج آپ نے میری بات، بحیثیت چھوٹے بھائی اور عزیز کے، ہر صورت ماننی ہے اور وعدہ کرنا ہے، کہ اس سے پیچھے نہیں ہٹنا ہے۔ میں نے بے تکلفی میں کہا، کہ آپ کا جو حکم ہو گا بغیر جانے کہتا ہوں، اس پر عمل ہوگا۔ وہ بہت خوش ہو کر بولے، کہ مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ اس پر انھوں نے کہا، کہ ملک صاحب حکومت پاکستان نے، آپ کو جج بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ مہربانی کر کے یہ موقع سردار سید محمد وکیل کو دیں۔ اگر وہ اب جج نہ بنا، تو پھر کبھی بھی جج نہیں بن سکے گا، مگر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت، جج بننے سے نہیں روک سکتی، آپ کو پھر موقع مل جائے گا۔ لہٰذا آپ کا یہ مجھ پر ذاتی احسان ہوگا۔ میں نے پوچھا، بتایئے میں نے کیا کرنا ہے؟ انھوں نے بتایا، کہ آپ نے صرف انکار کر دینا ہے۔ سردار ابراہیم خان سے میں نے کہا، کہ مزید کچھ، انھوں نے کہا، صرف انکار کرنا ہوگا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، آپ میرا انکار، حکومت پاکستان کو بتا دیں۔ اس پر وہ خوش ہو کر بغلگیر ہو گئے اور کہا، کہ آپ سے مجھے یہی توقع تھی۔ چائے پی اور واپس جب کار میں بیٹھے، تو لطیف دت غصہ میں پھٹ پڑے، انھوں نے ساری گفتگو سن لی تھی۔ ان کی تنقید کے دوہرانے کی گنجائش ہی نہیں ہے، کیوں کہ دونوں طرف سے وعدہ لینا اور وعدہ دینا، انہونی اور انوکھی بات تھی۔ میں نے دت صاحب سے کہا، اس بات کو اپنے تک ہی رکھیں۔ انھوں نے، بمہربانی اس کی پاسداری کی، مگر اس مرحلہ پر، جب میں نے یہ معاملہ اپنی فیملی کی میٹنگ میں پیش کیا، تو ایک تو یہ علم ہوا کہ امی ابو اور بیگم کے ساتھ تمام بچوں کو خبر مل چکی تھی اور انھوں نے اپنے طور فیصلہ بھی کر رکھا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی، کہ ماسوائے چھوٹے بھائی ایوب اور ماموں عبدالعزیز کے، سب کا فیصلہ تھا، کہ مجھے حکومت پاکستان کی پیش کش قبول نہیں کرنی چاہیے۔ ہر ایک کے دلائل الگ الگ تھے مگر فیصلہ متفق۔ میری اپنی سوچ بھی یہی تھی، مگر وجوہات مختلف تھیں۔ میں فطری طور پر آزاد طبع تھا، کسی اور کے ماتحت کام کرنا مشکل تھا۔ ابا جان کی کمائی سے، کبھی تنگ دستی کی نوبت نہ آئی تھی اور وکالت میں بھی، کوئی کمی نہ آئی تھی۔ سوشل تعلقات میں احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا، پاکستان سے باہر یورپ اور امریکہ تک تعلق تھا، جموں کشمیر کے دونوں حصوں میں، وسیع جان پہچان تھی۔ اس پر مزید یہ کہ سب بچے یونیورسٹی کی سطح سے لے کر کالج اور پبلک سکول میں زیر تعلیم تھے۔ وکالت پورے عروج پر تھی،

جس سے میں بھر پور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُن دنوں پاکستان اور آزاد جموں کشمیر میں ہائی کورٹ جج کی تنخواہ، صرف چار ہزار روپیہ ماہوار تھی، جس میں سے انکم ٹیکس بھی ادا کرنا ہوتا اور مظفر آباد سے راولا کوٹ، میرپور سرکٹس میں آنے جانے کے لئے، پیٹرول اپنی جیب سے استعمال کرنا پڑتا۔ ٹی اے ڈی اے، تنخواہ کے تناسب سے محض برائے نام تھا۔ ان امور کی روشنی میں، میں خود بھی جج بننا پسند نہ کرتا تھا۔

نیا تنازعہ

سردار ابراہیم خان کو مجھ سے استدعا کرنے کی ترغیب، یوسف صراف اور جنرل حیات نے دی تھی۔ سردار صاحب پلندری میں دورہ پہ تھے، انہیں سردار رفیق محمود کو، مظفر آباد سے خصوصی طور پر بھجوا کر، سارے حالات سے آگاہ کیا گیا اور دورہ مختصر کر کے اسلام آباد میں پہنچنے کے لئے کہا گیا۔ چنانچہ اسلام آباد میں، تین بڑوں کی کانفرنس میں منصوبہ بندی کے تحت، مجھ سے انکار کرنے کا وعدہ لینا، بڑے منصوبہ کی کڑی تھی۔ لہٰذا مجھ سے ملنے کے بعد وہ تینوں، وقفہ وقفہ سے، یکے بعد دیگرے، الگ الگ، جنرل چشتی سے ملے اور میری بجائے، سردار سید محمد کی تقرری کی تجویز دی، جو جنرل چشتی نے ہر ایک کے منہ پر مسترد کر دی۔ دوسرے راؤنڈ میں، سردار ابراہیم خان اور جنرل حیات اکٹھے ملے اور متفقہ طور پر، سید محمد کے حق میں دلائل دیئے اور میری طرف سے انکار کرنا بھی ظاہر کیا، مگر کامیاب نہ ہوئے۔ تیسری بار دونوں نے دھمکی دی، کہ اگر سید محمد کی تقرری نہیں کی جاتی، تو وہ دونوں بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں گے، جس پر جنرل چشتی نے برملا کہا، کہ ٹھیک ہے۔ آپ استعفیٰ دیں، ہم ابھی اور اسی وقت استعفیٰ منظور کر لیں گے۔ اس پر بھی بات نہ بنی اور ہر حربہ ناکام ہوا، مگر کافی تلخی ہوئی۔ بالآخر تینوں، نئی تجویز لے کر جنرل کے پاس گئے اور قانون میں ترمیم کے ذریعے، ہائی کورٹ میں ججز کی تعداد میں اضافہ کر کے، سید محمد اور میری تقرری کرنے کا مشورہ دیا۔ بہت بحث اور تکرار کے بعد وہاں ہی، قانون میں ترمیم کے لئے آرڈیننس کا مسودہ صراف صاحب نے تیار کیا، جو صدر کے دستخطوں سے جاری ہوا اور ایک کے بجائے دو ججوں کی تقرری کا فیصلہ ہوا۔ نہ جانے کیوں، جنرل چشتی، میری تقرری کے لئے، مجھ سے رائے حاصل کیے بغیر، اپنے فیصلہ پر مستحکم رہے۔ جبکہ ماسوائے میرپور بار میں آمد سے قبل، صرف ایک ملاقات، جنرل ضیاالحق کے ساتھ میٹنگ میں ہونے کے علاوہ، کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی اور نہ ہی کوئی جان پہچان تھی۔

حصولِ منزل

حسب معمول میں وکالت میں مصروف تھا۔ مجھے تین بڑوں کی جنرل چشتی سے ملاقاتوں اور قانون میں ترمیم کا کوئی علم نہ تھا، یہ سب بعد میں اُن بڑوں سے ہی معلوم ہوا۔ ایک صبح میں قتل کے مقدمہ میں، بحث کی تیاری میں مصروف تھا، کہ سینئر وکیل محمد یحییٰ چیمہ اور راجہ اسلم میری رہائش پر تشریف لائے۔ وہ میرے پڑوسی اور تعلق والے

تھے۔ ان تک بھی کسی طرح خبر پہنچی کہ میں نے جج بننے سے انکار کر دیا ہے۔ دونوں نے بہت سنجیدگی سے پیشکش قبول کرنے پر اصرار کرتے ہوئے کہا، اس سے قبل میرپور ضلع سے کسی کو ہائی کورٹ جج بننے کا اعزاز حاصل نہیں ہے۔ یہ پہلا واقعہ تھا، کہ حکومت پاکستان ازخود، مجھے جج بنانے کے لئے مضطرب اور خواہش مند تھی، جبکہ دوسرے لوگ اس عہدہ کے لئے، نہ جانے کیا کیا کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنے لئے نہیں بلکہ ملک اور قوم کے لئے قربانی دیں، اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ دے گا اور شاید اسی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہو، کہ آپ کی قربانی کے صلہ میں میرپور کے دوسرے وکلا کے لئے راستہ کھل جائے۔ وہ دونوں ایک گھنٹہ مختلف دلائل کے تحت مجھے قائل کرتے رہے۔ میں کورٹس میں پہنچا ہی تھا، کہ ڈپٹی کمشنر کا فوری ملاقات کا پیغام ملا۔ میں دفتر میں داخل ہی ہوا تھا، کہ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور گاڑی میں بٹھا کر اپنی رہائش پر لے گئے، انھوں نے فون ملایا، تو دوسری طرف جنرل حیات بول رہے تھے، ان کا اہم ترین ذاتی پیغام تھا، کہ دوسرے روز صبح ۹ بجے، جنرل چشتی کے ساتھ کور ہیڈکوارٹر میں ضروری میٹنگ ہے، جس کے لئے وہ خود مجھے اطلاع کر رہے ہیں۔ حسب اطلاع، میں کور ہیڈکوارٹر پہنچا، تو ملٹری سیکریٹری، کیپٹن محمد یونس، مجھے انتظارگاہ میں لے گئے، جہاں سردار سید محمد پہلے سے موجود تھے۔ وہاں معلوم ہوا، کہ دو اسامیوں پر دو جج مقرر ہونے تھے۔ کچھ توقف کے بعد، سید محمد کو میٹنگ روم میں طلب کیا گیا، وہ اندر گئے اور چند منٹ کے بعد خوش خوش واپس آ گئے۔ پھر ملٹری سیکریٹری مجھے اندر لے گئے۔ جنرل چشتی کے ساتھ مسٹر چوہان، سیکریٹری امور کشمیر و کونسل دوسری نشست پر موجود تھے۔ جنرل چشتی نے نہایت خندہ پیشانی سے، علیک سلیک کے بعد، وکالت اور سیاست کی کیفیت دریافت کی اور چائے پیش کی، ساتھ ہی سنجیدگی سے، آزاد کشمیر کے انتظامی امور اور عوامی مسائل اور مشکلات کا حوالہ دیتے ہوئے، مہاجرین کی آبادکاری اور متروکہ جائیداد کے انتظام و انصرام میں، لاپرواہی کا ذکر کرتے ہوئے، میری تعریف کے انداز میں کہا، کہ ہائی کورٹ جج کے فرائض کے ساتھ ساتھ اضافی ذمہ داری، کسٹوڈین جائیداد متروکہ بھی آپ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، جس کی مبارکباد بھی دی۔ میں نے ان کو میرے متعلق، اچھی رائے رکھنے اور جج کے اعلیٰ عہدہ کے اہل قرار دینے پر، شکریہ ادا کر کے، نہایت ادب و احترام سے، اُن کی پیش کش قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ اس پر جنرل چشتی کو شاید کم، مگر چوہان سیکریٹری کونسل کو حیران کن جھٹکا سا لگا، جس پر وہ متعجب ہو کر چونک گیا۔ اس پر بحث اور سوال و جواب میں بہت تکرار شروع ہو گئی۔ سردار ابراہیم خان سے انکار کر دینے کا وعدہ، تو سید محمد کی تقرری کی شکل میں ساقط اور بے معنی ہو گیا تھا، تاہم میری اپنی سوچ کے مطابق، عدل کرنے کی دشوار ترین ذمہ داری قبول کرنا، موجودہ معاشرہ کے ماحول میں، دوزخ کا ایندھن بننے کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اور سیاست میں ہونے اور وسیع ترین حلقہ احباب ہونے کے سبب، اعلیٰ درجہ احتیاط اور پرہیز کے باوجود، بھول چوک اور ناانصافی کا خطرہ تھا۔ اس خوف اور اپنی خانگی مشکلات کی وجہ سے، میں جنرل صاحب کے سامنے صاف انکاری ہو گیا، مگر جنرل چشتی نے اپنے طور پر، مجھے جج بنانے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی، وہ بضد رہے۔ اس

دوران، چائے کا ایک اور دور ہوا۔ گفتگو میں معمولی سے وقفہ کے دوران، مسٹر چوہان جو دیر سے کروٹیں بدل بدل کر میرے انکار سے بیزار ہو رہے تھے، موقع غنیمت جان کر بے قراری میں مجھ سے مخاطب ہو کر، ہمدردانہ نصیحت کرتے گویا ہوئے: ''ملک صاحب آپ کو علم ہونا چاہیے، کہ جج ہائی کورٹ بننے کے لئے لوگ کتنی کوشش کرتے ہیں اور پاپڑ بیلتے ہیں، مگر آپ کو حکومت اور جنرل صاحب خود پیشکش کر رہے ہیں اور آپ انکار پر بضد ہیں''۔ چوہان صاحب، جنرل چشتی، سردار ابراہیم اور حیات خان کے درمیان تکرار اور تلخی کے چشم دید گواہ تھے اور ان کو علم تھا، کہ کتنی جدوجہد اور مشکل کے بعد قانون میں ترمیم کر کے، دوسری اسامی پیدا کی گئی تھی۔ ابھی میں نے ان کے ہمدردانہ تبصرہ پر کچھ کہنا ہی تھا، کہ جنرل چشتی بولے، ''مسٹر چوہان آپ مجید ملک اور اس کے پس منظر کو نہیں جانتے۔ یہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے، جو عہدوں کی تمنا اور ہوس کے لئے سرگرداں رہتے ہیں''۔ بالآخر جنرل چشتی نے اپنا حکم سنایا کہ ''مسٹر ملک آپ کو جج بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہے، آج کے بعد آپ جج ہائی کورٹ ہیں آپ جا کر تیاری کریں''۔ میں نے بھی اپنا فیصلہ سنایا، کہ ''جنرل صاحب، آپ کی عزت افزائی کا بہت شکریہ، مگر مجھے یہ پیشکش قبول نہیں''۔ مصافحہ کیا اور رخصت لی۔ جنرل صاحب کے ساتھ میری گفتگو تمام ماتحت عملہ اور سید محمد سُن رہے تھے، وہ سب حیران تھے۔ ملتے ہی سید محمد، مجھ پر برس پڑے، کہ انکار کیوں کیا ہے۔ میری وضاحت تو وہ سُن چکے تھے، ان کو کار میں بٹھا کر، میں سلور گرِل ریسٹورنٹ مال روڈ لے گیا اور لنچ کے بعد اس کو راولاکوٹ بس سٹینڈ پر پہنچایا اور خود خراماں خراماں میرپور لوٹ آیا۔ یہ دن ۹ رمئی ۱۹۷۸ء کا تھا۔

تنہائی کی بقا

اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر، تمام سفر میں تنہا ہی رہا۔ احساس تنہائی کو ختم کرنے کے لئے، انسانوں کے جنگل میں سرگرداں ہی رہا۔ قہقہوں اور کبھی آنسوؤں کی لہروں میں، شریک انبساط و غم رہا، مگر تنہائی بھی ایسی، کہ تعاقب میں ہر آن ہر جگہ موجود۔ ہمارا تعلق اور رشتہ بچپن سے جوانی اور جوانی سے پیرانہ سالی تک، پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا، البتہ پانچ لمحات میں اور بیشتر دفعہ چھ لمحات میں یہ پختہ کار اور پیہم رواں ساتھی تنہائی بھی ساتھ چھوڑ جاتی رہی۔ اس کی روش اور اسلوب بھی انوکھے ہیں، جن کا زاویہ سرور اور حد کیفیت، ایسی مستی پیدا کرتے ہیں کہ تنہائی سے جدائی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے، مگر میں اکثر اپنے آپ کو داد دیتا ہوں، کہ آج تک میری رفیق، تنہائی کا کسی کو احساس تک نہ ہو پایا۔ زندگی کی سدابہار محفل میں اہل محفل میری مسکراہٹ کو چائے کی چاشنی اور موتیوں کے مانند الفاظ، نگینوں کے مانند جملوں اور زلفوں میں خم کے مانند خمار آلود واقعات کی دلفریبی کے زیر اثر، دوام خیال کرتے رہے، نہیں ایسا ہرگز نہیں، میں تو بھری محفل میں ہوں، تب بھی تنہا اور تنہائی میں تو یقیناً تنہا۔ بتاہوں۔ تنہائی میرا مقدر ہے اور میں تنہائی کا مقدر ہوں اور اسی مقدر کو دوام اور بقاء حاصل ہے، حتیٰ کہ مکان اور مکیں یکجا ہو کر بھی تنہا تنہا ہیں۔

جنرل کا اقرار

یہ واقعہ ستمبر ۱۹۹۳ء کا نوے ہال لندن کا ہے، اس روز میری سوانح حیات یعنی خودنوشت، منظر عام/ منصۂ شہود پر لانے کی تقریب تھی، جو لندن کی پیپلز کمپنی نے ترتیب دی تھی۔ اس تقریب میں پانچ سو کے قریب لوگ شامل تھے، جن میں جنرل فیض علی چشتی، خالصتان کی جلاوطن حکومت کے جلاوطن صدر، جگجیت سنگھ چوہان، کونسل کے بیرسٹر صبغت اللہ قادری، بیرسٹر اکبر علی ملک، معروف صحافی حبیب الرحمٰن اور دیگر شامل تھے۔ جنرل چشتی نے میری تعریف کے ساتھ فخریہ طور پر، بہترین چناؤ بطور جج اور میرے مسلسل انکار کے باوجود تقرری کرنے کے عمل کی، داد لی۔ چند روز قبل چوہدری لطیف اکبر وزیر مالیات نے شکایت کے طور بتایا، کہ ایک تقریب میں اسلام آباد میں آپ کے متعلق گفتگو کے دوران جنرل چشتی جو قریب بیٹھے آپ کے اعلیٰ معیار کے فیصلوں پر تبصرہ سن رہے تھے، نے یہ انکشاف کر کے سب کو حیران کر دیا، کہ آپ نے تو جج بننے سے انکار کر دیا تھا، مگر انھوں نے اصرار کر کے، تقرری کا حکم جاری کر دیا۔ لطیف اکبر نے پوچھا، کہ آپ نے انکار کرنے کا ذکر کبھی نہیں کیا، اس کی وجہ کیا تھی؟ انھوں نے انکار کرنے کی وجہ معلوم کرنے پر بہت زور دیا۔ میں نے اتنا جواب دیا، جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ رات گئی بات گئی۔ البتہ جنرل چشتی نے سچ کہا تھا، کہ میں نے جج بننے سے صاف انکار کیا تھا۔

تقریب حلف میں بدمزگی

میرپور سیشن جج کی عدالت میں حسب معمول، ایک قتل کے مقدمہ میں بحث کر رہا تھا۔ کمرہ عدالت وکلا اور عوام سے بھرا ہوا تھا۔ ۱۷ مئی ۱۹۷۸ء دن ۱۱ بجے کا وقت تھا، کہ جج کے ریٹائرنگ روم میں فون کی گھنٹی ہوئی۔ سردار مشتاق جج، معذرت کر کے فون سننے گئے۔ واپسی پر مسکراتے ہوئے کہا، کہ کمال ہے جی، آپ ہائی کورٹ کے جج ہو کر میرے سامنے بحث کر رہے ہیں۔ آپ کے لئے چیف جسٹس کا پیغام ہے، کہ کل صبح ۱۰ بجے ہائی کورٹ مظفرآباد میں آپ کا حلف ہونا ہے، بس پھر کیا تھا۔ وکلا نے مبارکباد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے ان کو کہا، کہ میں نے انکار کر دیا ہوا ہے، مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی اور پکڑ کر بار روم میں لے گئے، مٹھائی پیش کی۔ راجہ اسلم اور چیمہ صاحب نے وکلاء سے کہا کہ ان کو فوراً مظفرآباد لے جا کر حلف دلواؤ۔ وکلا کاروں کے جلوس میں مظفرآباد پہنچے۔ وہاں سیشن جج بوستان چوہدری نے۔ وکلاء کی آمد کی پہلے سے اطلاع پا کر طعام و قیام کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ دوسری صبح اور بھی احباب پہنچ گئے۔ حلف سے قبل رات بھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا میں گذاری، کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عدل و انصاف کی ذمہ داری جو میرے سپرد ہو رہی ہے، یہ بہت ہی کٹھن آزمائش ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ جیسے متقی اور عظیم فقیہ نے جان قربان کر دی، مگر اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا۔ بہترین ہدایت و راہنمائی کے ساتھ ثابت قدمی،

دیانت داری اور جرأت سے صحیح انصاف کرنے کی استطاعت کی دعا کی اور عہد کیا، کہ مخلوق خدا کی عزت، وقار اور بلند حوصلہ قائم کروانے کی روایت قائم کروں گا، جس کا پہلے فقدان تھا۔ اُس وقت اعلیٰ عدلیہ کے چیف جسٹس صاحبان کے درمیان، سرد جنگ کی وجہ سے، گروپ بندی عوام میں بے توقیری کی حد کو چھو رہی تھی۔ اس پس منظر میں، نئی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے بہت احتیاط، ثابت قدمی اور صبر و تحمل کی اشد ضرورت تھی، جس کا مجھ کو شدت سے احساس تھا۔ عدالت کے بڑے کمرہ میں حلف کی تقریب تھی۔ یہ دیکھ کر، کہ جج صاحبان اور چیف جسٹس کے ساتھ ہی، ڈائس پر چیف سیکریٹری کی کرسی بھی رکھی گئی ہے، اعلیٰ عدلیہ کی روایات کی خلاف ورزی پر تعجب ہوا۔ رائج الوقت ضابطہ کے تحت، دو یا دو سے زائد اسامیوں پر تقرری کے ایک حکم کی صورت میں، سنیارٹی کا تعین عمر کے لحاظ سے ہوتا ہے، بڑی عمر کو سنیارٹی میں فوقیت ہوتی ہے اور بتایا بھی گیا تھا، کہ مجھے سینئر رکھا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر میں دائیں جانب کرسی پر بیٹھا ہی تھا، کہ مہمانوں کے سامنے ہی چیف جسٹس نے مجھے اس نشست سے اٹھا دیا اور سید محمد کو بٹھایا۔ یہ منظر سب نے دیکھا اور اس رویہ پر سب کو تعجب اور افسوس ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا، کہ تقریب میں شامل ہونے سے قبل ہی، مرتبہ و مقام سے آگاہ کر دیا جاتا، تاکہ بدمزگی نہ پیدا ہوتی، مگر ایسا نہ کیا گیا۔ اس رویہ پر میں نے پہلے لمحہ فیصلہ کیا، کہ حلف ہی نہ لوں، مگر دوسرے لمحہ رائے بدل گئی، کہ یہ عدل کی کٹھن منزل کی، پہلی آزمائش ہے، ثابت قدم رہنا ہوگا، مگر غصہ بہت آیا، چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ماں نے بچپن میں سکھایا تھا، کہ دنیا آزمائش گاہ ہے، غصہ یا ترنگ کے جذبات میں، دانشمند بھی بھٹک جاتے ہیں۔ بھٹکنا مت، صبر اور استقامت سے کام لینا۔ ماں کی ہدایت پر عمل کرتے، ہوئے کانپتی ہوئی، متزلزل آواز میں حلف لیا اور خون میں جنبش سے لرزتی انگلیوں کے سہارے، ٹیڑھا میڑھا دستخط کیا۔ تقریب میں بیٹا شوکت مجید اور ماموں عبدالعزیز، پولیس انسپکٹر بھی شامل تھے۔ حلف کے بعد مہمان چائے پر جمع ہوئے تو، سب نے مبارکباد کے ساتھ ساتھ، چیف جسٹس کے رویے پر اظہار افسوس بھی کیا۔ چیف جسٹس کا ایک لحاظ سے میرپور سے بھی تعلق تھا۔ وکالت میرپور میں کی تھی۔ اس لحاظ سے ماموں جان سے قریب بھی تھے اور ان کے دبنگ، بے باک انداز سے واقف تھے۔ انھوں نے ماموں جان کے پاس جا کر مصافحہ کرتے ہوئے مبارک دی تو، ماموں جان نے مبارک قبول کرنے کے بجائے بلند آواز میں کہا، "صراف تم نے جو بدمعاشی کی ہے، اس پر میرپور آنے پر بات ہوگی"۔ چیف جسٹس بغیر جواب دیئے، آگے چل دیئے۔ اسی لمحہ سیکریٹری قانون، خلیل قریشی جس سے میرا کافی تعلق تھا، اس نے سب کی موجودگی میں، اپنے آپ کو سرخرو کرتے ہوئے، چیئرمین کشمیر کونسل، جنرل ضیاالحق کی طرف سے ارسال کردہ تقرری کی ایڈوائس دکھائی، اور میرا نام اول لکھا ہوا دکھایا، کہ چیف جسٹس نے اپنی قلم سے کاٹ کر، نیچے نمبر دو پر لکھا تھا، جس کے مطابق صدر حکومت نے تقرری کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔ حیات خان چیف ایگزیکٹو، صدر سردار ابراہیم اور چیف جسٹس سب اس میں شامل تھے۔ سیکریٹری قانون ماتحت ملازم تھا، لہٰذا اس گناہ میں سب

شامل ہو گئے۔ تاہم ان کو یہ پریشانی ضرور تھی، کہ اگر اس کو چیلنج کر دیا گیا، تو ان کی سبکی ضرور ہو گی۔ مجھے بہت سے لوگوں اور وکلا نے اس کے خلاف چیئر مین کونسل کے پاس، ریپر یزینٹیشن کرنے کی ترغیب دی، مگر میں نے سوچا، کہ اعلیٰ عدلیہ پہلے ہی گروپوں میں بٹی ہوئی، مخالفت کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے، اس میں مزید اضافہ کرنا، خودسوزی کی کوشش ہوگی۔ لہٰذا اپنی تمام تر توجہ، اپنے فرائض منصبی پر مرکوز کر دی اور دوسروں کو اپنی اپنی آگ میں جلنے دیا۔ میں نے چیف جسٹس سے بھی شکایت سے پرہیز کیا اور سردار سید محمد سے دوستی سے بڑھ کر، بڑے بھائی کی طرح سلوک دکھایا، مگر ریپریزنٹیشن کے خوف سے، انھوں نے اپنے کارندوں کی ملی بھگت سے تبدیل کردہ ریکارڈ ہی غائب کروادیا۔ حلف کی تقریب ختم ہوتے ہی، اسی روز، مقدموں کی فائلیں سماعت کے لئے پیش کر دی گئیں۔ زین العابدین شاہ وکیل، جن کی جدی وراثت کا مقدمہ ڈوگرہ عہد سے زیر سماعت تھا۔ بڑی بھاری فائل، کئی سو صفحات پر مشتمل، کئی جج صاحبان اس کے حجم سے ہی خائف ہو کر، بقول وکلا، تاریخ پر تاریخ مقرر کرتے رہے۔ دو دن میں بحث مکمل ہوئی اور اسی ہفتہ فیصلہ ہوا، جو پہلا فیصلہ تھا، جو اسی سال پی ایل ڈی ۱۹۷۸ء اے جے کے صفحہ نمبر ایک پر شائع ہوا۔ آغاز اچھا تھا۔ آزاد کشمیر کے تمام وکلاء اور بار ایسوسی ایشنز نے میری تقرری کو اعلیٰ عدلیہ میں خوش آئند قرار دیا۔ حلف کے بعد ڈڈیال، ابو جان اور امی جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مشاورت کے وقت تو وہ میرے جج بننے کے حق میں نہ تھے، مگر تقرری کے بعد عوام کی طرف سے پذیرائی اور پسندیدگی کے اثر کو، دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ امی جان کو مظفرآباد کے لمبے سفر اور میرے کھانے کی فکر کے ساتھ، حکمرانوں کی مخالفت کی زیادہ پریشانی تھی۔ انہیں میری سوچ اور ڈٹ کر کام کرنے کا علم تھا، مگر حکمرانوں کا اپنے خلاف فیصلے ناپسند کرنے اور انتقام کا بھی علم تھا، مگر دونوں کی ایک ہی ہدایت تھی، کہ انصاف ٹھیک کرنا جو ہونا ہو گا دیکھا جائے گا۔ دیانتداری پر تو وہ جانتے تھے، کہ کوئی کمپرومائیز نہ ہوگا۔ ان کی ہدایات اور دعا، میرے عزم اور راست روی کی طاقت بنی۔

آزمائش پر آزمائش

وکلا اور عوام جہاں میری تقرری پر خوش تھے، وہاں سیاستدان پریشان تھے۔ مارشل لاء کے نفاذ اور جمہوری حکومتوں کی معزولی کے ساتھ ہی، پاکستان اور آزاد کشمیر میں، سابق حکمرانوں کے خلاف، احتساب کا عمل شروع کر دیا گیا تھا، کسی منچلے نے میرے متعلق افواہ پھیلا دی، کہ مجھے بڑے سیاستدانوں کے خلاف، احتساب کرنے کے لئے جج لگایا گیا ہے، اس کا خوب پراپیگنڈا ہوا۔ سردار عبدالقیوم خان نے میرے خلاف جنرل ضیاالحق کو تین صفحوں پر مشتمل، خط لکھ کر مطالبہ کیا، کہ میری تقرری کا حکم، واپس لیا جائے۔ خط میں میرے طالب علمی کے زمانہ میں، وزارت امور کشمیر کے خلاف جلوس نکالنے، دستور ساز اسمبلی کے قیام، قانون ساز اسمبلی کے حق میں تحریک چلانے، حتیٰ کہ لبریشن لیگ منظم کرنے، اس کا دستور اور منشور مرتب کرنے کے تمام امور، مجھ سے منسوب کر کے،

لبریشن لیگ کے سیاسی پروگرام، آزاد حکومت کو ساری ریاست کی جائز حکومت تسلیم کروا کر، بین الاقوامی سفارتی جدوجہد برائے آزادی کرنے، سکیورٹی کونسل اور بین الاقوامی عدالت انصاف میں، مسئلہ کشمیر پیش کرنے کو میرے دماغ کی اختراع قرار دیا۔ جنرل چشتی کے بقول، جنرل ضیاالحق نے حاشیہ پر نوٹ لکھا کہ "سردار قیوم کو عقل سے کام لے کر اخلاق کے دائرہ میں رہنا چاہیے"۔ سردار قیوم کے علاوہ بھی کچھ بڑے عہدوں پر فائز اہلکار اور کچھ سیاستدان، جو خفیہ شعبہ میں بطور، وفادار حکومت پاکستان، مخبری بھی کرتے تھے، انھوں نے بھی اپنی اپنی کارگذاری میرے خلاف ذاتی اور خیالی، متوقع خوش خبری کے منتظر رہے۔

سردار عبدالقیوم، جب صدر حکومت تھے، تو ان کے خلاف عدم اعتماد ہوا اور حکومت ختم ہوگئی۔ انھوں نے عدم اعتماد کی کارروائی کو، غیر آئینی قرار دلوانے اور بقیہ مدت صدارت کے واجبات کے حصول کے لئے، ہائی کورٹ میں آئینی پٹیشن دائر کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پٹیشنر سردار قیوم کے میرے ساتھ تعلقات، اچھے نہ تھے اور اُس نے میری تقرری کے خلاف، جنرل ضیاالحق کو خط بھی لکھا تھا، چیف جسٹس نے، دوسرے دو جج صاحبان کے بجائے، وہ پٹیشن برائے سماعت، میرے سپرد کی۔ میں نے ذاتی وجوہات کی بناء پر، سماعت سے معذرت کر دی۔ انھوں نے معذرت سے اختلاف کرتے ہوئے، ایک مفصل حکم تحریر کر کے دوبارہ پٹیشن برائے سماعت ارسال کر دی۔ اس کے ساتھ ہی سردار قیوم نے بھی درخواست پیش کر دی، جس میں کچھ ماضی کے واقعات اور سیاسی اختلافات کا حوالہ دیا گیا تھا۔ میں نے پٹیشن میں درخواست کا حوالہ دے کر، پٹیشن واپس کر دی۔ اس پر چیف جسٹس نے ماتحت عدالتوں سے انتقال مقدمہ کے طریقہ کار کے انداز میں، جملہ واقعات مندرجہ درخواست پر، مفصل تبصرہ کرنے کے لئے لکھا۔ حالانکہ ہائی کورٹ کے جج کی طرف سے معذرت ہی کافی ہوتی ہے اور مزید یہ لکھا، کہ سردار قیوم کی درخواست کے مندرجات سے توہین عدالت کا ارتکاب پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کی جائے۔ جو لوگ قانون سے آگاہی رکھتے ہیں، وہ میرے ساتھ اتفاق کریں گے، کہ ایک ہائی کورٹ جج کو، چیف جسٹس تحت قواعد مقدمہ سماعت کے لئے، سپرد کر سکتا ہے۔ یا واپس لے سکتا ہے، حکم صادر نہیں کر سکتا، کہ کسی کے خلاف مقدمہ مرتب کرو۔ میں نے بادل نخواستہ، مزید چپقلش سے پرہیز کرتے ہوئے، مختصر سا تبصرہ کر دیا۔ اب ایک طرف چیف جسٹس، ناچاقی کی کیفیت پیدا کرنے پر بضد تھا، دوسری طرف سردار قیوم سے تنازعہ میں الجھا کر، اس کے میرے ساتھ ذاتی اختلاف کے الزام کو، درست ثابت کرنے کی کوشش تھی، جبکہ جج بنے ہوئے ابھی تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی۔ میں ذاتی طور پر، قانون کا طالب علم ہونے کے ناطے اور آزاد و غیر جانبدار عدلیہ کی حیثیت کے لحوظ، ماسوائے عدالت کے احکامات اور فیصلوں پر عملدرآمد کے فعل کے اور کسی معاملہ کے ارتکاب پر، توہین عدالت کے قانون کے تحت کارروائی کو، انسانی وقار اور عدلیہ کی عظمت کی توہین سمجھتا ہوں۔ اس نظریہ کے تحت بھی اور دیگر وجوہات کے

تحت، توہین کی کارروائی سے دانستہ اجتناب کیا۔ اس طرح اس مرحلہ پر ایک آزمائش سے سرخرو ہوا۔ دراصل ایک سازش کے تحت، ماضی میں سیاسی اختلافات کی آڑ میں، مجھے الجھانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ جب سیاست میں تھا، تو ڈٹ کر جرأت سے اختلاف کرتا رہا، تنقید کرتا رہا، مگر اب انصاف کی مسند پر بیٹھ کر میں نے سیاست نہیں، بلکہ آزادی اور غیر جانبداری سے، مروجہ قانون اور اسلام کے متعین کردہ اصول کے تحت، انصاف اور صرف انصاف کرنا تھا۔ لہٰذا میں کسی بہکاوے میں آنے والا نہ تھا۔ عدالتی نظام میں اچھے اور بڑے جج صاحبان کی، زندگی کی مکمل تاریخ، راہنمائی کے لئے سامنے تھی اور مستقبل قریب میں میرے رویہ میرے عمل اور فیصلوں نے روشن یا سیاہ تاریخ کا حصہ بننا تھا۔ البتہ یہ میرے اختیار میں تھا کہ گناہ کی سیاہ تاریخ کا باب بنوں یا انصاف کی درخشاں تاریخ کا روشن باب۔ حتمی فیصلہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے، حلف لینے کے ساتھ ہی، میں نے اعلیٰ عدلیہ میں برصغیر اور بالخصوص پاکستان کے نامور اور معروف، سابق جج صاحبان کے فیصلوں کا، از سر نو مطالعہ شروع کر دیا اور قانون کی اصطلاحات، محاوروں کے موزوں استعمال کا اسلوب اختیار کرنے کی مشق شروع کر دی۔ وکالت میں دلائل کی تائید میں، بطور نظیر فیصلوں کا حوالہ دینے کی نسبت، بطور جج قانون کی زبان میں فیصلہ لکھنا، قدرے محنت طلب اور مشکل ہوتا ہے۔ محنت کے نتیجہ میں میرا وزن دس کلو کم ہوگیا۔ میر پور آیا تو ماموں جان نے دیکھتے ہی کہا، تم جج بن کر مجنوں لگتے ہو۔ حقیقت میں مجھے پریشانی لاحق تھی، کہ اعلیٰ عدلیہ میں جج تو چند سال کے بعد ریٹائر ہو جاتا ہے، مگر اس کے فیصلے جو قانون کے ماہانہ رسالوں اور سالانہ رپورٹنگ میں شائع ہوتے ہیں، وہ تمام ممالک میں پڑھے جاتے ہیں اور بطور نظیر پیش کیے جاتے ہیں اور صدیوں تک اعلیٰ عدلیہ میں ان کا حوالہ دیا جاتا ہے اور بیشتر اوقات فاضل جج کے نام کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس احساس کے تحت یہ جانتے ہوئے، کہ جج کے عہدہ کی مدت مقرر ہے، مگر قانون کے مطابق اچھے فیصلوں کی مقبولیت اور شہرت محدود نہیں۔ بے شک میں نے ایک مدت کے بعد ریٹائر ہو جانا تھا، مگر بعد میں پچھتاوا اور ندامت نہیں ہونی چاہیے اور یہی مجھے ماں باپ اور مخلص دوستوں کی ہدایت تھی۔

سردار ابراہیم خان کی مجلس میں تعریف

قبل ازیں ۱۶ ر ستمبر ۱۹۷۶ء کی رات، مظفر آباد میں ذوالفقار علی بھٹو کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ کھانے کے بعد ہلکی پھلکی گپ شپ چل رہی تھی۔ دوران گفتگو سرینگر میں، قائداعظم کا ایک مقدمہ کے سلسلے میں، ہائی کورٹ میں پیش ہونے کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی حوالہ سے اے کے بروہی اور چند دوسرے، پاکستان کے معروف وکلاء پر تبصرہ کے دوران بھٹو صاحب نے پوچھا، کہ اس وقت آزاد کشمیر میں قابل وکیل کون ہے، تو سردار ابراہیم خان نے فوراً میرا نام لیتے ہوئے اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ملک صاحب اس وقت چوٹی کے وکیل ہیں، جس کی فوری تائید وزیر اعظم عبدالحمید خاں اور چیف جسٹس صاحبان نے بھی کی، بعد میں کسی نے دوسرے نمبر پر خواجہ شفیع وکیل کا نام بھی

لیا۔ اب جج بننے کے بعد، چیف جسٹس سپریم کورٹ، چوہدری رحیم داد نے ہماری تقرری پر سید محمد اور میرے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا، جس میں، دیگر مہمانوں کے علاوہ صدر حکومت، بھی مدعو تھے، وہ ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ ہم ابھی راستہ میں ہی تھے، کہ مہمانوں میں سے کسی نے میری تقرری کی تعریف کی، جو نہ جانے کیوں، میزبان تقریب کو پسند نہ آئی، تو انھوں نے اس کی تردید کردی۔ یہ انداز سردار صاحب کو پسند نہ آیا اور ماحول میں سنجیدگی طاری ہوگئی۔ ہم اسی لمحہ پہنچے، تو محفل میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کھانا دیا گیا، تو صدر صاحب نے مجھے آواز دے کر کہا، کہ میرے پاس آؤ اور مجھے ساتھ والی نشست پر دائیں جانب بٹھالیا، حالانکہ وہ نشست کسی اور کے لئے مختص تھی۔ حیات خان چیف ایگزیکٹو، ان کے بائیں جانب تھے۔ عشائیہ میں کے ایچ خورشید، سابق چیف جسٹس خواجہ محمد شریف کے علاوہ، چیف جسٹس ہائی کورٹ، جج صاحبان، سینئر وکلاء اور سیکریٹری صاحبان بھی مدعو تھے۔ سردار ابراہیم خان نے، حیات خان کو مخاطب کر کے کہا، ”کہ ابھی تک ملک صاحب کو مکان کیوں نہیں دیا گیا۔ انھوں نے کہا، کہ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے، کہ ملک صاحب جج بننے کیلئے تیار نہ تھے، حکومت نے منت کر کے، مشکل سے ان کو عہدہ قبول کرنے کے لئے راضی کیا، اور کہا کہ ملک صاحب ایک بڑے قابل اور دیانتدار وکیل تھے اور میرپور میں ایک خوبصورت بنگلہ میں رہائش پذیر ہیں، جہاں یہ شہزادوں کی طرح رہتے ہیں، میں خود ان کے بنگلہ پر گیا ہوں۔ ان کا ملک اور قوم پر احسان ہے، کہ انھوں نے جج کا عہدہ قبول کیا ہے“۔ جب وہ اس انداز میں تعریف کر رہے تھے، تو مجھے پسینہ آ رہا تھا کہ سردار صاحب کو اچانک محفل میں میری تعریف کرنے کی ضرورت، کیوں محسوس ہوئی تھی، جو لوگ سردار صاحب کو قریب سے جانتے ہیں، انھیں اس بات سے اختلاف نہ ہوگا، کہ سردار صاحب، رسمی اور روایتی تعریف کرنے، کا مزاج قطعی نہ رکھتے تھے، بلکہ بہت سلجھی ہوئی عادات اور اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ میرے تعجب کی وجہ یہ تھی، کہ ہمارے پہنچنے سے قبل، ہونے والی بدمزگی کا مجھے علم ہی نہ تھا۔ یہ تو دوسری صبح جسٹس راجہ خورشید سے، اس کا پس منظر معلوم ہوا۔ دراصل سردار صاحب نے، میزبان عشائیہ کے ناپسندیدہ جملہ کی تردید میں، بلکہ مذمت میں، مجھے محفل میں عزت دی اور احترام کیا۔ یہ سردار صاحب کا بہت بڑا پن اور عظمت تھی، ورنہ محفل میں اور لوگ بھی تو تھے۔ اس قدر تعریف کا ایسا نفسیاتی اثر ہوا تھا، کہ کھانے کے بعد خلاف روایت، مجلس جلد برخاست ہوگئی اور میزبان کا شکریہ ادا کرنا ہی فراموش کردیا گیا۔ میں نے وداع ہوتے وقت مصافحہ کرتے ہوئے، شکریہ ادا کیا، تو ان کو سراسیمگی کی کیفیت میں پایا۔

جائیداد متروکہ کا، فرضی ریکارڈ

جج ہائی کورٹ کے عہدہ کے ساتھ ساتھ، آزاد جموں کشمیر میں متروکہ غیر مسلم جائیداد کا اضافی کام، بطور کسٹوڈین بھی میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میرے پیش رو راجہ خورشید، ملک محمد اسلم، چوہدری رحیم داد، خان عبدالحمید خان، خواجہ محمد شریف اور فیاض حسین، چیف جسٹس جیسے ذہین اور کہنہ مشق جج، کسٹوڈین کے فرائض انجام دے چکے تھے۔

قریب ایک ماہ بعد، جنرل چشتی صاحب کا فون آیا، کہ وہ چند دنوں میں راولاکوٹ دورہ پر جا رہے تھے، اُنہیں ضلع پونچھ میں متروکہ جائیداد کے میزان، الاٹ شدہ و بلا الاٹ، مہاجرین اور مقامی لوگوں کے حق میں الاٹ شدہ جائیداد کی مکمل تفصیل چاہیے۔ اس تصور میں، کہ ہیڈ آفس میں ریکارڈ موجود ہوگا۔ میں نے احتیاطاً ایک گھنٹہ میں مطلوبہ تفاصیل فراہم کرنے کا عندیہ دیا۔ عبدالمجید سلہریا، سیکریٹری کے استفسار پر بھی یہی مؤقف اختیار کیا۔ فیاض راجہ دھیر کوٹ کے، مدت سے آفس نگران تھے، اس کو طلب کر کے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کا کہا، وہ پریشان ہو کر بولا، جناب مرکزی دفتر میں تو کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ میرے سوال کے جواب میں بتایا، کہ مرکزی دفتر میں، نگران دفتر، ایک کلرک اور دو قاصد ملازموں کی صرف ملازمت کی چار فائلوں کے سوا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ یہ جواب سُن کر پشیمانی میں ڈوب گیا، کیونکہ ایک گھنٹہ میں ان کو تفصیل مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دفتر میں ریکارڈ ہی نہیں تھا، اب کیا کیا جاتا۔ یہ معلوم ہوگیا، کہ ریکارڈ کی تفصیل ہے ہی نہیں، لہٰذا پرائیویٹ سیکریٹری، کبیر قریشی کی معاونت سے ایک فرضی چارٹ تیار کیا اور جنرل صاحب، سیکریٹری سلہریا صاحب کو ایک فرضی تفصیل بتا کر، اپنے فاضل پیشرو جج صاحبان کی احسن فرائض کی انجام دہی پر، حرف آنے سے بچا لیا۔ یہ فرضی تفصیل، بلاخوف تردید و تضاد تھی، کیوں کہ صحیح ریکارڈ مرکزی دفتر اور سیکریٹری محکمہ کے آفس میں موجود ہی نہ تھا۔ اس فعل پر، اپنی حاضر دماغی کے تحت، فرضی چارٹ بنانے پر ہنسی آئی، مگر گذشتہ تیس سال کی مدت میں ہر پٹوار، تحصیل اور ضلع میں اتنا عملہ موجود ہونے اور تنخواہ ادا کرنے کے باوجود، محکمہ متروکہ جائیداد کے مرکزی دفتر میں، ریکارڈ کا نہ ہونا، انتہائی افسوسناک غفلت تھی۔ اس لاپرواہی کے عمل نے مجھے چونکا دیا۔ اگر جنرل چشتی طلب نہ کرتے، تو یہ غفلت نہ جانے کب تک جاری رہتی۔ میں نے فی الفور تمام عملہ کی میٹنگ بلائی۔ میرے ذاتی علم میں تھا، کہ ماضی میں جسٹس ملک اسلم نے، کسٹوڈین بک تیار کرنے کا کام شروع کیا تھا، جو ان کے تبادلہ پر ٹھپ ہوگیا تھا۔ میں نے اولیں طور پر، کسٹوڈین بک ہنگامی طور پر مکمل کر کے، ہر دیہہ کا ایک رجسٹر، مرکزی دفتر میں جمع کروانے اور ایک زیرِ کار، ہر پٹوار میں رکھنے کا کام کروایا۔ گذشتہ تیس سال کا بقایا، کرایہ اور لگان وصول کرنا شروع کیا، ناجائز قبضہ جات اور تجاوزات ختم کروائے، فوج کے زیرِ قبضہ گھاس فارم کے بقایا جات وصول کیے، کسٹوڈین محکمہ کی معمولی آمدن میں، کروڑوں روپیہ بقایا جات اور کرایہ وصولی کی مد میں جمع ہو گئے، جس کی رپورٹ چیف ایگزیکٹو حیات خان، پڑھ کر بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے اس کی اطلاع جنرل چشتی کو بھی دی۔ وہ بہت مطمئن ہوئے۔ فرضی اعداد و شمار کے ریکارڈ نے، بہت کم مدت میں حقیقت کا روپ دھار لیا، بعد میں جب اس کا صحیح ریکارڈ کے اعداد و شمار سے تقابل کیا گیا، تو حیران کن حد تک، اس میں بہت کم فرق ثابت ہوا۔

گاڑی کی خرید میں اختلاف

ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور جج صاحبان کے لئے گاڑیاں خریدنے کے لئے، حکومت نے، رقم ہائی

کورٹ کے سپرد کی۔ میٹنگ میں چیف جسٹس نے فیصلہ دیا، کہ ریکنڈ یشنڈ کاریں خریدنی ہیں۔ سردار شریف اور سید محمد تو خاموش رہے، مگر میں نے رائے دی، کہ حکومت نے نئی گاڑیوں کے لئے رقم فراہم کی ہے، اس لئے ریکنڈ یشنڈ کاروں کی مرمتی کے اخراجات سے بچنے اور تھوڑے عرصہ کے بعد گاڑیاں ورکشاپ بھیجنے کی بجائے نئی گاڑیاں خریدنا بہتر ہوگا۔ میری رائے سنتے ہی، چیف جسٹس ناراض ہوکر بولے، کہ جب دوسرے جج صاحبان جو سینئر ہیں، اُن کو اختلاف نہیں ہے، تو آپ کیوں اتفاق نہیں کرتے؟ میں نے وضاحت کی، کہ میری رائے صرف میرے اپنے متعلق تھی۔ انھوں نے دوٹوک کہا، کہ آپ کو ہائی کورٹ کے لئے منظور کردہ رقم سے نئی گاڑی ہم نے دینی ہی نہیں ہے۔ آپ کے پاس کسٹوڈین کا چارج بھی ہے، لہٰذا اگر آپ کو گاڑی چاہیے، تو آپ محکمہ کسٹوڈین کے فنڈ سے گاڑی خرید لیں۔ اُس لمحہ مجھے اس رویہ اور دو محترم جج صاحبان کی خاموشی پر، صرف ترس آیا اور اس مختصر مکالمہ پر ہی، اکتفا کرتے ہوئے میں میٹنگ سے باہر آ گیا اور پچاس گز کے فاصلہ پر واقع، حیات خان، چیف ایگزیکٹو، کے پاس جا کر صرف اتنا بتایا، کہ میں کسٹوڈین فنڈ سے گاڑی خریدنے کی حکومت سے اجازت چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا، کہ آپ کی گاڑی کے لئے تو حکومت نے رقم فراہم کر دی تھی۔ وضاحت کیے بغیر، میں نے بتایا کہ چونکہ میرے پاس محکمہ کسٹوڈین کے پورے خطہ میں، جائیداد کے انتظام و انصرام کے معاملات ہیں، لہٰذا اسی محکمہ کے فنڈ سے گاڑی لینا مناسب ہوگا۔ حیات خان نے رقم کی منظوری اسی وقت دے دی۔ میں نے چند دنوں میں، نئی گاڑی کی خرید کے لئے کمیٹی بنا کر، ضابطہ کی کارروائی کر کے، نئی گاڑی خرید کروالی۔ گاڑی ہائی کورٹ کار پارک میں کھڑی پا کر، چیف جسٹس نے رجسٹرار کو بلا کر پوچھا، کہ نئی کار کس نے وہاں کھڑی کی ہے؟ اُس نے بتایا کہ جسٹس ملک کی گاڑی ہے۔ مجھے فوراً چائے پر اکیلے ہی دعوت دی۔ مُسکراتے ہوئے کہا کہ، آپ نے تو کمال کر دیا۔ مشورہ کیے بغیر گاڑی منگوالی۔ میں نے بے تکلف انداز میں کہا، آپ تو یہ شکایت نہ کریں۔ میٹنگ میں آپ نے ہی تو مشورہ دیا تھا اور آپ کے اُس میٹنگ میں بہترین مشورہ پر عمل کے نتیجہ میں نئی گاڑی ملی تھی، ورنہ دوسرے جج صاحبان کی طرح، ابھی تک منتظر ہی ہوتا۔ اس پر ہنس کر بولے، ''ملک صاحب، وہ لوگ آپ کی طرح کے رہن سہن کے حامل نہیں ہیں، انھوں نے تو جج بن کر پہلی دفعہ کار پر سواری کی تھی۔ لہٰذا ان کا معیار وہی ہے، جو میٹنگ میں بتایا تھا''۔ میں نے تحمل سے جواب دیا، کہ پہلے وہ جیسے بھی تھے، مگر اب تو ہائی کورٹ کے جج ہیں اور یہ سہولت ان کا حق تھا۔

رازدارانہ مشورہ

چیف جسٹس بہت ذہین اور مدبر تھے، ہمارے درمیان تلخیاں بھی پیدا ہوتی رہیں، مگر پرانے میرپور بار میں اکٹھے تھے۔ کے ایچ خورشید کے الیکشن میں اور لبریشن لیگ منظم کرنے میں بھی اکٹھے تھے، اس لئے بے تکلفی بھی بہت تھی، فرق صرف یہ تھا، کہ وہ چیف جسٹس تھے اور میں جج تھا، اور بقول ان کے، حلف کی سطح اور درجہ پر، میں جونیئر

جج تھا۔ مگر آزاد کشمیر کے وکلاء گواہ ہیں، کہ عدالت میں اور عدالت کے باہر، میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو جونیئر جج، خود سمجھا، نہ ہی دوسروں پر کسی طرح ظاہر ہونے دیا۔ میں جو چیف جسٹس کے عہدہ سے ریٹائرمنٹ سے ایک دن قبل تھا وہی روز اول جج بننے کے وقت تھا، جس کی دنیا گواہ تھی۔ تو بات راز میں مشورہ دینے کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ''آزاد کشمیر میں، سدھن قبیلہ، کسی نہ کسی حیثیت میں، ہمیشہ حکومت اور اقتدار میں رہے گا، اس لئے دانائی اور بہترین حکمت اسی میں ہے، کہ سدھن قبیلہ سے تعلقات، اچھے بنا کر رکھو''۔ ان سے یہ مشورہ سننے کے بعد، مجھ پر یہ آشکار ہوا، کہ سید محمد کو جج بنوانے میں اور قانون میں ترمیم کر کے، نئی اسامی پیدا کرنے کا مشورہ دینے اور سید محمد کو خلاف ضابطہ، مجھ سے سینئر قرار دینے کے لئے، اتنا کچھ کرنے کی وجہ، صرف سردار ابراہیم خان، حیات خان، سید محمد اور سدھن قبیلہ کی خوشنودی، حاصل کرنے کی خوشامد اور چاپلوسی تھی۔ لہٰذا کامیابی کا اسم اعظم، بقول ان کے، سدھن قبیلہ کو، ہر حالت میں خوش رکھنا تھا۔ اس مدبرانہ سوچ کا، جو حشر ہوا اس کا ذکر آگے ہوگا۔

گیسٹ ہاؤس میں قیام

سردار ابراہیم صاحب کی، معقول سفارش اور تعریف کے باوجود، مجھے ایک سال تک رہائشی مکان نہ ملا اور اس دوران سٹیٹ گیسٹ ہاؤس، میں قیام رہا۔ اتفاق سے پنجاب کے میجر شیخ، اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس اور چیئرمین تعلیمی بورڈ میرپور، سید نذیر حسین شاہ، سروس میں معطل ہو کر، اسی گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ شام کو نذیر شاہ کے پاس، کافی پینے کی محفل ہوتی تھی۔ نذیر شاہ نے، پی ایچ ڈی فرانس کی پیرس یونیورسٹی سے کی تھی۔ وہ بھٹو صاحب کے پرستار اور شیدائی تھے۔ ان دنوں بھٹو کو سزائے موت ہو چکی تھی اور وہ راولپنڈی جیل میں تھے۔ نذیر شاہ کی معطلی کی وجہ بھی، کھلے عام بھٹو کی حمایت اور ضیاالحق کی مخالفت تھی۔ نذیر شاہ کا تعلق، جموں شہر سے تھا۔ ان کے والد، چوہدری غلام عباس خان راہنما مسلم کانفرنس کے ماموں تھے۔ نذیر شاہ، بہت دلیر اور باغ و بہار طبع کے، مالک تھے۔ گورڈن کالج میں، مجھ سے سینئر تھے، مگر ان سے میل جول اور تعلق میں قربت، میرپور میں وکالت کے دوران، جب وہ کالج میں پرنسپل تھے، تب ہوئی تھی۔ ان کی مستقل رہائش بھی، میرپور میں ہی تھی۔ ان کی شادی پسند کی تھی، بیگم صاحبہ میرپور ہسپتال میں ڈاکٹر تھیں۔ شام کو کافی کی محفل میں، وہ کافی بناتے ہوئے اور جرنیلوں کو گالیاں دیتے ہوئے، میجر شیخ کو، گرم گرم خوشبودار کافی کا پیالہ پیش کرتے اور گالی نکال کر زوردار قہقہہ لگاتے۔ میجر شیخ، کافی لیتے ہوئے، کھسیانی ہنسی میں کہتے، نذیر شاہ اتنی ذائقہ دار کافی بنا کر، فوجی جرنیلوں کو گالیاں دے کر، اس کو کیوں بے ذائقہ بناتے ہو۔ ہر شام، اُن کے معمول میں شامل ہو کر، میں بہت لطف اندوز ہوتا۔ ایک دن میں نے، نذیر شاہ کو میجر شیخ کے سامنے، جرنیلوں کو گالیاں دینے سے منع کیا، تو بہت ہنسے اور کہا، کہ ملک صاحب! فوجیوں نے بھٹو کو پھانسی ضرور دینی ہے، کیونکہ جرنیل بھٹو سے خائف تھے، کہ اگر بھٹو بچ گیا، تو جرنیلوں کو فارغ کر دے گا۔ اس لئے میجر شیخ

کے سامنے، جرنیلوں کو گالیاں دینے میں مزہ آتا ہے، دل کا غبار ختم ہو جاتا ہے۔ حیات خان نے اُن کو معطل کیا تھا، اور اسی کے پاس، معطلی کے حکم کے خلاف، انھوں نے نظر ثانی پیش کر رکھی تھی۔ وہ حیات خان کو، حیات خان کے بجائے، پرائیویٹ محفل میں، حیاتو، کہہ کر بلاتے۔ مقررہ تاریخ پر، نظر ثانی کی سماعت ہونی تھی، مگر اگلی شام کو انہیں اطلاع ملی، کہ حیات خان اسلام آباد چلا گیا ہے، حالانکہ وہ مظفر آباد میں ہی تھا۔ نذیر شاہ نے، اس کی تصدیق کرنے کے لئے پریذیڈنٹ ہاؤس فون کیا۔ ان کا خیال تھا، کہ فون کوئی سٹاف کا آدمی اٹھائے گا۔ نذیر شاہ نے فون کیا اور ریسیو ہوتے ہی، فی الفور کہا ''اوئے کتھے اہیہ تیرا حیاتو''۔ اتفاق سے، فون حیات خان نے خود اٹھایا تھا۔ اُس نے جواب میں کہا ''میں خود بول رہا ہوں''۔ نذیر شاہ پھنس گیا۔ فوراً کہا، جناب آپ خود بول رہے ہیں؟ اس نے کہا، میں نذیر شاہ ہوں، معلوم کرنا تھا، کل میری نظر ثانی کی سماعت ہوگی؟ اس نے کہا ہاں ضرور ہوگی۔ دوسرے روز نظر ثانی خارج ہوگئی۔ نذیر شاہ، اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہنے لگے ''حیاتو نے اپنا انتقام لے لیا ہے''۔

ریاض الخطیب، سعودی سفیر سے ملاقات

پاکستان اور سعودی عرب میں سیاسی، معاشی اور دفاعی معاملات میں نسبتاً بہت خصوصی اور قریبی تعلقات قائم چلے آتے تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کہلانے کے بعد، لاہور میں اسلامی ممالک کی کانفرنس کے انعقاد میں اور پاکستان کو چیئرمین منتخب کروانے میں، شاہ فیصل نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب، بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ وہ نہایت دلکش شخصیت کے مالک، ذہین، فطین، ہر دلعزیز ہونے کے سبب، پاکستان میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو، جس تندی اور تیزی سے، اقتدار کی مسند پر براجمان ہوئے اور پاکستان میں سیاہ وسفید کے مالک بنے، ان کا ستارہ تیزی سے عروج پر درخشاں ہوا۔ اُن کو غالباً اقتدار میں کم وقت اور باقی کم زندگی کا، الہامی احساس تھا، کہ وہ اپنے طے کردہ مقاصد کو، جلد سے جلد حاصل کرنے کے درپے تھے، جہاں ایک طرف پاکستان مخالف، بین الاقوامی قوتیں، ان کے خلاف سازش میں متحرک تھیں، وہاں ساتھ ہی ساتھ، پاکستان کے اندر اُن کی سخت گیر انتظامی اور سیاسی حکمت عملی کے ردعمل میں، مخالف سیاسی قوتیں موقع کی تلاش میں تھیں، نہ چاہتے ہوئے بھی، قبل از وقت جنرل انتخابات میں، دھاندلی اور جبر کی وجہ سے، کچھ حلقوں میں انتخاب جیتنے کی کوشش نے، مخالفین کو موقع فراہم کر دیا۔ جس کی انتہاء مارشل لاء کے نفاذ اور مقدمہ قتل کے جرم میں، پھانسی کی سزا پر موقوف ہوئی۔ پاکستان میں، ایک بڑے طبقہ کی خواہش اور کوشش تھی کہ بھٹو کو سزائے موت سے بچایا جائے۔ اس طبقہ میں، ہم بھی شامل تھے۔ کے ایچ خورشید، تو مقدمہ کی سماعت کے دوران، بدستور بھٹو کے ساتھ رہے اور ان کے وکیل یحییٰ بختیار سے، دفاع میں مشاورت بھی کرتے رہے۔ جنرل ضیا الحق اسلامی قوانین کے نفاذ اور کچھ مدت اُردن میں فوجی خدمات سرانجام دینے کی وجہ سے، مشرق وسطیٰ کے ممالک

بالخصوص سعودی عرب میں بہت ہردلعزیز تھے۔سعودی سفیران سے، معمول سے زیادہ ملتے رہتے تھے۔ عام تاثر تھا، کہ وہ جنرل ضیاء کے زیادہ قریب ہیں۔ اتفاق سے، وہ صدر آزاد جموں کشمیر کی دعوت پر، اُن دنوں مظفرآباد تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں، منعقدہ ظہرانے میں اعلیٰ عدلیہ کے جج بھی مدعو تھے۔ کھانے کے بعد، میں ان کے ساتھ والی نشست پر تھا۔ میں نے تعارف کے بعد، سعودیہ کی مسئلہ کشمیر میں مسلسل دلچسپی اور حمایت کی تعریف کی، تو وہ بالکل بے تکلف ہو کر، کھل کر گفتگو کرنے لگے۔ میں نے مناسب موقع جان کر پاکستان کے حالات کی آڑ میں، بھٹو کی ذہانت، فراست اور جرأت مندانہ قیادت کا ذکر کر کے بھٹو کو پھانسی سے بچانے پر بات شروع کی، تو وہ میری طرف جھک کر، رازدارانہ، سرگوشی کے انداز میں میرے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے بولا، کہ وہ ذاتی اور سفارتی حیثیت میں اور سعودی حکومت، جنرل ضیاالحق پر بھٹو کو پھانسی نہ دینے کے لئے، اپنا پورا اثر استعمال کر رہے تھے اور قوی امکان تھا کہ سزا موت پر عمل نہ ہو۔ بھٹو کی حمایت میں، ریاض الخطیب سے بات کر کے، مجھے بے حد طمانیت اور سکون ملا، مگر موت اٹل تھی وہ ٹل نہ سکی۔ جب میں ریاض الخطیب سے گفتگو کر رہا تھا، میری تمام تر توجہ، اس کی گفتگو پر مرکوز تھی، مگر وہاں موجود مہمانوں کی توجہ، ہم دونوں پر تھی۔ چونکہ گفتگو ہم دونوں تک محدود تھی اور کافی دیر سرگوشیوں کا سا انداز رہا، تو محفل میں تاثر یہ قائم ہوا، کہ ہم پرانے شناسا تھے۔ تاہم چیف جسٹس، جن کو بھٹو صاحب میں دلچسپی تھی، ان کو میں نے اپنی کارگزاری بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

آسیب زدہ مکان، 15-A

مظفرآباد سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ایک سال کے قریب قیام کے بعد، مکان ملنے کا پیغام ملا، مگر مکان محمد یعقوب ہاشمی، ریٹائرڈ سیکریٹری کے قبضہ میں تھا۔ وہ بہت عالم شخصیت تھے، حکمرانوں کے بہت قریب تھے۔ تھوڑی سی شناسائی، مجھ سے بھی تھی، مگر جب ان کو مکان میرے نام الاٹ ہونے کا علم ہوا تو پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا، کہ جب تک ان کو کرایہ کا مکان نہیں ملتا، تب تک مجھے صبر سے کام لینا ہو گا، میں نے مان لیا۔ اس دوران انھوں نے تین صفحوں پر مشتمل، خط بھیجا، جس میں، مکان میں جو افسر صاحبان، پہلے رہ چکے تھے، ان کو مکان میں، جن مشکلات اور مصائب کا سامنا ہوا، بلکہ ایک دو بچوں کی پُراسرار طور پر موت واقع ہوئی، وہ واقعات خوفناک انداز، میں تحریر کیے اور تجویز کیا، کہ مکان مکمل طور پر آسیب زدہ تھا اور اس میں رہائش، جان کو خطرہ میں ڈالنے کے مترادف تھی۔ چونکہ میری جان زیادہ قیمتی تھی، اس لئے بقول ان کے، ضروری تھا، کہ میں متبادل رہائش کا انتظام کراوں۔ اپنے متعلق بیان کیا، کہ چونکہ وہ سید ہیں، اس لئے وظیفہ کر کے جنات کو قابو میں لائے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو زبانی پیغام دیا، کہ ملائکہ اور جنات کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں مخفی مخلوق ہیں۔ میں ملک بھی ہوں اور ظاہری مخلوق ہوں، لہذا مجھے جنات پر فوقیت حاصل ہے، آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ ان کے خط اور آسیب زدہ مکان کا چرچا، عام ہو گیا۔ جس

پر مجھے اورلوگوں نے بھی، اس مکان، کے متبادل مکان حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے بتایا کہ سال کے بعد آسیب زدہ مکان ملا ہے، اگر اس کو نہ لیا، تو کئی سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جنات سے سمجھوتہ کرلوں گا، مگر حکمران جنات، جو سال بھر ٹس سے مس تک نہ ہوئے تھے، ان سے کسی قسم کی بھلائی کی توقع نہ تھی۔ خیر مکان میں منتقل ہوا، اور پہلی رات ہاؤس شفٹنگ پارٹی کی۔ رات گیارہ بجے تک مہمانوں کی ہنگامہ آرائی جاری رہی، ان کے رخصت ہوتے ہی، دونوں ملازم پیش ہوگئے، کہ شہر میں ان کا رشتہ دار بیمار تھا، اس کی عیادت کے لئے جانا تھا۔ میں نے انسانی ہمدردی کے تحت، اجازت دے دی اور خود نماز ادا کر کے سوگیا۔ سحری کو حسب معمول بیدار ہوا، صبح کی نماز کے بعد سیر کو نکل گیا، واپس آیا تو دونوں ملازم بہت خوش تھے، کہ میں زندہ تھا۔ دراصل وہ رات کو، مکان میں جنات کے خوف سے رشتہ دار کی عیادت کا بہانہ بنا کر، غائب ہو گئے تھے۔ جب میں عدالت میں پہنچا، تو جج صاحبان اور سٹاف نے سوال کیا، کہ رات کو جنات کے ساتھ میں نے کیسے رات بسر کی؟ ہر ایک یہ انوکھی داستان سننے کا منتظر تھا، اور مجھے نارمل حالت میں دیکھ کر سب حیران تھے۔ میں نے بتایا کہ رات بھر درود شریف اور آیت الکرسی کا وظیفہ کر کے جنات کو دعوت دے کر، باہمی امن کا سمجھوتہ کرلیا، جس کا ان سب نے یقین کرلیا۔ آسیب زدہ مکان کا چرچا۔ یعقوب ہاشمی نے، مجھے خوف زدہ کر کے، مکان نہ لینے کی غرض سے کیا تھا، البتہ یہ درست تھا کہ پہلے مکینوں کے ساتھ، حادثات ہو چکے تھے اور انھوں نے خوف زدہ ہوکر وہ مکان، چھوڑ دیا تھا۔ راجہ نیاز خان کا، آٹھ سال کے قریب عمر کا بیٹا، پانی کی ٹینکی میں مردہ پایا گیا تھا۔ ان واقعات کی تائید پڑوس والوں سے بھی ہوئی۔ بہر حال میں نے سب کی طرف سے سوال کے جواب میں بتایا، کہ میں نے جنات سے ''جیو اور جینے دو'' کے مصداق معاہدہ کرلیا تھا، کہ ''پُر امن رہو اور پُر امن رہنے دو''۔ احباب نے میرے اس معاہدہ کا مذاق بھی خوب اڑایا۔ میرے بچے میرپور میں زیر تعلیم تھے، جس وجہ سے مظفر آباد میں تنہا ہی تھا، البتہ گرمیوں کی تعطیلات کے دوران، بچے مظفر آباد رہتے، مگر ان دنوں بھی ہم نیلم ویلی، چکار، سدھن گلی اور دوسری سیر گاہوں کی طرف نکل جاتے۔ ۱۹۷۹ء سے ستمبر ۱۹۹۴ء تک میں اسی مکان میں رہا، میرے ساتھ یا سامنے، کبھی بھی کوئی پُر اسرار واقعہ پیش نہ آیا۔ تاہم میں ہر ماہ میرپور، راولاکوٹ اور کوٹلی سرکٹ کے دورہ سے واپس آتا، تو خانساماں اور مالی، ان کو پیش آنے والے غیر معمولی واقعات، کا ذکر کرتے اور میری عدم موجودگی میں ہمیشہ خوف زدہ رہتے۔ میری موجودگی میں تو کبھی نہیں، مگر عدم موجودگی میں، دن یا شام کے وقت، کالے ناگ اور اژدھے، میرے بیڈ روم کے علاوہ دوسرے کمروں، باورچی خانہ اور لان میں چلتے اور کبھی بیٹھے پائے جاتے۔ ملازم اُن کو مارنے کی کوشش کرتے، مگر وہ غائب ہو جاتے۔ اس کی تائید پڑوس والوں نے بھی کی۔ ڈاکٹر وفا صاحب، ڈائریکٹر ہیلتھ ایک دن عصر کے وقت، مجھے ملنے آئے۔ میں میرپور میں تھا۔ انھوں نے بعد میں بتایا کہ میرے گھر میں، کمرہ کے دروازہ پر پھن پھیلائے کو برا سانپ کھڑا تھا اور گھر کے ملازموں کے علاوہ پڑوس کے

ملازم بھی اسے مارنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر ناکام تھے۔ انھوں نے بتایا، کہ انھوں نے بھی اس پریشان کن مقابلہ میں حصّہ لیا، مگر ناکام رہے، ابھی ناگ ادھر ہی تھا، کہ وہ واپس ہو گئے۔

جنات کی تخلیق تو آگ کے شعلہ یا لپک سے ہوئی ہے اور انسان کی کھنکنی، سوکھی مٹی سے اور ہر دو مخلوقات کو زندگی ودیعت ہوئی ہے، اُس انداز میں زندگی کا سفر جاری ہے، مگر جنات مخفی ہیں، جب کہ انسان کائنات میں ظاہر باہر ہے۔ جنات کے متعلق میرا علم، نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس مخلوق کی زندگی کے احوال کے مطالعہ یا تحقیق پر کبھی توجہ ہی نہ ہو سکی، البتہ گاؤں میں، بڑی عمر کے لوگ، اپنے تجربہ کی روشنی میں، جنات سے واسطہ پڑنے اور نسل در نسل زبانی سُنے سنائے واقعات، سناتے رہتے تھے، حتیٰ کہ جن ویران اور سنسان مقامات میں، جنات کا بسیرا ہوتا، ان کی نشاندہی بھی کرتے اور اکثر اوقات، شام کے بعد، ان مقامات کی طرف جانے سے منع کرتے۔ ہمارے پڑوس میں دو خواتین سے، جنات کا تعلق تھا۔ ایک خاتون کے کمرہ میں، مارچ اپریل کے مہینہ میں، جب کہ سیبوں کا موسم نہ ہوتا تھا، تازہ سیب رکھے ہوئے ملتے۔ یہ ڈوگرہ اور انگریز عہد حکومت کی بات تھی، جبکہ کولڈ سٹوریج کا نام ہی نہ سنا تھا اور وہ بھی ہمارے گاؤں میں، اُس وقت تو بہت پسماندگی تھی۔ دوسری خاتون کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ اس پر جب جن کا دخل ہوتا، تو اس کا جسم اکڑ جاتا اور چارپائی میں سے دباؤ کی وجہ سے چر چر کی آوازیں پیدا ہوتیں اور گفتگو کا انداز بڑا تمکنت والا اور کبھی دھمکی کے لہجہ میں ہوتا اور رخصت ہوتے وقت، وہ اعلانیہ دروازہ، اگر بند ہوتا، تو زور سے کھول دیتا اور کھلا ہوتا تو بند کر دیتا۔ اور بعد میں خاتون کا جسم، درد میں چور چور ہو جاتا۔ یہ دونوں خواتین صوم وصلوٰۃ کی پابند اور بہت با اخلاق اور نرم گفتار تھیں۔ اسی طرح ہمارے گھر، اقبال نامی لڑکا، ملازم تھا، یہ واقعہ بھی ۱۹۴۶ء کا ہے۔ امی جان اور چھوٹے بھائی دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ میں سکول کے کام میں مصروف تھا اور مطالعہ کر رہا تھا۔ ابھی عشاء کی اذان بھی نہ ہوئی تھی، کہ اقبال، جو عمر میں مجھ سے غالباً دو سال چھوٹا تھا، وہ اچانک میرے سامنے، اکڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہا، کہ کتاب بند کرو اور سیف الملوک سناؤ۔ گاؤں میں، میاں محمد بخشؒ، عارف کھڑی شریف کا کلام، محفلوں میں عام طور پڑھا جاتا تھا، نوجوانی میں، گاؤں میں لوگ، رات یا دن میں، جب مل بیٹھتے، تو سیف الملوک بہت ترنم سے پڑھتے۔ میری آواز بھی رسیلی تھی، اس وجہ سے میں بھی، میاں صاحب کا کلام پڑھتا تھا۔ جب اس نے غصہ میں مجھے کہا، تو حیرت ہوئی، وہ ملازم تھا اور بہت با اخلاق اور خدمت گار تھا، میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا، تو اس کی لال سرخ آنکھوں میں، اس قدر چمک اور چہرہ پر جلال تھا، کہ میں ڈر سے سہم گیا۔ دوسری دفعہ پھر، اس نے گرجدار آواز میں جب کہا، تو میں نے سہمے سہمے لہجہ میں گنگنانا شروع کیا، تو تیسری بار پھر کہا اونچی آواز میں پڑھو۔ گھبراہٹ میں دو تین شعر بلند آواز میں کہے ہی تھے، کہ اسی دوران اس نے، زور سے دروازہ کھولا اور گھوڑے کی سی رفتار سے، باہر کھیتوں میں بھاگ گیا۔ میں نے پڑوس سے آواز دے کر سب کو بلایا۔ میں ان کو یہ واقعہ بتا ہی رہا

تھا، کہ وہ اسی رفتار سے بھاگتا ہوا واپس آیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد، وہ ٹھیک ہو گیا، مگر اس کا جسم سخت درد کر رہا تھا۔ دوسرے روز عین اسی وقت، اس کی پھر وہی کیفیت ہو گئی۔ محلّہ کے سب مرد خواتین جمع تھے، تو جن نے بتایا، کہ وہ جن تھا اور اس نے واقعہ کا پس منظر یہ بتایا، کہ اقبال کے گاؤں کے پاس چشمہ تھا، جس کے قریب جن کا قبیلہ قیام پذیر تھا۔ اقبال نے ان کی قیام گاہ، میں پیشاب کر کے، ان کی توہین کی تھی، جس کی اس کو سخت سزا دی تھی۔ مگر اس کی بیوہ ماں کی فریاد پر، اس کو چھوڑ دیا تھا۔ کل، گذشتہ شام وہ اپنے بھائی کے علاج کے بعد واپس جاتے ہوئے اس کو ملا، مگر اس نے کوئی توجہ نہ کی، جس وجہ سے اس کو پکڑا اور ملک صاحب کو بھی تکلیف دی اور آج پھر تکلیف دی۔ اب میں جاتا ہوں، پھر نہیں آؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد اقبال پھر تمام جسم میں، سخت درد کی شکایت کر رہا تھا اور چشمہ والے واقعہ کی بھی، اس نے تصدیق کی۔ ان کے علاوہ بھی، بہت واقعات دیکھنے اور سننے میں آئے تھے، مگر انسان کا کوئی ثانی نہیں ہے، اس کو تمام تخلیق پر فوقیت حاصل ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو فضیلت حاصل تھی کہ دیگر اس کے ساتھ ساتھ جنات بھی ان کے تابع تھے، جن سے وہ کام لیتے تھے۔

سیاستدانوں کا احتساب

پاکستان کے قیام پر، دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس منعقدہ، ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے، اپنی تاریخ ساز تقریر میں، نئی قوم کی نئی مملکت کے بانی گورنر جنرل کی حیثیت میں، مملکت کے لئے بنیادی اصولوں پر مبنی چارٹر پیش کیا۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ، قائداعظم نے واضح نشاندہی کی، کہ ہندوستان میں دیگر برائیوں کے علاوہ سب سے بُری اور بڑی برائی، رشوت خوری اور بدعنوانی تھی۔ انھوں نے متنبہ کیا، کہ وہ اس برائی کو کسی سطح اور کسی شکل میں برداشت نہیں کریں گے۔ اسلام نے تو رشوت لینے اور رشوت دینے والے، دونوں کو، جہنمی قرار دے رکھا ہے۔ پاکستان میں ایوب خان نے، مارشل لا کے نفاذ کی جوازیت، دیگر معاملات کے علاوہ کرپشن اور بدعنوانی ظاہر کی۔ یہی جوازیت جولائی ۱۹۷۷ء کو ضیاء الحق نے اور اسی عنوان کے تحت پرویز مشرف نے ۱۲راکتوبر ۱۹۹۹ء کو مارشل لاء نافذ کیا، اگرچہ اس میں اضافی بات نواز شریف کی برطرفی اور جلاوطنی کا پہلو، ظاہر کیا گیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کے ساتھ ساتھ آزاد جموں کشمیر میں بھی، احتساب کا عمل شروع کروادیا تھا۔ اصل میں سیاستدانوں، بالخصوص مخالف سیاسی قوت پیپلز پارٹی کو، سیاست سے فارغ کرنا تھا، مگر ظاہری طور پر باقی حکمران سیاستدانوں کو بھی، اس میں شامل کر لیا گیا تھا۔ قانون تو سب پر لاگو تھا، البتہ احتساب کس کا ہونا تھا؟ یہ معاملہ حکومت کی صوابدید پر تھا۔ آزاد جموں کشمیر کی وزارت قانون میں، ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا اور کرپشن و بدعنوانی کی جو اور منبع، نوکرشاہی میں سے چند بااعتماد ملازمین کو، سیاستدانوں کے خلاف کرپشن اور بدعنوانی کے ثبوت اور شہادت فراہم کرنے، چارج شیٹ مرتب کر کے ریفرنس مرتب کرنے کی، ذمہ داری سونپی گئی۔ اس عمل میں اولین صوابدید،

چیف ایگزیکٹو کی، دوسری متعلقہ محکمہ کے سربراہ کی، تیسری شعبہ قانون، جس نے ریفرنس مرتب کرنا تھا، اور آخری اُس ملازم یا افسر کی تھی، جس نے عدالت یا ٹریبونل کے سامنے پیش ہو کر، بطور گواہ، الزام ثابت کرنا تھا یا وضاحت میں، الزام کمزور کرنا تھا یا اس میں شک یا ابہام پیدا کرنا تھا۔ آزاد جموں کشمیر چھوٹا سا خطہ، چالیس لاکھ آبادی پر مشتمل حکومت ہے۔ آبادی بڑے قبائل جاٹ، گوجر، راجپوت، سدھن، کشمیری اور دیگر چھوٹے قبیلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ حکمران سیاستدانوں اور نوکر شاہی، دونوں کا تعلق نسبتاً بڑے قبیلوں سے ہے۔ اور نوکر شاہی کی تقرری، ترقیابی اور تعیناتی بھی، قبیلائی ترجیحات کے تابع ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں کسی بہت کمزور یا ناپسندیدہ حکمران سیاستدان، کا صحیح احتساب ہونے کا امکان تھا یا چھوٹے قبیلہ کے کسی سیاستدان کے احتساب کے امکانات، زیادہ تھے اور انجام عیاں تھا۔

حیات خان، چیف ایگزیکٹو نے، احتساب ٹریبونل مقرر کرنے کے لئے، اعلیٰ عدلیہ کے چیف جسٹس صاحبان کے ساتھ اعلیٰ سطحی میٹنگ منعقد کی، جس میں چیف سیکریٹری بھی شامل تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد پہلا نام، میرا تجویز کیا گیا۔ چیف سیکریٹری نے بتایا، کہ ایک ٹریبونل سے کام نہیں چلے گا، اس لئے کم از کم دو ٹریبونل مقرر کرنے ہوں گے، اس پر دوسرے کے لئے سید محمد پر اتفاق ہوا۔ اُن دنوں، دونوں چیف جسٹس صاحبان میں، بڑا اختلاف تھا، بول چال بھی ختم تھی، مگر بطور ٹریبونل، میری تقرری پر اتفاق ہو گیا۔ اُن دنوں اختلاف کی سطح یہ تھی، کہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے تمام فیصلوں کے خلاف، سپریم کورٹ میں اپیل منظور کی جاتی۔ جسٹس ملک اسلم، میں کمال کی ظرافت تھی، وہ کہتے کہ، سپریم کورٹ نے گیٹ پر بڑا سا بورڈ لگا رکھا ہے کہ "یہاں پر ہائی کورٹ کے فیصلے منسوخ کیے جاتے ہیں، آؤ اور ہائی کورٹ کا فیصلہ منسوخ کروالو"۔ اس قسم کے بہت سے لطیفے وکلاء میں سرگرداں رہتے۔ احتساب کے معاملہ میں، دونوں چیف جسٹس متفق ہو گئے اور احتساب کے متوقع طوفان کا رُخ، ہماری طرف موڑ دیا گیا۔ سیاستدانوں میں بھی نئی نئی سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ حکومت پاکستان نے، جس شد و مد اور، اصرار کے ساتھ مجھے جج بنایا تھا، اس کی وجہ سے سب کو گمان ہو گیا اور تمام سیاستدانوں کا انجام عیاں تھا۔ سب سے پہلے ایسا ہوا، کہ چار پانچ سیاستدانوں کے خلاف ریفرنس، میرے پاس دائر ہوئے۔ پہلی سماعت پر ملزم سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ، جماعتی کارکنوں کے قافلے بھی، ان کی حمایت میں، کمرہ عدالت میں داخل ہو گئے اور اخبار نویس صحافی بھی موجود تھے۔ وکالت کے دور سے میرا معمول تھا، کہ میں باوضو رہتا۔ عدالت میں روز اول سے درود شریف، آیت الکرسی، سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص کی تلاوت کے بعد، صحیح انصاف کرنے کی خضوع و خشوع سے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے، مقدمات کی سماعت شروع کرتا۔ جس کا اظہار اب پہلی دفعہ مکمل عجز و انکساری سے کیا ہے۔ اپنے آپ سے عہد تھا، کہ کسی فریق مقدمہ سے رعونت اور تکبر سے پیش نہیں آنا، بلکہ ان کے عزت نفس کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، ان کو سماعت کرنا تھا۔ یہی سلوک اور رویہ تمام وکلا سے بھی، عدالت میں تھا۔ ڈوگرہ دور حکومت سے رائج رویہ، کہ فریقین مقدمہ ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے۔ اس رویہ کو بھی روز اول سے ختم کر کے، فریقین کو عزت و وقار کے

ساتھ، سماعت کے وقت کرسی پیش کی گئی۔ شروع شروع میں عادتاً، سائلان کھڑے رہنے پر اصرار کرتے، مگر جلد ہی ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ دوسری اصلاحات کا تذکرہ آگے ہوگا، البتہ یہاں صرف چند ایک مقدموں کا ضمناً، ذکر کرنا مقصود ہے، تاکہ نام نہاد احتساب کی تصویر عیاں ہو سکے۔

خان بہادر المعروف کے بی خان

کے بی خان کا تعلق مسلم کانفرنس سے تھا۔ وہ بنجوسہ سے ملحقہ، پُھل جڑی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ شروع میں سردار ابراہیم خان اور بعد میں سردار عبدالقیوم اور سردار سکندر حیات کے ساتھ رہے۔ سردار حیات خان کا تعلق بھی، بنجوسہ سے ملحق گاؤں، چھوٹا گلہ سے تھا۔ دونوں سدھن قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا، کہ دونوں میں سخت عداوت تھی۔ حیات خان نے اپنی نگرانی میں، کے بی خان کے خلاف، سنگین بدعنوانی کا مقدمہ تیار کروا کر، سید محمد کے پاس پیش کروایا۔ سید محمد بھی، بنجوسہ کے قریب کا رہنے والا تھا۔ دو تین دفعہ پیش عدالت ہونے کے بعد، کے بی خان نے، سید محمد پر عدم اعتماد کر دیا اور اس کا مقدمہ بھی میرے پاس آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اگھار کوٹلی کے، چوہدری اعظم، مظفر آباد کے راجہ حیدر خان کے بھائی، راجہ لطیف خان اور حاجی عثمان کے دو ریفرنس بھی دیگر درجن بھر لیڈروں کے ساتھ میرے پاس پیش ہو گئے۔ یہ سب لوگ بہت خائف تھے۔ چور کی داڑھی میں تنکا، کے مصداق، ان کو یوم حساب کے احساس کے تحت، سخت پریشانی تھی۔ حاجی عثمان پر اتنا دباؤ تھا، کہ اس کو دل کا اچانک دورہ پڑا اور ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہو گئے۔ نوکر شاہی کے کرپشن اور بدعنوانی میں ماسٹر مائنڈ افسران، جو ہر لحاظ سے شریک جرم تھے، ان کو اپنا یوم حساب سامنے نظر آ رہا تھا، کہ کہیں سیاستدانوں کے احتساب کے بعد، ان کے خلاف بھی کارروائی شروع نہ ہو جائے اور شریک جرم کے طور پر، وہ ملازمت سے ہی معزول و سبکدوش نہ کر دیئے جائیں۔ اس لئے نوکر شاہی جو اوّل کرپشن اور بدعنوانی کے جرائم میں راہنما اور معاون تھی، اب بطور گواہ، جرائم کے ارتکاب کی، توثیق و تائید کے لئے پیش پیش تھی۔ نہایت ہوشیاری اور مہارت سے ثبوت چھپانے، اس میں ابہام پیدا کرنے اور دونوں اطراف کو خوش کرنے کا کردار، ادا کر رہی تھی۔ اس میں کچھ معاونت حکومت کے پیروکاروں کی بھی تھی۔ ان حالات میں ماسوائے، راجہ لطیف کے، جس نے الزام کو درست تسلیم کیا اور اسے جرمانہ کیا گیا، باقی تمام سیاستدان، کے بی خاں جو بہت خوف زدہ، تھا مع حاجی عثمان و چوہدری اعظم، سب بری کر دیئے گئے۔ یہ تمام فیصلے یکے بعد دیگرے ہونے پر عوام اور سیاستدانوں میں میری شہرت ہوئی، مگر حکومت پریشان ہو گئی۔ اسی روز راجہ خورشید قائمقام چیف جسٹس سپریم کورٹ سے مشاورت کر کے، مجھے ایڈہاک جج سپریم کورٹ مقرر کرنے کا، حکم جاری کر دیا گیا۔ سیاستدان ملزمان کو، بری کرنے پر حکومت نے، عدم اعتماد کے طور پر، یہ حکم جاری کیا تھا، جس پر میں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

مستعفی ہونے کا فیصلہ

سماعت مقدمات سے فارغ ہوا ہی تھا اور راجہ مقصود خان، کمشنر اور چوہدری نذر حسین ایڈیشنل کمشنر ملنے آئے ہی تھے، کہ مجھے ایڈہاک جج سپریم کورٹ مقرر کیے جانے کا حکم ملا۔ میں اسی وقت، حیات خان، جو اس وقت صدر اور چیف ایگزیکٹو دونوں عہدوں پر فائز تھے، کو اس تقرری پر، بطور احتجاج، جج کے عہدہ سے تحریری استعفیٰ پیش کر کے اور خدا حافظ کہہ کر آ گیا۔ حیات خان، مجھے استعفیٰ واپس لینے کے لئے کہتے رہے، مگر میں نہ مانا اور واپس آ کر چوہدری نذر سے کہا، کہ وہ مجھے اپنی کار میں میرپور پہنچا دے۔ کیوں کہ مستعفی ہونے کے بعد، میں ہائی کورٹ کی کار، استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران حیات خان نے، سردار رحمت اللہ خان، سیکریٹری خوراک اور راجہ نیاز خان، سیکریٹری لوکل گورنمنٹ، جو میرے دوست تھے، دونوں کو مجھے استعفیٰ واپس لینے اور ایڈہاک جج کا حلف لینے پر، راضی کرنے کے لئے فی الفور بھیجا۔ میں ابھی ریٹائرنگ روم میں، راجہ مقصود اور چوہدری نذر سے محو گفتگو تھا، کہ وہ دونوں بھاگتے ہوئے آئے۔ مجھے باہر بلا کر گاڑی میں بٹھایا اور جلدی سے سپریم کورٹ لے گئے اور فی الفور راجہ خورشید سے حلف لینے کو کہا۔ وہ پہلے سے تیار تھے۔ بس میری منت سماجت کر کے حلف دلوا دیا۔ سیاستدان تو قانون کے مطابق، الزام ثابت نہ ہونے پر، بری ہو گئے، مگر مجھے، جج ہائی کورٹ کو، انتقامی طور پر، عام نوکر شاہی کے تبادلہ کے انداز میں، بغیر میری رائے لیے، راجہ خورشید کو اعتماد میں لے کر، مجھے ایڈہاک جج سپریم کورٹ ایک سال کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ یہ واضح طور پر میری توہین تھی، اس لئے میرا ردِ عمل، فطری تھا۔

خان عبدالحمید خان کی، خوش قسمتی

خان عبدالحمید خان جج ہائی کورٹ تھے، ان سے قبل، دو چیف جسٹس، شیخ عبدالمجید جالندھر کے مہاجر اور پنجاب جوڈیشل سروس کے تھے، اسی طرح سید فیاض حسین شاہ، کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ ان کے بعد عبدالحمید خان، ریاست جموں کشمیر کے پہلے چیف جسٹس، کے ایچ خورشید نے مقرر کیے۔ مابعد خواجہ شریف، چوہدری رحیم داد، خواجہ محمد یوسف صراف، سردار محمد شریف اور عبدالمجید ملک اور دیگر جج صاحبان، چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں کے ایچ خورشید عہدہ صدارت سے مستعفی ہوئے، تو وزارت امور کشمیر نے، بجائے الیکشن کروانے کے، چیف جسٹس کو ہی عبوری طور پر، حکومت کا صدر مقرر کر دیا۔ پیپلز پارٹی منظم ہونے پر، ۱۹۷۵ء کے انتخابات میں، خان عبدالقیوم، ان کے بھائی کی معاونت سے، یہ مہاجرین کشمیر کی سیٹ پر، سرحد سے کامیاب ہوئے۔ بھٹو اور خان قیوم کا پاکستان میں اتحاد تھا، جس بنا پر حمید خان کو، بھٹو نے آزاد کشمیر میں، وزیراعظم منتخب کروا دیا۔ جب پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہوا اور بھٹو حکومت ختم کر دی گئی، تو اسی وقت آزاد کشمیر میں بھی، اسمبلی تحلیل اور حکومت برطرف کر دی گئی۔ اور احتساب کے عمل میں، حمید خان اور وزیروں کے خلاف کرپشن اور بدعنوانی وغیرہ کے الزامات میں، ریفرنس

دائر ہوئے۔ خان حمید کے خلاف، جتنے ریفرنس تھے، ان سب میں فیصلہ اس کے خلاف ہوا تھا۔ جن کے خلاف اس نے، سپریم کورٹ میں اپیلیں دائر کی تھیں، ان تمام اپیلوں کو اکیلے جج، میرے سپرد کر دیا گیا۔ ان تمام مقدمات میں بھی، شہادت بہت کمزور تھی، مگر احتساب کی پالیسی کے تحت فیصلے حمید خان کے خلاف ہوئے تھے۔ اپیل میں تمام مقدمات میں، ماتحت ٹربیونل کے فیصلے، مسترد ہو گئے۔ جب تمام اپیلوں کے فیصلے ہو چکے، تو حمید خان ریٹائرنگ روم میں، مجھے ملنے آئے۔ بہت خوش تھے، میں نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ انھوں نے کہا، آپ سے ایک بات دریافت کرنے آیا ہوں۔ میں نے کہا، کیا پوچھنا ہے۔ بولے کہ میرے تمام مقدموں میں، سید محمد نے فوج کے کہنے پر فیصلے کیے تھے۔ لہٰذا پوچھنا یہ تھا، کہ آپ پر فوج اور ایجنسیوں نے دباؤ کیوں نہیں ڈالا؟ میں نے کہا، میں نے تو فیصلے قانون کے مطابق کیے ہیں۔ فوج اور ایجنسیوں کے متعلق جواب، تو وہ ہی دے سکتے تھے۔ البتہ یہ نہ سمجھ سکا، کہ تمام مقدمے سماعت کے لئے، مجھ اکیلے جج کے سپرد کیوں کیے گئے تھے۔ کہنے لگے اسی دباؤ کے تحت، کہنے لگے شکر ہے، کہ سپریم کورٹ میں بروقت آپ کی تقرری ہوئی، وگرنہ یہاں بھی وہی انجام ہوتا۔ انھوں نے کہا، کہ یہ محض ہماری خوش قسمتی تھی۔ انھوں نے چائے کا پیالہ پیا اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ میرا اکیلا جج مقرر ہونا، حمید خان کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

چیف جسٹس صراف مستعفی

میری بیگم اور میں، حج کے لئے روانہ ہوئے ہی تھے، کہ اچانک اطلاع ملی کہ حکومت نے، محمد یوسف صراف چیف جسٹس ہائی کورٹ کے خلاف، کرپشن اور بدعنوانی کے الزامات پر مبنی، مس کنڈکٹ کی چارج شیٹ مرتب کر کے، ریفرنس سپریم جوڈیشل کونسل کو ارسال کر دیا تھا۔ ہم حسب پروگرام مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ چند دن بعد، چیف جسٹس رحیم داد، جنھوں نے سپریم جوڈیشل کونسل کو پریذائیڈ کرنا تھا، وہ بھی حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے۔ وقوف عرفات کے بعد، دوسرے روز قربانی کر کے منیٰ میں، اپنے کیمپ میں تھے، کہ ساتھ والے کیمپ، جہاں چیف جسٹس پاکستان، حمود الرحمن بھی تھے، وہاں سے چوہدری رحیم داد، مجھے ملنے آئے۔ میرے اردگرد کافی لوگ محو گفتگو تھے۔ چوہدری صاحب نے یہ دیکھ کر فوراً کہا ''او ملک وہاں مظفر آباد میں بھی دربار لگاتے ہو اور یہاں بھی دربار لگا رکھا ہے''۔ میں نے اٹھ کر مصافحہ کیا اور کہا اور کیا کیا جائے، جناب دربار لگانا مقدر جو ٹھہرا۔ تشریف رکھنے کو کہا، تو بولے، نہیں، میں صرف تم سے ملنے اور یہ بتانے کے لئے آیا تھا، کہ اگلے روز پہلی فلائیٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا، اتنی جلدی کیا تھی؟ ابھی تو منیٰ میں قیام تھا، بولے تمھیں معلوم نہیں ہے، ہم نے واپس جا کر تمہارے گنجے صراف کو فارغ کرنا ہے''۔ یہ سن کر میں سہم گیا۔ وہ جلدی میں مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا، کہ اللہ تعالیٰ صرف تیری ذات کو بقا ہے، باقی سب فنا ہے۔ جو چیف جسٹس، سید محمد کی تقرری اور مجھ سے سینئر قرار دلوانے اور سدھن قبیلہ سے تعلقات استوار رکھنے کی پالیسی پر کارفرما، جنرل حیات خان اور سردار ابراہیم خان کے گرد

طواف کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، اسی سدھن قبیلہ کے حیات خان نے، اس کو چیف جسٹس کے معزز عہدہ سے، سبکدوش کرنے کا ذلیل طریقہ کار، اختیار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور معاف فرمانے کی دعا کی۔ میری بیگم بھی بہت پریشان ہوگئی اور افسوس کرنے لگی۔ حج کے بعد، جب واپس پہنچے تو ریفرنس کی سماعت شروع تھی۔ صراف صاحب کو عدالت کا کام کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اور سیاستدانوں کے حوالہ سے، میرے فیصلوں کی وجہ سے، مجھے ہائی کورٹ میں واپس بھیج دیا گیا ہوا تھا۔ صراف صاحب کے خلاف، گواہان میں، کوٹلی کے وکیل ملک محمد یوسف، میرپور سے چوہدری محمد تاج اور سول جج افتخار حسین بٹ بھی شامل تھے۔ افتخار بٹ نے انکار کر دیا۔ اس کو سروس سے فارغ کرنے کی دھمکی بھی دی گئی، مگر وہ ڈٹا رہا۔ ایک شام کو، صراف صاحب کے متعلق معلوم ہوا، کہ انھوں نے اپنے اعتماد کے قریبی تعلق دار، تین سدھن، سردار عظیم، سردار حمید اللہ اور سردار رفیق محمود، پر مشتمل وفد جنرل حیات کے پاس، ریفرنس واپس لینے کی سفارش کرنے کے لئے، ارسال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان مصیبت کی آزمائش میں، بہتری کے لئے جو بھی اقدامات کرتا ہے، وہ الٹا اثر کرتا ہے۔ صراف یہ بھول گئے تھے، کہ ان کے سبکدوش ہونے پر، سردار شریف نے چیف جسٹس بننا تھا۔ پریذیڈنٹ ہاؤس میں میرے دوست عجائب چوہان کے ہم زلف، محبوب حسین سٹاف افسر تھے، اس نے رات کو مجھے بتایا، کہ صراف صاحب نے اپنے حق میں، حیات خان کے پاس سفارش کرنے کے لئے، جو وفد بھیجا تھا۔ بجائے سفارش کے، انھوں نے حیات خان سے الٹا یہ کہا، کہ صراف کو جلد فارغ کر کے، سردار شریف کو چیف جسٹس بنایا جائے۔ دوسرے روز میں نے، صراف سے وفد کا ذکر کیا، تو وہ چونک پڑے، کیوں کہ وفد کو بہت راز داری میں بھیجا گیا تھا۔ پوچھنے لگے کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ میں نے ان کو بتایا، کہ وفد نے، ان کو جلدی فارغ کر کے، سینئر جج سردار شریف کو چیف جسٹس مقرر کرنے کی سفارش کی تھی۔ صراف پریشان ہو گئے۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ عصر کے وقت صراف اس دوران پہلی دفعہ، میرے مکان پر آئے اور مشاورت کی کہ کیا کیا جائے؟ میں نے منیٰ میں کہے ہوئے چوہدری رحیم داد کے الفاظ دوہرا کر بتایا، کہ ان دونوں میں باہمی نفرت اور دشمنی چھپی ہوئی نہیں تھی، چہ جائیکہ کرپشن، بدعنوانی اور مس کنڈکٹ کے گناہ کا بوجھ کندھے پر اٹھا کر فارغ ہوں، بہتر ہوگا کہ قبل از فیصلہ، مستعفی ہو جائیں۔ میرے منہ سے لفظ استعفیٰ، سنتے ہی صراف کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ خاموش ہو گئے، دو کپ چائے پی کر مجھے کہا، مزید سوچ کر رائے دیں۔ میں نے بتایا کہ میں اس پر کئی بار سوچ چکا تھا، مگر پہلے آپ نے مشاورت نہ کی تھی، اس لئے از خود مشورہ دینا مناسب نہ تھا۔ البتہ چوہدری صاحب اور دوسرے ججز نے، اپنے طور پر آپ کو فارغ کرنے کا فیصلہ، پہلے سے کر رکھا تھا اور آپ کو یہ علم ہونا چاہیے تھا، کہ جوڈیشل کونسل میں ایک جج سردار شریف بھی تھا، جس نے خود چیف جسٹس بننا تھا۔ صراف کے چہرہ سے لگ رہا تھا، کہ ان باتوں کا اس کو کم ہی احساس تھا، دو گھنٹے کی نشست میں صراف یقیناً بہت مایوس ہوئے، مگر کامیابی کے تمام راستے بند تھے۔ رات بھر

سوچ و بچار کے بعد اور بچوں کے ساتھ میری رائے کی روشنی میں، تبادلہ خیال کرنے کے بعد، انھوں نے دوسرے روز حکومت کو استعفیٰ ارسال کر دیا۔

ہم نے ہائی کورٹ میں، صراف صاحب کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد کی۔ سردار شریف اور سردار سید محمد نے، ان کے متعلق چند الفاظ میں، الوداع کہنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ البتہ میں نے اور افتخار حسین بٹ نے ان کو، ان کے بطور جج اور چیف جسٹس اور بحیثیت انسان، بہت خراج تحسین پیش کیا۔ زمانہ بھی کیا ہے، اتفاق سے الوداعی تقریب اسی کمرہ عدالت میں تھی، جس میں میرا حلف ہوا تھا۔ لیکن میں نے ان تکلیف دہ واقعات کو ماضی کے لمحات میں دفن کر کے، محبت و احترام کے جذبات میں، الوداعی تقریب کا اختتام کیا۔ چند دن بعد، جب صراف صاحب اپنی فیملی کے ساتھ، مظفر آباد دارالحکومت، جس میں انھوں نے، اپنے عہدہ کے اعزاز کے تحت، بہت عروج دیکھا تھا، اور کبھی کبھی تو وہ حکمرانوں کے بہت ہی قریب رہ کر، حکمرانی میں مشاورت بھی کرتے رہے، جس شہر کی کشمیری برادری کے وقار اور احترام میں وہ فخر کرتے، اس شہر کو خیر باد کہہ رہے تھے۔ اقتدار کے پجاریوں کی، پچاس ہزار کی آبادی اور عدلیہ کے اتنے بڑے شعبہ سے صرف ان کا داماد طارق مسعود، غلام احمد، ڈپٹی رجسٹرار، شبیر حسین شاہ اکونٹنٹ، جسٹس عبدالمجید ملک، ایس ڈی او محکمہ برقیات، طارق عزیز ملک اور خواجہ شہاد احمد ایڈووکیٹ، ان کو رخصت کرتے وقت، ان کے مکان پر موجود تھے، جنھوں نے بہت بوجھل دل کے ساتھ ان کو خدا حافظ کہا۔ یہ بہت عبرت ناک اور سبق آموز منظر تھا۔

جسٹس صراف، نئی ابتلا و سزا

کہا جاتا ہے کہ مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ صراف صاحب الحاق پاکستان کے علمبردار اور حکومت کے بہت پسندیدہ شخصیت، خیال کیے جاتے تھے۔ اسلام آباد میں، ان کے گہرے رابطے تھے اور فوج میں بھی، ان کا تعلق واسطہ تھا۔ ان کے قریبی حلقوں میں تاثر تھا، کہ اس کے بعد ان کو چیف جسٹس سپریم کورٹ بنایا جانا تھا اور وہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد، ان کو کسی بڑے ملک میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا جانا تھا۔ پاکستان کے اہم اور بین الاقوامی معاملات میں، خطوط کے ذریعہ، وہ حکومت پاکستان کو مثبت اور مفید مشورے بھی دیتے تھے، مگر مستعفی ہونے پر، حکومت نے، ان پر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کے قانون کے تحت، پابندی عائد کر دی۔ وہ قانون چیلنج ہو گیا، جس کو ہم نے، ہائی کورٹ کے فیصلہ میں، بنیادی انسانی حقوق سے متصادم، امتیازی اور بدنیتی پر مبنی، قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دے دیا۔ اس طرح ان کی وکالت پر پابندی ختم ہو گئی، مگر اس دوران ان کو کافی پریشانی رہی۔ اسی دوران صراف صاحب نے روزنامہ جنگ میں، انٹرویو دیا، جس میں سپریم جوڈیشل کونسل پر، ہلکی سی تنقید بھی کی، جس پر ان کے خلاف توہین کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ جج صاحبان نے توہین کے مقدمہ میں، جلدی جلدی سماعت کر کے،

میر پور سرکٹ میں فیصلہ کیا۔ان کو سزائے قید دے کر جیل میں بھجوادیا۔اس پر پاکستان، آزاد کشمیر اور مقبوضہ جموں کشمیر میں، شور پڑ گیا، جس پر جنرل ضیاالحق نے مداخلت کر کے، ان کی سزا قید معاف کروا کر، میر پور جیل سے آزاد کروایا۔ وہ تین دن اور تین راتیں عام قیدی کی طرح جیل میں رہے۔اس طرح ان کو نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔

چیف جسٹس رحیم داد کی تنزلی

چوہدری رحیم داد، چیف جسٹس کے ریٹائر ہونے میں چھ ماہ کی مدت باقی تھی۔محمد اکبر کیانی، ایس ایس پی، پامسٹری میں مہارت رکھتے تھے۔اس نے رحیم داد صاحب کو بتایا، کہ ان کے ہاتھ میں صدر حکومت بننے کی لکیر تھی۔ ان سے آئی ایس آئی کے ایک میجر کی بھی، روزانہ ریٹائرنگ روم میں ملاقات رہتی تھی۔رحیم داد نے کیانی کی ترغیب کی دلچسپی میں، ایس پی کیانی سے، روزانہ ملاقات شروع کر دی۔رحیم داد صاحب کی میرے ماموں زاد ملک طارق عزیز سے بھی، بہت گپ شپ تھی۔مجھے طارق سے معلوم ہوا، کہ چیف جسٹس اب صدارت کی تیاری کر رہے تھے۔ حیات خان، چیف ایگزیکٹو کے ساتھ ساتھ، صدر کے عہدہ پر بھی فائز تھا، یہ خبر اس تک بھی جا پہنچی۔حکمران، کانوں کے کچے اور شکی مزاج ہوتے ہیں۔اس معاملہ میں مزید تحقیقات کروائی گئی، تو اطلاع دہندہ نے، اس کی توثیق کرتے ہوئے بتایا، کہ چیف جسٹس تو صدر کے عہدہ کا حلف لینے کی تیاری کر چکے تھے۔حیات خان، نے فوراً بند کمرہ میں، اعتمادی افسروں کی میٹنگ میں، ہنگامی طور پر کرپشن اور بدعنوانی پر مشتمل الزامات کا ریفرنس مرتب کر کے، چیف جسٹس کو سبکدوش کرنے کے لئے، سپریم جوڈیشل کونسل میں دائر کرنے کا فیصلہ کیا۔محمد یوسف صراف والا عمل دہرایا جانے والا تھا۔ان کی مدت سروس میں اس وقت، صرف چار ماہ باقی تھے۔چیف سیکریٹری نے تجویز دی، کہ بجائے ریفرنس، ان کو پہلے تجویز دی جائے، کہ وہ چیف جسٹس شریعت کورٹ اور ریفرنس میں سے، ایک تجویز، قبول کر لیں۔انھوں نے شریعت کورٹ میں تنزلی کا چوائس، قبول کیا۔ابھی ان کا شریعت کورٹ کا حلف ہونا تھا، کہ مجھے طارق سے اس بات کا علم ہوا۔میں طارق کو ساتھ لے کر، چیف جسٹس کے پاس بھاگ کر گیا، کہ وہ تنزلی قبول کرنے کی بجائے، قبل از ریٹائرمنٹ چار ماہ رخصت پر چلے جائیں۔ان کی رہائش پر پہنچا ہی تھا، کہ ان کو سیکریٹری قانون، خلیل قریشی کا فون آیا، کہ حلف کے لئے پہنچیں۔وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر، گاڑی میں حلف کے لئے روانہ ہو گئے اور تنزلی کا حلف لے لیا اور سپریم کورٹ سے رخصت ہوتے وقت، بقول ان کے جانشین راجہ خورشید کے، آئی ایس آئی کے میجر کو، راجہ خورشید سے ملاقات کروا کر کہا، کہ میجر صاحب آپ سے روزانہ ملتے رہیں گے۔یہ صاحبان بصیرت کے لئے سبق اور چیف جسٹس کے لئے مکافات عمل تھا۔ریٹائرمنٹ کے بعد، مجھے ملے تو خود ہی اپنے فیصلہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا، کہ چیف جسٹس شریعت کورٹ کی تقرری قبول کرنا، بہت بڑی غلطی تھی، مگر وہ وقت اب ہاتھ نہیں آتا۔ انسان بہت جلد باز ہے۔جلدی میں کیے گئے کام پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔

محمد یوسف صراف کے خلاف مس کنڈکٹ کی تہمت پر مبنی، ریفرنس کے نتیجہ میں مستعفی ہونے اور اسی تسلسل میں، توہین عدالت کے جرم میں سزا اور چند دن جیل میں گذارنے اور اس کے بعد چوہدری رحیم داد کا چیف جسٹس سپریم کورٹ کے عظیم عہدہ سے، شریعت کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ پر تنزلی قبول کرنے اور وہ بھی ریٹائرمنٹ سے صرف چار ماہ قبل، اعلیٰ عدلیہ کے دو بڑوں میں کھلے بندوں لڑائی، طعنہ بازی اور گروپ بندی اور آخر میں یکے بعد دیگرے دونوں کی غیر روایتی، بلکہ رسوائی کے انداز میں رخصتی سے، آزاد جموں کشمیر کی، اعلیٰ روایات کی حامل عدلیہ کے وقار اور عظمت کو شدید دھچکا لگا۔ اس میں مزید رسوائی اس وقت ہوئی، جب سردار محمد شریف نے ہائی کورٹ اور راجہ خورشید نے سپریم کورٹ کے مستقل چیف جسٹس کی خالی اسامی پر، ایکٹنگ چیف جسٹس کی حیثیت میں، تقرری قبول کر کے حلف لیا۔ ایکٹ ۱۹۷۴ء کے تحت ہائی کورٹ میں ایکٹنگ چیف جسٹس کا عہدہ ہی نہ تھا، جس کی اسامی ۱۹۹۳ء میں ترمیم کے تحت پیدا کی گئی۔ ان واقعات سے وکلاء اور قانون سے وابستہ لوگوں میں، تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ کوٹلی کا نوعمر وکیل جو بعد میں جج فیملی کورٹ مقرر ہوا، اس نے متذکرہ بالا حالات سے متاثر ہو کر، اپنے ردعمل کا یوں اظہار کیا

ع میزان وقت پر تلے تو بے وزن نکلے
وہ جنہیں اپنے گراں ہونے کا دعویٰ تھا

زبیر بٹ نے اس شعر کے ذریعے، نوجوان نسل کی کیا اور کیسی ترجمانی کی، اس پر تبصرہ نہ کرنا اور نہ ہی زیر قلم لانا، مناسب ہوگا۔ ان واقعات کے رونما ہونے کے کئی سال بعد، اعلیٰ عدلیہ میں ایک اور زلزلہ آیا، جس کے نتیجہ میں، جسٹس ریاض اختر چوہدری، چیف جسٹس سپریم کورٹ اور سینئر جج، جسٹس منظور حسین گیلانی، جنہیں بعد میں عدلیہ میں کشمکش اور ریاض اختر کے خلاف ریفرنس کی وجہ سے، ایکٹنگ چیف جسٹس مقرر کیا گیا تھا۔ ہر دو متحارب قوتوں کو ٹکراؤ اور تصادم کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ یہ اتفاق ہے، کہ ہر دو واقعات میں، چیف جسٹس محمد یوسف صراف اور جسٹس منظور گیلانی، دونوں کا تعلق بارہ مولہ، بھارت کی مقبوضہ وادی کشمیر سے ہے اور چوہدری رحیم داد چیف جسٹس اور ریاض اختر چوہدری چیف جسٹس دونوں کا تعلق، ضلع کوٹلی سے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وادیٔ کشمیر اور کوٹلی کو، الگ کرنے والے سلسلۂ پیر پنجال سے نکلنے والی، تابکاری کے زیر اثر، ہر دو خطوں کے جج صاحبان میں ایک دوسرے کے خلاف جذبہ شدت انتقام، اعلیٰ عدلیہ کی تباہی کا باعث بنا اور قبل از وقت، اعلیٰ ادارہ، ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے محروم ہوگیا اور عدلیہ کی پُرشکوہ عمارت میں دراڑیں پڑ گئیں۔

وکلاء کے لئے چیمبرز کی تعمیر

یہ ذکر ہو چکا ہے، کہ اضافی طور پر متروکہ جائیداد کا انتظام و انصرام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ اس شعبہ پر

پہلے خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی تھی اور سوتیلی اولاد کی طرح، اتنا اہم ترین، غیر مسلم باشندگان ریاست کی نقل مکانی سے ان کی جائیداد کی امانت کا شعبہ، لاپرواہی اور لوٹ کھسوٹ کا شکار رہا۔ اس میں مکانات، دوکانات، مزروعہ وغیر مزروعہ اراضیات جو شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں تھیں، کے علاوہ کوٹلی میں پرائیویٹ جنگل، بڑی بڑی جاگیریں اور مذہبی عبادت گاہوں کے لئے وقف زمینیں بھی شامل ہیں۔ اصولاً تو شروع میں ہی متروکہ جائیداد کے انتظام وانصرام کا خودمختار ادارہ قائم ہو جانا چاہیے تھا، مگر بوجوہ ایسا نہ کیا گیا اور بالآخر ۱۹۸۷ء میں ادارہ کی حکومت کے تابع الگ حیثیت قائم ہوئی۔ تاہم بہت محنت اور جدوجہد کے تحت تمام متروکہ جائیداد کا ریکارڈ مرتب کر کے، کرایہ، لگان اور پیداوار کے بقایاجات کی وصولی کی گئی اور کروڑوں روپیہ کسٹوڈین فنڈ کے نام پر، بینک میں معیادی اور غیر معیادی، سیونگ اور کرنٹ اکونٹ میں جمع کیے گئے۔ یہ مشکل اور ناپسندیدہ کام بھی، میں نے ہی سرانجام دیا۔

میرپور سرکٹ میں سماعت کے دوران چند سینئر وکلاء سے معلوم ہوا، کہ پرانے میرپور شہر سے نئے میرپور شہر میں منتقلی کے بعد سے، اب وکلاء بارروم کے علاوہ کھلے احاطہ میں اور عدالتوں کے برآمدوں میں، کرسی رکھ کر، کام کرنے میں مشکل محسوس کرتے تھے۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ تھا۔ جج بننے سے قبل، میں خود بارروم کے ساتھ، شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کام کرتا رہا تھا۔ میرے ساتھ راجہ اسلم، چوہدری محمد حسین اور لطیف دت ایڈووکیٹ، بیٹھتے تھے۔ یوسف صراف، محمد یحییٰ چیمہ، عبدالخالق انصاری اور قاضی عبدالغفور، ہائی کورٹ برآمدہ کے باہر۔ چوہدری شیر زمان، راجہ صدیق، چوہدری تاج، راجہ لہراسب، سب جج عدالت کے باہر اور یونس سرکھوی ہمارے ساتھ بیٹھتے۔ شریف طارق اور چوہدری لال خان، تحصیل کے باہر دفتر لگاتے۔ وکلاء کو میں نے تجویز دی، کہ صدر حکومت سے مطالبہ کریں، کہ کسٹوڈین فنڈ سے، وکلاء کے لئے چیمبرز تعمیر کروائے جائیں۔ اتفاق سے صدر حیات خان، میرپور میں ہی تھے۔ وکلاء نے میری تجویز کے مطابق، ان کو مطالبہ پیش کیا جو انھوں نے، مجھ سے مشاورت سے مشروط، مان لیا۔ مظفرآباد میں، صدر حیات نے مجھ سے وکلاء کے مطالبہ سے متعلق مشاورت کی، تو میں نے اس تعمیراتی منصوبہ پر پہلے ہی مکمل تیاری کر رکھی تھی، جس کی تفصیل اور مالی طور پر مفید منصوبہ پیش کیا۔ حیات خان، تعمیراتی کام میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور ان کو حکومت پاکستان کی ہدایت بھی تھی، کہ آزاد کشمیر میں تعمیراتی اور ترقیاتی کام کیے جائیں اور عوام کو معمولات زندگی میں، ہر طرح کی سہولت فراہم کی جائے۔ انھوں نے مجھ سے، چیمبرز کی تعمیر کے منصوبہ پر عمل کرنے پر، اتفاق کرتے ہوئے تعمیر کی تحت ضابطہ، اجازت دے دی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر، عمارت کے لئے موزوں جگہ پسند کر کے، آرکیٹیکٹ اور چیف انجینئر تعمیرات عامہ سے نقشہ عمارت، اور تخمینہ اخراجات یعنی لاگت تیار کروا کر، صدر حیات کو پیش کر کے، حتمی منظوری حاصل کر لی اور سنگ بنیاد رکھنے کی تاریخ بھی طے کر لی۔ پاکستان اور جموں کشمیر میں، اپنی نوعیت کا یہ انوکھا اور پہلا، وکلاء کی پیشہ ورانہ سہولت کا باوقار، حکومتی منصوبہ تھا۔ پہلے مرحلہ میں،

دومنزلہ عمارت کی تعمیر طے ہوئی، جو آئندہ بیس سال کے لئے کافی تھی۔ البتہ اس میں تیسری منزل کی گنجائش رکھی گئی۔ صدر حیات خان، سنگِ بنیاد کی تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ وکلاء کے علاوہ، میرپور کے عوام بھی اس منصوبہ پر بہت خوش ہوئے اور صدر حیات کے ساتھ ساتھ میری بھی، تعریف ہوئی۔ عمارت میں تمام جدید سہولتیں مہیا کی گئیں تھیں۔ قومی پریس اور پاکستان ٹیلی ویژن پر اس کی خوب پبلسٹی کی گئی، خصوصیت سے ہندوستان کے زیر قبضہ جموں کشمیر کے تناظر میں۔ منصوبہ پر تعمیر بھی فی الفور شروع کروادی گئی۔ میرپور سے مظفرآباد پہنچا ہی تھا، کہ رات گیارہ بجے، صدر حیات کا فون آیا، کہ پریذیڈنٹ ہاؤس میں کچھ مہمان ہیں جو میرے ہاں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں، صدر کی رہائش گاہ قریب ہی تھی۔ وہاں راولاکوٹ کے وکلاء تشریف فرما تھے۔ صدر حیات نے کہا، کہ یہ سب آپ کے معترف اور دوست ہیں، ان کا مطالبہ یہ ہے کہ راولاکوٹ میں بھی وکلاء چیمبرز تعمیر ہونے چاہئیں اور دوسرا مطالبہ یہ ہے، کہ میرپور میں زیر تعمیر عمارت سے، راولاکوٹ میں چیمبرز کی تعمیر پہلے ہونی چاہیے۔ جب عدلیہ میں میری تقرری ہوئی، تو میرپور کے بعد راولاکوٹ، باغ، پلندری، عباسپور، کوٹلی، بھمبر اور مظفرآباد کے وکلاء نے بے حد خوشی منائی اور میرے اعزاز میں ظہرانے اور عشائیے دیئے اور تمام تقریبات بڑے پیمانے پر بینڈ باجوں کے ساتھ منعقد کی تھیں۔ جسٹس رحیم داد صاحب نے کئی دفعہ کہا، کہ تم تو وزیر اعظم پر بھی سبقت لے گئے ہو۔ حالانکہ اعلیٰ عدلیہ کی روایات ایسی نہ تھیں، مگر عدالت کا حصّہ ہونے کے ناطے یہ معیوب بھی نہ تھا۔ راولاکوٹ بار کا یہ معمول تھا، کہ سرکٹ کے دورہ کے دوران، روزمرہ چائے کے وقفہ میں، بار روم میں سب کے لئے چائے کا اہتمام ہوتا۔ صدر حیات نے بجا طور پر کہا، کہ سب وکلاء میرے دوست تھے۔ میں نے دونوں مطالبات، تسلیم کر لئے۔ دو ہفتوں میں، ہنگامی طور پر آرکیٹیکٹ اور چیف انجینئر سے نقشہ اور لاگت کا تخمینہ طے کروا کر، صدر حیات سے، حکومتی منظوری حاصل کر کے، سنگِ بنیاد کی تقریب منعقد کی گئی، جس میں حیات خان مہمان خصوصی تھے۔ میں نے وہاں کے مقامی ٹھیکیدار کو، تعمیر کا ٹھیکہ دے کر، عمارت مقررہ مدت سے پہلے تیار کرنے پر، خصوصی بونس کا بھی اعلان کیا۔ عمارت تیار ہونے پر، حیات خان نے افتتاح کی تقریب میں، کھل کر میری تعریف کی اور سیاستدانوں کے احتساب کے مقدموں میں، سیاستدانوں کو بری کرنے کی وجہ سے جو رنجش تھی، وہ سب ختم کر دی۔ راولاکوٹ چیمبرز کی عمارت سائیز میں میرپور کی عمارت سے چھوٹی تھی، وہ جلد مکمل ہوگئی اور راولاکوٹ کے وکلا سے، کیا گیا وعدہ پورا ہوگیا۔

آزاد کشمیر بھر کے وکلا میں، چیمبرز کی تعمیر کے مطالبہ میں، شدت آ گئی۔ ہر ضلع کے صدر مقام اور بالخصوص مظفرآباد، دارالحکومت سے مرکزی بار اور کوٹلی کے وکلا کا دباؤ، بہت زیادہ ہوگیا۔ حیات خان صدارت سے فارغ ہوگئے اور اس کے بعد، بھمبر مغلورہ کے، جنرل عبدالرحمٰن، صدر اور چیف ایگزیکٹو مقرر ہوئے۔ جنرل عبدالرحمٰن اس سے قبل بھی اس عہدہ پر رہ چکے تھے۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے آخری ایام میں، جنرل عبدالرحمٰن کی کابینہ میں،

مسلم کانفرنس کے سیّد عبداللہ شاہ آزاد اور لبریشن لیگ کے راجہ ذوالقرنین وزیر نامزد ہوئے تھے۔ عبدالرحمٰن بہت دیانتدار اور شریف طبع انسان تھے۔ دوٹوک بات منہ پر کرنا، ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ جب دوسری بار صدر مقرر ہوئے، تو میرپور میں وکلا چیمبرز کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ افتتاحی تقریب میں وہ مہمان خصوصی تھے۔ وکلاء چیمبرز میں تمام جدید سہولتیں میسر تھیں۔ صدر عبدالرحمٰن نے اس کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے اسلام آباد، جنرل ضیاء الحق کے پاس، میری بہت تعریف کی اور تجویز پیش کی، کہ میری زیرِ نگرانی، پاکستان میں بھی وکلاء چیمبرز، تعمیر کروائے جائیں۔ جب مجھے انھوں نے، اس سلسلہ میں صدر ضیاء الحق سے ملاقات کی تجویز پیش کی، تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ صدر عبدالرحمٰن کی تجویز پر، مظفرآباد میں کسٹوڈین بلڈنگ، جس میں سٹاف آفسز، کورٹ روم وغیرہ کے علاوہ دوسری منزل پر رہائشی فلیٹس بھی تھے، تعمیر کیے اور ان کے ملحق وکلاء چیمبرز کی عمارت بھی تعمیر کی۔ صدر عبدالرحمٰن نے دونوں عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھا اور افتتاح بھی کیا۔

جنرل عبدالرحمٰن بحیثیت صدر حکومت

سیاستدانوں کا احتساب جاری تھا، اس کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں کوآپریٹو بینک، جنہیں بالخصوص میرپور میں ۱۹۷۳ء میں، وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے، رجسٹریشن منسوخ کر کے، لکویڈیٹ کر دیا تھا اور شریک حصہ داروں سے جمع شدہ رقوم کی وصولی بھی شروع کر دی تھی۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا، شراکت دار گرفتار کیے جا رہے تھے اور ان کی جائیدادیں بھی قرق کی جا رہی تھیں۔ جنرل ریٹائرڈ عبدالرحمٰن، جب دوسری بار عہدہ صدارت اور چیف ایگزیکٹو پر فائز ہوئے، تو اس وقت میں دوسری بار، سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج تھا۔ ان کی تقرری کے بعد ہی، ہائی کورٹ میں بحیثیت جج واپس آیا۔ سردار محمد شریف، دو ماہ بعد ریٹائر ہوئے اور دو ہفتے قبل، بحیثیت مستقل چیف جسٹس ان کی چیئرمین کشمیر کونسل نے، توثیق کی تھی۔

چیف جسٹس کے عہدہ پر تقرری

زندگی کا سفر مدوجزر کے مانند بدستور جاری تھا۔ صبح وشام کے تسلسل میں، حسب معمول، عدالت پہنچ کر مقدموں کی سماعت شروع ہی کی تھی، کہ ہائی کورٹ کی عمارت پرانا سیکریٹریٹ سے، پچاس گز کے فاصلہ پر، جنوب میں واقع پریذیڈنٹ آفس سے صدر حکومت کی طرف سے پیغام آیا، کہ صدر کے چیمبر میں ۱۱ بجے میرا چیف جسٹس ہائی کورٹ مقرر ہونے پر حلف ہونا تھا۔ اس وقت ہائی کورٹ میں میرے علاوہ، جسٹس سید محمد تھے۔ پیغام سنتے ہی، جسٹس سید محمد، بغیر بتائے ناراض ہو کر اپنی رہائش گاہ چلے گئے۔ ان دنوں سدھن قبیلہ کے سردار حبیب خان صدر عبدالرحمٰن کے ایڈوائزر مقرر تھے۔ بقول صدر صاحب، انھوں نے میری تقرری پر احتجاج کیا، کہ یہ سید محمد کا حق تھا، البتہ وہ اور سید محمد صاحب، حلف کی تقریب میں شامل نہ ہوئے۔ ۱۰ اگست ۱۹۸۳ء کو ۱۱ بجے دن، صدر عبدالرحمٰن نے

حلف لیا۔ وہ تمام سیکریٹریز حکومت اور دیگر ملازمین، وکلاء اور عوام، جن کو ہائی کورٹ جج کے حلف کی تقریب میں، چیئرمین کونسل کی ایڈوائس کے برعکس، میرے جونیئر جج کے طور پر حلف لینے سے رنج اور دکھ ہوا تھا، اتفاق سے وہ سب، چیف جسٹس کے عہدہ کے حلف کی تقریب میں شامل تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے اور سب کی ایک ہی آواز تھی، کہ "حق بہ حق دار رسید"۔ ہائی کورٹ کے سٹاف اور وکلاء میں خوشی قابل دید تھی۔ اس میں حیران کن بات یہ تھی، کہ رفیحہ خورشید سپریم کورٹ میں بدستور، دو سال سے زائد عرصہ سے، ایکٹنگ چیف جسٹس تھے۔ پاکستان کے تمام صوبوں میں، ہائی کورٹ اور پاکستان سپریم کورٹ میں بھی، تمام ایکٹنگ چیف جسٹس مقرر تھے، مگر میری تقرری بحیثیت مستقل چیف جسٹس ہوئی تھی، جس پر وزیراعظم پاکستان، محمد خان جونیجو کے، میرے اعزاز میں منعقد کیے گئے عشائیہ، جس میں دیگر معزز مہمانوں کے علاوہ، وفاقی محتسب اعلیٰ، جناب سردار محمد اقبال، سابق چیف جسٹس لاہور اور کمانڈر انچیف پاکستان، کے۔ ایم عارف بھی شامل تھے، وہاں جناب اے کے بروہی معروف جیورسٹ نے، سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، کہ اس وقت پاکستان اور آزاد جموں کشمیر میں، صرف ایک ہی چیف جسٹس ہے، وہ جسٹس عبدالمجید ملک ہے، باقی تمام ایکٹنگ ہیں۔

ہائی کورٹ میں حسب روایت، مبارک دینے والوں سے فراغت پا کر، رہائش گاہ پہنچا، وہاں بھی مہمان منتظر تھے۔ معافی طلب کر کے، اللہ تعالیٰ کا شکر، شکرانہ کے نفل ادا کر کے کیا اور نئے آغاز کی نسبت اور تقاضا کے تحت، نئی آزمائش اور عوام کے حقوق کے تحفظ اور بروقت عدل وانصاف کی استطاعت اور استقامت کی منزل، سجدہ ریز ہو کر حاصل کرنے کی دعا کی۔ عین اسی لمحہ، مجھے امی جان اور ابا جان کی پرورش اور تربیت کا اور جوان ہو کر عملی زندگی کے آغاز تک، احسانات لمحہ بہ لمحہ یاد آنے لگے۔ ابا جان میرے جج بننے کے لئے، آمادہ نہ تھے، مگر تقرری کے بعد، ملاقات پر اکثر سوال کرتے "مجید تم چیف جسٹس کب بنو گے؟" میں ہنس کر اطمینان سے کہتا، اولاد کے لئے اولیاء اللہ تو ماں باپ ہوتے ہیں، ماں باپ کی دعا کی قبولیت کو، فوقیت حاصل ہوتی ہے، جس پر خوش ہو کر فرماتے جب اللہ کو منظور ہو گا، تب چیف جسٹس بن جاؤ گے۔ امی جان ان عہدوں کے جھمیلوں میں نہ پڑتیں، وہ صرف صحت اور خیریت کی دعا کرتیں۔ ابا جان ۱۰ رجون ۱۹۸۲ کو، ظہر کے وقت ہلکا سا بخار ہونے پر، اچانک وفات پا گئے۔ وفات سے دو گھنٹے قبل، امی جان کو کہا، کہ مجید کو فون کرو، کہ مجھ سے ملاقات کر لے۔ میں میرپور سرکٹ میں دورہ پر تھا۔ ۱۲ بجے کے قریب فون ملا، مگر امی جان نے کہا، کہ اپنے ساتھ چھوٹے بھائی یعقوب، کو بھی لے آنا۔ یعقوب الائیڈ بینک میں AVP تھا، وہ آفس میں نہ تھا۔ ایک گھنٹہ بعد ملا۔ ہم ڈڈیال شہر کے اندر داخل ہوئے، تو ابا جان نے امی جان سے کہا، کہ مجید لیٹ ہو گیا ہے، ملاقات نہ ہو سکی۔ انھوں نے اللہ حافظ کہا اور روح پرواز کر گئی۔ میں صرف پانچ منٹ تاخیر سے پہنچا تھا۔ ابا جان کی تین بڑی بہنیں تھیں، دو جوانی میں وفات پا گئیں۔ پانچ سال کی عمر میں ماں، عطر قلی اور

چھ سال کے ہوئے تو والد، نوازش علی خان بھی وفات پا گئے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد ان کی پرورش میرے نانا، ملک فیض عالم خان نے کی تھی، مگر سب کچھ ملنے کے باوجود، ان کی بچپن کی زندگی، محرومیوں کی بھاری گٹھڑی تھی۔ انھوں نے مرچنٹ نیوی کی سروس میں اور بعد میں، برمنگھم کی نیوٹن فونڈری میں، شب و روز محنت کر کے، بہت دولت کمائی اور اپنی بچپن کی محرومیوں کے غم اور دکھ کو، میری پرورش اور تربیت کر کے، اطمینان اور طمانیت کی شکل میں ختم کیا، جس کا مجھ سے اکثر اوقات ذکر کرتے۔ میں جو کچھ بھی تھا، ان کی محرومیوں اور محنت کا صلہ تھا۔ میری پیدائش سے قبل، امی جان کو حضرت امام بری شاہ لطیف کی زیارت پر لے گئے۔ دعا مغفرت کی، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے نیک اولاد کی دعا کی۔ میں سات سال کا تھا، جب مجھے اپنے ساتھ، امام بری شاہ لطیف کی زیارت پر لے کر گئے تھے۔ چیف جسٹس مقرر ہونے پر، شکرانے کے دو نفل ادا کرنے کے بعد، دعا کرتے ہوئے سجدہ ریز ہوا، تو ابا جان خوش ہوتے سامنے آئے۔ بس اس پر آنسو تیز بارش کی طرح چھلک پڑے اور میں جی بھر کر اتنا رویا، کہ ہچکی بندھ گئی اور رونا بند نہ ہو رہا تھا، بے ساختگی میں اتنا رویا کہ تمام ملازم، پریشان ہو کر میرے پاس آ گئے۔ بس اس خوشی پر غم اور دکھ کے آنسوؤں کی نہ تھمنے والی بارش۔ ابا جان کی اس اعزاز کی خوشی میں شامل نہ ہونے کے غم، دکھ اور کسک کی تھی۔ دن بھر کی حسرت اور شام کے دکھ کے لمحات، رات کو مہمانوں کے قہقہوں، لطیفوں اور خوش گپیوں میں سما کر، نئی سحر، نئی صبح اور نئے عزم کے ساتھ نئی زندگی کے مستقبل میں ڈھل گئے۔ ۱۰ راگست ۱۹۸۳ء کا عدلیہ کی سٹیج پر سورج کے عروج کا سفر بتدریج ظہر، عصر اور مغرب کی منزل پر رواں دواں رہا۔ شہرت کے مدوجزر سے گذرتا رہا۔ ”ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں“۔

غائبانہ مدد کا کرشمہ

طالب علم تھا، تو ذہن میں وکیل بننے کا خیال پیدا ہوا، جو بتدریج پختہ ہوتا رہا۔ پاسپورٹ نہ ملنے کی رکاوٹ نے، لندن لنکنز لاء ان میں، قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بیرسٹر کہلانے سے، تو محروم رکھا، مگر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں، قانون کی تعلیم سے فیض یاب ہو کر، لاہور ہی میں وکالت شروع کر دی۔ ابھی قانون کے شعبہ اور وکالت میں بنیادی اصول اور ادب و آداب سیکھ ہی رہا تھا، کہ منگلا ڈیم میں زمین اور مکانات متاثر اور نقل مکانی کے مسائل کے دباؤ کے تحت، لاہور کے وسیع تر، محنت طلب اور ذہانت و دانش کے مقابلہ کے ماحول سے، اچانک میرپور، ایک محدود چھوٹے خطہ میں منتقل ہونا پڑا۔ ان ہر دو معاملات میں میری سوچ اور منصوبوں کی، بالا بالا حالات کے دھارے کے تحت تبدیلی میں، میرا شعور ہرگز شامل نہ تھا۔ وکالت سے مجھ کو، عشق کی حد تک لگاؤ تھا، مگر حالات نے اچانک کروٹ لی اور میرے نہ چاہنے اور معاشرہ کی رکاوٹوں کے باوجود، عدلیہ کی ذمہ داری کا بوجھ لاد دیا گیا۔ چاروناچار عوام کو، محدود سطح پر، انصاف فراہم کرنے کی ذمہ داری نبھا رہا تھا، کہ مقامی قوتوں نے، ہائی کورٹ سے، بغیر میری رائے حاصل کیے، اپنی سہولت کی غرض کے تحت، اٹھا کر سپریم کورٹ میں پہنچا دیا۔ مگر ہمارے احساس اور منصوبہ بندی

کے بغیر ہی، جنرل حیات کو رخصت کر کے، جنرل عبدالرحمٰن کو مسندِ صدارت مل گئی اور قدرت کے کرشمہ سے میں حیرت زدہ ہوگیا، جب دوسری بار، اچانک چیف جسٹس کے عہدہ پر تقرری ہوئی۔ حیات خان صدر رہتے، تو یقیناً یہ اعزاز مجھے نہ ملتا، مگر اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمت ہوتی ہے، جس کے سامنے انسان کا اثر ورسوخ، وسائل، برادری، قبیلہ کی طاقت ناکام اور ناکارہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ میری زندگی میں، نشیب وفراز کا یہی علم اور تجربہ ہے۔

میرپور سرکٹ میں مصروفِ کار تھا، کہ پاکستان نظریاتی کونسل کے چیئرمین، جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب نے، ظہرانہ میں مدعو کیا۔ ان سے وکالت کے دوران، اول لاہور، سردار اقبال صاحب کی رہائش گاہ پر اور دوسری بار، ایک تقریب میں، کے ایچ خورشید صاحب کے ہمراہ، ملاقات ہوچکی تھی، مگر ان سے زیادہ مراسم نہ تھے۔ وہ جج سپریم کورٹ رہ چکے تھے۔ پاکستان کی اشرافیہ میں ان کا بڑا مقام تھا۔ اسلام آباد ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ وہ بہت ہی پیار اور احترام سے ملے۔ ملتے ہی کہا، او ہو ہم تو پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ ان کی یادداشت اچھی تھی۔ مجھے ان کی گفتگو سے فوراً احساس ہوا کہ شاید مجھے اکیلے میں مدعو کیا گیا تھا، کوئی اور مہمان نہ تھا۔ محترم چیمہ صاحب نے اپنا مدعا، خود ہی بیان کرنا شروع کر دیا۔ ان دنوں صدر ضیاء الحق نے مولانا ظفر احمد انصاری، جن کا تعلق کراچی سے تھا، وہ بہت معروف اور اسلامی علوم کے سکالر تھے، کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جسٹس افضل چیمہ اور جسٹس محمد گل، سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج، جو آزاد کشمیر میں، چیف الیکشن کمشنر تعینات تھے، پر مشتمل ایڈوائزری کونسل بنا رکھی تھی، جس سے حکومتی نظام کے معاملات میں، مشاورت ہوتی تھی۔ چیمہ صاحب نے بتایا، کہ سپریم کورٹ کے جج صاحبان میں، سب سے قابل جج، جسٹس گل تھے، مگر وہ کم گو اور بہت محتاط جج تھے۔ وہ کبھی کسی شخص کی، بے جا تعریف نہ کرتے تھے۔ ایک اعلیٰ اہلیت کے حامل جج ہوتے ہوئے، سننے کے قائل تھے اور بولتے صرف ضرورت کے تحت ہی تھے۔ چیمہ صاحب نے کہا، کہ صدر ضیاء الحق نے ایڈوائزری کمیٹی کی، بہت اہم میٹنگ رکھی ہوئی تھی۔ حسب پروگرام، چیمہ صاحب کی رہائش گاہ پر، سب نے جمع ہوکر، وہاں سے اکٹھے، صدر ضیاء الحق کے ہاں جانا تھا۔ اُن کی رہائش گاہ پر پہنچتے ہی، جسٹس گل نے کہا، کہ صدر ضیاء سے میٹنگ سے قبل، آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے، چیف جسٹس کی تقرری کا حکم، جاری کروانا ہے اور ساتھ ہی، انہوں نے تجویز کیا کہ جسٹس چیمہ اس کے متعلق گفتگو کا آغاز کریں گے اور مولانا ظفر احمد انصاری سے کہا، کہ وہ تائید کریں گے۔ یہ تو طے ہوگیا۔ ابھی اس معاملہ میں، ان کی ذاتی دلچسپی پر بات کرنی ہی تھی، کہ جسٹس گل نے خلافِ معمول، ازخود آپ کی ذہانت، اہلیت اور جرأتمندانہ کام کی تعریف شروع کردی۔ اس پر ہم دونوں نے، ان کی تجویز سے اتفاق کیا اور پریزیڈینٹ صاحب کے ہاں پہنچے۔ جسٹس چیمہ نے کہا، کہ جوں ہی صدر ضیاء الحق آئے۔ طے شدہ تجویز کے برعکس، جسٹس گل نے، صدر ضیاء الحق سے مخاطب ہوکر کہا، کہ آپ نے آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی ایڈوائیس روک رکھی ہے اور ہائی کورٹ، بغیر چیف جسٹس کے، کام نہیں کر

رہا۔ ساتھ ہی انہوں، نے آپ کی اہلیت اور ذہانت کی تعریف شروع کر دی۔ صدر ضیاء الحق نے اپنے سٹاف افسر، سردار عزیز کو بلا کر فائل، پیش کرنے کا حکم دیا اور فائل پیش کرنے پر، دستخط کر کے حکم دیا، کہ فائل ابھی صدر آزاد کشمیر کو پہنچاؤ اور ان سے کہو، کہ وہ فائل ملنے پر کنفرم کریں۔ جسٹس چیمہ صاحب نے کہا، جسٹس گل صاحب نے، جس انداز میں آپ کی تعریف ہمارے پاس اور صدر ضیاء الحق کے سامنے کی، اس سے بے حد متاثر ہو کر، آپ سے ملاقات کا شوق ہوا، مگر آپ کو تو میں پہلے ہی مل چکا تھا۔ اس وقت آپ وکیل تھے اور سیاست میں تھے۔

جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب کے ظہرانہ کے بعد، جموں کشمیر کونسل میں وزیر امور کشمیر، جنرل چشتی کے جانشین، جنرل سید جمال میاں کے ہاں، چائے پر دعوت تھی۔ ملتے ہی سید جمال، سلام کے بعد، دونوں کان چھوتے ہوئے بولے، اللہ معافی، میرے اللہ معافی، بھائی مجید ملک، آزاد کشمیر میں قبیلائی تعصب کی انتہا ہے۔ میں تو بہت پریشان ہوا ہوں۔ میں حیران ہوں، کہ اس قدر متعصب ماحول میں، آپ کس طرح زندگی گذارتے ہو؟ میں سمجھ تو گیا، کہ جنرل کیا اشارہ کر رہا تھا، مگر میں نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا، جنرل صاحب پاکستان کی نسبت ہمارے ہاں قبیلائی رواداری، ہم آہنگی اور وسعت قلبی زیادہ ہے۔ اس نے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا، چھوڑ و یار ان باتوں کو۔ یہ تمہارے چیف جسٹس بننے میں، جس قدر، سدھن قبیلہ کے فوجی افسران اور سیاستدانوں کا، تمہارے خلاف مجھ پر اور صدر ضیاء پر دباؤ رہا ہے، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم پر اللہ کی مہربانی اور تمہارے نیک والدین کی دعا، کا اثر تھا، کہ تم اس عہدہ پر فائز ہوئے ہو، ورنہ دوسرے جج کی بہت سفارش تھی۔ جنرل سید جمال میاں کا تعلق بنوں، صوبہ پختونخوا کے علاقہ سے تھا۔ وہ پٹھان تھا اور صحیح فوجی تھا، اس نے تمام تفصیل بتا دی۔ ان دنوں صدر ضیاء الحق کے سٹاف افسر، جنرل سردار عزیز پلندری والے تھے، جو اُس وقت غالباً کرنل تھے، بعد میں جنرل ترقیاب ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے فائل اپنے پاس رکھ لی تھی، اور اس دوران میرے خلاف دباؤ ڈلواتے رہے۔ جسٹس چیمہ نے بھی یہ بتایا تھا، کہ جسٹس گل کے یہ معاملہ اٹھانے پر، صدر ضیاء نے سٹاف افسر سے باز پُرس کی، کہ فائل پیش کیوں نہ کی تھی۔ تاہم یہ اٹل حقیقت ہے کہ، ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے''۔

نئی سحر نئی آزمائش

اعلیٰ عدلیہ میں جج کی ذمہ داری، ایک خاص حد تک ہوتی ہے، بنیادی طور پر صحیح صحیح، بدوں تاخیر، بدوں اثر ورسوخ اور بدوں خوف، انصاف کرنا ہوتا ہے۔ ثانوی طور پر وکلاء اور اہل مقدمات کے ساتھ ادب واحترام کا رویہ قائم رکھنا، مطلوب ہوتا ہے۔ نظام عدل، جو سابق برطانوی آمریت کا رائج کردہ تھا، اس میں کچھ ردوبدل اور ترامیم واضافہ، اسلامی قوانین کے نفاذ پر، بروئے کار لایا گیا تھا مگر مجموعی طور، جملہ قواعد وضوابط، برطانوی نظام کا ہی چربہ چلے آتے تھے۔ اس نظام عدل میں، چیف جسٹس ہائی کورٹ کو مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ جملہ عدلیہ کے

تمام امور چیف جسٹس کے تابع اور زیر انتظام ہیں۔ ہمارے ہاں، پاکستان میں رائج نظام کی پیروی، کیے جانے کا ضابطہ نافذ کیا گیا ہے، مگر اس میں خاطر خواہ کسی مرحلہ پر، بھی مماثلت نہ تھی۔ چند مقامات، جہاں ڈوگرہ عہد میں، ضلع اور تحصیل کے دفاتر تھے، ان کے علاوہ نئے اضلاع اور تحصیل کے مقامات پر، عدالتیں کرایہ کی مختصر اور چھوٹی چھوٹی دکانات میں قائم تھیں۔ مظفرآباد دارالحکومت میں، ہائی کورٹ پرانے سیکریٹریٹ کی عمارت کے شمالی کونہ میں قائم تھی۔ تین کمروں پر مشتمل عدالت، دو کمرے برائے ریکارڈ، ایک کمرہ سٹاف، ایک کمرہ ایڈووکیٹ جنرل اور ایک چھوٹا کمرہ وکلاء کے لئے میسر تھے۔ اس پس منظر میں، عدلیہ کے ادارہ کو، قومی نشان اور تحریک آزادی کے نصب العین کے تناظر میں، ہر لحاظ سے مؤثر، باوقار اور تہذیب وتمدن کا عکاس بنانا، میرا خواب تھا، بلکہ عدلیہ کو مکمل آزاد، خودمختار اور با اختیار ادارہ ثابت کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی، ماتحت عدلیہ کو حسب حال سہولتیں فراہم کرنا اور انصاف گستری میں پسماندگی اور غلامی کے دور کے ماحول کو، ترقی اور آزادی کے نئے ماحول سے، روشناس کروانے کا کٹھن کام بھی سر انجام دینا تھا۔ وکلاء اور اہل مقدمات، جو دقیانوسی، غلامانہ آداب اور روایات کے قیدی بن چکے تھے، ان کو انسانی حقوق اور احترام انسانیت کی روشن اقدار سے روشناس کروانا، میرا نصب العین اور اولین ترجیحات میں شامل تھا، جس کا میں نے روز اول سے آغاز، اس طرح کیا، کہ ہر سائل کی، دادرسی کے لئے، چیف جسٹس تک براہ راست رسائی کی سہولت فراہم کرتے ہوئے ضابطہ سے ماورا، سادہ کاغذ پر، بدوں کورٹ فیس، درخواست پر، دادرسی کرنی شروع کر دی۔ اس سے نادار اور غریب عوام کی حق رسی، بلا تاخیر ہونی شروع ہوگئی۔ اس کی مثال یوں ہے، کہ گرمیوں کی تعطیلات میں لاہور کے وکلاء، نیلم ویلی کی سیاحت سے واپسی پر ہائی کورٹ میں ملنے آئے۔ ان میں راجہ افراسیاب، جو بعد میں جج سپریم کورٹ بنے، وہ بھی شامل تھے۔ وہ سب میرے ہاں چائے پر، گپ شپ کر رہے تھے، کہ اس دوران ایک نوجوان پھٹے لباس میں ملبوس، لہولہان حالت میں، درخواست لے کر پیش ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ مظفرآباد کے فلاں خواجہ صاحب کی کوٹھی کی تعمیر میں، تین ماہ سے بطور مزدور کام کرتا رہا، وہ نیلم کا رہنے والا تھا، اسی روز اس کو اطلاع ملی، کہ اس کی ماں سخت بیمار تھی اور اس کو گھر بلایا تھا۔ اس نے خواجہ صاحب سے مزدوری کی رقم طلب کی، تو اس کو مزدوری بھی نہ دی اور مار مار کر زخمی بھی کر دیا تھا۔ وہ تھانہ گیا، ایس پی اور انسپکٹر جنرل پولیس اور صدر حکومت کے پاس بھی گیا، مگر کسی نے بھی اس کی فریاد نہ سنی۔ لاہور کے وکلاء کے سامنے، اس نے روتے ہوئے مدد کرنے کی فریاد کی۔ میں نے سیکریٹری سے فوراً، ایس ایچ او کو فون پر اس مزدور کو مزدوری کی رقم دلوانے اور زدوکوب سے متعلق مقدمہ رجسٹر کرنے کو کہا۔ اتفاق سے وکلاء ابھی میرے پاس ہی تھے، کہ وہی مزدور مسکراتا ہوا آیا، زخم پر پٹی ہو چکی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا، کہ اس کو تمام رقم وصول ہوگئی تھی، اور مقدمہ بھی تھانہ میں رجسٹر ہو چکا تھا۔ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، علامہ اقبال کے بیٹے، چیف جسٹس تھے۔ لاہور کے وکلاء

نے یہ واقعہ چیف جسٹس کو سنایا اور اپنے تاثرات بھی بتائے، کہ آزاد کشمیر میں کتنا آسان اور کس قدر جلدی انصاف ہوتے ہوئے، انہوں نے دیکھا تھا۔ اس پر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے، مجھے طویل خط ارسال کیا، جس میں اُس واقعہ سے وکلاء پر اثر کے علاوہ، لاہور آنے اور ان کے ہاں قیام پذیر ہونے کی دعوت بھی دی۔ بظاہر یہ ایک معمولی معاملہ تھا، جس کی اتنی اہمیت کا، مجھے قطعی احساس نہ تھا۔ اس کا احساس ڈاکٹر جاوید اقبال کے خط سے ہی ہوا۔

ہائی کورٹ رولز کی ترتیب

آزاد جموں کشمیر میں ہائی کورٹ نے، کورٹس اینڈ لاز کورٹ کے تحت، ۱۹۴۸ء سے بشمول ماتحت عدلیہ، کام شروع کر رکھا تھا، مگر ہائی کورٹ کے، ضابطہ کار کے قواعد مرتب کرنے پر توجہ نہ دی گئی اور تمام امور صوابدیدی طور پر، چیف جسٹس اکیلے ہی سرانجام دیتے رہے۔ جج صاحبان سے اہم ترین امور میں، مشاورت شاذ و نادر ہی کی جاتی، مگر ایسی مشاورت بھی رسمی نوعیت کی ہوتی۔ جج بننے کے فوراً بعد، مجھے اس کا احساس ہو گیا تھا۔ لہٰذا ہائی کورٹ کے رولز آف پروسیجر، عبوری دستور ۱۹۷۴ء کے تحت، مرتب کر کے ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴ء سے، نافذ العمل کیے۔

ہائی کورٹ کی نئی عمارت کی تعمیر

ہائی کورٹ کی الگ عمارت کی تعمیر میری پہلی ترجیح تھی، مگر نوکر شاہی کے سرخ فیتہ کی رکاوٹ ہٹانی ضروری تھی۔ سیکریٹری مالیات اور سیکریٹری تعمیرات عامہ کے ساتھ ذاتی مراسم کا فائدہ اٹھایا، مگر اس میں سب سے بڑی معاونت، صدر عبدالرحمٰن کی تھی، جنہوں نے بہت تعاون کیا۔ سیکریٹری محمد یوسف اعوان، بہت دیانتدار اور ضابطہ کے پابند تھے، جب تک مالیاتی بجٹ، میں اتنی بڑی عمارت کی تعمیر کیلئے رقم مختص اور منظور شدہ نہ ہو، ٹینڈر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ صدر عبدالرحمٰن نے تحت ضابطہ، متعلقہ قواعد میں نرمی کرتے ہوئے ٹینڈر منظور کروایا۔ صدر عبدالرحمٰن کو تعمیراتی منصوبوں میں بہت دلچسپی تھی۔ ان کی دلچسپی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، بیک وقت کوٹلی، بھمبر، فتح پور نکیال، ڈڈیال، کھوئی رٹہ فارورڈ، دھیر کوٹ، اٹھمقام اور ہٹیاں بالا کے مقامات پر ماتحت عدالتوں کی عمارتوں کی تعمیر کروادی۔ مظفر آباد میں کسٹوڈین آفس، عدالت اور رہائشی فلیٹس کے علاوہ، وکلاء چیمبرز کی عمارت بھی تعمیر کروادی۔ یہ معاملات ۱۹۴۷ء سے توجہ طلب تھے، جن کی تکمیل کی۔ مہاجرین جموں کشمیر کی آبادکاری، متروکہ جائیداد کی عارضی اور عبوری الاٹمنٹ کے تحت کی گئی تھی، جو ریاست میں استصواب رائے کے تابع تھی۔ قانون میں ترمیم کر کے، متروکہ جائیداد کے غیر مسلم مالکان کے حقوق ملکیت اور واپسی قبضہ، غیر مشروط کو محفوظ رکھتے ہوئے، مہاجرین کو جائز الاٹمنٹ، تحت ضابطہ عبوری ملکیت کی حیثیت دی گئی، جس سے مہاجرین کو محکمہ کی قدم قدم پر مداخلت اور ہر معاملہ میں اجازت حاصل کرنے کی دشواری سے، نجات حاصل ہو گئی اور ان کے لئے آسانی پیدا ہو گئی۔

پروٹوکول کا خاتمہ

دنیا کے آزاد جمہوری ممالک میں، حکمران اور عوام کے مابین معمولات میں کوئی فرق اور فاصلہ قائم نہیں ہوتا۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنے پیغمبرؐ اور خلفائے راشدہؓ کے قائم کردہ نظام حکومت اور نظام انصاف کیلئے، وضع کردہ طریقہ کار اور ان اقدار کے اوصاف پر فخر ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنا لازم ہے۔ مگر آزادی حاصل ہونے کے باوجود ہم استعماری یورپی قوتوں کے، اپنے ممالک میں، اپنے عوام کے ساتھ، حکومتی اختیار کردہ اقدار کے قطعی برعکس، نوآبادی، مغلوب اور غلام اقوام پر مسلط کردہ نظام حکومت اور نظام عدل سے وابستہ رہ کر، عوام کی طرف عود کردہ حیثیت اور اختیارات کے بل بوتے پر، ایک وسیع حد فاصل قائم کر کے، ایک ملک اور ایک قوم میں، امتیازی طبقات کی حیثیت اور شکل اختیار کیے ہوئے ہیں اور آمریت کے تمام نشانات، قواعد کی شکل میں پروٹوکول اور سیکیورٹی کے، نمائشی نام پر نافذ کر رکھے ہیں۔ ملک کا صدر، وزیراعظم، وزراء، ممبران پارلیمنٹ اور تمام نوکرشاہی، ملک کے قانون سے بالاتر، امتیازی حیثیت اختیار کرتے ہوئے، اپنے آپ کو آسمانی مخلوق تصور کیے ہوئے ہیں۔ جج ہائی کورٹ مقرر ہوتے ہی، پروٹوکول اور سیکیورٹی کے نمائشی استعماری اور آمرانہ رویہ سے، میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی، پولیس گارڈ فارغ کر دی۔ مظفرآباد میں اور دوسرے سرکٹ، میرپور، کوٹلی اور راولاکوٹ میں اکیلے سفر کرتا۔ وکلاء اور عوام میں، غلامی کے دور کا احساس محرومی اور احساس کم تری ختم کرنے اور خوداعتمادی اور عزت نفس کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے، خوف اور دلی احترام کی اقدار کو ملحوظ رکھ کر، کمرہ عدالت میں مخصوص محتاط رویہ، اختیار کیے رکھا۔ تاہم عدالت میں سماعت مقدمات کے بعد وکلاء، بالخصوص باہر سے آنے والوں کو، چائے پر دعوت دے کر، ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ متذکرہ بالا رویہ اختیار کرنے پر، حکمران طبقہ مجھ پر بدستور تنقید کرتا رہا، مگر اس کے برعکس عوام اور وکلاء بہت مداح رہے۔ چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہو کر، قانون اور قواعد وضوابط کا قیدی بننے کے بجائے، عوام کی زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد دادرسی کرنے اور حق رسی کرنے کی حکمت عملی پر، کاربند رہا۔ میرا طریقہ عموماً یہ تھا، کہ مقدمہ میں وکلاء کی بحث کے بعد، فریقین مقدمہ سے دریافت کرتا، کہ مزید وہ کوئی بات اپنے حق میں یا مخالف فریق کے خلاف بتانا چاہتے ہیں تو بتا دیں۔ جس کے بعد اسی وقت فیصلہ، سٹینو کو لکھوا کر سنا دیتا۔ بیشتر اوقات چائے کے وقفہ سے قبل ہی، فارغ ہو کر، وکلاء کو چائے پر مدعو کرتا۔ شام کو جج صاحبان، سیکریٹریز اور پروفیسر صاحبان، میری رہائش پر گپ شپ کے لئے جمع ہوتے۔ اس پر حکمران اور چیف جسٹس کہتے، کہ جسٹس ملک دربار لگاتا ہے۔ مظفرآباد چھوٹا سا شہر ہے اور دارالحکومت بھی ہے، صدر، وزیراعظم اور دیگر تمام شعبوں کی کوئی خفیہ سے خفیہ بات، پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ دوسرا وصف یہ تھا، کہ ایک معمولی سی بات، جو آپ نے خود کسی سے کی ہوگی، وہ شہر سے گھوم پھر کر آپ کے پاس، جنگل بن کر خبر کی شکل میں واپس پہنچے گی۔ میرے ساتھ زیادتی یہ ہوتی، کہ افسر لوگ خود آ کر صدر اور وزیراعظم کے کارنامے سناتے اور

جب صدر اور وزیراعظم کے پاس جاتے تو ان کو بتاتے، کہ جسٹس ملک کی طرف سے یا جسٹس ملک کے گھر میں، آپ کے خلاف یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ سن کر وہ مجھ سے ناراض ہو جاتے۔ مظفر آباد میں یہ بھی دیکھا، کہ اقتدار میں آنے والے کے لئے، پھولوں کی سیج سجائی جاتی ہے اور جانے والے کو، خدا حافظ بھی نہیں کہا جاتا، مگر میرے ساتھ بالکل مختلف سلوک روا رکھا گیا تھا، اس لحاظ سے سب دوست مجھے خوش قسمت قرار دیتے ہیں، بلکہ اب تک مظفر آباد شہر کے احباب، وکلاء اور دفاتر میں عملہ، مجھے بہت عزت دیتا ہے، بالخصوص صحافی صاحبان بہت احترام کرتے ہیں۔ اس مختلف رویہ پر بھی بہت سے لوگ شاکی ہیں۔ مظفر آباد میں اس عمومی رویہ سے، باہر سے تعینات ہونے والے اعلیٰ افسران اور جج صاحبان کے علاوہ، سیاستدان بھی، یہ شکایت کرتے ہوئے سنے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ ایسی شکایت درست ہے کہ نہیں۔

صدر عبدالرحمٰن کو میرے دورہ راولاکوٹ سے پریشانی

چیف جسٹس کے عہدہ پر تقرری کے بعد، راولاکوٹ سرکٹ میں سماعت مقدمات کے لئے دورہ کا پروگرام، پریس میں شائع ہوا۔ صدر عبدالرحمٰن نے اخبار میں دورہ کے پروگرام کی خبر پڑھی، تو انھوں نے میرے متعلق دریافت کروایا۔ میں سماعت کر کے ریٹائرنگ روم میں تھا، کہ غلام حیدر جمعدار بھاگتا ہوا آیا اور بتایا کہ صدر صاحب آرہے ہیں۔ اسی لمحہ صدر صاحب اندر آ گئے اور سٹاف کو باہر جانے کو کہا، بہت راز میں کہا، کہ راولاکوٹ دورہ پر مت جاؤ، وہاں تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ تمہارے چیف جسٹس بننے پر، سدھن قبیلہ کے لوگ خوش نہیں تھے، اس لئے وہاں تمہارے لئے سخت خطرہ ہے۔ میں نے صدر صاحب کی بات سننے کے بعد، اپنے متعلق ان کی دلچسپی اور تشویش پر، ان کا شکریہ ادا کیا، اور بتایا کہ راولاکوٹ کے لوگوں سے میری پرانی شناسائی اور تعلق ہے، وہ اچھے لوگ ہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں، آپ میرے لئے دعا کریں۔ مگر وہ نہ مانے اور دورہ منسوخ کرنے پر بضد ہو گئے۔ میرے تمام دلائل سننے پر بھی، جب قائل نہ ہوئے، تو میں نے ان سے کہا، کہ چیف جسٹس تو میں تمام ریاست کا ہوں، پھر ڈر اور خوف سے تو کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا اپنے عہدہ کی حیثیت منوانے کے لئے بھی، دورہ ضروری تھا۔ ایک گھنٹہ بحث و تکرار کے بعد، دورہ پر جانے کا فیصلہ قائم رہا۔ راولاکوٹ پہنچنے پر، تمام وکلاء اور سدھن قبیلہ کے معززین نے، استقبال کیا۔ دوسرے روز، بار کی طرف سے ظہرانہ تھا۔ اس سے اگلے روز، باغ، پھر پلندری اور عباسپور میں دعوتیں ہوئیں۔ سردار لطیف خان، سردار مختار خان، سردار افضل خان، سردار عنایت خان اور سردار خان ایڈووکیٹ نے، الگ الگ ظہرانوں کا اہتمام کیا۔ ان تمام تقریبات میں، جسٹس سید محمد اور دوسرے جج صاحبان بھی، شامل ہوتے رہے۔ چیف جسٹس کے عہدہ پر، میری تقرری پر تمام وکلاء اور عوام نے، خوشی کا اظہار کیا اور صدر عبدالرحمٰن اور صدر ضیاء الحق کا شکریہ ادا کیا اور میرے اعزاز میں، تحریری سپاسنامے پیش کیے۔ ان تمام تقریبات کی روئیداد اور فوٹو گراف،

پریس میں نمایاں جگہ پر شائع ہوئے، مگر اہم بات، جو بعد میں معلوم ہوئی، وہ یہ تھی کہ صدر عبدالرحمٰن نے میری نگرانی اور حفاظت کے لئے چیف سیکریٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس کو، خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں، مگر میں ہر مقام پر بغیر پروٹوکول جاتا رہا۔ مظفرآباد واپس آنے پر، صدر عبدالرحمٰن نے چائے پر بلایا اور بغلگیر ہوکر ملے۔ انھوں نے فی البدیہہ کہا، کہ "مجید، تم تو سدھنوں میں بہت مقبول ثابت ہوئے ہو۔ یہ راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے پونچھی، کیوں تمہارے خلاف تھے"۔ میں نے صرف یہ کہا کہ وہ میرے خلاف نہیں تھے، وہ دراصل سید محمد کے حمایتی تھے، اس پر وہ بہت ہنسے۔ ان واقعات سے، آزاد کشمیر میں قبیلائی تعصب کی عکاسی ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے، ان تعصبات کے نتیجہ میں، اہلیت، صلاحیت، ذہانت، دیانت، محنت، شخصیت کی اعلیٰ اقدار اور اوصاف سے، چشم پوشی کے عمل کے نتیجہ میں، ملک کے تمام ادارے پستی کی انتہاء کو پہنچ چکے ہیں، تمام انتظامی، تعلیمی، عدلیہ کے اداروں کا براحال ہو چکا ہے، اس میں فوری اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ قوم کا ذہین اور اہلیت وصلاحیت کا حامل نوجوان طبقہ، مایوس اور دلبرداشتہ ہوکر بیرونی ممالک میں، تلاش روزگار کے لئے، بتدریج منتقل ہو رہا ہے۔

وائس چانسلر یونیورسٹی کی ذمہ داری

آزاد جموں کشمیر ریاست کے، کالج اور ہائی سکول، پنجاب تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹی لاہور سے منسلک تھے۔ مابعد آزاد کشمیر میں تعلیمی بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پیدا ہوئی۔ صدر حیات نے، کثیر مشاورت کے بعد، یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ کیا، اس میں بھی علاقائی تعصب منظر عام پر آ گیا۔ جس کے دباؤ میں پرنسپل کیمپس مظفرآباد کے علاوہ، زرعی کیمپس راولاکوٹ، انجینئرنگ کیمپس میرپور اور کامرس شعبہ کے کیمپس کوٹلی میں قائم کیے گئے۔ اس طرح وقت کے لحاظ سے یہ دنیا کی بڑی یونیورسٹی بن گئی، جواب چار سے زائد الگ الگ یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ آزاد جموں کشمیر یونیورسٹی کے پہلے چانسلر، صدر حیات خان اور وائس چانسلر، پروفیسر عبدالعزیز سلہریا مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی کے قیام کے دوران مشاورت میں، میں بھی شامل رہ چکا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں، وائس چانسلر سلہریا نے حج پر جانے کی لئے تین ماہ کی رخصت لی۔ چنانچہ ان کی رخصت کے دوران، وائس چانسلر کی اضافی ذمہ داری بھی میرے سپرد ہوئی۔ ابتدائی مرحلہ تھا، ان دنوں چار مقامات پر، چار شعبوں کے بڑے مسائل تھے، تاہم وسائل کے مطابق انتظام وانصرام تسلی بخش طریقہ سے، سرانجام پاتا رہا، جس کیلئے چانسلر، صدر حکومت اور وائس چانسلر، دونوں مطمئن اور معترف تھے۔

چند فیصلے جو عدلیہ کی شہرت اور مجھ پر انتقام کا سبب ثابت ہوئے

عدلیہ کی کلیدی ذمہ داری، ریاست اور عوام اور انفرادی طور پر، عوام کے مابین انصاف کرنا ہے۔ آزاد جمہوری نظام میں، آزاد، خودمختار عدلیہ کو انصاف کرنے میں آسانی اور سہولت ہوتی ہے، مگر غلام یا نیم غلامانہ

نظام میں، اس عمل میں مداخلت، اثر اندازی اور دباؤ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر جیسے چھوٹے علاقہ میں، جہاں جج کی تقرری میں ہائیکورٹ، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان کے صوابدیدی پینل کے بعد، جموں کشمیر کونسل، انٹیلی جنس بیورو، آئی ایس آئی، ایم آئی کی کسوٹی سے نکل کر، وزیر امور کشمیر جو پاکستان اسمبلی کا ممبر ہوتا ہے، کی سفارش پر، وزیر اعظم پاکستان کی، بحیثیت چیئرمین کونسل، حتمی منظوری اور ہدایت پر، صدر آزاد کشمیر جج کی تقرری کا نوٹیفکیشن، صادر کرتا ہے۔ یہ ایک طویل، کٹھن اور الجھاؤ کا حامل ضابطہ کار ہے، اس میں حتمی اختیار وزیر اعظم پاکستان کو حاصل ہے۔ دو بار اس طے شدہ ضابطہ سے ہٹ کر بھرف سادہ درخواست اور صدر آزاد کشمیر کی استدعا پر، بدوں آسامی اور بجٹ کے، قائمقام وزیر اعظم پاکستان نے، جج ہائی کورٹ کی تقرری کی ہدایت جاری کردی، اور دوسری بار وزیر اعظم پاکستان نے، وزیر اعظم آزاد کشمیر کی طرف سے پیش کردہ، سادہ درخواست پر، براہ راست جج سپریم کورٹ کی تقرری کردی۔ عبوری ایکٹ ۱۹۷۴ء سے انحراف کرتے ہوئے ایسا کیا گیا۔ آزاد جموں کشمیر میں، چونکہ آئین ساز اسمبلی کا منظور کردہ آئین نافذ نہ ہے، چند سیاسی جماعتوں کی قیادت کی رائے کے تحت، حکومت پاکستان کی پیشگی منظوری سے، مرتب کردہ اور آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کا، منظور کردہ ایکٹ ۱۹۷۴ء نافذ ہے، جس کے تحت تمام ادارے اور عدلیہ کا شعبہ بھی قائم ہے۔ آزاد حکومت کے قیام کے بعد، ۱۹۵۰ء میں، وزارت امور کشمیر کے مرتب کردہ، اور آزاد حکومت کے نافذ کردہ، رولز آف بزنس کے مطابق، ۱۹۶۰ء تک تمام ادارے چلتے رہے۔ ۱۹۶۱ میں آزاد کشمیر میں عوام کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ صدر حکومت اور قانون ساز کونسل کے انتخابات، پہلی دفعہ ہوئے۔ قانون ساز کونسل کو اسمبلی میں تبدیل کر کے، صدر اور اسمبلی کے انتخابات ۱۹۷۰ء میں ہوئے۔ بنیادی انسانی حقوق اور ہائی کورٹ کی رٹ کے اختیارات کا اضافہ ہوا۔ ہائی کورٹ میں اختیارات کے اضافہ کی وجہ سے، حکومت کے احکامات و انتظامی امور اور اسمبلی میں قانون سازی کا دائرہ کار، قانون اور عبوری دستور کے تابع کر دیا گیا۔ حکومتی اختیارات قانون کے تابع ہونے، بالفاظ دیگر قانون پر عملداری کے اصول کو اپنانے سے، آمرانہ اور استعماری اختیارات محدود ہو کر رہ گئے۔ حکومت کی من پسند طرز حکمرانی اور بے راہ روی کی عادات پر، عدالتی قانونی نگرانی اور احتساب کو ناپسندیدہ قرار دیا جانے لگا۔ عدلیہ پر متوازی حکمرانی اور حکومت کے معاملات میں بے جا مداخلت کے الزام کی آڑ میں، انتقام کے نت نئے حربے بروئے کار لائے جانے لگے، خصوصیت سے عدلیہ کی مالی خودمختاری، نہ ہونے کی وجہ سے، مالی معاملات میں عدلیہ کو لگام دینے کا عمل شروع کیا گیا۔ سول سروس میں، ججز کے رشتہ داروں کو تبادلہ، ترقیابی میں رکاوٹوں کے ذریعے، انتقام کا نشانہ بنانا، معمول بن گیا۔ چیف جسٹس یوسف صراف کہتے کہ آزاد کشمیر میں صرف وہ جج انصاف کر سکتا ہے، جس کا کوئی رشتہ دار سول سروس میں نہ ہو۔ ان کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، مگر کڑی آزمائش سے گذر کر سولہ سال، تین ماہ، تیرہ دن، میں ہزارہا مقدمات کے فیصلے کیے، مگر یہاں صرف، اُن مقدموں کے فیصلوں

کا ذکر کرنا دوسروں کے لئے مفید ہوگا۔ جن کی وجہ سے، آزاد جموں کشمیر عدلیہ کو عالمی شہرت ملی، مگر فیصلہ کرنے والا جج انتقام کا نشانہ بنا رہا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، ہندوستان میں جمعیت العلماء کے محترم راہنما اور برطانوی استعماریت اور آمریت کے خلاف، ہندوستان کی آزادی کے نامور اور شعلہ بیان مقرر تھے، ان کو ''بلبل ہندوستان'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ نماز عشاء کے بعد اور نماز صبح تک تواتر اور تسلسل سے تقریر کرتے، تقریر میں جملہ بازی سے مجمع میں ہنسی اور قہقہوں میں زعفران زار و بہار کا سماں پیدا کر دیتے اور اسی لمحہ تقریر کا دھارا بدل کر، ہنستے ہنستے، قہقہے لگاتے مجمع کو رُلا دیتے۔ باغیانہ تقریروں کے جرم میں، کئی بار جیل گئے۔ تقریر سے متاثر ہو کر، جب واہ واہ کی آوازیں بلند ہوتیں تو از راہ تفنن شاہ جی کہتے ''ہاں جب باغیانہ تقریر سے سرور آتا ہے، تو کہتے ہو' واہ شاہ جی واہ'' اور جب مجھے گرفتار کر کے انگریز جیل بھیجتا ہے تو پیچھے کہتے ہو، جا شاہ جی جا''۔ اسی کے مانند، جب جج عوام کے حق اور حکومت کے خلاف فیصلہ کرتا ہے، تو خوب تعریف ہوتی ہے اور داد ملتی ہے، کہ کتنا اچھا فیصلہ ہوا ہے۔ واہ او جج واہ اور جب حکومت ناراض ہو کر، جج کو انتقام کا عبرتناک نشانہ بناتی ہے، تو وکلاء اور عوام تماشائی بن کر کہتے ہیں '' جا او جج جا''۔ کچھ اسی قسم کی دار و رسن کی منزل سے ہمیں بھی گذرنا پڑا، مگر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی، ہم ثابت قدم رہ کر ہر کڑی آزمائش میں سرخرو ہوئے۔

احمد شمیم کی تنزلی

جنون آزادی میں، سری نگر کی قدیم، علم و ادب کی روح پرور، گل لالہ کی فضاؤں سے نکل کر ہمالہ و پنجال کی برف پوش چوٹیوں اور یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں سے پھسلتا، سنبھلتا، گرتا بھاگتا، بھارتی افواج کی آگ اگلتی بندوقوں سے بچتا، آزاد کشمیر کی فضاؤں میں تن تنہا، خالی ہاتھ، احمد شمیم پہنچا، تو اس وقت آزادی کے شعلے دھیمے پڑ رہے تھے اور ڈوگرہ آمریت کے خلاف اٹھنے والی طوفان کی گرد، ہندوستان کے غاصبانہ تسلط میں، بدل کر سکیورٹی کونسل میں ہونے والے مباحثوں کے اثر میں، بیٹھ رہی تھی۔ اس بدلتی رُت نے، احمد شمیم کو آزاد کشمیر میں واقع، ڈگری کالج میر پور کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ اس میں غنی کاشمیری، مجبور اور آزاد کی شاعری اور للہ عارفہ کے تخیل و سوز کی خودی و روح بستی تھی۔ میر پور کالج، جموں کشمیر اور لاہور کے علم و ادب کے گہوارہ سے، نکلے ہوئے اساتذہ کے، ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ بزم ادب، شعر و سخن کے مشاعروں اور علم و ادب کی محافل منعقد کرنے میں، بہت متحرک اور باعمل تھا۔ احمد شمیم اور اس کے ہمعصر طلباء، نے شاعری میں خوب نام پیدا کیا۔ لاہور سے ایم۔ اے جرنلزم کرنے کے بعد، اس نے محکمہ اطلاعات آزاد کشمیر میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقیاب ہو کر، ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔ حکومت نے نشر و اشاعت کی سہولت کے لئے، ڈائریکٹر کا دفتر، اسلام آباد کشمیر ہاؤس میں قائم کیا تھا۔ اسلام آباد میں احمد شمیم کی نشست و برخاست دفتری اوقات کار کے بعد، پاکستان کے معروف شعراء اور ادیبوں سے ہوتی، جن میں مختار صدیقی، یوسف ظفر، باقی صدیقی، عطا حسین کلیم، منو بھائی اور دیگر شامل تھے۔ آزاد خیال،

جمہوریت پسند نوجوان، بھری محفل میں دوٹوک بات کر دیتا۔ آزاد کشمیر کی سول سروس میں، حسد، چغلی اور خوشامد کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، ملازم لوگ ایک دوسرے کے خلاف، بات سے بتنگڑ بنانے کی، تلاش میں رہتے ہیں۔ احمد شمیم نے لاپرواہی میں، صدر حکومت کی کسی بات کا مذاق اڑایا، بات صدر کو پہنچائی گئی۔ حیات خان فوجی افسر تھا، اس نے احمد شمیم کی تنزلی کا حکم کر کے، اس کو مظفرآباد آفس میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعینات کر دیا۔

احمد شمیم نے تنزلی کا حکم، ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا، چیف جسٹس نے پٹیشن میرے سپرد کر دی۔ میں نے سماعت ابتدائی کے بعد، حکومت کو جواب دہی کے لئے نوٹس جاری کر دیا۔ دوسری تاریخ پر، صدر کی ترغیب میں، جسٹس سید محمد کو بھی میرے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ ہم دونوں نے، اتفاق رائے سے، صدر حکومت کا حکم تنزلی، کالعدم قرار دے کر احمد شمیم کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ فیصلہ میں نے تحریر کیا تھا، جس میں، میں نے استدعا کے مطابق قرار دیا، کہ ''صدر کا حکم میلا فائیڈی یعنی بدنیتی پر مبنی تھا''۔ صدر حیات نے ان دنوں سیاستدانوں کا احتساب شروع کرر کھا تھا۔ اس کے معاونین نے اس کو یقین دلایا، کہ جسٹس ملک نے فیصلہ میں لفظ میلا فائیڈی لکھ کر آپ کو ملزم گردانا ہے اور یہ فیصلہ مستقبل میں آپ کی سیاست میں نااہلی کا باعث بنے گا۔ حیات خان اور اس کے معاونین نے، میرے خلاف پراپیگنڈہ کا محاذ قائم کر دیا۔ اسی دوران ممتاز راٹھور، کے بی خان، حاجی عثمان اور دیگر سیاستدان بھی، میں نے احتساب میں بری کر دیئے، جس کی وجہ سے مجھے سپریم کورٹ میں، ایڈہاک جج مقرر کر دیا گیا۔ احمد شمیم کو مذاق میں، بہت عرصہ تک ''مسٹر میلا فائیڈی'' کہا جاتا رہا۔

سردار ابراہیم خاں کی رہائی

ان دنوں صدر حیات کی حکومت کے خلاف، پیپلز پارٹی، مسلم کانفرنس، آزاد مسلم کانفرنس اور محاذ رائے شماری پر مشتمل، چار جماعتی اتحاد قائم ہو کر، احتجاجی تحریک شروع ہوئی۔ حکومت نے سردار ابراہیم خان کو، ریسٹ ہاؤس لوہار گلی، سردار عبدالقیوم کو، نزول ریسٹ ہاؤس میں، جبکہ چوہدری نور حسین، عبدالخالق انصاری، چوہدری خادم، ریاض انقلابی، عظیم دت، صابر انصاری اور علی محمد چاچا کو، پلندری جیل میں رکھا گیا تھا۔ سردار ابراہیم نے، ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی پٹیشن دائر کر کے، اپنی گرفتاری کو چیلنج کر دیا۔ ہائی کورٹ میں، جسٹس سردار محمد شریف اور جسٹس سید محمد نے، پٹیشن ناقابل سماعت قرار دے کر، خارج کر دی۔ سردار ابراہیم خان نے ہائی کورٹ کا فیصلہ، سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ راجہ خورشید چیف جسٹس نے، اپیل کی سماعت سے معذرت کر کے، اپیل میرے سپرد کر دی۔ میں نے حکومت کو نوٹس جاری کیا، تو دوسرے روز، سردار ابراہیم خان عدالت میں اصالتاً پیش ہوئے اور بحث، خود کرنے کی استدعا کی۔ حکومت نے اس کی سخت مخالفت کی اور سکیورٹی وغیرہ کا عذر پیش کیا۔ چیف جسٹس راجہ خورشید نے بھی، سردار ابراہیم کی اصالتاً حاضری کی اجازت دینے سے، منع کیا اور جوازیت پیش کی، کہ

سردار ابراہیم بہت غصیل تھا اور وہ عدالت میں کارکنوں کے سامنے، صدر حیات پر تنقید کر کے تماشہ لگائے گا، جس سے صدر حکومت اور عدالت کی توہین ہوگی۔ میں نے ان سے اتفاق نہ کیا۔ سردار ابراہیم محبوس تھے، وہ سائل تھے، عدالت کے سامنے اپنا موقف پیش کرنا، ان کا قانونی حق تھا۔ وہ بیرسٹر تھے، تین دفعہ حکومت کے صدر رہ چکے تھے، اور صف اول کے سیاستدان و لیڈر تھے۔ میں نے حکومت کو حکم دیا، کہ سردار ابراہیم کو عدالت میں پیش کیا جائے۔ اس پر حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ پریس میں خبر کو لیڈ دی گئی اور آزاد کشمیر بھر میں شور پڑ گیا۔ ان دنوں پاکستان میں مارشل لاء اور آزاد کشمیر میں ایمرجنسی نافذ تھی، جس وجہ سے اس بات کا زیادہ چرچا ہوا۔ سردار ابراہیم عدالت میں پیش ہوئے، وکلاء اور عوام کورٹ میں اور باہر لان میں جمع تھے۔ بہت سی تماش بین قوتیں تماشہ کی منتظر تھیں۔ سردار صاحب نے نہایت ادب و احترام سے، ہائی کورٹ کے فیصلہ پر، قانونی تنقید کی اور استدعا کی، کہ ہائی کورٹ کو ڈائریکشن دی جائے، کہ ان کی حبس بے جا کی پٹیشن میں اٹھائے گئے، اعتراضات کی روشنی میں، فیصلہ کیا جائے۔ انھوں نے صدر حکومت کی ذات سے متعلق، ایک لفظ تک نہ کہا۔ میں نے تفصیلی سماعت کے بعد، اپیل منظور کر کے، حسب استدعا ہائی کورٹ کو ہدایت جاری کی۔ اپیل کا فیصلہ ہونے کے بعد، حکومت نے سردار ابراہیم اور سردار عبدالقیوم کو چھوڑ دیا۔ پلندری جیل میں محبوس سیاستدانوں کو میں نے دوسرے حکم کے ذریعے آزاد کر دیا۔

چوہدری نور حسین کی رہائی

چوہدری نور حسین، میرپور کی معروف شخصیت تھے۔ وہ مسلم کانفرنس سے سیاسی اختلافات کی بنا پر الگ ہوئے اور الگ سیاسی جماعت بنائی۔ پچاس کی دہائی میں، وزیر تعلیم رہے۔ وہ بہت ذہین اور نڈر لیڈر تھے، مگر ان کی سیاست، جاٹ قبیلہ اور میرپور ڈویژن تک ہی محدود رہی۔ انھوں نے میرپور میں کوآپریٹو بینک قائم کیا تھا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے اتحادی تھے، آزاد کشمیر میں دیگر کوآپریٹو بینکوں کے ساتھ ساتھ، ان کا بینک بھی لیکویڈیٹ کر دیا گیا۔ صدر حیات کی حکومت نے، چوہدری صاحب کے بھائی خادم حسین کو، ان کے ذمہ بینک گارنٹی کی عدم ادائیگی میں، بحیثیت ضامن، گرفتار کر کے، جیل بھیج دیا۔ چوہدری نور حسین نے گرفتاری کو چیلنج کر دیا، مگر ہائی کورٹ نے ان کی پٹیشن خارج کر دی۔ انھوں نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ عبوری دستور اور قواعد کے مطابق، سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت، دو جج صاحبان کرنے کے مجاز ہیں، مگر چیف جسٹس نے یہ اپیل بھی سماعت کے لئے میرے سپرد کر دی۔ شیخ بشارت ایڈووکیٹ، چوہدری نور حسین کی طرف سے پیش ہوئے، مگر جن وجوہات کی بنا پر حکومت کا حکم گرفتاری، چیلنج کیا گیا تھا، ان کی تائید میں ریکارڈ پر، کوئی دستاویزی ثبوت، فراہم نہ کیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے رجسٹرار کوآپریٹو بینک، پیروی کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے بحث کے بعد، میں نے بینک سے متنازعہ گارنٹی طلب کی، جس پر حکومت نے سخت اعتراض کیا، مگر بحیثیت جج، میں نے انصاف کرنا تھا۔ ان دنوں

میر پور میں، چوہدری محمد صادق، رجسٹرار تعینات تھے، ان کو مع ریکارڈ طلب کیا گیا۔ ریکارڈ کی پڑتال پر دیکھا، کہ متعلقہ گارنٹی کی رقم، بینک کو کئی سال پہلے ادا ہو چکی ہوئی تھی۔ چوہدری نور حسین سیاسی انتقام کے تحت کئی ماہ سے جیل میں تھے، میں نے ان کو رہا کیا اور مقدمہ خارج کر دیا۔ اسی دوران مجھے سردار عبدالقیوم اور سردار سکندر حیات کے خلاف، احتساب کے مقدمات میں، ان کے حق میں کیے گئے، فیصلوں کے نتیجہ میں، سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کے عہدہ سے واپس، ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

وزیراعظم ہاؤس میں عشائیہ

محمد خان جونیجو ۱۹۸۵ء میں وزیراعظم پاکستان منتخب ہوئے۔ وہ نہایت شریف، دلیر اور دیانتدار تھے۔ وہ وزیراعظم کی حیثیت سے، نہایت سادہ اور کفایت شعار تھے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور سلیقہ شعار انسان تھے۔ بقول ان کے واقف کار اعلیٰ افسران کے، ان کے ہاں وزیراعظم ہاؤس میں، صرف ایک سالن پکتا۔ گھر میں صرف ایک فریج تھا۔ ضرورت سے زیادہ ملازموں کو، وزیراعظم ہاؤس سے دوسرے شعبوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے کفایت شعاری کا اصول، کابینہ اور اعلیٰ فوجی سروس میں بھی، رائج کیا۔ وہ پہلے وزیراعظم تھے، جس نے فوجی جرنیلوں کے زیر استعمال، بڑی گاڑیاں واپس حاصل کر کے، ان کو ۱۲۰۰ سی سی گاڑیاں استعمال کرنے پر عمل کروایا۔ وہ آخری دیانتدار سیاستدان وزیراعظم تھے۔ انھوں نے دلیرانہ قدم اٹھاتے ہوئے، حزب اختلاف کی سیاسی قیادت کی مشاورت سے، مگر جنرل ضیاء الحق کی رائے کے خلاف، افغانستان میں روس کے خلاف جنگ میں، معاہدہ امن کیا، جس پر ان کو وزارت عظمیٰ سے، مستعفی ہونا پڑا۔ انھوں نے مظفرآباد کا دورہ بھی کیا۔ وہ آزاد کشمیر کے معاملات سے بہت آگاہ رہتے۔ ۱۹۸۵ء میں پاکستان میں پارلیمنٹ کے الیکشن کے بعد، ۶ راپریل کو، آزاد کشمیر کے اسمبلی الیکشن، مئی ۱۹۸۵ء میں منعقد کرانے کا اعلان ہوا۔ جنرل ضیاء الحق کی ترغیب پر، صدر آزاد کشمیر نے، ۲۰ راپریل کو امیدواروں کے جماعتی ٹکٹ جاری ہونے اور نامزدگی مکمل ہونے کے پانچ دن بعد، سیاسی جماعتوں کی انتخاب میں اہلیت اور نااہلیت کا ترمیمی آرڈیننس جاری کر دیا۔ پولیٹیکل پارٹیز آرڈیننس ۱۹۷۴ء میں دفعہ ۸-الف کا اضافہ کر کے، قرار دیا گیا کہ "الیکشن کمشنر کو اختیار حاصل ہوگا، کہ وہ سیاسی جماعت، جو الیکشن میں آزاد کشمیر اور پاکستان (مہاجرین کی مختص سیٹوں) میں، جملہ ڈالے گئے جائز ووٹوں میں سے، ساڑھے بارہ فیصد اور ہر ایک ضلع میں، پانچ فیصد، ووٹ حاصل نہ کر پائے گی، اس جماعت کی رجسٹریشن منسوخ کر دے، جس کے نتیجہ میں، اس جماعت کے ٹکٹ پر الیکشن میں کامیاب ممبر اسمبلی، نااہل قرار پائے گا اور سیٹ سے محروم ہوگا"۔ اسمبلی الیکشن میں، مسلم کانفرنس نے ۲۰ سیٹوں پر، تحریک عمل پارٹی نے ۹، لبریشن لیگ نے ۴ اور آزاد مسلم کانفرنس نے ۲ سیٹوں پر کامیابی حاصل کی مگر اوسط ووٹ حاصل کرنے میں صرف مسلم کانفرنس اور لبریشن لیگ ہی کامیاب ہوئیں، جبکہ تحریک عمل، حیات خان

کی پارٹی اور آزاد مسلم کانفرنس چوہدری نور حسین کی پارٹی، جملہ ڈالے گئے ووٹوں کی ساڑھے ۱۲ فیصد اوسط اور ضلع وار ۵ فیصد اوسط کے مطابق ووٹ حاصل نہ کرسکیں۔ اس طرح ان کو رجسٹریشن کی منسوخی اور کامیاب ممبران کی، نااہلی کا سامنا تھا۔ اہلیت کی ایسی شرط آزاد ممبران پر لاگو نہ تھی۔ سات آزاد ممبر بھی کامیاب ہوئے تھے۔ لہٰذا ہر دو جماعتوں نے رٹ پٹیشن کے ذریعہ، ترمیم شدہ قانون کے نافذ کردہ، اوسط ووٹ حاصل نہ کرنے پر، پارٹی رجسٹریشن منسوخ کیے جانے کی شرائط اور الیکشن کمشن کے اختیار کو آئین اور بنیادی حقوق سے متصادم ہونے اور الیکشن شیڈول کے اعلان اور امیدواروں کی نامزدگی کے بعد، نافذ کیے جانے کو مبنی بر بدنیتی قرار دینے اور دیگر قانونی وجوہات کی بنیاد پر، چیلنج کردیا، کہ ان شرائط کو مسترد قرار دیا جائے۔ فریقین کی جانب سے، پاکستان کے نامور اور معروف وکلاء ایس ایم ظفر، چوہدری اعجاز احمد، خواجہ سعید، ملک محمد قیوم ڈپٹی اٹارنی جنرل پاکستان، ایڈووکیٹ جنرل سردار رفیق محمود، مرزا محمد نثار، سردار سیاب خالد، منظور حسین گیلانی، ایف ایم چوہان اور نیاز علی شاہ، پیش ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر وکلاء بعد میں، پاکستان ہائی کورٹ، سپریم کورٹ اور آزاد کشمیر میں چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ فیصلہ میں، متنازعہ قانونی ترمیم کو، آئین اور بنیادی انسانی حقوق سے متصادم پاکر، مسترد کردیا گیا۔ اس پر وکلاء، عوام اور حکومت کے ایوانوں میں بہت تبصرہ اور چرچا ہوا۔ وزیراعظم پاکستان محمد خان جونیجو کی طرف سے، عشائیہ کے لئے وزیراعظم ہاؤس میں دعوت ملی۔ وزیراعظم ہاؤس میں جناب سردار اقبال، وفاقی محتسب اعلیٰ، جناب اے کے بروہی، معروف قانون دان، جنرل کے ایم عارف کمانڈر انچیف اور کچھ وفاقی وزرا بھی مدعو تھے۔ اے کے بروہی صاحب کی مجھ پر بہت شفقت تھی، وہ ہر محفل میں میری تعریف کرکے بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ اس محفل میں بھی مہمانوں کو مخاطب کرکے، انھوں نے اعلان کے انداز میں کہا، کہ اس وقت ملک میں صرف ایک، عبدالمجید ملک چیف جسٹس ہے، باقی تمام ایکٹنگ چیف جسٹس تھے، اس کی سردار اقبال صاحب نے بھی تائید کی۔ وزیراعظم نے تحریک عمل پارٹی کے فیصلہ کی کاپی حاصل کرکے، فیصلہ پڑھا تھا۔ وہاں معلوم ہوا، کہ چند دن قبل، صدر اور وزیراعظم آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم اور سکندر حیات نے، جونیجو صاحب سے ملاقات میں، میرے خلاف اس فیصلہ کے حوالہ سے تبصرہ کیا، تو جونیجو صاحب نے ان سے پوچھا، کہ کیا انھوں نے فیصلہ پڑھا تھا؟ جواب نفی میں ملنے پر انھوں نے کہا، کہ جسٹس ملک نے فیصلہ کرکے، پاکستان کی سیاست اور جمہوریت کو بچالیا ہے، یہ اس کی قانونی دانش کا، پاکستان پر احسان تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ قانون حقیقت میں پاکستان میں نافذ کرنے کا فیصلہ ہوا تھا، جبکہ آزاد کشمیر میں بطور تجربہ، نافذ کیا گیا تھا۔ عشائیہ پر مدعو کرنے کا مقصد فیصلہ کو سراہنا تھا اور مخصوص مہمانوں کو بھی، اسی وجہ سے، مدعو کیا گیا تھا۔ اتفاق سے عشائیہ جمع کی رات کو تھا۔ آزاد کشمیر میں اور کسی جج کو دعوت نہ تھی۔ نماز جمع کے بعد میں شلوار قمیض اور سلیپر پہنے گاڑی میں بیٹھ گیا، ڈرائیور نے سوٹ رکھ لیا۔ کوہ مری کمپنی باغ پہنچے، تو اچانک ڈرائیور سے دریافت کرتے

پر معلوم ہوا، کہ شوز اور جرابیں گاڑی میں رکھنا، وہ بھول گیا تھا، بہت پریشان ہوئے، کہ شوز کے بغیر دعوت میں کیسے شامل ہوں گا۔ جمع کے دن اسلام آباد میں تمام شوسٹور بند تھے۔ ہم پریشانی میں تمام مارکیٹوں میں گھومتے رہے، اتفاق سے ایک باٹا شوز شاپ کا آدھا شٹر کھلا تھا، ڈرائیور نے اندر جھانک کر، مالکان کو اپنی مشکل کا دکھڑا سنایا، ان کو ہماری حالت پر رحم آیا اور انھوں نے بمہربانی شوز کی مشکل حل کی، ورنہ وزیراعظم منتظر ہی رہتے۔

صدر پاکستان، غلام اسحٰق خان کا ردعمل

مسلم کانفرنس کی حکومت، اپنی جگہ ہائی کورٹ کے فیصلوں، جن میں حکومت کے خلاف آئین و قانون احکامات اور فیصلوں کو، مسترد اور منسوخ کیا گیا تھا، پر پیچ پا اور غصہ میں تھی۔ بالخصوص کرنل نقی خان، کی اسمبلی رکنیت سے نااہل قرار دیے جانے پر، سخت ناراض ہوگئی۔ دوسری طرف، فیصلہ قومی پریس میں شائع ہونے اور میڈیا پر نشر ہونے پر، پاکستان کے صدر، غلام اسحٰق خان نے، فیصلہ کی کاپی منگوا کر، اپنے سیکریٹری کے ذریعے، مجھے فیصلہ کرنے پر مبارکباد دی۔ پاکستان بننے کے بعد، اسمبلی ممبر کے فلور کراس کرنے اور جماعت بدلنے کی بنا پر، نااہل قرار دیئے جانے پر، یہ شاید پہلا فیصلہ تھا۔ کرنل ریٹائرڈ نقی خان، سدھن ایجوکیشن کانفرنس کے موجد اور ڈوگرہ عہد میں قائم ہونے والی اسمبلی میں، تحصیل سدھنوتی پونچھ سے منتخب، پہلے رکن اسمبلی، خان محمد خان کے بیٹے تھے۔ انھوں نے ۱۵رمئی ۱۹۸۵ء کے اسمبلی الیکشن میں حصہ لے کر، تحریک عمل پارٹی کے نامزد امیدوار کی حیثیت میں، پلندری کے حلقہ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مسلم کانفرنس نے اکثریتی پارٹی کے سبب، حکومت قائم کی۔ ۱۹۸۷ء میں اسمبلی الیکشن کے قانون میں، ترمیم کرکے، اسمبلی ارکان پر جماعت بدلنے اور فلور کراس کرنے پر، رکنیت سے نااہل قرار پانے کی شرط عائد کردی گئی۔ ۹رجون ۱۹۸۸ء کو، نقی خان کو، تحریک عمل پارٹی سے مستعفی ہوکر، مسلم کانفرنس، برسراقتدار جماعت میں شامل ہونے پر، وزیر خوراک و صحت مقرر کیا گیا۔ نقی خان کے وزیر مقرر کرنے کے فیصلہ اور حکم کو، میرپور کے نوجوان وکیل، بیرسٹر نورالامین نے، رٹ پٹیشن کے ذریعے چیلنج کردیا۔ عذرداری میں متعدد قانونی اعتراضات اٹھائے گئے۔ کرنل نقی خان کو، مروجہ قانون کے تحت فلور کراس کرنے پر، وزارت اور رکنیت اسمبلی سے نااہل قرار دیا گیا اور عرصہ وزارت کے دوران حاصل کردہ مالی مراعات، واپس کرنے اور قومی خزانے میں جمع کروانے کا حکم بھی دیا گیا۔ اپیل میں فیصلہ ہائی کورٹ بحال رہا، البتہ سپریم کورٹ نے بحیثیت وزیر حکومت، حاصل کردہ، مالی مراعات معاف کردیں۔

محترمہ بےنظیر بھٹو، وزیراعظم پاکستان کا عشائیہ

مسلم کانفرنس کی حکومت، جس کے صدر سکندر حیات اور وزیراعظم سردار عبدالقیوم تھے، نے آزاد کشمیر کی سول سروس میں، حزب اختلاف پیپلز پارٹی کے ساتھ تصفیہ کے تحت، گریڈ بی ۱۷، ۱۸ اور بی ۱۹ میں سینکڑوں لوگوں کی مختلف عہدوں پر، مختلف شعبوں، انتظامیہ اور عدلیہ میں حصہ داری کے تحت، تقرریاں ایڈہاک کے طور پر کردیں۔

پبلک سروس کمشن کی مقرر کردہ شرائط اور طلب کردہ درخواستوں کو، بالائے طاق رکھتے ہوئے، ٹیسٹ انٹرویو منسوخ کر کے، اسمبلی میں ۲۳ر جولائی ۱۹۹۲ء کو مسودہ قانون، ریگولرائزیشن آف ایڈہاک اپوائنٹمنٹ آف سول سرونٹس، پیش کیا گیا جو ۱۸ر اگست ۱۹۹۲ء کو قانون ساز اسمبلی نے بدوں عذر اور بدوں بحث، اتفاق رائے سے منظور کر لیا اور صدر حکومت کی منظوری سے ۱۸ر اگست سے ہی نافذ العمل قرار دے دیا۔ اس قانون کی دفعہ ۳ کے تحت، ایک اندازہ کے مطابق، ۴۶۰ سے زائد ایڈہاک تقرریاں، پبلک سروس کمشن کی سفارش اور سول سرونٹس ایکٹ اور تقرری کے تمام قواعد و ضوابط سے مستثنیٰ قرار دے کر، جائز اور تحت قانون مستقل قرار دے دی گئیں۔ ریکارڈ کے مطابق، اس وقت ہزاروں امیدوار، پبلک سروس کمشن کی پہلے سے مقرر کردہ تاریخوں پر، منعقد ہونے والے امتحان اور کئی سو، انٹرویو کے منتظر تھے۔ ایڈہاک تقرریوں کو مستقل قرار دینے پر، آزاد کشمیر بھر میں شور پڑ گیا۔ ان دنوں سردار عبدالقیوم وزیراعظم، اپنے بیٹے عتیق احمد، کی سیاسی اور حکومتی امور میں، عملی تربیت کر رہے تھے۔ وہ اسمبلی کا رکن بھی تھا، لہٰذا تمام انتظامی امور اس کے سپرد تھے۔ وزرا کو بھی، اپنے معاملات میں عتیق احمد خان سے، ہدایات حاصل کرنے کے لئے، انتظار کرنا پڑتا اور جوتے کمرہ سے باہر اتار کر، دوزانو بیٹھنا پڑتا۔ عوام میں ان تقرریوں کو ''عتیق کمشن تقرریوں''، کا نام دیا گیا تھا۔ کمشن سے مراد سیاستدانوں کا معروف کمشن تھا، اس کو پبلک سروس کمشن بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس قانون کو مختلف امیدواروں نے، ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔

آزاد جموں کشمیر حکومت، اپنی جگہ اسمبلی میں، متفقہ طور قانون منظور ہونے پر، بہت ہی مطمئن تھی اور اس کے قانونی مشیروں نے بھی، تسلی دے رکھی تھی۔ دیگر جج صاحبان کو، ذاتی وجوہ کی بناپر، مقدمہ کی سماعت سے گریزاں پا کر، اکیلے ہی سماعت کی۔ چونکہ فریقین کا تعلق، میرپور اور مظفرآباد سے تھا اور ان کے وکلاء بھی وہاں ہی سے تھے۔ اس وجہ سے سماعت الگ الگ کی، مگر فیصلہ ایک ہی کیا۔ وکلاء کے بیشتر اعتراضات یکسو کرتے ہوئے، متنازعہ قانون کو آئین اور قانون سے متصادم قرار دیتے ہوئے، کالعدم قرار دے دیا۔ اس پر حکومت، ممبران اسمبلی اور مستفید ہونے والے ملازمین تڑپ اٹھے، مگر عوام اور وکلاء نے اس کو تاریخ ساز اور خوش آئند فیصلہ قرار دیا۔ پریس اور میڈیا نے، اس کی خوب اشاعت کی اور نشر کیا۔ اسی دوران وزیراعظم پاکستان، بینظیر بھٹو نے میرے اعزاز میں، عشائیہ کا اہتمام کیا، جس میں پاکستان کے چیف جسٹس، محمد افضل ظلہ اور دیگر تمام جج صاحبان کے علاوہ، مرکزی وزراء، ممبران پارلیمنٹ اور پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے ممتاز حسین راٹھور، اسحاق ظفر اور دوسرے ممبران اسمبلی بھی مدعو تھے۔ آزاد کشمیر کا کوئی اور جج مدعو نہ تھا۔ میرباز کھیتران وزیر امور کشمیر نے، استقبال کیا۔ میری نشست وزیراعظم کے ساتھ، دائیں جانب تھی، باقی تمام مہمان سامنے تشریف فرما تھے۔ وزیراعظم نے روایتی انداز میں، خود میرا تعارف کروایا اور بطور چیف جسٹس میری کارکردگی کی تعریف کی اور خصوصیت سے، ایڈہاک سول سرونٹس کی سروس کے ریگولرائزیشن قانون کو، کالعدم قرار دینے کی بہت تعریف کرتے ہوئے کہا، کہ یہ تاریخ ساز فیصلہ آزاد کشمیر کے عوام پر

احسان تھا۔ جوشِ خطابت میں، محترمہ نے کہا کہ ”ملک صاحب آپ کو تو پاکستان کا چیف جسٹس ہونا چاہیے“، اس پر ظلہ صاحب اور دیگر جج صاحبان نے کروٹ بدلی۔ بی بی نے ممتاز راٹھور، جو قائد حزب اختلاف تھے اور صاحبزادہ اسحاق ظفر سے مخاطب ہو کر کہا، کہ ”آپ سب قیوم خان کے ساتھ مل گئے تھے اور متعلقہ قانون منظور کیا، اگر چیف جسٹس ملک صاحب فیصلہ نہ کرتے، تو مستحق عوام کو ان کا حق کیسے ملتا“۔ میں نے وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا۔ حکومت کی فیصلہ کے خلاف اپیل خارج ہو گئی اور سپریم کورٹ نے فیصلہ کی توثیق کر دی۔

بیٹی کے خلاف فیصلہ

ایڈہاک ملازمین، جن کی سروس مستقل ہوئی تھی، ان چار سو ساٹھ کے قریب مستفید ہونیوالے ملازموں میں، میری بیٹی عذرا مجید بھی شامل تھی، وہ کالج میں گریڈ ۱۸ میں لیکچرر تعینات تھیں۔ حکومت اور ممبران اسمبلی کو اس کا علم تھا، دوسرے جج صاحبان مقدمہ سماعت کرنے سے گریزاں تھے۔ شاید ان کو بھی اپنے اقربا میں سے مستفید ہونے والے ملازمین کے متاثر ہونے کا احتمال تھا۔ تاہم بعد میں، وکلاء سے معلوم ہوا، کہ وکلاء میں اس قسم کی چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں ہوتی رہی تھیں، کہ متنازعہ قانون کو کالعدم قرار دینا مشکل ہوگا، مگر فیصلہ ہونے پر، سرگوشیاں اور بدگمانی کرنے والے، سب ششدر رہ گئے، تاہم میرے لئے خوشی کا مقام تھا۔ کہ میری بیٹی، بیگم اور بچے، سب فیصلہ سے مطمئن، بلکہ مداح تھے۔

سردار سکندر حیات، وزیر اعظم کی نااہلیت

سردار سکندر حیات کی، عمومی اور مستقل رہائش کریلہ مجہان گاؤں ضلع کوٹلی میں ہے، جہاں ان کا نام، ووٹر لسٹ میں ۱۹۶۰ء سے بنیادی جمہوریت کی طرز لوکل گورنمنٹ کے الیکشن کے وقت سے درج تھا اور وہیں سے اسمبلی کے الیکشن میں، ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۵ء میں حصہ لیا اور منتخب ہو کر ۱۹۷۰ء میں وزیر اور ۱۹۸۵ء میں وزیر اعظم منتخب ہوئے تھے۔ اسی دوران ۱۵ رمئی ۱۹۹۰ء کے اسمبلی الیکشن میں حصہ لینے کے لئے کوٹلی ۲، ایل اے ۹ میں، بطور امیدوار کاغذات نامزدگی پیش کیے، مگر ساتھ ہی جموں کے مہاجرین کی مختص اسمبلی سیٹ جموں ۲، ایل اے ۳۴ میں بھی بطور امیدوار، کاغذات نامزدگی پیش کر دیئے۔ اس نے اپنا رہائشی مقام راولپنڈی وارڈ نمبر ۴، مکان نمبر ایف/۸۷۷، سیٹلائیٹ ٹاؤن ظاہر کر کے، جموں-۲ کے حلقہ اسمبلی کی ووٹر فہرست میں اپنا ووٹ اور نام درج کروا لیا۔ اس حلقہ سے الیکشن میں بطور امیدوار حصہ لینے پر اعتراض ہوا، مگر ریٹرننگ افسر اور اپیل میں الیکشن کمشنر نے، اعتراض مسترد کر کے، اس کو دو مقامات پر ووٹ کا حق اور بطور امیدوار الیکشن میں حصہ لینے کا حق تسلیم کر لیا، جسے تین بالمقابل امیدواروں نے، مروجہ قوانین الیکٹورل مختص سیٹوں میں تقسیم اور اسمبلی الیکشن قوانین اور آئین سے متصادم ہونے کی بنیاد پر چیلنج کر دیا۔ چوہدری اختر حسین، سید غلام مجتبیٰ اور غلام صابر پٹیشنرز اور سکندر حیات اور چیف الیکشن کمشنر کی طرف سے

پاکستان اور آزاد کشمیر سے نصف درجن سے زائد وکلا نے، بحث میں حصہ لیا۔ مروجہ قانون کے تحت اور آئین میں مقرر کی گئی سیٹوں، امیدواروں کی اہلیت اور نااہلیت کی روشنی میں فیصلہ صادر ہونا تھا۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن میں مکان نمبر الف/۸۷۷ حمید اختر بیگ اور نجمہ حمید اختر بیگ کی ملکیت اور رہائش گاہ تھا، جس کے پتہ پر ان دونوں کا نام بطور ووٹر، فہرست میں شامل تھا۔ سکندر حیات کا نام اپنے گاؤں کی ووٹر فہرست میں شامل تھا، جہاں سے وہ اس سے قبل انتخابات میں حصہ لے چکا تھا، جس وجہ سے، وہ مہاجرین جموں مقیم پاکستان کی سیٹ پر الیکشن لڑنے کا اہل نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے یہی فیصلہ کیا، جو اپیل میں سپریم کورٹ نے بھی بحال رکھا، سکندر حیات کی طرف سے، ایس ایم ظفر، ملک اسلم، راجہ خورشید سابق چیف جسٹس اور ریاض اختر چوہدری پیش ہوئے، جبکہ مخالف وکیل آغا عاشق حسین نے پیروی کی۔ سکندر حیات وزیراعظم تھے، انھوں نے اس فیصلہ کو اپنی توہین سمجھ کر، ہمارے خلاف خوب تنقید کی، ان کو بلاوجہ میرے خلاف اشتعال تھا، حالانکہ سپریم کورٹ نے بھی ہمارے ساتھ اتفاق کیا تھا۔

گلگت بلتستان کی حیثیت کا تعین

ریاست جموں کشمیر کی جدید حیثیت، برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان معاہدہ امرتسر کے تحت، ابتدا میں متعین ہوئی، جس کے بعد گلاب سنگھ اور اس کے بعد رنبیر سنگھ، اس کے بیٹے نے، گلگت اور شمال مغرب میں ہنزہ، نگر، یاسین کوہ غذر، اشکومن اور چیلاس کو بھی ریاست میں شامل کر لیا۔ چترال بھی ریاست کا حصہ رہا، جو زار روس کی اس طرف پیش قدمی پر، انگریز حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ گلگت اور ملحقہ علاقہ کا رقبہ ۱۴۶۸۰ مربع میل شامل کر کے، ریاست کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل بنتا ہے۔ اسی طرح ۱۹۱۱ء، ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں بھی، یہ علاقہ جموں کشمیر کا حصہ ظاہر کیا گیا ہے۔ برطانوی حکومت نے وسط ایشیا میں روس کے بڑھتے ہوئے اثر کے دفاع میں، مہاراجہ سے ایک معاہدہ کے تحت ۲۹ ر مارچ ۱۹۳۵ء کو یہ علاقہ جزوی طور پر، ۶۰ سال مدت کے لئے لیز یعنی پٹہ پر حاصل کیا، مگر ہندوستان و پاکستان کی آزادی پر، انتقال اقتدار کے قانون آزادی ہند کے نفاذ پر، ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے دن سے تاج برطانیہ اور ریاستوں کے حکمرانوں کے مابین ماضی میں ہونے والے تمام معاہدے ساقط قرار پائے اور ریاستی عوام، آزاد اور خود مختار اقتدار اعلیٰ کے مالک بن گئے۔ اس قانون کے تحت، معاہدہ گلگت ساقط ہونے پر، مہاراجہ نے بریگیڈیئر گھنسارہ سنگھ ڈوگرہ کو، گلگت کا گورنر مقرر کیا، جس نے برطانوی کمانڈر سے چارج حاصل کیا۔ گھنسارہ سنگھ کو، کرنل حسن مرزا نے اپنی نفری اور گلگت سکاؤٹس کی مدد سے گرفتار کر کے، یکم نومبر کو آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور ۴ر اکتوبر اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائم ہونے والی عبوری آزاد کشمیر حکومت سے، اس کو منسلک کر دیا گیا۔ جب سیکیورٹی کونسل میں ریاست میں رائے شماری کروانے کا فیصلہ ہوا، تو یواین کمشن نے سری نگر، مظفر آباد، گلگت اور میرپور کا دورہ کیا اور رائے شماری کا ناظم اعلیٰ بھی مقرر ہو گیا، تو ۲۸ر اپریل ۱۹۴۹ء کو وزارت

امور کشمیر کے وزیر بے محکمہ، نواب مشتاق احمد گورمانی، صدر آزاد کشمیر حکومت اور صدر مسلم کانفرنس کے درمیان، انتظامی امور معاہدہ کے تحت، امور خارجہ، دفاع، آزاد افواج، تحریک آزادی، مسئلہ کشمیر، مالیات اور گلگت بلتستان سے متعلق تمام امور، حکومت پاکستان نے حاصل کر لیئے۔ تب سے اس خطہ میں، نوکر شاہی کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ لوگ آزادی، انسانی حقوق اور مراعات سے بھی محروم ہو گئے۔ آئین، عدلیہ اور مقننہ سے محروم عوام نے، پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ میں حق رسی کی جستجو کی، مگر محروم رہے اور حکمرانوں تک رسائی نہ ملی۔ اس پس منظر میں، ضلع دیامیر، تحصیل داریل تانگیر، کے ملک محمد مسکین، جو بعد میں سپیکر اسمبلی منتخب ہوئے، حاجی امیر جان، سابق کونسلر تانگیر نے مظفرآباد کے سینئر وکیل، شیخ عبدالعزیز، نائب صدر لبریشن لیگ کی شمولیت میں، ہائی کورٹ مظفرآباد میں، رٹ پٹیشن دائر کر کے، معاہدہ ۲۸ر اپریل ۱۹۴۹ء کی منسوخی اور گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر میں شامل کرنے، قانون ساز اسمبلی جموں کشمیر و عدلیہ وانتظامیہ میں شراکت اور ہر قسم کے انسانی حقوق اور آزادیوں کو بحال کرنے اور تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں شراکت کی استدعا کی۔ سیاسی جماعتوں کے علاوہ حکومت پاکستان اور حکومت آزاد جموں کشمیر کو مقدمہ میں فریق بنایا گیا۔ حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر نے اپنے جواب میں یہ تسلیم کیا تھا، کہ علاقہ گلگت ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہے، مگر بقول ان کے، یہ آزاد کشمیر کا حصہ نہ تھا، لہٰذا ہائی کورٹ کو اختیار سماعت حاصل نہ تھی۔ اس اعتراض کے جواب میں، آزاد کشمیر حکومت کے قیام کے اعلامیہ، معاہدہ منتقلی انتظام گلگت، منجانب صدر آزاد حکومت، پاکستان چین عبوری معاہدہ تعین حدود ۲ر مارچ ۱۹۶۳ء اور عبوری ایکٹ ۱۹۷۴ء کی تجزیاتی تشریح فیصلہ کے پیرا گراف ۱۰۵ تا ۱۴۸ میں متعلقہ قانونی حوالہ جات کے بشمول دیا جا کر، پاکستانی اور ہندوستانی حکومتوں اور افواج کے، رائے شماری کے وقت کے تابع، عبوری قیام اور اختیارات کا مفصل احاطہ کر کے، عدالت کے اختیار سماعت مقدمہ کو جائز قرار دے کر، حکم دیا گیا، کہ عبوری معاہدہ ۲۸ر اپریل ۱۹۴۹ء، اپنی افادیت کھو چکا تھا، لہٰذا حکومت پاکستان شمالی علاقہ کا انتظام وانصرام، حکومت آزاد کشمیر کے سپرد کرے اور آزاد حکومت انتظام سنبھال کر، اس علاقہ کے عوام کو آزاد کشمیر کے قومی اداروں، انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ وغیرہ میں مساویانہ حقوق اور نمائندگی دے اور تمام ادارے اس علاقہ میں قائم کرے۔ فل بینچ کا فیصلہ ۷۴ صفحات پر مشتمل تھا، جو ۸ر مارچ ۱۹۹۳ء کو سنایا گیا، تو حکومتوں میں بھونچال آ گیا۔ قومی اور بین الاقوامی پریس اور نشریاتی میڈیا نے اس کی خوب تشہیر کی۔ آزاد کشمیر عدلیہ کو عالمی سطح پر شناخت ملی۔ ۱۹۹۳ء میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے، آزاد کشمیر ہائی کورٹ کو انسانی حقوق کے تحفظ اور آزادیوں کی بحالی میں، سر فہرست اول پوزیشن دی۔ یہ فیصلہ عدلیہ کی شہرت کا مینار بن گیا۔

صدر فاروق لغاری کا ردعمل

صدر فاروق لغاری، ایک ماہ بعد مظفرآباد دورہ پر تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں صدر سکندر حیات کی

رہائش گاہ پر ظہرانہ تھا، جس میں ایک سو کے قریب، مہمان شامل تھے۔ ان سے میری پہلے سے شناسائی تھی۔ پنڈال میں ان سے بائیں، چوتھے نمبر پر میری نشست تھی۔ ساتھ ہی جسٹس سید محمد، وزیر اعظم سردار عبدالقیوم درمیان میں تھے۔ ان کی آمد اور ملاقات کے بعد، نشست پر بیٹھتے ہی وہ بلند آواز میں مجھ سے ہم کلام ہوئے اور کہا کہ ''ملک صاحب، آپ کا گلگت سے متعلق فیصلہ سیاسی ہے یا قانونی''؟ میں نے بھی اتنی ہی بلند آواز میں مخاطب ہو کر کہا کہ ''فیصلہ قطعی قانونی اور صحیح ہے''۔ اس پر سب مہمان میرے بے باک انداز جواب پر متعجب ہوئے۔ سید محمد نے دھیمے سے، داد دینے کے انداز میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ''یار بہت بے باک ہو''۔ سردار سکندر اور سردار عبدالقیوم میری طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

وزیر اعظم بے نظیر کا غصہ

بے نظیر، گلگت کے فیصلہ پر سخت ناراض اور غصہ میں تھیں۔ نوکر شاہی کے چند لوگوں اور میرے خلاف حاسد افراد، جن کے سامنے اس نے میرے اعزاز میں عشائیہ میں بہت تعریف کی تھی، انہوں نے خوشامدانہ انداز میں اس کے خوب کان بھرے، کہ اب گلگت پاکستان کے قبضہ سے نکل جائے گا اور چین سے پاکستان کا زمینی رابطہ، کٹ جائے گا۔ اس باشعور خاتون نے بھی جذبات میں آ کر، وزیر قانون اقبال حیدر کو حکم دیا، کہ فیصلہ کے خلاف فی الفور اپیل دائر کرواور جیسے بھی ہو، سپریم کورٹ سے فیصلہ منسوخ کرواؤ۔ چنانچہ ہر دو، حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر نے الگ الگ اپیل دائر کی۔ سپریم کورٹ میں جسٹس سید محمد، جسٹس بشارت احمد شیخ اور ایڈہاک جج چوہدری محمد تاج نے اپیل منظور کر کے، اس نکتہ پر کہ ایکٹ ۱۹۷۴ء کی دفعہ '۲' میں دی گئی تعریف کے تحت، گلگت بلتستان، گوریاست جموں کشمیر کا حصہ ہے، مگر عوام کے آزاد کردہ علاقہ آزاد کشمیر کا، حصہ نہیں ہے، لہٰذا اس علاقہ کے متعلق ہائی کورٹ کو اختیار سماعت حاصل نہ تھا۔ بقول جسٹس محمد تاج، اپیل دائر ہونے کے بعد سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سید محمد اور دیگر کو، وزیر قانون پاکستان، اقبال حیدر نے فون کر کے ہوٹل پرل کانٹیننٹل بھوربن کوہ مری مدعو کیا۔ جسٹس محمد تاج بھی ساتھ موجود تھے، وہاں اقبال حیدر نے وزیر اعظم بے نظیر کا فیصلہ سنایا، کہ گلگت کے متعلق جسٹس ملک کے فیصلہ کو ہر صورت بدلنا ہے، یہ وزیر اعظم کا حکم تھا۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے، باقی تمام فیصلہ سے اتفاق کر کے، مختصراً نکتہ اختیار سماعت پر فیصلہ منسوخ کر دیا۔ اقبال حیدر نے تین چار دفعہ مختلف اوقات میں، ٹیلی ویژن پر گفتگو اور انٹرویو میں، فخر کے لہجہ میں میرا نام لے کر اور ہائی کورٹ کا ذکر کر کے کہا، کہ انہوں نے گلگت سے متعلق فیصلہ، بہت کوشش سے بدلوایا ہے، مگر جسٹس محمد تاج، کئی بار عام محفل میں بھوربن پی سی میں چیف جسٹس اور ججز کی وزیر قانون سے ملاقات میں، وزیر اعظم بے نظیر کا فرمان سن کر، چہروں کے تاثرات اور بدلتے رنگوں کی کیفیت، مزہ لے لے کر، بتاتے رہتے ہیں۔

سپریم کورٹ پاکستان میں تبصرہ

جسٹس راجہ افراسیاب کا تعلق مقبوضہ علاقہ راجل، نوشہرہ، جھمبر سے ہے۔ انہوں نے لاہور میں وکالت شروع کی اور لاہور ہائی کورٹ میں جج مقرر ہوئے۔ بعد میں جج سپریم کورٹ مقرر ہوئے۔ ان کی شادی بھی میرپور میں ہی ہوئی ہے۔ وہ میرپور تشریف لائے اور بہت رازداری میں کہا، کہ وہ خاص معلومات کی غرض سے آئے تھے اور وجہ بتاتے ہوئے کہا، کہ اگلے روز سپریم کورٹ اسلام آباد میں، ایک مقدمہ میں گلگت سے متعلق آپ کے فیصلہ کا حوالہ دیا گیا تھا، مگر جب وہ فیصلہ پڑھا، تو تمام جج صاحبان کو تجسس ہوا، کہ آپ نے گلگت جیسے حساس علاقہ کے متعلق جب فیصلہ کیا، تو حکومت اور انٹیلی جنس کی ایجنسیوں نے آپ کو رو کا یا دباؤ نہیں ڈالا۔ میں ان کی گفتگو سنتا رہا اور آخر میں ان کے سوال کا جواب انہیں سے پوچھا، کہ آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے۔ انہوں نے پھر کہا، کہ میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ میں نے ان کو بتایا، کہ جب سے میں جج مقرر ہوا، تب سے اس فیصلہ تک، اور اس کے بعد بھی کبھی کسی حکومت، یا فوج یا خاص اداروں یا ان کے سربراہ نے بلواسطہ یا بلاواسطہ عدلیہ میں فرائض کی بجا آوری اور مقدمات کے فیصلہ میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ ایسا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سن کر وہ حیران رہ گئے اور کہا، کہ فیصلہ خود بھی اسی کریکٹر کی گواہی دیتا ہے، جس پر تمام جج خوش تھے، مگر حیران تھے۔

فیصلہ کی تشہیر

پاکستان لیگل میگزین میں فیصلہ شائع ہونے کے علاوہ، انسانی حقوق کی تنظیم کے سربراہ، میاں ممتاز حسین نے ملائیشیا کی پریس میں فیصلہ کی پانچ ہزار نقول، کتابی شکل میں چھپوا کر، امریکہ، یورپ، برطانیہ، پاکستان اور آزاد کشمیر، گلگت بلتستان کی لائبریریوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں تقسیم کیں، بالخصوص وکلاء اور طلبا میں اس کی بہت مانگ رہی۔

چوہدری یٰسین کی اومنی بس ضمانت

مسلم کانفرنس کی حکومت میں وزیر تعلیم، راجہ محمد اکرم کے حلقہ انتخاب سے، ان کے مدمقابل ایک یٰسین نامی نوجوان، حلقہ چڑہوئی کوٹلی میں انگلینڈ سے واپس لوٹ کر، مقامی سیاست میں متحرک ہو رہا تھا۔ اس کا تعلق جاٹ قبیلہ سے ہے اور سیاسی وابستگی پاکستان پیپلز پارٹی آزاد کشمیر سے ہے۔ بعد میں وہ ممبر اسمبلی منتخب ہو کر اول وزیر، بعد میں سینئر وزیر بھی بنا۔ شروع میں وہ غیر معروف تھا۔ ان دنوں مسلم کانفرنس کی حکومت نے، اسے بجلی پول چھین کر لے جانے، چوری اور کارکنوں پر حملہ اور قتل کی کوشش جیسے جرائم میں ملوث کر کے، گرفتار کروا دیا۔ ماتحت عدالتوں میں جرائم کی سنگین نوعیت کی وجہ سے، ضمانت نامنظور ہوئی۔ شریعت کورٹ میں، اپیل میں ملزم کے وکیل نے اضافی درخواست دے کر اصرار کیا کہ سماعت میں خود کروں۔ بظاہر تو کوئی خاص وجہ میرے خود سننے کی نہ تھی، تاہم میں نے سماعت شروع کی اور ملزم کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ پولیس نے کافی تاخیر سے ملزم کو پیش کیا اور وضاحت

کی، کہ کوٹلی سے، میر پور کے درمیان حکمران جماعت کے کارکنوں نے راستہ روک رکھا تھا اور خطرہ تھا، کہ وہ ملزم پر حملہ کر کے قتل کر دیں گے۔ جس وجہ سے کوٹلی سے کہوٹہ اور راولپنڈی سے دینہ کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے، تاخیر ہو گئی تھی۔ ملزم کے وکیل اور پولیس سے دریافت پر معلوم ہوا، کہ ملزم کے خلاف مزید الزامات کی درخواستیں بھی التوا میں پڑی تھیں۔ اس مقدمہ میں ضمانت ہونے پر، دیگر مقدمات میں اس کی گرفتاری زیر تجویز تھی۔ سماعت کے بعد مقدمہ متعلقہ کے علاوہ، دیگر مقدمات میں اومنی بس ضمانت کا حکم دے کر، حکم دیا کہ آئندہ کسی بھی جرم میں، ملزم محمد یٰسین کو اس عدالت کے علم میں لائے اور اجازت کے، بغیر گرفتار نہ کیا جائے۔ اس سے قبل، آزاد کشمیر میں ایسے کسی حکم کی کوئی مثال نہ تھی اور نہ ہی بعد میں اب تک، کوئی حکم صادر ہوا۔ البتہ پاکستان میں سردار محمد اقبال چیف جسٹس لاہور نے، مسٹر محمد حنیف رامے کی گرفتاری پر، ضمانت منظور کرتے ہوئے، ایسا حکم صادر کیا تھا، مگر حنیف رامے، معروف دانشور، سابق وزیر اور نامور سیاستدان تھا۔ یٰسین کو تو مقامی سطح پر بھی کم ہی لوگ جانتے تھے، مگر حکمران پارٹی اور وزیر کے آمرانہ رویہ کے خلاف، عام شہری کی آزادی کے حق کو، برابری کے اصول پر، قانون اور انصاف کا تحفظ فراہم کرنا اعلیٰ عدالت کا فرض تھا، نہ کہ احسان۔ اس پر قانون کی عملداری اور انصاف کے تقاضوں سے لاعلم اور ناواقف حکمرانوں نے بہت تنقید اور واویلہ کیا، مگر قانون اور انصاف کا عمل جاری رہا۔

معرکۃ الآرا فیصلہ، ریاست کے عوام کے حقوق اور حیثیت

معروف اور قومی اہمیت کے فیصلوں میں، مقدمہ ایوب عزیز وغیرہ بنام جموں کشمیر کونسل وغیرہ قابل ذکر ہے۔ سرینگر کے شہری ایوب عزیز، ان کی بیگم اور بچے پاکستان میں ویزہ پر آئے۔ ان کو ۱۸ مارچ ۱۹۹۴ء کو ایک ماہ کا ویزہ جاری ہوا۔ معیاد ختم ہونے پر انھوں نے پاکستان میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی اجازت طلب کی، جو نا منظور ہوئی اور واپس جانے کا حکم ہوا۔ وہ مظفرآباد پہنچے اور ہائی کورٹ میں پٹیشن دائر کی، کہ وہ مظفرآباد رہنا چاہتے تھے۔ بحیثیت باشندہ ریاست یہاں مستقل رہائش اختیار کرنا، ان کا حق تھا، جس کی اجازت طلب کی گئی۔ حکومت پاکستان اور آزاد جموں کشمیر کے مؤقف کی سماعت کے بعد، ریاست جموں کشمیر کے عوام کے سٹیٹس اور حیثیت، قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء، سیکیورٹی کونسل و یو۔ این کمشن کی قراردادوں کی روشنی اور تجزیہ کے تحت، قرار دیا، کہ ریاست جموں کشمیر کی سیاسی، قانونی اکائی قائم ہے۔ جنگ بندی معاہدہ صرف ہندوستان و پاکستان کی متحارب افواج کے درمیان ہے، نہ کہ دو حصوں میں فوجی تسلط کے تحت منقسم عوام میں۔ ریاست کے عوام کو پوری ریاست میں نقل وحمل اور آنے جانے، تجارت کرنے، نقل مکانی کرنے کا مکمل حق اور اختیار حاصل ہے۔ لہٰذا ایوب عزیز وغیرہ کو مظفرآباد اور ریاست کے ہر حصہ میں رہائش کا حق اور اختیار حاصل ہے۔ حکم دیا کہ پاکستان حکومت، جموں کشمیر کونسل اور آزاد حکومت ایوب عزیز اور ان کی فیملی کو مظفرآباد سے بے دخل کر کے سرینگر جانے کا حکم دینے سے ممنوع رہے۔ فیصلہ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ء کو

صادر کیا گیا، جو اَب تک قائم ہے اور پی ایل ڈی اے جے کے صفحہ-۱ پر رپورٹ شدہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد، ریاست جموں کشمیر کی جغرافیائی اکائی، سیاسی و قانونی وحدت اور باشندگان ریاست کا ریاست کے کسی حصہ میں، رہائش اختیار کرنے یا بالخصوص دو حصوں میں منقسم دو حکومتوں کے زیر انتظام علاقوں میں نقل مکانی کی وجہ سے حق اور حیثیت کے تعین کا، یہ پہلا عدالتی فیصلہ ہے۔

حکومت خائف کیوں؟ سردار عبدالقیوم کا استفسار

مسلم کانفرنس، آزاد جموں کشمیر کے باضابطہ قیام ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۷ء سے نامزد ہو کر، وزارت امور کشمیر کے زیر نگرانی، عوام پر مطلق العنان اور مختار کل کی حیثیت سے حکمران اور مسلط تھی۔ ڈوگرہ عہد میں، عوام کو ووٹ کے ذریعے قانون ساز اسمبلی منتخب کرنے کا، جو حق ۱۹۳۴ء میں حاصل تھا۔ آزادی ملنے اور ڈوگرہ حکمران کی آمریت ختم ہوتے ہی، ووٹ کے حق سے عوام کو محروم کر دیا گیا تھا اور ڈوگرہ ہندو قبیلہ کے جانشین، مسلمان قبائل بن گئے، یہ سلسلہ ۱۹۶۰ء تک چلتا رہا۔ جب پاکستان میں دستور اور جمہوریت کی بساط لپیٹ کر مارشل کا نفاذ تھا، تو لوکل گورنمنٹ کے قیام کی شکل میں بنیادی جمہوریت کا نظام نافذ ہوا، اور آزاد کشمیر میں کے ایچ خورشید صدر مقرر ہوئے، تو یہاں کے عوام کو ووٹ کا حق ملا اور ایک منتخب قانون ساز جموں کشمیر کونسل قائم ہوئی، جس میں اسحاق بلتی، گلگت بلتستان کا ممبر بھی شامل تھا اور ۱۹۶۰ء میں پہلی دفعہ منتخب بی ڈی ممبران کے ووٹ کے ذریعہ، الیکشن میں، صدر کا چناؤ ہوا۔ اسمبلی ۱۹۷۰ء میں قائم ہوئی اور عبوری دستور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۴ء میں نافذ ہوا۔ من مانی کارروائی اور احکامات جاری کرنے کی عادی، مسلم کانفرنسی حکومت کے جب دستور اور قانون کے مغائر احکامات، عدالت میں چیلنج ہوئے اور کالعدم قرار دیئے گئے، تو حکومت پریشان ہو گئی۔ ایک تقریب میں، تمام جج صاحبان، وزراو غیرہ کی موجودگی میں، مجھ سے مخاطب ہو کر سردار قیوم نے کہا، کہ ''ملک صاحب کیا وجہ ہے کہ حکومت آپ سے خائف رہتی ہے''؟ میں نے یوں ہی جواب دیا۔ ''دراصل میری شکل ہی خوفناک ہے''۔ اس پر قہقہہ بلند ہوا، تو صدر صاحب نے کہا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہے، آپ خوش شکل اور خوش مزاج ہیں''۔ دوسری دفعہ ایک تقریب تھی، جس میں وزیر اعظم سکندر حیات بھی تھے۔ دوران گفتگو سردار عبدالقیوم نے، پھر وہی سوال کیا، کہ کیا وجہ ہے، کہ حکومت آپ سے خائف رہتی ہے؟ میں نے کہا کہ ''یہ سوال تو آپ حکومت سے کریں، کہ وہ کیوں خائف ہے''؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ چیف سیکریٹری کے بقول، وزیر اعظم تمام وزیروں سے کہتے ہوئے سنے گئے کہ ''انتظامی احکامات ضابطہ اور قانون کے مطابق جاری کیا کریں، ورنہ چیف جسٹس اوپر بیٹھا ہوا ہے، وہ چلنے نہیں دے گا''۔ ایسی ہی شکایت پر غالباً، سردار عبدالقیوم نے دوبار یہ استفسار کیا تھا، کہ حکومت آپ سے خائف کیوں ہے''؟

حکومت کے انتقام کی ابتدا

جج ہائی کورٹ مقرر ہونا، کبھی سوچا نہ تھا، البتہ بحیثیت شہری، احترامِ انسانیت کے جذبہ اور احساس کے تحت، آزادی کی جدوجہد میں، نوعمری میں ہی متحرک ہوگیا تھا، اسی احساس کے تحت، عوام کو صحیح اور فوری انصاف کے تحت، دادرسی کرنے والے عدلیہ کے ادارہ کے قیام کی آرزو مند تھی۔ تاہم عدلیہ میں تقرری پر، میں نے اپنے آپ سے، کئی بار سوال کیا کہ، عام شہری کو عدل وانصاف کیسے مہیا کیا جائے۔ برفانی ہواؤں میں آگ تاپنے کی خواہش پالنے کے خیال نے، عدل وانصاف کی انگاروں بھری بھٹی پر لا کھڑا کیا۔ آگ کے شعلوں سے دامن بچا کر گذرنا، کٹھن آزمائش تھی، مگر حکمران اپنی نمود ونمائش میں، میری آزمائش سے بے پرواہ، عوام کے حقوق اور قانون کی عملداری کو روندتے ہوئے، من پسند حکمرانی کے لئے بضد تھے، ورنہ ناپسندیدگی کی اور کوئی وجہ نہ تھی۔ میرا انداز، ایک لحاظ سے، نامزد صدر جنرل حیات کو، جب احتساب کے مقدموں کے فیصلوں میں پسند نہ آیا، تو نوکر شاہی کے اکسانے پر، ہائی کورٹ سے ایڈہاک جج کے طور سپریم کورٹ میں بھیج دیا گیا، میں نے استعفیٰ دیا، تو مسترد کر دیا گیا۔ ان کے بعد جنرل عبدالرحمن صدر نامزد ہوئے، تو سپریم کورٹ سے واپس ہائی کورٹ میں لایا گیا۔ ان کی صدارت کی مدت میں، آزاد جموں کشمیر عدلیہ کی شناخت کے لئے مختلف اقدامات کیے، جس کے بعد، منتخب جمہوری حکومت مئی ۱۹۸۵ء میں وجود میں آئی۔ آزاد کشمیر میں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء کے بعد بالغ رائے دہی کے تحت، اسمبلی اور صدر کے عہدہ کے الیکشن ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں پارلیمانی نظام کے قیام کے بعد، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۵ء میں الیکشن ہوا۔ سردار عبدالقیوم صدر کے عہدہ پر اور سردار سکندر حیات، وزیراعظم منتخب ہوئے تھے۔ جج مقرر ہونے سے قبل، میں لبریشن لیگ میں سیکریٹری جنرل تھا۔ مسلم کانفرنس میں یہ سوچ تھی، کہ سیاستدانوں کا احتساب کرنے اور سیاست میں ان کو نااہل قرار دینے کی غرض سے، مجھے جج فائز کیا گیا تھا۔ حالانکہ سب کے علم میں تھا، کہ میں نے جج بننے سے انکار کر دیا تھا، اور اس کے باوجود میری تقرری کر دی گئی تھی۔ جج مقرر ہو کر مقدمات میں فیصلے کیے جانے کے بعد، ان کی پہلی غلط فہمی تو دور ہوگئی، مگر صحیح فیصلے کرنے، عدالت میں احترام اور اخلاق کا رویہ اختیار کرنے اور عدالتوں اور وکلاء کے لئے چیمبرز کی تعمیر کرنے پر، جونہی شہرت ملی، وہ قابل قبول نہ تھی اور اس سے حسد کی نئی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ دوسری جیوڈیشل کانفرنس میں، صدر اور وزیراعظم، دونوں بطور مہمان خصوصی مدعو کیے اور عدلیہ کی سابق کارگذاری پر، انھوں نے نہ چاہنے کے باوجود بہت تعریف کی۔ سردار عبدالقیوم، بہت روادار، مہمان نواز اور وضع دار انسان تھے، ان میں یہ خوبی تھی، کہ جب بھی بیرون ملک سے سفارت کار، دانشور اور وفود ان سے ملنے آتے وہ اپنے مخصوص مشیروں کے علاوہ، مجھے بھی ضرور دعوت دیتے اور کھل کر تبادلہ خیال کرتے۔ ان سے متعلق مزید واقعات سیاست کے باب میں زیر تحریر لائے جائیں گے۔

سردار سکندر حیات کے والد سردار فتح محمد خان سے، جب میں سکول میں طالب علم تھا، تب سے واقفیت تھی۔ سکندر حیات سے، لاہور لاء کالج میں، راجہ صدیق اور راجہ مقصود کے ذریعے تعارف ہوا۔ یہ ایک سال پیچھے تھا، وکالت کے دوران مزید تعلق بڑھا۔ ان کی شادی میں بارات کے ساتھ گوجرانوالہ گیا۔ اس وقت میر پور میں صرف میرے پاس کار تھی۔ اپنی کار میں، ان کی دلہن کو کوٹلی ان کی رہائش گاہ پہنچایا۔ ان کے والد ایک دفعہ سخت بیمار تھے۔ میں ان کی عیادت کے لئے گیا، تو کوٹلی کے وکلاء خواجہ منظور اور عبدالقیوم قادری کی موجودگی میں، سکندر حیات کا بازو پکڑ کر میرے ہاتھ میں دیا اور کہا، کہ سکندر کا خیال رکھنا۔ یہ صرف تعلقات کی نوعیت بتانے کے لئے ظاہر کیا ہے۔ سکندر حیات نے، سب سے اول وزیراعظم بنتے ہی، وکلاء چیمبرز کی تعمیر کے ٹھیکیداروں، جن کا تعلق مسلم کانفرنس سے تھا، شیخ ظفر یعقوب اور کیپٹن سرفراز کو بلا کر دریافت کیا، کہ ٹھیکہ میں جسٹس ملک کو کتنا کمیشن دیا تھا؟ انھوں نے کہا کہ ٹھیکہ محکمہ تعمیرات عامہ نے دیا تھا اور ادائیگی بھی اسی محکمہ نے کی تھی۔ جسٹس ملک تو صرف تعمیر کی انسپکشن کے لئے آتے اور ہدایات دیکر چلے جاتے تھے، اس کے علاوہ ان کا کوئی تعلق نہ دیکھا تھا۔ تسلی نہ ہونے پر محکمہ کے افسران سے بھی تحقیقات کی۔ اس وقت کوٹلی میں وکلاء چیمبرز کی تعمیر ہو چکی تھی، اور افتتاح ہونا تھا، جو میں نے خود، یا سردار عبدالقیوم سے کروانے کا طے کیا تھا۔ اسی دوران سکندر حیات نے، اپنے پرنسپل سیکریٹری، خلیل قریشی کو میرے پاس روانہ کیا اور خواہش ظاہر کی، کہ کوٹلی اس کا شہر ہے، اس لئے چیمبرز کا افتتاح اس سے کروایا جائے۔ خلیل قریشی دوست تھا، اس نے مجھے اس پر رضامند کر لیا۔ تقریب کے دن خلیل قریشی نے پھر مجھے کہا، وزیراعظم کی خواہش ہے، کہ آپ خطبہ استقبالیہ میں ان کی تعریف میں چند الفاظ کہیں۔ میں نے بتایا، کہ یہ سیاسی تقریب نہیں ہے اور چیف جسٹس ہونے کی حیثیت سے میں نے قصیدہ نہیں پڑھنا۔ یہ سکندر کو ناگوار گذرا۔ اس نے مظفر آباد پہنچ کر، کسٹوڈین کے عہدہ پر، راجہ آزاد کی تقرری کی، جس نے حسب الحکم اسی شام، میری رہائش پر مجھ سے چارج لے لیا۔ پہلا ایکشن یہ ہوا۔

ہائی کورٹ کی نئی عمارت کے افتتاح کے لئے، جج صاحبان سے مشاورت جاری تھی، کہ پھر وزیراعظم کا نام تجویز ہوا، کیونکہ ماتحت عدالتوں کی تعمیر اور عملہ کے الاؤنس وغیرہ کے امور زیرالتوا تھے، جن کا تعلق براہ راست وزیراعظم سے تھا۔ یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو ہائی کورٹ کے ملحق، وسیع لان وخوبصورت پنڈال میں، آزاد کشمیر بھر کے وکلاء، جج، مجسٹریٹ، ممبران اسمبلی کے علاوہ، سابق صدر حکومت، محترم کے ایچ خورشید، حیات خان اور پاکستان فیڈرل شریعت کورٹ کے، چیف جسٹس گل محمد، وزراء اور سول سوسائٹی کے معززین، کثیر تعداد میں شامل ہوئے۔ سب کی رائے تھی، کہ اس سے قبل مظفر آباد میں، اتنی خوبصورت اور بہترین ترتیب دی گئی، کوئی تقریب نہ ہوئی تھی۔ پاکستان کا تمام قومی پریس بھی موجود تھا۔ سکندر حیات نے، اپنے نام کی زرق برق خوبصورت افتتاحی تختی دیکھی، تو دنگ رہ گئے اور بے ساختہ کہا "ملک صاحب! کیا یہ پلیٹ یہاں ہمیشہ رہے گی؟" میں نے جواب میں کہا، ان شاء اللہ تعالیٰ

ضرور رہے گی۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ میری تقریر نظریاتی، بے مثال عدلیہ کی ضرورت اور افادیت اور بالخصوص، جموں کشمیر کی آزادی کے نصب العین، آزاد حکومت کے قیام کی جوازیت، قائداعظم کے افکار کا مرقع اور مستقبل کے چیلنجز کی نشاندہی اور موجودہ حکومت کی دال روٹی کمانے تک محیط ہونے کی عکاس ہی نہیں بلکہ، خوداحتسابی کی روشن مثال تھی، جس پر پاکستان کے پریس نے، پاکستان ہائی کورٹ لاہور کے چیف جسٹس، جسٹس کیانی سے مجھے مماثلت دی۔ روزنامہ نوائے وقت کے معروف صحافی، سلطان سکندر نے، رنگین صفحہ اول پر مکمل کارروائی، تبصرہ کی شکل میں شائع کی اور برمحل اشعار میں کہا، کہ مظفرآباد کی تاریخ میں جسٹس عبدالمجید ملک نے نثر میں، شاعرانہ اور ادبی انداز میں جملے بازی کر کے، تقریر میں جسٹس کیانی مرحوم کی یاد تازہ کر دی۔ وہ تاریخ ساز تقریب، میری دشمن ثابت ہوئی۔ میرے خلاف حاسد قوتوں نے، تانے بانے بننے شروع کر دیئے۔ ایک ماہ بعد ماتحت عدلیہ سے متعلق، مالی اور انتظامی مسائل پر وزیراعظم سے میٹنگ طے ہوئی، جو صرف گپ شپ اور صدر سردار قیوم کے اختیارات پر تبصرہ کی نذر ہو گئی۔ میں نے ماحول سے اندازہ لگایا کہ ہمارے معاملات حل کرنے میں، وزیراعظم کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے رجسٹرار، افتخار حسین بٹ کے ذریعے، چیف سیکریٹری راحت اللہ جرال اور سیکریٹری مالیات کو، اپنے چیمبر میں طلب کر کے، تمام انتظامی اور مالیاتی امور جو اُن کے دائرہ کار میں تھے اور جائز بھی تھے، ان سے طے کروا لیے۔ تین ماہ بعد خلیل قریشی، پرنسپل سیکریٹری کا فون آیا، کہ وزیراعظم ماتحت عدلیہ کے معاملات کے حل کے لئے، آپ سے میٹنگ پر آمادہ ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ معاملات طے ہو چکے ہیں، اس پر ان کو تعجب ہوا اور معلومات حاصل ہونے پر غصہ بھی آ گیا، کہ وزیراعظم کی توثیق کے بغیر، تمام معاملات براہ راست حل کر لیے گئے تھے۔ اسی دوران موسم گرما کی تعطیلات میں، میں لندن، کشمیر کانفرنس میں شامل تھا، کہ میرے داماد، طارق ملک جو محکمہ برقیات میں انجینئر تھا، نے فون پر بتایا، کہ اکاؤنٹس برانچ میں وزیراعظم کی ہدایت پر، میرے ٹی اے، ڈی اے بلز کی تین دفعہ، ایک جج پڑتال کر چکے ہیں اور میرے خلاف ریفرنس دائر کیا جا رہا تھا۔ کانفرنس کے بعد واپس آیا، تو معلوم ہوا، کہ میرے خلاف کوئی مواد نہ ملا تھا، لہٰذا چیف جسٹس راجہ خورشید، وزیراعظم سکندر حیات، صدر عبدالقیوم نے ایک میٹنگ میں، مجھے چیف جسٹس کے عہدہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا، کہ وہ جسٹس شیر زمان کو، میری جگہ چیف جسٹس بنانا چاہتے تھے، مگر انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ چوہدری شیر زمان، میرے قاعدہ یعنی پہلی جماعت سے کالج تک کے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ وکالت بھی اکٹھے کرتے رہے، لہٰذا انھوں نے انکار تو کرنا ہی تھا۔ ریفرنس کے لئے ان کو کچھ نہ ملا، لہٰذا انھوں نے راجہ خورشید کو سازش میں شامل کر کے، مجھے ایڈہاک جج، سپریم کورٹ مقرر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دستور کے تحت، صرف ہائی کورٹ جج، نہ کہ چیف جسٹس ایڈہاک جج مقرر کیا جا سکتا تھا۔ دستور میں ہائی کورٹ میں ایکٹنگ چیف جسٹس کا ذکر اور طریقہ کار ہی نہ تھا۔ سکندر حیات نے میرے خلاف

رپورٹ تیار کروائی اور چیف سیکریٹری راحت اللہ جرال کو توثیق کرنے کے لئے دی۔ اس نے بجائے توثیق کے، ایک صفحہ میری تعریف اور حمایت میں لکھ دیا۔ سکندر حیات نے دو وزراء، راجہ ذوالقرنین اور چوہدری یوسف کی موجودگی میں بلا کر، اس کو برا بھلا کہا اور بے عزتی کی، مگر وہ ڈٹ گیا اور دوٹوک جواب دیا، کہ وہ غیر آئینی کام کر رہے تھے، جس میں وہ شریک ہونے کو تیار نہ تھا۔ وہاں موجود دونوں وزرا میرے پڑوسی اور دوست تھے، وہ خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ میرے اور چیف سیکریٹری کے حق میں، ایک لفظ تک نہ کہا۔ سکندر حیات نے سیکریٹری قانون، راجہ بشیر کو مزید قانونی مشاورت کے لئے، چیف جسٹس پاکستان کے پاس بھیجا، انھوں نے رائے میرے حق میں دی اور بتایا کہ چیف جسٹس کو ایڈہاک جج مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران وزیراعظم پاکستان، جو جموں کشمیر کونسل کے چیئرمین تھے اور جنرل اسمبلی اقوام متحدہ کے اجلاس میں شامل ہونے گئے تھے، ان کو نہ جانے اس سازش کا، امریکہ میں کیسے علم ہو گیا، ان کے پرنسپل سیکریٹری مسٹر ایسانی نے وہاں سے سکندر حیات کو، وزیراعظم محمد خان جونیجو کا پیغام دیا، کہ ان کے پاکستان واپس آنے تک جسٹس ملک کے متعلق کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اس پر سکندر حیات اور الرٹ ہو گیا اور صدر سردار عبدالقیوم، جس نے حکم جاری کرنا تھا، پر زور دینا شروع کر دیا۔ صدر نے جسٹس منظور گیلانی کے ذریعہ مجھے پیغام دیا کہ، میں سکندر حیات سے مل کر معاملہ طے کروں۔ میں نے کیا طے کرنا تھا، میں نے تو کچھ بگاڑا نہ تھا۔ دن رات محنت کر کے، ملک اور عدلیہ کا نام ہی تو بلند کیا تھا۔ ایک دن ریٹائر تو ہونا ہی تھا اور سکندر نے کون سا عمر بھر وزیراعظم رہنا تھا۔ میں نے صدر کے پیغام کا شکریہ ادا کیا۔ حسب سابق، معمول کے مطابق، کام کرتا رہا۔ ہر روز وکلاء زور دیتے، کہ پہلے ان کا مقدمہ سنا جائے۔ شاید ان کو بھی ان باتوں کا علم ہو چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق میرپور سرکٹ میں مقدمات کی سماعت کے لئے آ گیا۔ قہر درویش بر جان درویش کے مصداق، مظفرآباد تو افواہ سازی کا منبع ہے، وہاں صبح و شام نئی نئی باتیں، سازشیں سننے کو ملتیں۔ میرپور میں قدرے سکون تھا۔ میں میرپور میں تھا، مظفرآباد سے سردار عبدالقیوم نے، اپنے بھائی عبدالغفار خان اور حاجی عبدالعزیز کو، میرے پاس بھیجا اور کشمیر ہاؤس اسلام آباد میں آنے کو کہا، تا کہ سکندر حیات سے راضی نامہ کروایا جائے۔ میں چار سال چیف جسٹس رہ چکا تھا، مزید میرے لئے اس عہدہ میں، کوئی کشش نہ تھی۔ میں نے ان دونوں کا، میرے پاس آنے اور صدر سردار عبدالقیوم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور جواب میں اتنا کہا، کہ "سکندر وزیراعظم ہیں اور میں چیف جسٹس ہوں، ہمارے شعبے الگ الگ ہیں، فرائض اور دائرہ کار الگ ہے، تنازعہ یا جھگڑا ہے ہی نہیں، تو راضی نامہ کس بات کا کرنا تھا۔ میں نہ تو پہلے ان سے ناراض تھا، نہ ہی اب ناراض تھا۔ مجھے حکومت پاکستان نے میرے انکار کے باوجود جج مقرر کیا تھا، پھر مستقل چیف جسٹس مقرر کیا۔ میں کشمیر ہاؤس اس غرض کے لئے نہیں جاؤں گا"۔ اس دوران طارق اور افتخار بٹ بھی آ گئے۔ دو گھنٹے ہماری بحث رہی مگر میں نہ مانا۔ دوسرے دن رات ۹ بجے سردار عبدالغفار اور حاجی عبدالعزیز پھر تشریف لائے اور تجویز دی

کہ سردار عبدالقیوم کی خواہش تھی، کہ اسلام آباد میریٹ ہوٹل میں ملاقات کریں۔ میں نے ان سے ادب کے ساتھ وہی دلائل پیش کر کے، ملاقات سے معذرت کی، جس پر تیسری تجویز یہ دی گئی، کہ دوسرے دن، وہ دونوں لاہور جارہے تھے، تو دینہ کے مقام پر ملاقات کرلیں۔ میں نے اس پر بھی معذرت کردی۔ چند دن بعد، جس روز وزیراعظم پاکستان نے واپس آنا تھا، اس سے ایک دن قبل، میری ایڈہاک تقرری اور میری جگہ سینئر جج شیر زمان کی بجائے، سردار اشرف جونیئر جج کو، ایکٹنگ چیف جسٹس مقرر کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کردیا گیا، اطلاع ملتے ہی میں گھر چلا گیا۔ میں نے اپنے طور پر ریٹائرمنٹ لینے اور مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا، مگر گھر پہنچتے ہی وکلاء اور شہریوں کی کافی تعداد جمع ہوگئی اور سب کا مطالبہ تھا، کہ مستعفی نہیں ہونا ہے۔ اتنی دیر میں لاہور سے سردار اقبال صاحب کا فون آ گیا، وہ بہت غصہ میں تھے اور مجھے کہا کہ فوراً مظفرآباد واپس جاؤ اور حلف لو، مستعفی نہیں ہونا۔ یہ بزدلی ہوگی اور مخالف تو چاہتے ہی یہی ہیں، مگر بھاگنا نہیں ہے، مقابلہ کرنا ہے۔ سردار صاحب سے بات ہورہی تھی، کہ کے ایچ خورشید، جو میرپور میں ہی تھے، وہ بھی آ گئے اور سردار صاحب سے ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ انھوں نے ان کی تائید کی اور کہا، کہ ”حکومت آزادکشمیر آپ کے فیصلوں سے خائف تھی اور آپ سے جان چھڑانا چاہتی تھی، مگر آپ نے، اب پیچھے نہیں ہٹنا“۔ انھوں نے بھی تاکید کی، کہ آج ہی مظفرآباد جائیں۔ میرپور کے وکلاء اور شہریوں کا بھی پرزور مطالبہ تھا۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی، میں اسی روز مظفرآباد پہنچا۔ میرے پہنچنے پر ملا جلا تاثر تھا، مگر دوسرے دن میں سپریم کورٹ پہنچا، تو سب کو حیرت ہوئی، ان کو میرے استعفیٰ کا انتظار تھا، میرے فیصلہ سے ان کے منصوبے، دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس راجہ خورشید، جس نے اس گھناؤنی سازش میں، کلیدی کردار ادا کیا تھا، میں نے اس سے بھی کوئی شکوہ نہ کیا، مگر اس کو اپنے کرتوت کا شدت سے احساس تھا۔ لہٰذا وہ باربار کہتا کہ ”اس نے چیف جسٹس ہائی کورٹ مقرر ہونے کے لئے میری سفارش کی تھی“۔

جسٹس شیر زمان کو انکار پر، ایکٹنگ چیف جسٹس بنانے کی بجائے، اس سے جونیئر جج سردار اشرف کو چیف جسٹس بنادیا گیا۔ چیف سیکریٹری راحت اللہ جرال، خود سردار اشرف کے پاس گیا اور اسے بتایا، کہ صدر کا حکم، خلاف آئین ہے۔ اول تو آئین کے مطابق چیف جسٹس کو، اس عہدہ سے ایڈہاک جج نہیں بنایا جاسکتا، دوئم، ہائی کورٹ میں ایکٹنگ چیف جسٹس کی تقرری کا، دستور میں ذکر ہی نہیں اور اس کے علاوہ، آپ سے سینئر جج شیر زمان خان، نے جب انکار کردیا ہے، تو یہ مناسب ہوگا، کہ آپ بھی انکار کردیں۔ بقول راحت اللہ جرال کے، اشرف نے اس کا مشورہ ماننے سے صاف انکار کردیا اور حلف لینے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس حکم کے خلاف، میرپور کے وکلاء، پیپلز پارٹی کے سابق صدر اور ممبر اسمبلی پیر علی جان شاہ، سینئر وکیل اور صدر محاذ رائے شماری، عبدالخالق انصاری نے بہت سخت احتجاجی بیانات دیئے۔ آزادکشمیر کے عوام نے، اس کو ناپسند کیا اور اسے آزادکشمیر کی عدلیہ کی آزادی میں، آمرانہ

مداخلت قرار دیا۔ ہم نے گذشتہ دس سال سے، آزاد کشمیر کی عدلیہ کی آزادی کا جو تاثر قائم کیا تھا، وہ خود پوچھ کے حکمرانوں کی آمرانہ سازش میں شریک ہو کر، پوچھ سے چیف جسٹس راجہ خورشید اور جج ہائی کورٹ سردار اشرف نے، ڈنکے کی چوٹ پر، پامال اور پاش پاش کر دیا۔ اس پر یہ مشورہ بھی ملا، کہ اس حکم کو چیلنج کیا جائے، مگر چیلنج کہاں اور کیسے کیا جائے؟ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس دونوں اس میں فریق تھے۔

جسٹس شیر زمان، بطور ایڈہاک جج سپریم کورٹ تعینات تھے، ان کو واپس جج ہائی کورٹ بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ میری تقرری ہوئی تھی۔ شیر زمان نے مجھے تجویز کیا، کہ سپریم کورٹ میں ان کو جو گاڑی ملی تھی، وہ وہی گاڑی، ہائی کورٹ میں بھی رکھنا چاہتے تھے۔ جج بننے سے قبل وہ اور ان کا خاندان، مسلم کانفرنس میں تھے۔ اب مسلم کانفرنس کی حکومت تھی۔ ان کی خواہش کے احترام میں، میں نے ان کی تجویز مان لی اور نہ جانے کیوں، میں نے ان سے کہا، کہ حکومت مجھ سے ناراض ہے، اس لئے آپ اپنی طرف سے وزیراعظم کو اطلاعاً خط ارسال کر دیں۔ شیر زمان نے وزیراعظم کو اطلاع کے طور پر، خط لکھ دیا اور لکھا، کہ میں ان کی تجویز سے متفق ہوں۔ وزیراعظم نے فوراً جواب میں لکھا، کہ وہ تجویز مسترد کرتے ہیں اور گاڑیاں فوراً بدل لی جائیں۔ جسٹس شیر زمان خط ملتے ہی بھاگتے ہوئے، میرے پاس پہنچا اور سخت پریشانی میں مجھے خط دکھایا، میں خط پڑھ کر ہنس دیا اور شیر زمان سے کہا آپ کو اپنی زیر استعمال گاڑی پسند ہے، تو ٹھیک ہے، وہی گاڑی شوق سے استعمال کرو، اس میں وزیراعظم کا دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ شریف انسان ہے، کہنے لگا اگر باز پرس ہوئی تو؟ میں نے کہا کسی کو باز پرس کرنے کا اختیار نہیں تھا، اور بالفرض باز پرس ہوگی، تو تم میرے ذمہ ڈال دینا، کہ مجید ملک نے گاڑی تبدیل کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے گاڑی نہیں بدلی۔ اس کے بعد نہ گاڑی تبدیل کی نہ کسی نے پوچھا، اس کا مجاز ہی کوئی نہ تھا:

فلک نے اُن کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

شعلوں میں تپش

آزاد جموں کشمیر، پاکستان اور ہندوستان میں اعلیٰ عدلیہ کے جج، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فلیگ استعمال کرنے کے مجاز ہیں، لیکن وزیراعظم انتقام کی آگ میں اس قدر انگاروں پر کروٹیں لے رہا تھا، کہ اس کو میں عدلیہ میں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے جو سردار غفار اور حاجی عبدالعزیز کو، وزیراعظم سے ملاقات سے انکار کیا تھا، اس سے اس کی انا اور تکبر کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ، کہ میں نے بدوں شکر و شکایت مکمل اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اپنا عدالت کا کام شروع کر دیا تھا۔ میری رہائش پر شام کو سیکریٹری اور دوسرے افسر جمع ہوتے اور خوب گپ شپ ہوتی اور حکومت کے جاہلانہ احکامات اور پالیسی پر کھلا تبصرہ ہوتا۔ پہلے سے زیادہ، رونق بڑھ گئی تھی۔

ان میں بیشتر ملازم، جو دن کو وزیراعظم کے ساتھ کام کرتے، شام کو میرے ہاں لطیفے سناتے اور مظفرآباد کے مخصوص کلچر اور روایت کے تحت اپنی سنائی ہوئی باتیں اور گفتگو کو میرے ذمہ لگاتے، کہ شام کو ملک یہ باتیں آپ کے متعلق کرتا تھا، اگر بہت نرمی کرتے تو جا کر چغلی لگاتے، کہ دیکھو جی جسٹس ملک کے گھر فلاں فلاں تنقید ہو رہی تھی۔ اس پر وزیراعظم کو مستقل شکایت تھی، کہ ملک کا گھر شاہی دربار ہے۔ اس پس منظر میں وزیراعظم، میری حیثیت اور وقار کم سے کم کرنے کی سوچ کرتا۔ اس نے فلیگ استعمال کرنے کے قانون میں، ترمیم کر کے، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ کے جج صاحبان کو گاڑی پر فلیگ استعمال کرنے کے استحقاق سے محروم کر دیا، جس دن یہ حکم نافذ ہوا، اس کے دوسرے روز میں انگلینڈ اور امریکہ چلا گیا اور گرمیوں کی تعطیلات ختم ہونے پر واپس آیا۔ اس دوران باقی جج صاحبان، سردار عبدالقیوم صاحب سے ملے اور انھوں نے میری واپسی سے چند دن قبل فلیگ کا استحقاق بحال کروا دیا۔

وزیراعظم کے دل کا اپریشن...... میری ہائی کورٹ میں واپسی

میں گرمیوں کی تعطیلات کے دوران برمنگھم میں، اپنے ماموں زاد ملک محمد بشیر کے ہاں تھا، کہ اطلاع ملی، کہ سکندر حیات عارضہ دل میں مبتلا ہیں اور کرام ویل ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ دوسرے روز لیوٹن شہر میں تھا، تو معلوم ہوا کہ ان کا اپریشن تجویز کیا گیا تھا۔ میں نے ان سے فون پر رابطہ کیا، تو وہ اس وقت، اپریشن تھیٹر سے باہر، انتظار گاہ میں تھے، اس مرحلہ پر انسان زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتا ہے اور نفسیاتی خوف تو ہوتا ہی ہے۔ میں نے ان کو حوصلہ دیا اور خشوع وخضوع سے ان کی کامیاب سرجری اور جلد صحت یابی کے لئے دعا کی، وہ خوش ہوئے اور شکریہ ادا کیا۔ ہسپتال سے فارغ ہو کر، وہ سردار نسیم کی لندن میں رہائش گاہ پر قیام پذیر تھے۔ میں ان کی عیادت کے لئے گیا، تو وہاں بیگم نجمہ حمید، حمید اختر بیگ، سردار نسیم اور دیگر موجود تھے۔ سرجری کے باوجود سکندر حیات کھڑے ہو گئے، مجھے گلے لگا کر ملے اور بہت خوش ہوئے۔ ماضی کی سب رنجشیں دور ہو گئیں۔ وہاں ہی انھوں نے پیشکش کی، کہ میں ان کے ساتھ ہی واپس چلوں اور چیف جسٹس کے عہدہ کا چارج لوں، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ابھی تعطیلات باقی تھیں، میں نے سوئٹزر لینڈ اور دیگر یورپین ممالک میں جانے کا پروگرام طے کر رکھا تھا، اس لئے ساتھ واپس آنے سے معذرت کی، البتہ جس روز واپس پہنچا، تو ہائی کورٹ میں بطور چیف جسٹس آ گیا۔ اس دوران میرے فیصلے، حسب سابق صادر ہوتے رہے اور وزیراعظم کو ان کے ساتھ نباہ کرنا پڑا، مگر حالات پر سکون رہے۔ اسی دوران الیکشن ہوئے اور حکومت بدل گئی، سردار عبدالقیوم پھر صدر حکومت اور ممتاز راٹھور پیپلز پارٹی کے، وزیراعظم منتخب ہوئے۔

ممتاز حسین راٹھور سے تعلقات، بہ نسبت دیگر حکمرانوں کے قدرے، خوشگوار تھے۔ اس میں رواداری کے علاوہ بے تکلفی بھی تھی، مگر وہ بہت محتاط تھا، حالانکہ سیاست سے میرا تعلق واسطہ نہ تھا۔ عدالتی فرائض کے علاوہ، میری دوسری ترجیح اور مصروفیت، جموں کشمیر کی تحریک آزادی تھی۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں شمولیت اور برطانوی

پارلیمنٹ اور امریکن کانگریس وسینٹ میں لابی کرنا، میرے معمولات میں شامل تھا، جو میں نجی تعلقات اور ذاتی اخراجات کے ذریعہ سرانجام دیتا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے بیشتر ارکان سے، برطانیہ میں مقیم میرپور کے لوگوں کی وساطت سے، ذاتی تعلقات قائم تھے، جن سے استفادہ کر کے لابی کرتا تھا۔ ممتاز حسین راٹھور اس سے آگاہ تھا، چنانچہ اس نے بین الاقوامی عدالت انصاف میں، کشمیر کا مسئلہ، پیش کرنے کے لئے، مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری، مجھے سونپی۔ میں نے لاہور سے اقوام متحدہ کے قواعد وضوابط کے دو ماہر، بیرسٹر صاحبان کی معاونت سے، اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں کے ملحوظ، مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کے مسلمہ وعدوں کی روشنی میں، جب مسودہ مکمل کیا، تو عین اس موقع پر راٹھور نے اسمبلی توڑ دی اور اس کی حکومت ختم ہوگئی اور بین الاقوامی عدالت انصاف میں، مسئلہ کشمیر اٹھانے کا منصوبہ، تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

۱۹۹۱ء میں نئے انتخابات کے نتیجہ میں، سردار عبدالقیوم وزیر اعظم اور سردار سکندر حیات، صدر کے عہدہ کے لئے منتخب ہوئے۔ اسمبلی ممبران کی اکثریت، سکندر حیات کو وزیر اعظم منتخب کرنے کے حق میں تھی، مگر میاں نواز شریف، صدر مسلم لیگ نے فیصلہ سردار عبدالقیوم کے حق میں کیا، لہٰذا وہ وزیر اعظم بن گئے۔ سردار عبدالقیوم صاحب کے عدلیہ کے ساتھ معاملات معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات کے دوران میں انگلینڈ میں تھا۔ ویکیشن جج ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ میں، حکم امتناعی جاری کر کے، حکومت کو ایکسائز ٹیکس کی وصولی پر پابندی عائد کر دی، جس وجہ سے حکومت کروڑوں روپیہ کے ٹیکس کی وصولی سے محروم ہوگئی۔ وزیر اعظم، نے اعلیٰ عدلیہ کے خلاف، جلسہ عام میں تقریر داغ دی۔ اسی ہفتہ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کا دورہ آزاد کشمیر تھا۔ میں واپس آیا، تو سردار صاحب کا توہین آمیز بیان، میرے نوٹس میں لایا گیا۔ بیان سنگین توہین آمیز تھا۔ میٹنگ میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان سے مشاورت کے بعد، توہین عدالت کے بجائے، اظہار ناپسندیدگی کا خط لکھنے اور وزیر اعظم پاکستان کی آمد پر، ان کے اعزاز میں، سردار عبدالقیوم کی طرف سے ظہرانہ کی دعوت کا، بطور احتجاج بائیکاٹ کیے جانے کا فیصلہ ہوا۔ وزیر اعظم پاکستان کے احترام کی خاطر، ان کو تمام معاملہ سے بذریعہ ٹیلیگرام آگاہ کیا گیا، جس کی اطلاع مظفر آباد، وزیر اعظم آزاد کشمیر کو بھی دے دی گئی اور پریس ریلیز بھی جاری کر دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ مچ گیا۔ ہم لوگ میرپور میں تھے، ہم نے فیصلہ کر لیا تھا، کہ فیصلہ پر قائم رہنا ہے۔ ہم سے فون پر وزراء نے معافی مانگی، وزیر اعظم نے بہت زور لگایا، ہائی کورٹ کے جج ڈٹے رہے، سپریم کورٹ کے جسٹس بشارت احمد شیخ بھی فیصلہ پر قائم رہے، البتہ جسٹس سید محمد اور جسٹس سردار اشرف، غیرت ووقار کو بالائے طاق رکھ کر، ظہرانے میں شامل ہوگئے۔ مگر میری طرف سے ظہرانے میں شامل نہ ہونے کی معذرت کی اطلاع پر، میاں نواز شریف نے سب کے سامنے سردار عبدالقیوم کی، خوب باز پرس کی اور ان کو جج صاحبان کا احترام کرنے کی ہدایت کی، بعد میں سردار عبدالقیوم نے کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔

سردار عبدالقیوم کا عظیم کارنامہ

آزاد جموں کشمیر کی عدلیہ کا درجہ، رتبہ، تنخواہ اور مراعات پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کے برابر اور ہم پلہ قائم چلا آ رہا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں، نہ جانے کس وجہ سے، وزارت امور کشمیر نے حکومت آزاد کشمیر کو خط تحریر کیا، کہ اعلیٰ عدلیہ کے چیف جسٹس اور جج صاحبان کی تنخواہ پاکستان میں مروجہ تنخواہ سے، ایک روپیہ کم مقرر کی جائے۔ سیکریٹری قانون اس وقت محمد صدیق فاروقی تھے، اس نے یہ بات مجھے بتائی۔ سردار عبدالقیوم، کشمیر ہاؤس اسلام آباد میں تھے، میں نے فون پر یہ بات ان کے نوٹس میں لائی۔ انھوں نے مجھے اور سیکریٹری قانون کو کشمیر ہاؤس میں بلالیا اور خط دیکھنے کے بعد، سیکریٹری کو جواب تحریر کروایا، عدلیہ کی مراعات اور سٹیٹس میں برابری روایتی طور پر زبانی ہی چلی آ رہی تھی اور ہمارے قانون، کورٹس لاز کوڈ کے تحت مراعات اور شرائط متعین تھے۔ میں نے ان کو تجویز دی، کہ اس کا آئینی تحفظ ضروری ہے۔ انھوں نے دوسرے روز میٹنگ میں جسٹس بشارت شیخ کو بھی طلب کرلیا۔ ہم نے آئین میں ترمیم کا مسودہ تیار کیا، جس پر سردار صاحب نے کمال حکمت عملی سے، اسمبلی کے جائینٹ سیشن میں ترمیم، منظور کروادی، جو عبوری دستور میں جدول چار اور پانچ کے طور پر شامل ہے۔ اگر اس وقت آئین میں اعلیٰ عدلیہ کی مراعات کا تحفظ نہ کیا جاتا، تو بعد میں آنے والی قیادت یہ تحفظ مشکل ہی سے فراہم کرپاتی۔

۱۹۹۳ء میں حکومت پاکستان، گلگت بلتستان کو، پاکستان میں مدغم کرنے میں بہت سنجیدہ تھی۔ سردار عبدالقیوم کو اس کا علم ہوا، تو انھوں نے مجھ سے اور دوسرے ماہرین سے کئی دن مشاورت کر کے، دلائل کے ذریعے حکومت پاکستان، بالخصوص فوج کی متعلقہ کمانڈ کو قائل کر کے، اس کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس وقت بھی میاں نواز شریف وزیراعظم پاکستان تھے۔ ان دو معاملات میں سردار قیوم کا بڑا واضح کردار تھا۔

محترم لارڈ ایوبری کے ساتھ، اقوام متحدہ میں

برطانوی ہاؤس آف لارڈز کے سینئر ممبر لارڈ ایوبری، تحریک آزادی جموں کشمیر کے لئے ہمارے حق میں بہت متحرک تھے۔ انھوں نے ہر پلیٹ فارم پر مسئلہ کشمیر اٹھایا اور ہماری آزادی کے حق میں تشہیر اور لابی کی۔ اگست ۱۹۹۳ء میں، میں اس کی رہائش گاہ پر اسے ملنے گیا، تو نذیر احمد کونسلر بھی ساتھ تھا، جو بعد میں ہاؤس آف لارڈز کا، لیبر پارٹی نے رکن نامزد کیا اور اب لارڈ نذیر احمد کے طور پر جانا جاتا ہے۔ دوران گفتگو لارڈ ایوبری نے، مجھ سے نئی تجویز طلب کی، جس سے تحریک میں تیزی پیدا ہو اور ہندوستان پر دباؤ بڑھایا جائے۔ میں نے تجویز کیا، کہ برطانوی ممبران کشمیر کمیٹی کا وفد، سیکریٹری جنرل اقوام متحدہ سے ملاقات کرے اور اسے مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں اٹھا کر، اس کی منظور کردہ قراردادوں پر عمل پیرا ہو کر، ریاست میں رائے شماری کروانے کے اقدامات کیے جانے کا کہے۔ اس نے اس تجویز کو سراہتے ہوئے، میری تائید کی۔ میں دو تین کانفرنسوں میں شرکت کے بعد واپس آ گیا۔ حسب پروگرام

کوٹلی سرکٹ میں دورہ پر تھا۔ ۲۸/اکتوبر کو رات گیارہ بجے لارڈ ایوبری نے فون پر کہا، کہ ۳۱/اکتوبر تک لندن پہنچوں، کیونکہ یکم نومبر کو امریکہ، نیویارک جانا ہے اور ۳/نومبر ۱۹۹۳ء کو، سیکریٹری جنرل اقوام متحدہ سے ملاقات طے ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سخت تاکید کی، کہ میرا آنا بہت ضروری تھا۔ باہر جانے کے لئے حکومت کی اجازت اور رخصت لینا ضروری تھی، مگر سیٹ بک کروانے، اجازت اور رخصت حاصل کرنے کے لئے وقت درکار تھا۔ میں فوری میر پور پہنچا اور ہوائی جہاز کی سیٹ بک کروا کر ۳۱/اکتوبر کو مانچسٹر پہنچ گیا۔ اس کی اطلاع صرف میری بیگم کو تھی، البتہ صبح سیر کرتے وقت، ڈیم کے کنارے، عبدالخالق انصاری سے ملاقات پر ان کو رازداری میں یہ بات بتائی۔ وہ خوشی میں چونک کر گلے لگ گئے اور کامیابی کی دعا کی۔ ہماری یہ مہم راز میں ہی تھی، مگر روجر گاڈسیف ممبر پارلیمنٹ، جو ان دنوں چیئرمین پارلیمانی کشمیر کمیٹی تھے اور وفد میں شامل تھے۔ غلطی میں ان سے روزنامہ جنگ لندن کے رپورٹر کو خبر مل گئی، جس نے اخبار میں رپورٹ کر دیا تھا، مگر اس کو صرف میرے متعلق علم ہو سکا تھا۔ اخبار جنگ لندن کے سینئر صحافی نقی جامعی کو علم ہوا، تو اس نے اس کی توثیق کے لئے، میری تلاش شروع کر دی۔ رات گیارہ بجے اس نے، مجھے تلاش کر ہی لیا۔ ہندوستان کی لندن اور امریکہ میں سفارتکاری بہت متحرک اور فعال تھی۔ خطرہ تھا، کہ ہندوستان سفارتی دباؤ کے تحت وفد کی، سیکریٹری جنرل اقوام متحدہ سے ملاقات منسوخ ہی نہ کروا دے، کیونکہ ماضی میں میرے ساتھ ایسے واقعات پیش آ چکے تھے۔ میں نے ملکی مفاد میں اس کو خبر شائع کرنے سے بہت منع کیا، مگر اس کا شعبہ صحافت تھا۔ اتنی بڑی خبر وہ کیوں کیش نہ کرواتا۔ وفد میں ہم لوگ، لارڈ ایوبری، روجر گاڈسیف ایم پی، چیئرمین برطانوی پارلیمنٹ کشمیر کمیٹی، جمی بوئیس ایم پی، ممبر کمیٹی نارمن ویسٹ ممبر یورپین پارلیمنٹ، نذیر احمد کونسلر اور چیف جسٹس آزاد جموں کشمیر ہائی کورٹ، جسٹس عبدالمجید ملک، چھ افراد شامل تھے۔ میں نے میر پور کے نیویارک میں مقیم، احباب کو خبر دے دی تھی۔ وہ پچاس ساٹھ لوگ ائیرپورٹ پر منتظر تھے۔ ان کی گاڑیوں میں وفد ہوٹل پہنچا۔ شام کو میں نے لارڈ ایوبری سے کہا، کہ ۳/نومبر کو دن ۱۱ بجے ہونے والی ملاقات کی توثیق کر لیں۔ انھوں نے کہا، بھائی ملاقات طے ہے، فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے ہندوستان کی سفارتی تخریب کاری سے ان کو آگاہ کیا۔ وہ مشکل سے مانے اور کنفرم کرنے کے لئے فون کیا، تو جواب میں بتایا گیا، کہ ملاقات نہیں ہوگی۔ سیکریٹری جنرل صومالیہ سے متعلق، ضروری میٹنگ میں مصروف ہوں گے۔ وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ مصر کے بطرس غالی، سیکریٹری جنرل تھے، ان سے لارڈ ایوبری کی تلخی ہو گئی، میں نے تلخی کرنے سے روکا۔ برطانیہ کے اقوام متحدہ میں مستقل سفیر سے رابطہ کیا گیا، تو اس نے سوال کیا، کہ وفد آفیشل ہے یا پرائیویٹ؟ اس نے وضاحت کی کہ وہ سیکریٹری جنرل کو ملاقات کے لئے مجبور نہ کر سکے گا۔ لارڈ ایوبری نے اس کو بتایا، کہ وفد میں جموں کشمیر کا چیف جسٹس بھی شامل ہے، جو خصوصی طور پر کشمیر سے آیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا، کہ وہاں جموں کشمیر کے، چیف جسٹس کی کیا اوقات ہوگی، جہاں برطانیہ کے

ممبران پارلیمنٹ کو وقت دے کر، ملاقات میں پس وپیش ہو رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد، برطانوی مستقل نمائندہ برائے اقوام متحدہ نے اطلاع دی، کہ شام پانچ بجے ملاقات طے ہوگئی ہے، اس پر اطمینان ہوا۔ برطانوی ایم پی مجھ سے پوچھنے لگے، کہ مجھے کیسے خیال ہوا، کہ ملاقات کی توثیق کرلیں، میں نے وضاحت کی، کہ ہمارا ہندوستان سے پچاس سال سے واسطہ تھا، روزنامہ جنگ لندن میں خبر شائع ہونے پر، ہندوستان کے سفارتکاروں کا متحرک ہونا لازمی تھا، جس وجہ سے احتیاطاً میں نے توثیق کرنے کو کہا تھا۔

اقوام متحدہ میں

اس سے قبل امریکہ جاکر، میں اقوام متحدہ کے تمام اداروں کو دیکھ چکا تھا، البتہ اس دفعہ آمد کی وجہ ذاتی نہیں، بلکہ ملکی اور قومی تھی۔ ان دنوں سیکریٹری جنرل نے کئی سال بعد، جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس کی افتتاحی تقریر میں، مسئلہ کشمیر کے حل کرنے کی ضرورت کی وضاحت کی۔ اقوام متحدہ کے قیام کے اڑھائی سال بعد یہ مسئلہ پیش ہوا تھا، اتنا پرانا اور حق خودارادیت سے وابستہ ہونے اور جنوبی ایشیا میں اس کی موجودگی اور دنیا کے امن کے لئے مستقل خطرہ ہونے کی وجہ سے، اس کا حل ضروری تھا۔ ملاقات سے قبل ڈاکٹر فائی اور یوسف بچھ ہوٹل میں ملاقات کے لئے آئے۔ یوسف بچھ کا تعلق سری نگر سے ہے۔ وہ کئی سال اقوام متحدہ میں پاکستانی حکومت کی طرف سے سفارتی عہدہ پر، خصوصیت سے کشمیر کے حوالہ سے فائز رہے۔ مشاورت سے انھوں نے مسودہ بھی ترتیب دیا، جو زبانی گفتگو کے علاوہ، سیکریٹری جنرل کو پیش کرنا تھا۔ مسودہ بہت معنی خیز اور جموں کشمیر کے عوام کی امنگوں کے پیرائے میں ترتیب دیا گیا تھا۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ کے طبع شدہ لوگو اور نام پر تحریر کرکے، وفد کے ارکان کے نام، حیثیت اور دستخطوں سے، سیکریٹری جنرل کو، وفد کے سربراہ لارڈ ایوبری نے پیش کیا۔ دوران گفتگو ڈپٹی سیکریٹری جنرل اور ڈائریکٹر نے کہا، کہ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں، سیکریٹری جنرل کی طرف سے پیش کی گئی، سالانہ رپورٹ میں اور افتتاحی تقریر میں، مسئلہ کشمیر حل کرنے کی ضرورت کا اظہار کرنے پر، ہندوستان کے مستقل سفیر، حکومت اور دفتر خارجہ نے الگ الگ طور پر احتجاج کیا تھا، جبکہ دوسری جانب، پاکستان کے مستقل نمائندہ، سفیر، حکومت اور دفتر خارجہ نے، رسمی طور بھی سیکریٹری جنرل کے اقدام کو خوش آئند قرار نہ دیا اور نہ ہی دو الفاظ شکریہ کے کہے۔ انھوں نے پاکستان کے، جموں کشمیر کے مسئلہ سے، سردمہری اور لاتعلقی کے رویہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس گفتگو اور تاثر پر، برطانوی ممبر پارلیمنٹ میرے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے، لیکن مجھے تو پہلے سے علم تھا، کہ ۲رجولائی ۱۹۷۲ء کو، جب سے معاہدہ شملہ ہوا تھا، پاکستان نے ہندوستان کے ساتھ صرف دوطرفہ مذاکرات کو ہی اولین ترجیح کے طور پر، اختیار کیا ہوا تھا اور سیکیورٹی کونسل کے ایجنڈا میں مسئلہ کشمیر شامل کرنے اور اس کی مسلمہ متفقہ قراردادوں پر عمل کرکے پلیبسیٹ ایڈمنسٹریٹر کی تقرری، افواج کے انخلا اور استصواب رائے کا مطالبہ اور ذکر تک نہیں کیا تھا۔ دوطرفہ مذاکرات کے فارمولہ کی گردش میں، جموں کشمیر کے

عوام کی ڈیڑھ سو سال کی تحریک آزادی میں دی گئی، جوانوں کی خوب صورت زندگی کی، پاکیزہ اور عظیم قربانی کو زمین کے چند میلوں کے ٹکڑے پر قبضہ کی بھینٹ چڑھا دیا تھا اور آزادی کی مقدس تحریک اور عظیم نصب العین کو، زمین کی تقسیم کے تنازعہ کی حیثیت میں، بدل دیا تھا۔ اس کی بنیاد ایوب خان نے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو سندھ طاس معاہدہ میں، پنڈت نہرو کو جموں کشمیر کے، اس کے زیر تسلط دریاؤں پر، حسب ضرورت بجلی گھر تعمیر کرنے کا، اختیار دے کر، ہندوستان کے ریاست کے بڑے حصے پر، غاصبانہ قبضہ کو جائز مان کر، مستقل جارحیت کو جائز حق تسلیم کر رکھا تھا۔ اور بعد میں اعلان تاشقند، معاہدہ شملہ، اعلان لاہور، اعلان واشنگٹن اور ۶ جنوری ۲۰۰۴ء کو اعلان اسلام آباد کے تحت، پاکستان کے یکے بعد دیگرے حکمرانوں، سیاستدانوں اور جرنیلوں نے تحریک آزادی کی حیثیت اور ہیئت ہی بدل دی ہے اور رہی سہی کسر گلگت بلتستان کی حیثیت، عوام کو پاکستان کے شہری، اور علاقہ کو پاکستان میں، ایک صوبہ یا ڈویژن کی، آئین کے تحت، بدل کر مسئلہ جموں کشمیر سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ان دنوں پاکستان کا اقوام متحدہ میں مستقل نمائندہ، منیر اکرم تھا۔ سردار مسعود خان صدر حکومت آزاد کشمیر، جو بعد میں سفیر اور پاکستان کا یو این او میں مستقل نمائندہ رہا، تب پاکستان کے سٹاف میں، ایک جونیئر افسر تھا۔ اس وقت گلگت بلتستان کے متعلق مارچ ۱۹۹۳ء میں آزاد جموں کشمیر ہائی کورٹ کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا۔ اتفاق سے اسی روز یو این او کی کمیٹی نمبر تین میں، گلگت بلتستان پر ہندوستان اور پاکستان کی بحث جاری تھی۔ پاکستانی مشن کو ہمارے وفد کی اطلاع تھی، جوں ہی ہم میٹنگ سے فارغ ہو کر نکلے، تو مسعود خان باہر منتظر تھا، وہ مجھ سے ملا اور اپنا تعارف کروا کر کہا کہ "منیر اکرم صاحب کو ہندوستان کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے جواب کے لئے، فلاں نکتہ پر آپ کی راہنمائی اور معاونت چاہیے"۔ میں راولا کوٹ کے نوجوان کی پاکستان مشن میں تعیناتی پر، بہت خوش ہوا اور مطلوبہ معلومات اس کو فراہم کیں۔ اس کے بعد یو این پریس کلب میں، سیکریٹری جنرل سے ملاقات کے تاثرات بیان کرنے کے لئے پہنچے۔

خالد حسن سے ملاقات

اقوام متحدہ میں ہمارے وفد نے، شاید کشمیر کے حوالے سے زیادہ وقعت حاصل کر لی ہوئی تھی۔ چونکہ ہمارے پاس تشہیر کے وسائل ہی نہ تھے اور نہ ہیں، مگر برطانوی ایم پیز نے جموں کشمیر پر بات کرنے کے لئے، پریس کانفرنس کی۔ ہندوستان کے پندرہ سولہ اور باقی مختلف ممالک کے صحافی تھے۔ لارڈ ایوبری نے ملاقات پر بریفنگ دی۔ ہندوستانی صحافیوں نے ہم پر کم، مگر انگریزوں پر سوالات کے تابڑتوڑ حملے کیے۔ ایک سوال یہ بھی ہوا، کہ وفد کے سفری اور قیام و طعام کے اخراجات کس نے برداشت کیے ہیں؟ اس پر روجر گاڈسیف خوب بولے اور ہندوستانی صحافیوں کی بولتی بند کر دی، اس وقت کشمیر میں جہاد پورے جوبن پر تھا اور ہندوستان سخت پریشان تھا، وزیراعظم

زیسمارا؛ جموں کشمیر پر سمجھوتہ کرنے پر تیار تھا۔ جنرل ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کی شروع کی ہوئی، کشمیری نوجوانوں کی تحریک کو، ضیاء الحق اور اختر عبدالرحمٰن کی حادثہ میں وفات کے بعد، میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی حکومتوں نے ختم کرنے کی بے حد کوشش کی مگر ناکام رہے۔ جب جہاد عروج پر تھا، پاکستان کی سفارتکاری خاموش اور اپنے آپ میں مگن تھی، فوج اپنے طور پر، کشمیر میں ہندوستان کی فوج اور کشمیری نوجوانوں کا خون بہتا دیکھ کر، تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس پریس کانفرنس میں خالد حسن، جس کے ساتھ گورنمنٹ کالج نیو ہوسٹل میں، چند ماہ اکٹھے گذارے تھے، کے ساتھ کئی سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ وفد کی، سیکریٹری جنرل سے ملاقات پر بہت خوش اور معترف تھا۔ اے پی پی کے افتخار چوہدری نے مجھ سے سوال کیا، کہ ''جج صاحب، آپ چیف جسٹس ہیں، آپ اس وفد میں کس طرح شامل ہوئے، آپ کو حکومت سے اجازت کس طرح ملی تھی؟'' میرے جواب سے پہلے ہی، خالد حسن نے اس کو بتایا، یہ وفد لایا ہی مجید ملک نے ہے، ورنہ اس سے پہلے کبھی برطانیہ کے ممبران پارلیمنٹ کا وفد کشمیر کی حمایت میں نہ آیا تھا۔ اس نے کہا، کہ مجید ملک ہر سال گرمیوں کی تعطیلات میں برطانیہ اور یورپ میں ذاتی اخراجات پر مسئلہ کشمیر پر لابی کرتا ہے، نہ یہ حکومت سے اجازت لیتا ہے اور نہ ہی اس کو حکومت پوچھتی ہے۔ کشمیر کی آزادی، مجید ملک کا عشق اور مشن ہے، خالد حسن کی معلومات پر میں حیران رہ گیا۔

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور سینٹ میں میٹنگ

دوسرے دن، حسب پروگرام واشنگٹن کیپٹل ہل پہنچے، سینٹ کے اجلاس میں کچھ وقت گذارا، جس کے بعد پہلے سینیٹر براؤن سے اور پھر سینیٹر متعلقہ خارجی امور، منی ہون سے ایک ایک گھنٹہ صرف مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی پر گفتگو ہوئی۔ ان ملاقاتوں میں مسئلہ کشمیر پر بریفنگ اور سوالات کے جوابات، تمام تر میرے ذمہ تھا۔ بہت اطمینان بخش اور خوش گوار ملاقاتیں تھیں۔ اتفاق سے، ڈاکٹر غلام نبی فائی بھی، ان ملاقاتوں میں ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری شناسائی تو کافی پہلے سے تھی، مگر امریکی سینیٹرز سے میری، جموں کشمیر کے مسئلہ پر دسترس، فیکٹس، فگرز اور انداز سفارت کاری پر عبور، انھوں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا، ان کو غالباً معلوم نہ تھا کہ کئی سال سے، میں اس مہم سے منسلک تھا۔ انھوں نے یوسف بچھ اور سردار عبدالقیوم سے بھی اس پر میری تعریف کرتے ہوئے کہا، کاش کہ امریکہ میں کشمیر پر ایسی سفارتکاری پہلے ہوئی ہوتی، تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ یہ مجھے بعد میں بتایا گیا۔

خودمختار جموں کشمیر کی امریکی سفارش

سینیٹ ممبران سے ملاقات اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں میٹنگ اور جموں کشمیر کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کے بعد، وفد کے ممبران کو، امریکہ کی کشمیر پالیسی بالخصوص صدر بل کلنٹن کی حالیہ پالیسی کی وضاحت کی گئی۔ جنوبی ایشیا کی انچارج رابن رافیل تھیں، ان سے پہلے بھی کافی ملاقاتیں، مظفر آباد، اسلام آباد اور لندن میں ہو چکی تھیں اور اچھی

خاصی شناسائی تھی، اتفاق سے اس دن وہ کہیں باہر تھیں۔ ان کے سیکنڈ انچارج نے رازداری میں، رابن رافیل کی مرتب کردہ اور صدر کلنٹن کی توثیق شدہ، بیس صفحات پر مشتمل رپورٹ دکھائی۔ ''اس رپورٹ میں ہندوستان و پاکستان کا جموں کشمیر سے متعلق تاریخی، قومی مؤقف کے تحت اختیار کردہ رویہ، ماضی کی روشنی میں، ڈوگرہ حکومت کے خلاف شروع کی گئی تحریک آزادی، ہندوستان و پاکستان کے زیرِ کنٹرول خطہ اور عوام کی نام نہاد حکومتوں کی طرزِ حکمرانی اور جملہ امور کا، تنقیدی جائزہ لے کر، تجویز کیا گیا تھا، کہ ریاست کو آزاد، خودمختار حیثیت دی جائے''۔ یہ رپورٹ دیکھنے پر، میں نے اس کی کاپی کے حصول کے لئے، خواہش کا اظہار کیا تو بتایا گیا، کہ یہ رپورٹ کلاسیفائیڈ دستاویزات میں شمار ہوتی ہے، اس کی کاپی ممنوع ہے۔ ہمیں مزید بتایا گیا کہ رابن رافیل ایک ہفتہ کے بعد، ہندوستان پاکستان جارہی ہیں۔ وہاں ہر دو ممالک کی حکومتوں کو اس رپورٹ کے مطابق کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی تجویز پیش کریں گی، دونوں کی طرف سے تجویز قبول کرنے کے بعد، اس پر عمل کے لئے، باقاعدہ اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔

ہندوستان کا تیز ترین ردعمل

جنگ اخبار لندن کی رپورٹ کی روشنی میں، ہمارے وفد کے نیویارک میں سیکریٹری جنرل سے ملاقات کے دن ہی، فاروق عبداللہ چیف منسٹر جموں کشمیر نیویارک پہنچا، اس کے لئے ہندوستان کے سفیر نے فائیوسٹار ہوٹل میں وسیع تر پریس کانفرنس کا انتظام کر رکھا تھا، جس کو ہندوستان کے کشمیر بارے مؤقف پر بریف کیا گیا اور الیکٹرانک میڈیا پر زبردست تشہیر کی گئی۔ دو دن بعد سیکریٹری جنرل کے ساتھ، پانچ ممبران انڈین پارلیمنٹ کی ملاقات کروائی گئی، ان میں تین ہندو اور دو مسلمان ممبران تھے، دو کا تعلق جموں کشمیر سے تھا، اس کے برعکس، پاکستان کے مشن اور سفارتخانہ سے، کسی آدمی نے نہ ہمارے وفد سے رابطہ کیا، نہ ہی انڈیا کے جارحانہ بیانات کی تردید میں، پاکستان کا مؤقف پیش کیا۔

برطانوی ممبران پارلیمنٹ کا کردار

انگلینڈ میں مقیم میرپور، کوٹلی، بھمبر اور دیگر آزاد جموں کشمیر کے عوام نے، جہاں پاکستان کی معیشت کو زرمبادلہ سٹرلنگ کی شکل میں کما کر مضبوط اور مستحکم کیا، اس سے کئی گنا بڑھ کر، جموں کشمیر کی تحریک آزادی میں ہر سطح اور ہر لحاظ سے بہت کام کیا اور مالی قربانی دی ہے۔ اس میں چند ایک پاکستانیوں کی قربانی بھی شامل ہے، جو قابل تحسین ہے۔ انھوں نے برطانوی عوام اور پریس کو ہمنوا بنایا، بالخصوص ممبران پارلیمنٹ میں، اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے آزادی کی حمایت پر قائل کر کے، منظم اور متحد کیا۔ پارلیمنٹ میں جموں کشمیر کی آزادی کی حمایت میں، کشمیر پارلیمنٹری کمیٹی تشکیل دی گئی، اس کمیٹی کے پلیٹ فارم پر لارڈ ایوبری، میکس میڈن، روجر گاڈسف اور متعدد

دیگر ممبران ذاتی اخراجات پر جموں کشمیر کے عوام کے حقوق اور آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہے، جس کی تفصیل مناسب سطح پر تحریر میں لانا ضروری ہوگا۔ یہاں صرف اس تناظر میں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے، کہ یو این او کے دورہ کے کیا اثرات مرتب ہوئے، پانچ دن کے سفر اور قیام میں، وفد میں شامل تمام ممبران نے تمام اخراجات، اپنے اپنے طور پر، اپنی گرہ سے برداشت کیے، نیویارک میں مقیم میرپور کے احباب نے پُرزور اصرار کیا، کہ قیام وطعام کا انتظام، انھوں نے کر رکھا تھا، مگر انھوں نے قبول نہ کیا، بلکہ پہلے سے بک کیے ہوئے ہوٹل میں، قیام کیا اور تمام بل اپنا اپنا ادا کیا۔ ہمارے اصرار پر صرف ایک ایک کپ کافی کا، میرپور کی میزبانی میں لیا، البتہ مجھے اور نذیر کو میرے دوست محمد اعظم کے پاس، چند راتوں کے قیام کی اجازت دی۔ لندن سے نیویارک، واشنگٹن اور واپس لندن تک تمام اخراجات خود برداشت کیے، اس کا تذکرہ بطور بے لوث خدمت اور اعلیٰ اخلاق کی مثال کے، کیا ہے۔ اس کا تقابل ہمارے لیڈروں سے کیا جائے، بالخصوص ان پاکستان اور جموں کشمیر کے نام نہاد لیڈروں، کارکنوں اور صحافیوں کا جنھوں نے کشمیر کے نام پر، پاکستان کی ایجنسیوں، سفارتخانوں اور آزاد کشمیر کے عوام سے کروڑوں روپیہ حاصل کر کے برطانیہ، یورپ اور امریکہ کے علاوہ دبئی اور امارات میں تجارت، کاروبار اور جائیدادیں بنائی ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے انگریز ممبران پارلیمنٹ کا کردار باعث مثال اور باعث صد تحسین ہے۔

وزیراعظم بے نظیر کا آخری تحفہ

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی بریفنگ کے مطابق، انچارج جنوبی ایشیا، رابن رافیل نے وزیر خارجہ اور وزیراعظم پاکستان اور ہندوستان سے اسلام آباد اور نئی دلی میں ملاقاتیں کیں اور صدر کلنٹن کی منظور کردہ، جموں کشمیر کو خودمختار بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ اس کے واپس جانے کے ایک ہفتہ بعد، وزیراعظم نے بیان جاری کیا، کہ خودمختار جموں کشمیر نہ تو پاکستان کو منظور ہے اور نہ ہی ہندوستان اور چین کو قبول ہے۔ یہ تو قابل فہم بات تھی، کہ بقول وزیراعظم پاکستان، یہ تجویز ان کو قبول نہ تھی، مگر تعجب اس میں تھا، کہ محترمہ نے ہندوستان اور چین کی جانب سے یہ دعویٰ کیسے کر دیا؟ ہندوستان کے وزیراعظم نرسیما راؤ تھے، انھوں نے اور ان کی وزارت خارجہ نے، اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا تھا۔ یہی پوزیشن چین کی تھی، بیشک ان کو یہ تجویز پسند نہ ہوئی ہوگی، مگر ان کی طرف سے وزیراعظم پاکستان کا تبصرہ اور انکار، بین الاقوامی آداب اور اخلاق کے مغائر تھا۔ امریکہ کی طرف سے جموں کشمیر کی سیاسی اور جغرافیائی وحدت قائم رکھتے ہوئے، پاکستان، ہندوستان اور جموں کشمیر کی انا، فتح وشکست کے ماورا اب تک آخری قابل عمل تجویز، جس کی گہرائی میں جائے بغیر، سرسری جائزہ پر ہی، مسترد کر دیا گیا اور سندھ طاس معاہدہ، اعلان تاشقند، معاہدہ شملہ، اعلان لاہور اور اعلان اسلام آباد کی روح بحال رکھی گئی۔ ریاست جموں کشمیر کے اقتدار اعلیٰ اور حق حکمرانی کے اہل و مالک عوام، جو ریاست سے متعلق کسی معاہدے اور اعلان میں فریق نہ ہیں اور جن سے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق

خودارادیت کے تحت عہد کیا گیا ہوا ہے، بجائے اس کے کہ ان سے کوئی مشاورت کی جاتی، دوطرفہ مذاکرات کے تحت فیصلہ کرنے کے عمل نے، جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت کی، اساس ہی ساقط کردی گئی ہے اور جموں کشمیر کی تحریک آزادی کی، حیثیت بدل کر زمین کا تنازعہ قرار دے کر، بندر بانٹ اور تسلط کا رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ کشمیری عوام بدستور آزادی، کے لئے قربانی دے رہے ہیں اور حصول مشن تک دیتے رہیں گے۔

وزیراعظم بے نظیر کا انتقام

میری ریٹائرمنٹ سے کئی ماہ قبل، سپریم کورٹ میں جج کی خالی اسامی پر میری تقرری کے لئے، چیف جسٹس اور صدر نے سفارش کی ہوئی تھی۔ مجھے اس کا پہلے علم نہ تھا۔ وزیراعظم پاکستان نے، بحیثیت چیئرپرسن جموں کشمیر کونسل، اس کی توثیق کرنی تھی۔ گلگت بلتستان کے متعلق ہمارے فیصلہ پر، وہ بہت غصہ میں تھیں۔ حالانکہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر کے اور جج صاحبان کو وزیر قانون پاکستان، اقبال حیدر کے ذریعے، بھوربن کوہ مری میں، بقول جسٹس محمد تاج، فیصلہ بدلنے پر پابند بھی کر دیا جا چکا تھا، مگر جب متعلقہ وزیر نے، میری تقرری کی فائل پیش کی، تو اس وقت ممتاز حسین راٹھور اور اسحاق ظفر وہاں پہلے سے موجود تھے، بقول ان کے، بے نظیر میرا نام سنتے ہی، آگ بگولہ ہوگئی اور کہا کہ جسٹس ملک کی تقرری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس نے گلگت کا فیصلہ کر کے، ہمیں مشکل میں پھنسا دیا تھا۔ ممتاز راٹھور نے اس ماحول سے بروقت فائدہ اٹھایا، اس نے بے نظیر سے کہا، کہ میرپور میں پیپلز پارٹی کا مخلص، سینئر وکیل محمد یونس سرکھوی ہے، اس کی تقرری کر دیں۔ بے نظیر نے یونس سرکھوی کو براہ راست جج سپریم کورٹ مقرر کر دیا، یہ وہی وزیراعظم بے نظیر تھیں، جو چند ماہ قبل سروسز کے مقدمہ میں، میرے فیصلہ پر خوش ہوئی تھیں، کہ میرے اعزاز میں عشائیہ دیا اور سب مہمانوں کے سامنے، جس میں افضل ظلہ چیف جسٹس پاکستان بھی تھے، کہا کہ ملک صاحب آپ جیسے قابل جج کو تو چیف جسٹس پاکستان ہونا چاہیے، اب جج مقرر کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ حالانکہ جب چیف جسٹس سپریم کورٹ کی ریٹائرمنٹ ہوئی تو، فیصلہ سے قبل چیف جسٹس سپریم کورٹ مقرر کرنے کی مجھے اس وقت پیشکش کی گئی تھی۔ مگر میں نے چیف جسٹس ہائی کورٹ رہنے کو ترجیح دیتے ہوئے، انکار کر دیا تھا۔ جب اس انکار کا علم ہوا تو، میں بہت خوش ہوا، اس طرح عدلیہ میں متعدد بار مختلف ادوار میں حکومتوں سے ٹکراؤ میں، نشیب و فراز سے گذر کر ریٹائرمنٹ کے لمحات قریب سے قریب تر آ گئے۔

الیف آئی یو، سے آخری مصافحہ

میرپور میں وکالت کے دوران فوجی عدالت یا فوج سے متعلق، کسی مقدمہ سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ مجھے جج مقرر ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے، کہ وادی لیپہ کا ایک نوجوان جو مظفرآباد قلعہ میں کئی ماہ سے محبوس تھا، اس کا مقدمہ میرے سپرد ہوا، پہلے کئی ماہ سے وہ مقدمہ سردار شریف سن رہے تھے، ان کی استدعا پر مجھے بھی بینچ میں شامل کر لیا

گیا۔ محبوس لڑکا، ایف آئی یو کی حراست میں تھا، مجھے ایف آئی یو کا مطلب اور اس کے دائرہ کار کا علم ہی نہ تھا، معلوم ہوا کہ اس کا مطلب، فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ تھا اور پاکستان ڈیفنس ایکٹ کے تحت جاسوسی کے متعلق مقدمات، اس کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ مگر وہ تعمیل کر کے حاضر نہ ہو رہے تھے اور نہ ہی محبوس کو پیش کر رہے تھے۔ میں نے اس رویہ پر، جی او سی کو مری کو خط ارسال کیا، جس کے حکم پر پہلی دفعہ محبوس کو پیش کیا گیا۔ نوجوان کو بے گناہ پا کر آزاد کر دیا گیا۔ اس مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہی تھا، کہ اس کے بعد ایف آئی یو سے متعلق تمام مقدمات میرے سپرد ہوتے رہے اور لائن آف کنٹرول کے قریب آباد، عوام کی حق رسی ہوتی رہی۔ اس دوران ہندوستان پاکستان کی افواج کے دونوں ممالک میں اور بالخصوص، جموں کشمیر کے دونوں اطراف کے، بہت ہی دلچسپ واقعات اور کنٹرول لائن پر واقع آبادیوں سے متعلق اہم معلومات حاصل ہوئیں، جس کے لئے الگ سے کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات۔ اس سے قدرے زیادہ تلخ ہیں کشمیری عوام کے اوقات و حالات۔ میری ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل، ایک محبوس کو پیش عدالت کرنے سے، پس و پیش کیا جانے لگا، چند بااثر لوگوں کی ایما پر بطور انتقام، ایک خوددار نوجوان کو محبوس کیا گیا تھا۔ اس رویہ پر میں نے حکم دیا، کہ دونوں ملکوں کی فوج اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت، دفاع اور سیکیورٹی کے لئے، آزاد کشمیر اور سیزفائر لائن، کے دونوں طرف استصواب رائے تک مقیم ہے۔ آزاد کشمیر میں، قانون ساز اسمبلی سے منظور کردہ قوانین نافذ العمل ہیں۔ دفاع، آزاد کشمیر حکومت اور اسمبلی کے دائرہ اختیار میں نہ ہے، اس لئے یہ اسمبلی دفاع کے متعلق قانون نہ بنا سکتی ہے، اور نہ ہی نافذ کر سکتی ہے۔ پاکستان ڈیفنس ایکٹ یہاں نافذ نہ ہے، لہٰذا ایف آئی یو اس کے تحت کسی کے خلاف گرفت نہیں کر سکتی ہے۔ اس کی نقول جی ایچ کیو، حکومت پاکستان اور وزارت خارجہ کو ارسال کر کے کہا، کہ اس پر عدالت میں جواب دہی کی جائے، اس پر طوفان کھڑا ہو گیا، البتہ ایف آئی یو والے پیش ہوئے، محبوس بھی پیش ہوا، جس نے بیان دیا، کہ اس کو آزاد کر دیا گیا تھا۔ ایف آئی یو کے بریگیڈیئر کا مطالبہ تھا، کہ آرمی ایکٹ کے نفاذ سے متعلق حکم میں نظر ثانی کی جائے، مگر میں نے حکم برقرار رکھا، جواب تک قائم ہے۔

الوداع اعلیٰ عدلیہ

اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل و کرم، قدم قدم پر راہنمائی، غیر جانبداری، دیانتداری اور جرأت سے فرائض کی بجا آوری پر، میرے ساتھ شامل حال رہا، بالآخر ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۴ء کو میں نے عدالتی گاؤن اور پرچم اتار دیا۔ ہائی کورٹ میں میرے جانشین، بچپن کے ساتھی اور شناسا، چوہدری شیر زمان تھے، انھوں نے فل کورٹ ریفرنس میں بہت عزت دی اور میرے عہد کی، روایتی، رسمی اور غیر رسمی، ذاتی طور پر تعریف کی، وکلاء میں سب سے زیادہ ادبی اور ظرافت سے مزین خطاب ایڈووکیٹ جنرل رفیق محمود کا تھا۔ اس میں جملہ بازی، لطیفہ گوئی اور مدح سرائی کا اسلوب اختیار کیا گیا

تھا۔ ہائی کورٹ سٹاف کی طرف سے ترتیب دی ہوئی تقریب تو عملاً تقریب عروسی تھی، بیشک اس میں دولہا اور دلہن کے کردار بیک وقت مجھ میں سموئے ہوئے تھے، مگر تقریب گاہ میں روشنی، قمقموں اور پھولوں سے آراستہ پنڈال، بینڈ کی دلآویز سریلی دھن پر خود رقص کا سماں پیدا کر رہا تھا۔ سٹاف نے میری محبت کا اس رات بھرپور مظاہرہ کیا۔ سب مہمان شاداں شاداں، اس قدر خوبصورت تقریب سے خوب لطف اندوز ہوئے، یہ مظفرآباد کی بستی میں ایک شاہکار اور اپنی مثال آپ تقریب تھی۔ اس میں محض روایتی سجاوٹ اور بناوٹ نہ تھی، بلکہ دل و دماغ میں رچی محبت اور احترام کی خوشبو اور مہک تھی۔

سردار عبدالقیوم کو ریٹائرمنٹ کا یقین

یہ محض اتفاق تھا، یا کہ حالات کی ستم ظریفی، کہ مجھ سے قبل مسلم کانفرنس حکومت کے دور میں، مسلم کانفرنس حکومت کی طرف سے خود مقرر کردہ اور اس کی سفارش پر بنائے گئے اعلیٰ پائے کے، اچھے جج صاحبان ملک محمد اسلم، راجہ محمد خورشید ریٹائر ہوئے۔ اس سے قبل چیف جسٹس محمد یوسف صراف، چیف جسٹس سردار محمد شریف، چیف جسٹس چوہدری رحیم داد ریٹائر ہوئے، مگر نہ تو حکومت کی سطح پر اور نہ ہی ریاست کی سطح پر، کوئی الوداعی تقریب منعقد ہوئی اور نہ ہی جائز مرتبہ کے تحت، انہیں رخصت کیا گیا، بلکہ یہ اعلیٰ روایت ہی گویا، متروک ہو چکی تھی۔ جب میری ریٹائرمنٹ ہوئی، تو سردار عبدالقیوم وزیراعظم کی جانب سے اعلیٰ سطح کی الوداعی تقریب کا پرتکلف اہتمام کیا گیا۔ وزیراعظم نے نہایت ہی نپے تلے، شایان شان اسلوب میں عدلیہ کا معیار بلند کرنے، اس کی اعلیٰ کارکردگی عالمی سطح پر منوانے اور وقار بلند کرنے پر تعریف کی۔ عدلیہ اور حکومت کے درمیان کشیدگی کو غلط فہمی قرار دے کر، اجتماعی رواداری پر اطمینان کا اظہار کیا۔ وزیراعظم کی طرف سے شیلڈ اور تحائف پیش کیے گئے، اس پر مہمانوں اور صحافیوں کو خوشگوار تعجب ہوا۔ اسلام آباد پریس کلب کے سینئر صحافیوں نے اس قدر عزت افزائی سے مجھے رخصت کرنے کا سبب پوچھتے ہوئے کہا، کہ آپ تو ہمیشہ جسٹس ملک سے نالاں رہتے اور کہتے تھے، کہ وہ سیاستدان جج تھا۔ سردار عبدالقیوم صاحب نے مسکرا کر کہا، کہ سیاستدان جج اس لئے کہتا تھا، کہ اس کے خلاف کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں، اور پورے احترام سے الوداعی اعلیٰ سطح کی تقریب اس لئے منعقد کی، کہ اس بات کا یقین کر لیا جائے، کہ جسٹس ملک واقعی ہی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا، کہ اب افسوس ہو رہا ہے، کہ اس جج سے، پنجاب پاکستان میں کشمیر پراپرٹی اور منگلا ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی کے منافع کی آمدن حاصل کرنے کے فیصلے کیوں نہ کروائے، ان کو حاصل کرنے کے فیصلے، صرف جسٹس عبدالمجید ملک ہی کر سکتا تھا۔ انھوں نے رواداری کے طور پر، میری اور عدلیہ کی عزت افزائی کی۔

صدر سردار سکندر حیات کا تحفہ

سردار سکندر حیات سے نسبتاً زیادہ خانگی اور ذاتی تعلقات تھے، ہمارے چند ایک دوست بھی مشترک تھے،

مگر میرے جج ہائی کورٹ اور چیف جسٹس کے طور پر کچھ فیصلوں، جن کی سپریم کورٹ میں توثیق ہوئی، کی وجہ سے ان کے کان بھرے گئے، وہ خود وکیل تھے، ان کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی، مگر اقتدار میں گھمنڈ اور تکبر ہوتا ہے، اس کی نفسیات میں ہی من مانی اور خود پسندی ہوتی ہے، جو کینہ اور انتقام کو جنم دیتی ہے اور اس پر اردگرد چاپلوس، خوشامدی اور چغل خور درباری طبقہ کی جعلی اور نمائشی ملمع سازی، بڑے بڑے دانشور جابکدست، دانا حکمرانوں میں خود پسندی پیدا کردیتی ہے۔ شاید ان میں سے کچھ عوامل ان کے مزاج پر غالب آ گئے ہوں، ورنہ اس قدر غلط فہمی کی بظاہر اور کوئی وجہ نہ تھی۔ البتہ مجھ میں، شاید جسے میں خوبی سمجھتا رہا، بحیثیت جج اور چیف جسٹس، صدر اور وزیراعظم کو سلام پیش کرنے جانا اور نمائشی تعریف کرنا، میرے مزاج اور عادات میں شامل نہ تھا۔ ہوسکتا ہے اس کو برا سمجھا گیا ہو، بالخصوص جبکہ میری سطح کے دوسرے ساتھی، ایسا کر کے قربت حاصل کرنے میں کامیاب تھے، تاہم میں سکندر حیات کا بڑا پن سمجھتا ہوں، کہ انھوں نے میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں الوداعی ظہرانہ دیا۔ بحیثیت میزبان، مہمانوں کے بڑے اجتماع میں میرے عدالتی فیصلوں، عدلیہ کا عالمی سطح پر وقار بلند کرنے اور روشناس کروانے پر میری کاوشوں اور دانشوری کی تعریف کے ساتھ، شیلڈ بھی دی۔ میں نے سکندر حیات کا، زندگی کے اس حصہ کی خوشگوار مسافت طے کرنے میں، ان کی قابل تحسین معاونت اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔

ممتاز راٹھور کے تاریخی الفاظ

مظفرآباد کی سنٹرل بار کی جانب سے، اسمبلی ہوسٹل کے بڑے ہال میں، الوداعی عشائیہ کا انتظام تھا۔ حسب روایت بہت سے وکلاء نے میرے رویہ اور کارگذاری کے متعلق خوبصورت انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ ممتاز حسین راٹھور سنٹرل بار کے صدر تھے، تقریر کے فن میں اس کو خوب مہارت تھی۔ اس نے جب مظفرآباد میں وکالت شروع کی اور میری عدالت میں پہلی بار پیش ہوا، تو مقدمہ میں بحث شروع کرنے سے پہلے کھڑے ہو کر کہا، ملک صاحب ایک عرض ہے۔ میں نے کہا بتایئے، اس نے کہا، کہ میں ایک ہفتہ سے جائزہ لینے کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، کہ مظفرآباد کے وکلاء کو قانون بہت کم معلوم ہے، یہ صرف عدالت میں تقریر پر کام چلا رہے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ ان سب سے اچھی تقریر میں کر لیتا ہوں۔ لہٰذا واقعات مقدمہ پر تقریر میں کروں گا اور مقدمہ سے متعلقہ قانون، آپ استعمال کریں گے۔ کورٹ روم بھرا ہوا تھا، اس پر میں تو مسکرایا، مگر باقی سب نے، بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ممتاز راٹھور نہایت خوش شکل، خوش لباس اور خوش گفتار تھا۔ عشائیہ میں تقریر شروع کرتے ہی، اس نے کہا، کہ دو آدمی بہت بدقسمت ہیں، ایک وہ جو ذوالفقار علی بھٹو کا جانشین وزیراعظم بنا اور دوسرا وہ، جو چیف جسٹس عبدالمجید ملک کا جانشین چیف جسٹس مقرر ہوا۔ کیونکہ نہ وہ بھٹو جیسا وزیراعظم بنا اور نہ ہی ملک صاحب کے معیار پر پورا اترنا اور خوش اسلوب رہنا ممکن ہوگا۔ نئے چیف جسٹس شیرزمان چوہدری اس پر مسکرا دیئے، البتہ باقی جج صاحبان قدرے جزبز ہوئے، مگر

راٹھور دوٹوک بات کرنے کا عادی تھا، وہ بھٹو کا شیدائی تھا، کچھ سال بے نظیر کے ساتھ رہا، مگر جب بے نظیر نے سلطان محمود کو وزیراعظم آزاد کشمیر نامزد کیا تو وہ احتجاجاً مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گیا۔

راولاکوٹ میں سردار سلیمان خان کی دعوت

مظفر آباد، ہٹیاں بالا، میر پور، بھمبر، کوٹلی، فتح پور نکیال، پلندری، عباسپور، راولاکوٹ اور باغ کے وکلاء، بار ایسوسی ایشنز کی جانب سے بہت پر تکلف تقریبات منعقد ہوئیں۔ ماتحت سول اور ڈسٹرکٹ جج صاحبان اور قاضی صاحبان کی جانب سے مشترک تقریب اسلام آباد میریٹ، فائیو سٹار ہوٹل میں ہونی مقرر ہوئی تھی، مگر چیف جسٹس ہائی کورٹ کی جانب سے، اجازت رخصت نہ ملنے کی وجہ سے منعقد نہ ہو سکی تھی۔ راولاکوٹ ہورنہ میرا گے، سردار سلیمان خان ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ نوجوانی میں ۱۹۴۷ء میں جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہ سردار ابراہیم خان کے رشتہ دار اور پڑوسی تھے۔ ریٹائرمنٹ کے دو ہفتہ بعد میرے ہاں میر پور تشریف لائے۔ ان سے شاید ایک یا دو بار جسٹس سید محمد کے ہمراہ ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے اعزاز میں راولاکوٹ ہورنہ میرا میں، ظہرانہ دینے کی دعوت دیتے ہوئے، دوسرے چار پانچ موجود مہمانوں کے سامنے، میری تعریف میں کلمات کہتے ہوئے کہا، کہ "ان کا کوئی مقدمہ کبھی میری عدالت میں نہ تھا اور نہ ہی اس کے کسی رشتہ دار کا مقدمہ میرے پاس پیش ہوا، مگر آزاد جموں کشمیر میں جس خوش اخلاقی، دیانتداری اور جرأت سے، آپ نے بڑے بڑے مقدموں میں فیصلے کیے، ان سے متاثر ہو کر مجھے اشتیاق تھا کہ آپ سے ملوں اور آپ کے اعزاز میں بڑی تقریب منعقد کروں، مگر ڈر تھا کہ شاید آپ انکار نہ کر دیں، اس لئے آپ کی ریٹائرمنٹ کا منتظر رہا۔ لہٰذا اب حاضر ہوا ہوں، مجھے تاریخ بتائی جائے"۔ میں نے عزت افزائی پر، ان کا شکریہ ادا کیا اور دیگر مصروفیت کی وجہ سے معذرت پیش کی، مگر انہوں نے بضد ہوتے ہوئے کہا، کہ وہ انتظار کر لیں گے، مگر ان کی دعوت قبول کرنی ہوگی۔ اس پر دوسرے مہمانوں نے بھی زور دے کر ان کی تائید کی، اس پر پروگرام طے ہوا۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں، جب ہورنہ میرا پہنچا، تو پنڈال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سردار محمد ابراہیم خان، سابق صدر، ان کے علاوہ سردار مختار خان، افضل خان، عنایت خان، سردار لطیف خان وغیرہ، وکلاء، جج صاحبان اور پونچھ کے معززین بھی شامل تھے۔ سب نے لمبی چوڑی تقریریں کیں، جن میں تعریف ہی تعریف تھی۔ سردار ابراہیم خان نے بہت دلچسپ گفتگو کی۔ انہوں نے کہا، "ملک صاحب، شاید آپ کو علم نہ ہو، کہ یہ سردار سلیمان، میرا قریبی رشتہ دار اور پڑوسی ہے، میں تین دفعہ حکومت میں صدر رہا ہوں، مگر اس نے میرے اعزاز میں چائے کی پیالی تک کا انتظام، نہ کیا۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے اعزاز میں اتنا بڑا فنکشن، سردار سلیمان نے کیا ہے اور اس کا تمام انتظام، اسلام آباد کے فائیو سٹار ہوٹل نے کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب آپ کے احترام میں یہاں موجود ہیں، مگر میں ابراہیم خان، آپ کے احترام کے ساتھ ساتھ، سلیمان خان کے

ڈر کی وجہ سے تقریب میں آیا ہوں"۔ اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار تھا، کہ پونچھ کے معززین اور سردار سلیمان خان نے، اس اعلیٰ سطح پر میری عزت افزائی کی تھی۔ یہ زندگی کا عظیم سرمایہ تھا جس پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

ہم عصر جج صاحبان

آزاد جموں کشمیر حکومت کے ابتدائی اعلان ۴ راکتوبر اور باضابطہ قیام ۲۴ راکتوبر ۱۹۴۷ء کے وقت، ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شیخ عبدالمجید اور چوہدری نیاز احمد، جج مقرر ہوئے۔ شیخ عبدالمجید کی ریٹائرمنٹ پر، لاہور کے سید فیاض حسین شاہ، چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ چوہدری نیاز احمد کے بعد، خان عبدالحمید خان اور دوسرے جج خواجہ محمد شریف مقرر ہوئے۔ سید فیاض شاہ کے بعد عبدالحمید خان چیف جسٹس اور سردار یار محمد خان جج مقرر ہوئے۔ سردار یار محمد خان کی وفات پر، چوہدری رحیم داد جج اور عبدالحمید خان کے بطور صدر حکومت مقرر ہونے پر، خواجہ محمد شریف چیف جسٹس اور محمد یوسف صراف جج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اس عرصہ میں شروع سے شیخ محمد حفیظ، ایڈووکیٹ جنرل تعینات رہے۔ اس دوران جوڈیشل بورڈ بحال کیا گیا اور خواجہ محمد شریف کو چیف جسٹس مقرر کیا گیا، جبکہ چوہدری رحیم داد کو چیف جسٹس ہائی کورٹ اور ان کی جگہ ملک محمد اسلم کو جج ہائی کورٹ مقرر کیا گیا۔ خواجہ محمد شریف کی ریٹائرمنٹ پر، محمد یوسف صراف چیف جسٹس، جوڈیشل بورڈ مقرر ہوئے۔ سردار محمد شریف اور راجہ محمد خورشید، جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں جوڈیشل بورڈ کی جگہ سپریم کورٹ کے قیام پر چوہدری رحیم داد، چیف جسٹس اور راجہ محمد خورشید، ملک محمد اسلم جج سپریم کورٹ، یوسف صراف چیف جسٹس ہائی کورٹ، سردار سید محمد اور میری تقرری بطور جج ہائی کورٹ ہوئی۔ یوسف صراف کے بعد سردار محمد شریف، چیف جسٹس اور چوہدری شیر زمان، جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ چوہدری رحیم داد کی ریٹائرمنٹ پر راجہ خورشید چیف جسٹس سپریم کورٹ تعینات ہوئے۔ سردار شریف کی ریٹائرمنٹ پر میری تقرری بطور چیف جسٹس ہائی کورٹ ہوئی۔ سید محمد جج سپریم کورٹ اور سردار محمد اشرف، راجہ محمد اکرم اور قاضی عبدالغفور جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ راجہ اکرم اور قاضی عبدالغفور کی ریٹائرمنٹ پر، بشارت احمد شیخ، خواجہ محمد سعید، ان کے بعد چوہدری ریاض اختر، چوہدری محمد تاج اور محمد صدیق فاروقی، جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے اور محمد یونس سرکھوی جج سپریم کورٹ مقرر ہوئے۔

باب چہارم

سیاست اور تحریک آزادی سے وابستگی

پسِ منظر

۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے خاتمہ اور برطانوی استعماریت کے ہندوستان پر تسلط کے نتیجہ میں قائم ہونے والی حکومت برطانیہ نے، حکمت حکمرانی مؤثر اور فعال بنانے کے لئے، قانون نافذ کرنے کا عمل ۱۸۵۸ء میں شروع کیا۔ اس میں ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۵ء میں بتدریج جدت پیدا کی جاتی رہی اور ہندوستان کے عوام کو بھی، شامل حکمرانی کم و بیش کیا جاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ۱۸۸۵ء میں ایک سابق ملازم انگریز Alan Octavian Hume نے، انڈین کانگرس نامی سیاسی تنظیم قائم کی۔ انگریز نے اقتدار، مسلمان بادشاہت ختم کر کے حاصل کیا تھا، آبادی زیادہ تر ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی، لہٰذا ہندوؤں کی وفاداری حاصل کرنے کی پالیسی اپنائی گئی اور مسلمانوں کو، حریف قرار دے کر، ان کو ہر سطح پر کمزور اور تقسیم کرنے کی، حکمت عملی اختیار کی گئی۔ اس حکمت عملی کو مسلمان علماء اور شرفاء کی انگریز کے نظام سے دُوری اور بائیکاٹ سے مزید تقویت حاصل ہوئی، جس کے احساس کے نتیجہ میں، سرسید احمد خان نے ۱۸۷۷ء میں، ایم اے او کالج علی گڑھ میں قائم کیا۔ جس نے ان کی وفات کے بائیس سال بعد، یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کی۔ اسی احساس کے تحت ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں، نواب سلیم اللہ خان نے مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے، اجلاس منعقد کیا جس میں مسلم لیگ قائم کی گئی، جس کے صدر آغا سلطان محمد منتخب ہوئے۔ کانگرس اور مسلم لیگ بالآخر جدوجہد کر کے آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

کشمیر بحیثیت ملک، اپنی الگ شناخت اور عروج و زوال کی تاریخ کا حامل رہا ہے۔ ہندو، بدھ اور اسلامی سلطانی ادوار کے امتزاجات کا مرقع اور تہذیب و تمدن کا حامل ملک، پہلی دفعہ اکبر اعظم کی فتح کے تحت، برصغیر کا حصہ بنا۔ احمد شاہ ابدالی نے اسے کابل افغانیہ کے تابع اور رنجیت سنگھ نے اس کو پنجاب کی سلطنت میں شامل کیا۔ ۹ر مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ لاہور کی شق ۳ کے تحت، رقم تاوان جنگ کی عدم ادائیگی کے عوض، دربار لاہور نے کمپنی بہادر کو دریا بیاس اور سندھ کی درمیان واقع، قلعے، پہاڑی علاقے مع کشمیر اور ہزارہ، ہمیشہ کے لئے واگذار کر دیئے، چنانچہ یہ تمام علاقے جو دریائے روای کے دائیں کنارے اور سندھ کے بائیں کنارے پر واقع تھے اور معاہدہ لاہور کے تحت، ایسٹ انڈیا کمپنی کو واگذار کیے گئے تھے، پچھہتر لاکھ روپیہ نانک شاہی، کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ کو معاہدہ امرتسر کے تحت ۱۶ر مارچ ۱۸۴۶ء کو ہمیشہ کے لئے فروخت کر دیئے گئے۔ گلاب سنگھ نے دریائے سندھ کے دائیں

کنارے پر واقع گلگت کے تمام علاقہ جات بھی، ریاست میں شامل کر لیے۔ بالآخر ۱۸۷۰ء میں چیف آف نگر اور ہنزہ نے ایک تحریری معاہدہ کے تحت، ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی اطاعت قبول کر لی، جس کے بعد چترال کے مہتر نے بھی، معاہدہ کے تحت مہاراجہ کی باجگذاری تسلیم کر لی۔ کوہ غذر، اشکومن، جو قبل ازیں مہتر چترال کے ماتحت تھے، اب براہ راست مہاراجہ کے زیر انتظام آ گئے۔ اس طرح جدید ریاست جموں کشمیر معرض وجود میں آئی۔ ڈوگرہ گلاب سنگھ کا آبائی تعلق، جموں سے تھا، جس وجہ سے کشمیر کے ساتھ جموں چسپاں کر دیا گیا۔ تبت کا حصہ لداخ بلتستان اور گلگت اور اس کے شمال مغرب ملحقہ علاقے زیر انتظام لائے جانے کے بعد اس کا نام جموں کشمیر و تبت ہا بحیثیت ریاست لکھا جانے لگا۔

آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کا قیام

انسانی تاریخ گواہ ہے، کہ جب سے نظریہ ریاست نے جنم لیا ہے۔ نظریہ خاندانی کے مانند طاقتور افراد اور طبقہ، زمینی وسائل اور انسانوں کا حتی المقدور استحصال کرتا چلا آ رہا ہے، جابر اپنی قوت کے بل بوتے پر حاکمیت قائم کرتا اور اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جاتا ہے۔ یہ کشمکش صدیوں پر محیط رہی ہے، جس کے نتیجہ میں ملکوں کی وسعت سکڑتی، پھیلتی اور بدلتی رہی ہے۔ جموں کشمیر میں اس عمل کے تحت ڈوگرہ خاندان کا تسلط قائم ہوا، مگر

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

کے مصداق عوام میں، احساس احترام آدمیت اور حقوق انسانیت کا، ہر مذہب اور فلسفہ و منطق درس دیتا چلا آ رہا ہے۔ انسانی عظمت، بیداری کے لبادہ میں تحریک کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ اسی جذبہ نے جموں کشمیر میں یکے بعد دیگرے دو واقعات کے ردعمل میں واضح طور پر آزادی کے حق کی منظم شکل اختیار کر لی۔ معاہدۂ امرتسر کے تحت، ایک قوم کی خرید و فروخت کے خلاف نفرت اور غصہ تو تھا ہی، مگر اکثریت آبادی مسلمانوں سے، حکمرانی کے تکبر و غرور میں ظالمانہ رویہ اختیار کرکے، جموں عیدگاہ میں ۱۹؍اپریل ۱۹۳۱ء کو خطبہ عید پر پابندی عائد کر دی گئی، تو جموں کشمیر کے علاوہ پنجاب، بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اس پر احتجاج کیا اور مذہبی آزادی پر قدغن کی مذمت کی۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد ہی جموں جیل میں، توہین قرآن کا واقعہ پیش آنے پر جلتی نے تیل کا کام کیا۔ فضل داد نامی کنسٹیبل، پنجسورہ کی تلاوت کر رہا تھا، لبھو رام ہیڈ کنسٹیبل نے اس کو دھکا دیا اور پنجسورہ زمین پر گرا دیا۔ اس واقعہ اور خطبہ عید پر بندش کے خلاف، پوری ریاست میں مظاہرے، جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں ایک اجتماع حضرت بل سری نگر میں منعقد ہوا، جس کے اختتام کے بعد عبدالقدیر نے تقریر کی اور اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ بنا۔ ۱۳؍جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل میں سماعت تھی، جہاں مسلمانوں کا ہجوم جمع ہو گیا، تکرار اور پھر گولی چلنے پر ۲۲ مسلمان

شہید ہو گئے اور کئی زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ سے ریاست بھر میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ مہاراجہ نے مسلمان قیادت سے مذاکرات شروع کیے۔ اس دوران سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ اور جموں میں چوہدری غلام عباس نے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی، مگر میرپور، بھمبر اور راجوری میں عدم ادائیگی مالیہ اور ٹیکس کی تحریک نے بلوؤں اور ہنگامہ آرائی کی شکل اختیار کر لی جس کی تحریک احرار پنجاب نے حمایت کا اعلان کر دیا۔

تحریکِ میرپور

میرپور میں اس سے قبل، ہندو بنیا کے سودی نظام کے خلاف، مسلمانوں میں اشتعال تھا، چنانچہ عدم تعاون اور عدم ادائیگی لگان کی تحریک، جموں میں پابندی خطبہ عید و توہین قرآن اور شہدا سرینگر کی تحریک میں سمو کر، ڈوگرہ آمریت کے خلاف بغاوت اور ریاست میں مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کی حیثیت اختیار کر گئی۔ جس کی قیادت راجہ محمد اکبر، مولوی محمد عبداللہ سیاکھوی، غازی الٰہی بخش، مولوی عبدالکریم، مولوی عبدالحق، مولوی عبدالغنی ڈنڈے والا، حاجی وہاب الدین، حاجی علم دین قصاب، غازی عبدالرحمٰن کھوئی رٹہ اور دیگر متعدد نوجوان کر رہے تھے۔ تحریک احرار کے چنیوٹ کے جتھہ کی قیادت کرتے ہوئے غازی الٰہی بخش، دریا جہلم بمقام گتالیاں پتن عبور کر کے چیچیاں داخل ہونے پر ڈوگرہ پولیس نے شہید کر دیئے۔ اس پر مسلمان اور مشتعل ہو گئے۔ ضلع میرپور سے مہاراجہ کی تمام انتظامیہ، پولیس اور فوج بھاگ گئی۔ ڈڈیال میں پوٹھہ بنگش اور پوٹھہ شیر کے عوام نے پولیس سے اسلحہ چھین لیا، اسی دوران جموں میں بھی ہنگامے شروع ہو گئے۔ مہاراجہ نے بے بس ہو کر وائسرائے سے انگریز فوج بھیجنے کی استدعا کی۔ چنانچہ جموں میں انگریز یونٹ نے امن قائم کیا اور میرپور میں دوسری دفعہ، انگریز رجمنٹ نے مسلمانوں کے مطالبات منوا کر جنوری ۱۹۳۲ء کے آخر میں امن بحال کیا۔ مگر بعد میں معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے غداری، بغاوت اور بلوؤں کے جرائم کے تحت، عوام پر مقدمے بنائے گئے اور گرفتاریاں کی گئیں علاقہ کھڑی، میں نواں گراں کے صوبے شاہ، انگسیٹ پور کے ملک فضل احمد اور بھمبر غازی گڑھا کے راجہ ولایت خان عرف باتے خان کو ٹکٹکی پر کوڑوں کی سزا دی گئی تھی۔ عوام کو ایک سال سے ایک ماہ تک قید اور جرمانہ کی سزائیں دی گئی تھیں۔ وادی سماہنی کے راجہ محمد زمان عرف بڈھے خان کی جاگیر ضبط کر لی گئی تھی۔ جبکہ اندر ہل میں تحریک کی حمایت کرنے پر ملک فیض عالم خان، میرے نانا کو موہڑہ ملکاں کی، نمبرداری سے معزول کر دیا گیا تھا۔ طویل مقدمہ بازی کے بعد ۱۹۴۰ء میں نمبرداری بحال ہوئی۔ اس سے قبل ۱۸۴۶ء میں معاہدہ امرتسر پر عملدرآمد کے لئے، میرپور میں انگریز رجمنٹ کی مدد سے گلاب سنگھ نے نظام بحال کیا تھا۔ چوہدری غلام عباس نے اپنی کتاب، ''کشمکش'' میں میرپور کی تحریک کو اہمیت نہیں دی، البتہ، شیخ عبداللہ نے آتش چنار میں اس کا ذکر کیا ہے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے، جموں کشمیر میں اس وقت کی سیاسی قیادت، شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کو نااہل قرار دیتے ہوئے تحریر کیا ہے، کہ مسلمانوں میں ۱۹۳۱ء کی تحریک

میں اس قدر جوش، جذبہ اور عزم تھا کہ مہاراجہ کی حکومت عملاً ختم ہو چکی تھی اور اس نے انگریز وائسرائے کی مدد سے دوبارہ ریاستی نظم ونسق قائم کیا۔ اگر مسلمان لیڈر مذاکرات کی آڑ میں، مسلمان عوام کو امن قائم کرنے پر مجبور نہ کرتے، تو مہاراجہ گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ انھوں نے کمشن کی تقرری سے اتفاق کر کے، مسلمان عوام کی تاریخ ساز انقلابی تحریک کو، چند مفاداتی رعائتوں کے عوض ختم کر دیا۔ البتہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں عوام کی تحریک کے نتیجہ میں، سیاسی تنظیم آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس، سرینگر میں قائم ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ صدر اور چوہدری غلام عباس خان، سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ سبز پرچم پر چاند ستارہ اور سفید ہل کا نشان بطور قومی پرچم منظور ہوا۔ مسلم کانفرنس کا نصب العین، ذمہ دار نظام حکومت اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ قرار دیا گیا۔ گلینسی کمشن کی پیش کردہ سیاسی اور معاشی اصلاحات کی روشنی میں، اور برصغیر کی سیاست کے اثرات کے تحت، تحریک کو وسیع تر کرنے کی سوچ نے جنم لیا۔ ایک مخصوص رائے ہے کہ شیخ عبداللہ انڈین کانگرس اور وادی کے کشمیری پنڈتوں کے زیر اثر آ گئے اور نیشنل کانفرنس قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ جموں کے معروف صحافی اور دانشور، بلراج پوری نے اپنے انگریزی ماہنامہ میں، ۲۰۱۳ء میں انکشاف کیا، کہ چوہدری غلام عباس اور میرپور کے معروف سنت سردار بدھ سنگھ اتفاق سے، کٹھ جیل میں تھے۔ رمضان شروع ہوا تو چوہدری صاحب نے روزے رکھنے کی ضرورت کے پیش نظر، جیل حکام کو سحری اور افطار کے لئے انتظام کرنے کا کہا۔ سردار بدھ سنگھ کا اگرچہ سکھ مذہب سے تعلق تھا، مگر چوہدری صاحب سے روزہ کی اصلاحی برکت اور افادیت سے قائل ہو کر، ان کے ساتھ تمام روزے رکھے۔ بقول پوری، چوہدری غلام عباس، سردار بدھ سنگھ کے اس عمل اور انسانی حقوق کے تحفظ اور اصلاحات کی جدوجہد سے متاثر ہو کر، ان کو اپنی تنظیم میں شامل کرنے پر متفق ہو گئے اور مسلم کانفرنس کو، نیشنل کانفرنس میں بدلنے کی تحریک شروع کی۔ بلراج پوری کے مؤقف کی تائید یا تردید کسی اور باوثوق ذریعہ سے نہ ہوئی ہے، البتہ یہ درست تھا کہ سردار بدھ سنگھ، نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر تحریک کا حصہ رہے۔

نیشنل کانفرنس کا قیام

۱۱ر جون ۱۹۳۹ء کے جنرل کونسل کے اجلاس میں، مسلم کانفرنس کی تنظیم کا نام بدل کر، آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس طے پایا۔ قومی پرچم سبز کے بجائے انقلابی سرخ رنگ اور مظلوم طبقہ کسان کا سفید ہل، جس سے زمین کی کاشت ہوتی ہے، برقرار رکھا گیا۔ سرینگر کے اس اجلاس میں چوہدری حمیداللہ نے اس کی مخالفت میں تقریر کی۔ نیشنل کانفرنس میں سوشلسٹ نظریہ کے حامل افراد بھی شامل ہوئے، مجموعی طور پر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ، غیر مسلم محروم طبقہ کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد کا بھی اعلان کیا گیا، مگر جموں اور سرینگر کی، سیاسی اور معاشرتی سوچ میں بنیادی تضاد، مختلف شکلوں میں ابھرنا شروع ہو گیا اور برصغیر کی بہت فعال اور متحرک سیاسی کشمکش اور تفریق وتقسیم کا اثر، نمایاں ہوتے ہوئے، ذاتیات پر محیط ہو کر رہ گیا۔ الزامات اور جوابی

الزامات، وسیع سیاسی اختلاف کی شکل میں، ۱۹۴۲ء میں چوہدری غلام عباس کی نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اور مسلم کانفرنس کی بحالی پر منتج ہوئے۔ سیاسی خلیج بڑھتی چلی گئی اور قومی تحریک کا طاقتور متحد دھارا، تقسیم ہو کر، کمزوری کا شکار ہو گیا اور لمحات کی خطاؤں نے صدیوں کی سزا پائی، جو نہ ختم ہونے والی غلامی کی اندھیری رات کی شکل اختیار کر گئی۔

قائداعظم کا دورۂ کشمیر

لاہور میں قائداعظم سے ملاقات کر کے، مسلم کانفرنس کی طرف سے چوہدری غلام عباس اور نیشنل کانفرنس کی طرف سے شیخ عبداللہ اور مولانا سعید مسعودی نے کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ حسب پروگرام، قائداعظم ۸رمئی ۱۹۴۴ء کو سیالکوٹ سے جموں کے لئے روانہ ہوئے سوچیت گڑھ، ریاست کی سرحد پر ان کا استقبال کیا گیا، جموں کا تمام شہر اور دیہاتوں کے عوام امڈ کر سڑک پر آ گئے۔ سڑک محرابوں سے سجادی گئی تھی، جموں کے عوام نے استقبال کی نئی تاریخ مرتب کی تھی، عیدگاہ کے کھلے میدان میں جلسہ منعقد ہوا، مکانوں کی چھتوں پر بھی خواتین اور مرد مسلمانوں اور ہندوؤں کا جم غفیر تھا، شاید ہی کوئی انسان گھر میں رہا ہوگا۔ قائداعظم نے انگریزی میں تقریر کی اور اے آر ساغر، فی البدیہہ اس کا ترجمہ کرتے رہے۔ تقریر ختم ہوتے ہی خلاف معمول، وائسرائے ہندوستان سے ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے، والے قائد نے، ساغر کو گلے لگالیا اور کہا کہ ساغر، میری تقریر سے تمہارا ترجمہ، بہت ہی مؤثر تھا، اس پر خوب تالی بجی۔ ۹رتاریخ کو سرینگر کے لئے روانہ ہوئے، رات بانہال ریسٹ ہاؤس میں بسر کی۔ ۱۰رمئی ۱۹۴۴ء کو وہاں سے سرینگر روانہ ہوئے، تو بانہال سے سرینگر تک، دیہاتوں کے لوگ مرد عورتیں بچے جوق در جوق، سڑک پر قائد کو قریب سے ہو کر دیکھنے کے لئے، ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو گئے۔ سرینگر شہر دلہن کی طرح سجایا گیا تھا، دونوں جماعتوں کے کارکنوں نے محرابیں اور آرائشی گیٹ، بڑھ چڑھ کر رنگ برنگے پھولوں، کپڑوں اور جماعتی پرچموں سے آراستہ کیے۔ سرینگر کی خواتین قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے جذبہ سے سرشار، چھتوں، بالکونیوں اور سڑکوں پر امڈ کر آ گئیں۔ سرینگر کا حسین منظر قابل دید تھا، نیشنل کانفرنس نے استقبالیہ تقریب، پرتاپ پارک میں منعقد کی، جیالال کلم نے انگریزی میں اور شیخ عبداللہ نے اردو میں خطبہ سپاس پیش کیا۔ قائداعظم نے جواب میں کہا کہ ''آپ نے بحیثیت صدر مسلم لیگ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیڈر کے، میرا استقبال کیا ہے، جس پر کوئی بادشاہ بھی جتنا چاہے فخر کر سکتا ہے۔ میں آپ کا خیر سگالی کا پیغام، ہندوستان کے مسلمانوں کو پہنچاؤں گا اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان، آپ کی جدوجہد آزادی میں برابر کے شریک ہیں''۔ مسلم کانفرنس نے ڈل گیٹ کے پاس درگجن میں استقبالیہ تقریب رکھی تھی، تمام راستہ محرابوں سے سجایا گیا تھا، سپاسنامہ کے جواب میں قائداعظم نے اپنی گرجدار آواز میں تاریخ ساز خطاب میں کہا ''ہم مسلمان؛ ایک اللہ، ایک قرآن، ایک کعبہ اور ایک پیغمبر پر یقین رکھتے ہیں، ہم کو چاہیے کہ ایک تنظیم، ایک پلیٹ فارم، ایک پرچم اور ایک لیڈر کی قیادت میں متحد ہوں''۔ جموں کشمیر میں قائداعظم

نے صحیح قائدانہ پیغام دیا، مگر خود پسند اور انا پرست قیادت نے اس پر قطعاً توجہ نہ دی۔ انھوں نے چوہدری غلام عباس کو نصیحت کی کہ ''اگر ریاست کی قیادت کرنی ہے تو کشمیری زبان سیکھو''۔ ان کو کشمیری نہ آتی تھی۔ ایک ملاقات میں شیخ عبداللہ سے دولوک کہا'' جو اُس نے آتش چنار میں تحریر میں لایا، کہ میں آپ کے باپ کی مانند ہوں اور میں نے سیاست میں، اپنے بال سفید کیے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہندو پر، اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کبھی آپ کے دوست نہیں بن سکتے۔ میں نے زندگی بھر، ان کو اپنانے کی کوشش کی، مگر ان کا اعتماد حاصل کرنے میں، کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ وقت آئے گا جب آپ کو میری بات یاد آئے گی اور آپ افسوس کریں گے''۔

قائداعظم کے قیمتی الفاظ پتھر پر لکیر ثابت ہوئے، جس پنڈت نہرو کی دوستی کا اسیر ہو کر شیخ عبداللہ نے جموں کشمیر کو اس کی گود میں ڈالا، اسی کی حکومت کے تحت ۱۴ سال جیل میں رہے اور اس کا خمیازہ جموں کشمیر کی تین نسلیں خون، عزت، عفت اور جائیداد کی قربانی کی شکل میں بھگت رہی ہیں اور روز مکافات نظر نہیں آرہا۔ قائداعظم اڑھائی ماہ مادر ملت کے ہمراہ کشمیر میں قیام کے بعد ۲۵ رجولائی ۱۹۴۴ء کو براستہ مظفر آباد واپس آئے، ان کے قیام کے دوران کشمیری نوجوان، کے۔ ایچ خورشید کی شکل میں، اپنی ذہانت اور تحریک پاکستان سے لگن کے سبب، ان کو ایک بااعتماد معاون ملا۔ جس کو بطور سیکریٹری ہمراہ لائے۔

قائداعظم کے کشمیر میں قیام کے دوران، جموں کشمیر میں تحریک آزادی سے وابستہ، سیاسی جماعتوں کے قائدین اور بااثر افراد سے متعدد ملاقاتوں سے تحریک پاکستان سے متعلق کشمیری عوام میں بہت بیداری پیدا ہوئی۔ قائد کے نظریہ کے اثرات کے ردعمل میں نیشنل کانفرنس کی دعوت پر، کانگریس کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، عبدالغفار خان، عبدالصمد اچک زئی اور میاں افتخار الدین سرینگر گئے۔ ان کے خلاف دریائی جلوس کے دوران، کشمیر کے عوام نے برہنہ ہو کر زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا، ان دنوں ذرائع ابلاغ بہت محدود اور کمزور تھے، اس کے باوجود یہ خبر عوام میں پھیل گئی، یہ مظاہرہ یکم اگست ۱۹۴۵ء کو ہوا، جس کے نتیجے میں ریاست کی سیاست، جو قبل ازیں ریاست کی آزادی تک محدود تھی، اس میں ریاست کے اندر انتشار اور تقسیم میں شدت آگئی اور ساتھ ہی نظریات میں بھی ہندوستانی سیاست کی فکر، اثر انداز ہو گئی۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی حمایت میں عوام تیزی سے گروہ بندی میں بٹنے شروع ہو گئے، حکومت کی سروس میں ملازم، تعلیمی اداروں میں استاد اور طلباء بھی، اسی طرح تقسیم ہو گئے۔ ان میں روزمرہ کی تکرار معمول بن گئی۔ باایں ہمہ ریاست کی آزادی کی تحریک کا وجود الگ رہا۔

کشمیر چھوڑ دو اور ڈائریکٹ ایکشن

ہندوستان کی آزادی کے معاملات یکسو کرنے کے لئے، حکومت برطانیہ نے کیبنٹ مشن جو تین ممبران پر مشتمل تھا، ہندوستان بھیجا، جو ۲۴ رمارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا۔ اس پر ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے

جسٹس مجید ملک اپنے پہلے دورہ راولاکوٹ کے دوران بحیثیت چیف جسٹس ایک فنکشن میں
بائیں سے جناب سردار مختار خان ایڈووکیٹ ،سردار روشن خان اور مرزا زید اللہ فہیم سٹیج پر تشریف فرما ہیں۔

جسٹس مجید ملک صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے ہمراہ
میجر جنرل محمد حیات خان سابق صدر آزاد کشمیر بھی موجود ہیں۔

جسٹس مجید ملک، محترمہ غنوی بھٹو چیئرپرسن پی پی پی شہید بھٹو پارٹی
پروفیسر نذیر تبسم، ڈاکٹر مبشر حسن میرپور ۲۰۰۲ء ایک استقبالیہ میں

جسٹس مجید ملک چیف منسٹر جموں کشمیر جناب مفتی سعید کے ہمراہ
۲۰۰۵ء جموں میں

جناب عبدالغنی لون، جناب وید بھسین، جناب کرشن دیو سیٹھی ۲۰۰۰ء
دورہ میرپور کے دوران ایک فنکشن میں، راجہ خالد اکبر، امان اللہ خان
اور ڈاکٹر ظفر یعقوب بھی سٹیج پر موجود ہیں

محمد شریف طارق ایڈووکیٹ، جسٹس مجید ملک،
جناب سردار عبدالقیوم خان ایک تقریب میں

جسٹس مجید ملک محمد نواز شریف وزیراعظم پاکستان کے ساتھ ۱۹۹۹ء

میاں ممتاز حسین جسٹس مجید ملک کے ہمراہ

پگواش کانفرنس اسلام آباد کے موقع پر جموں وکشمیر سے آئے وفد کے دورہ میر پور کے دوران، پروفیسر نور بابا، ڈاکٹر امیتابھ مٹو VC، پروفیسر بھیم سنگھ، ڈاکٹر نرمل سنگھ، اصغر کربلائی، پروفیسر چاڑک،
وید بھسین، انورادھا بھسین، انجو بھسین، پروفیسر ریکھا چودھری، جسٹس مجید ملک، منیر حسین چودھری، جسٹس اعظم خان، پروفیسر حنیف خواجہ، پروفیسر نذیر انجم، بیگم جسٹس مجید ملک، اسماء مجید ملک، ڈاکٹر زاہدہ قاسم
ہمایوں زمان مرزا، اصغر سینئر ایڈووکیٹ و دیگر میر پور آزاد کشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی دفعہ ایک ساتھ

جسٹس مجید ملک ہمراہ سردار محمد عبدالقیوم سابق براعظم آزاد جموں کشمیر، صاحبزادہ عتیق الرحمٰن، جناب عبدالغنی لون میجر جنرل حیات خان سابق صدر آزاد کشمیر امان اللہ خان چیئرمین JKLF میرپور ۲۰۰۰ء میں ایک استقبالیہ کے دوران

جسٹس عبدالمجید ملک، عبدالرحیم راتھر وزیر نیشنل کانفرنس، صاحبزادہ عتیق الرحمٰن فیض پوری اور طاہر یعقوب ملک ۲۰۰۶ء میرپور ایک استقبالیہ میں

جسٹس مجید ملک سابق وزیرِ اعظم بیرسٹر سلطان محمود چوہدری، راجہ ذوالقرنین خان،
میجر جنرل محمد حیات خان سابق صدر آزاد کشمیر کے ہمراہ ایک تقریب میں

جسٹس مجید ملک، ممتاز دانشور پروفیسر خان زمان مرزا سیکرٹری کشمیر لبریشن سیل کے ہمراہ

پرنس آف ویلز کالج جموں ۲۰۰۶ء میں جسٹس مجید ملک،
صابر انصاری ایڈووکیٹ، یش پال گپتا آف کوٹلی

جسٹس مجید ملک، وید بھسین جی، میڈم سوشوبھا بھاروے اور ملک اصغر ایڈووکیٹ
CDR کے تحت کانفرنس منعقدہ ۲۰۰۶ء جموں میں

اسلام آباد میں جناب عبدالغنی لون، صدر پیپلز لیگ سری نگر جموں کشمیر کے بیٹے سجاد لون کی شادی کے موقع پر
ممتاز کشمیری دانشور یوسف بچھ، جسٹس مجید ملک، راجہ خالد اکبر خان اور عبدالغنی لون
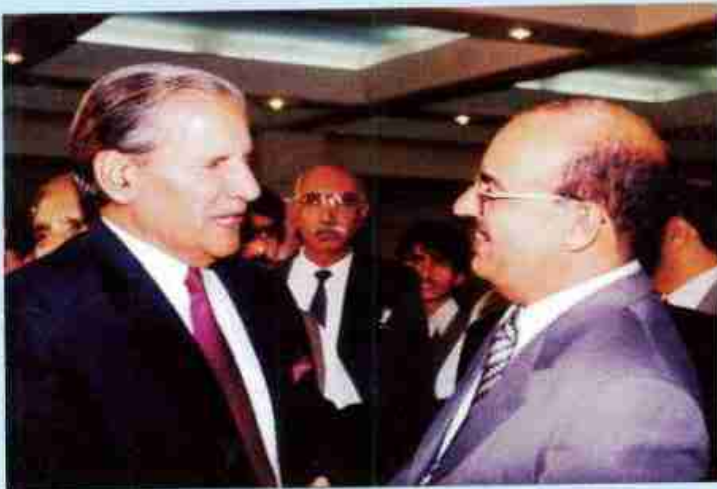
جسٹس مجید ملک و میجر جنرل سردار محمد انور سابق صدر
آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر ایک تقریب میں
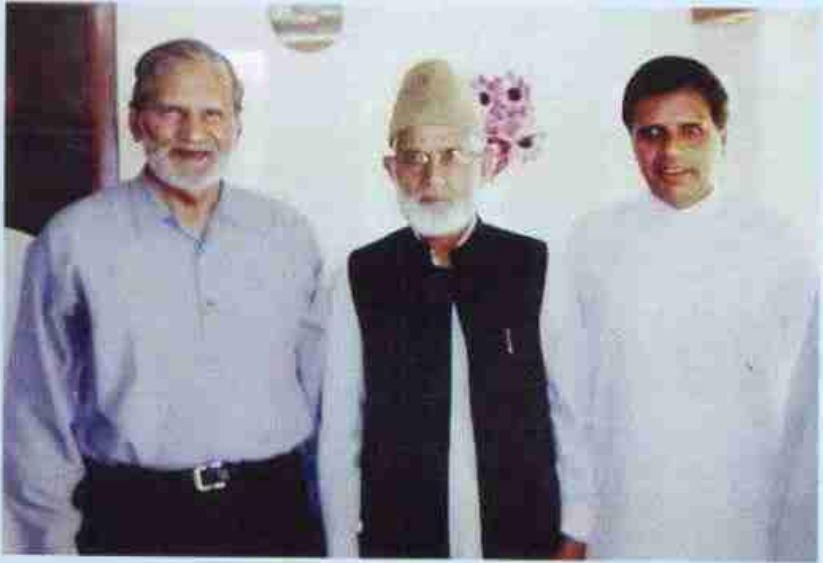
جسٹس مجید ملک، سید علی گیلانی چیئرمین حریت کانفرنس، منیر حسین چوہدری چیئرمین بھٹو شہید پارٹی
آزاد کشمیر جولائی ۲۰۰۵ء میں گیلانی صاحب کی رہائش گاہ سری نگر میں ملاقات کے دوران

جسٹس مجید ملک، فاروق عبداللہ سابق چیف منسٹر جموں وکشمیر و عبدالغنی کوہلی
جولائی ۲۰۰۵ء جموں میں ایک ملاقات کے دوران

مطالبہ پر مذاکرات شروع ہوتے ہی، ریاست کی تحریک میں تیزی آ گئی۔ ۱۰ رمئی ۱۹۴۶ء کو نیشنل کانفرنس نے مہاراجہ کے خلاف ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کر دی۔ ۲۰ رمئی کو شیخ عبداللہ گرفتار ہو گئے، اس کے مدمقابل مسلم کانفرنس نے سرینگر کے اجلاس میں، مطالبات کے حق میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا اور ۲۵ راکتوبر کو چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھی بھی گرفتار ہو گئے۔ ہندوستان میں تاریخی آزادی کی منزل قریب آ رہی تھی، مگر جموں کشمیر کی سیاست بہت ابہام، الجھن اور کنفیوژن کا شکار تھی۔ بقول سید علی احمد شاہ راہنما مسلم کانفرنس، چوہدری غلام عباس کی قیادت میں، ۱۲ رکنی وفد قائداعظم سے شملہ کانفرنس کے موقع پر ملا اور شیخ عبداللہ کی کشمیر چھوڑ دو تحریک اور گرفتاری کے علاوہ، مہاراجہ کے خلاف، ڈائریکٹ ایکشن کی تحریک بھی زیر بحث آئی۔ قائداعظم نے واضح کیا، کہ ''پاکستان بننے والا ہے۔ اب تحریک چلانے کا مرحلہ گذر چکا ہے، شیخ کو چھوڑ دو تم جموں کشمیر میں عوام کو پاکستان کے حق میں متحد اور منظم کرو''، مگر کوتاہ اندیش قیادت، کنوئیں کے مینڈک کے مانند بدلتے ہوئے حالات کا ادراک نہ کر سکی اور عوام کو ڈوگرہ حکمران اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر، بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ جس کا انجام نومبر ۱۹۴۷ء میں قتل و غارت، گھیراؤ جلاؤ اور لوٹ مار کی شکل میں جموں اور ملحق علاقوں میں ہوا، اور ان کو لاکھوں کی تعداد میں نقل مکانی کرنی پڑی۔ چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھی مارچ ۱۹۴۸ء میں، جموں جیل سے آزاد ہو کر سیالکوٹ پہنچے۔

قانون آزادی ہندوستان و قیام پاکستان

ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ، تقسیم اور قیام پاکستان کی شکل میں ہوا، جس کا اعلان ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ۱۸ رجولائی کو، قانون آزادی ہند کے نام سے، قانون منظور کیا، جس کا اطلاق ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء سے کیا گیا۔ اس کے تحت ہر دو، نوزائدہ ممالک کو انتقال اقتدار کے ساتھ دفعہ ۷ (ii) میں یہ بھی طے کیا گیا، کہ اسی دن برطانیہ اور ریاستوں کے راجوں مہاراجوں کے مابین تمام معاہدے، عہدنامے اور اقرارنامے ساقط ہوں گے اور ریاستوں کے عوام کا، اقتدار اعلیٰ بحال ہوگا۔ قانون آزادی کے تحت ریاستوں کے حکمرانوں کا حق اور اختیار حکمرانی ختم قرار پایا۔ تاہم وائسرائے، کانگرس اور مسلم لیگ میں پالیسی طے پائی، کہ ''ریاستوں کے حکمران کسی ایک ملک کے ساتھ، اپنی ریاست کا الحاق کرنے کے مجاز ہوں گے، تاہم وہ جغرافیائی قربت، عوام کے رجحان اور ریاست کے مفادات کے تحت، الحاق کا فیصلہ کریں گے''۔ ہندوستان کے قانون آزادی کے تحت، ریاستوں کو جو آزاد خودمختار حیثیت عود ہوئی تھی، ریاستوں کو اختیار حاصل تھا، کہ وہ خودمختار رہیں۔ اس کی تائید، اول کیبنٹ مشن کے اعلان میں جو ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء میں کیا گیا، اس کے بعد برطانیہ کی حکومت کے پالیسی بیان، ۲۰ رفروری ۱۹۴۷ء میں اور قانون آزادی منظور کرتے وقت ۱۸ رجولائی ۱۹۴۷ء کو، برطانیہ کی پارلیمنٹ نے، مباحثہ کے دوران بھی دوٹوک وضاحت کی کہ ''ریاستوں کو خودمختاری کا اختیار اور حق حاصل ہوگا''۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کا بھی یہی مؤقف تھا۔

کانگرس بھی یہ قانونی حیثیت تسلیم کرتی تھی تاہم ریاستیں بقول کانگریسی قیادت، وسائل کی کمی کے سبب کسی ایک ملک کے خلاف اپنا دفاع کر سکنے کے قابل نہ تھیں، لہٰذا ان کو الحاق کرنا ضروری تھا۔ کانگریس نے اپنا پالیسی اعلان ۱۴رجون اور قائداعظم نے ۱۸رجون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں کیا۔ حیدرآباد دکن اور ٹراونکور کے والیان ریاست نے، آزاد خودمختار رہنے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ نظام حیدرآباد نے، اپنا مستقل مندوب اقوام متحدہ میں اور سفیر پاکستان میں تعینات کر دیا، مگر ہندوستان نے دونوں ریاستوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔

جموں کشمیر

جموں کشمیر جغرافیائی طور پر پاکستان کے ساتھ، جنوب مغرب میں لمبی سرحد سے منسلک تھا اور گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ، جس کو دریائے راوی کٹھوعہ کی تحصیل، اب ضلع کٹھوعہ سے الگ کرتا ہے، سے ملحق تھا۔ جبکہ گورداسپور، بٹالہ، شکرگڑھ، سیالکوٹ سے جموں، اور بھمبر، میرپور، پونچھ، مظفرآباد، چیلاس اور گلگت تک سرحد، پاکستان کے صوبہ پنجاب اور خیبر پختونخوا سے ملحق ہے۔ اس کے دریا پنجاب اور سڑکیں بھی پنجاب اور خیبر پختونخوا میں ملتی ہیں۔ متحدہ ریاست میں آخری مردم شماری کے مطابق ریاست میں آبادی، مسلمان ۷۸ اعشاریہ ۱۱ فیصد، ہندو ۲۰ اعشاریہ ۲۰ فیصد، سکھ اور دیگر بدھ وغیرہ ایک اعشاریہ ۶۴ فیصد کی شرح سے تھی۔ اب اوسط آبادی مسلمان ۷۵ فیصد، ہندو سکھ بدھ وغیرہ غیر مسلم ۲۵ فیصد ہیں۔ اس طرح ہندوستان، پاکستان اور وائسرائے کے مابین طے شدہ پالیسی کے تحت، ریاست جموں کشمیر کے الحاق کی صورت میں، اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ مہاراجہ نے پاکستان کے ملحق تمام علاقوں کا دورہ کیا اور ڈوگرہ ہندو اور سکھ فوجی دستے داخلی راستوں پر تعینات کر دیئے۔ جبکہ مسلمان فوج لیہہ، لداخ، گلگت اور مظفرآباد کی سرحد پر منتقل کر دی، اس طرح اپنے طور پر دفاع کا حصار مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی۔

مہاراجہ کا انوکھا رویہ

ہندوستان میں ۵۶۶ ریاستوں کے راجوں، مہاراجوں نے ۳رجون کو، ہندوستان پاکستان کی آزادی کے اعلان کے بعد، اپنی اپنی ریاستوں کے مستقبل کے متعلق، متعلقہ حلقوں سے مشاورت شروع کر دی اور قانون آزادی ہند کی منظوری کے بعد، الحاق کا فیصلہ کر لیا مگر مہاراجہ نے سرینگر میں قیام کر لیا اور فیصلہ سے پس و پیش کی پالیسی اختیار کر لی، جبکہ اعلان قیام پاکستان کے بعد، ریاست کو پاکستان کا حصہ تصور کر لیا گیا تھا اور مسلمان عوام کی یہی سوچ تھی۔ اس دوران کانگریس کے ہندو لیڈر اور راجے مہاراجے بھی مہاراجہ سے سرینگر میں ملتے رہے مگر مہاراجہ مسلسل سوچ و بچار اور تذبذب میں رہا۔

وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی کشمیر آمد

وائسرائے ماؤنٹ بیٹن ریاستوں کے الحاق کے معاملہ میں بہت متحرک تھا وہ ظاہرو باہر کانگریس کے مؤقف کا حامی تھا۔اس نے کانگریس کی ایماپر صوبہ سرحد اور بہار کے مسلم اکثریتی علاقہ سلہٹ میں ریفرنڈم کروایا، کانگریس کوگمان تھا کہ غفار خان کے زیراثر سرحد کے پٹھان ہندوستان کے حق میں فیصلہ کریں گے ،جس کے ساتھ زمینی راستہ قائم رکھنے کے لئے جموں کشمیر کا الحاق، ہندوستان سے کروانا ضروری تھا۔مہاراجہ ذاتی طور پر شیخ عبداللہ اوراس کی حمایت کی وجہ سے، پنڈت نہرو کوناپسند کرتا تھا۔اس پس منظر میں پنڈت نہرو کے مشورہ سے، وائسرائے خود ۱۹؍جون کوسرینگر مہاراجہ سے ملاقات کے لئے آیا، تین دن مذاکرات ہوتے رہے، مہاراجہ نے آخری دن کی ملاقات میں فیصلہ کرنے کا وعدہ کیا، مگر آخری دن اس نے دردِسر میں مبتلا ہونے کا کہہ کر، ملاقات سے انکار کردیا اوروائسرائے بدوں فیصلہ کروائے، دہلی واپس آ گیا۔

مہاتما گاندھی کی سرینگر آمد

وائسرائے کے دورہ کی خاطرخواہ کامیابی نہ ہونے پر، پنڈت نہرو اور پٹیل نے پٹیالہ اور کپورتھلہ کے، سکھ مہاراجوں کوسرینگر بھیجا۔انہوں نے بھی مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق کی ترغیب دی۔آخر میں مہاتما گاندی یکم اگست ۱۹۴۷ءکوزندگی میں پہلی دفعہ، کشمیر آیا، تین دن قیام کے دوران، اس نے مہارانی تارادیوی اورمحل میں مقیم راج گروکا، مہاراجہ پر خانگی اثر استعمال کرکے ،ایک تو مہاراجہ سے شیخ عبداللہ کوقید سے آزاد کرنے، دوسرا کشمیر کے وزیراعظم رام چندکاک کوتبدیل کرنے کا فیصلہ کروایا۔رام چندکاک سرینگر کا پنڈت تھا، جوریاست کوآزادوخودمختار رکھوانے کا حامی تھا۔اپنے ذاتی دوست ،نواب آف بھوپال کے ذریعہ مہاراجہ نے قائداعظم کو بھی، جموں کشمیر آزادوخودمختار رکھنے کا تاثر دے رکھا تھا، البتہ اس کا اعلان حالات کے مطابق کیے جانے کا طے تھا۔مہاراجہ کومشکل یہ تھی کہ شیخ عبداللہ کوپنڈت نہرو (ہندوستان) کے حامی تھے، مگر مہاراجہ کے مخالف تھے، دوسری جانب گوکہ مسلم کانفرنس مہاراجہ کی حمایتی تھی، مگر پاکستان کے حق میں تھی، جس وجہ سے مہاراجہ الجھن میں تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔

سٹینڈسٹل اگریمنٹ

مہاراجہ نے الحاق کرنے یا ریاست کوخودمختار رکھنے کی فکری کشمکش کے دوران ڈاکخانوں، سول سپلائی اور رسل ورسائل کا نظام بدستور جاری رکھنے کے لئے، ہردوممالک کو"معاہدہ جوں کا توں" کے ذریعے تعلقاتی کیفیت برقرار رکھنے کی پیشکش کی، جو ہندوستان نے تو نہیں، مگر پاکستان نے قبول کرکے ۱۴؍اگست کو، انتقال اقتدار کے دن معاہدہ قبول کرلیا، چنانچہ ۱۵؍اگست کوآزادی کے دن، ریاست میں ڈاکخانوں پر پاکستانی پرچم لہرایا گیا۔رسل ورسائل اورسول سپلائی کا نظام بھی حسب سابق بحال رہا۔

شیخ عبداللہ کی مہاراجہ کو وفاداری کی یقین دہانی

مہاتما گاندھی کے دورہ سرینگر کے نتیجہ میں، وزیراعظم رام چند کاک کو فارغ کر کے، جسٹس مہر چند مہاجن، جو اس سے قبل پنجاب باؤنڈری کمشن میں، کانگریس کے نامزد رکن تھے، کو ریاست کا وزیراعظم بنایا گیا، وہ سردار پٹیل کا پسندیدہ اور مشرقی پنجاب میں ہائی کورٹ جج تھا۔ ہائی کورٹ سے رخصت دے کر، اس کو وزیراعظم مقرر کیا گیا تھا۔ مہاجن کی تقرری ریاست کی ہندوستان سے، الحاق کی حکمت عملی تھی۔ شیخ عبداللہ جس نے ایک سال قبل، مہاراجہ کے خلاف کشمیر چھوڑ دو، تحریک شروع کی تھی اس کی مہاراجہ سے، صلح کروائی گئی، چنانچہ شیخ عبداللہ نے ۲۶ ستمبر کو، مہاراجہ کے نام جیل سے خط تحریر کر کے، مہاراجہ، اس کے خاندان اور حکومت کی وفاداری کا، غیر مشروط عہد کر کے، یقین دہانی کروائی، کہ وہ موجودہ حالات میں مہاراجہ کی سربراہی اور حکمرانی میں کام کرنے پر تیار ہے۔ کانگریس اور مہاراجہ کو مسلم اکثریت کے توڑ کے لئے، مسلمان قیادت کی اشد ضرورت تھی، لہٰذا یہ رکاوٹ دور کردی گئی تھی، شیخ عبداللہ کو رہا کردیا گیا اور بعد میں شریک اقتدار کرلیا گیا، اول چیف ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں وزیراعظم کی حیثیت میں۔

مسلم کانفرنس کا کردار

ڈائریکٹ ایکشن کے ایجنڈا اور قانون توڑنے کے جرم میں، قائداعظم کی ہدایت کے خلاف، اکتوبر ۱۹۴۶ء میں گرفتار ہونے والے، چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھی، جیل میں آرام سے وقت گذارتے رہے، نہ ان کی گرفتاری کی اطلاع، قائداعظم کو دی گئی اور نہ ان کی رہائی کی کوشش ہوئی۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا انقلاب آیا، دونوں ملک آزاد ہوگئے۔ چوہدری غلام عباس صدر مسلم کانفرنس کی گرفتاری پر، ان کے نامزد، چوہدری حمیداللہ صدر اور آغا شوکت سیکریٹری جنرل کی جگہ، پروفیسر اسحاق قریشی سیکریٹری جنرل، نامزد ہوئے تھے، اس طرح مسلم کانفرنس کی قیادت ان کے پاس تھی، ان دونوں کا تعلق جموں سے تھا۔ چوہدری حمیداللہ کا آبائی گاؤں ہریاوالہ ضلع گجرات میں تھا، وہ چوہدری نیاز احمد سابق چیف سیکریٹری ریاست، اور جج ہائی کورٹ کے رشتہ میں کزن تھے، وہ وکیل تھے اور ممبر اسمبلی تھے۔ اے آر ساغر کے بعد اچھے مقرر تھے، اسحاق قریشی اپنے انٹرویو در انگریزی ماہنامہ، ہیرلڈ کراچی مارچ ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں اظہار کرتے ہیں کہ "جب قائداعظم نے پاکستان کا، گورنر جنرل بننے کا اعلان کیا، تو ان کو مبارک دینے اور ریاست میں سیاسی پوزیشن کے بارے میں، تبادلہ خیال اور ہدایات لینے، چوہدری حمیداللہ اور وہ، قائداعظم سے ملاقات کرنے دہلی گئے، ان کے بقول قائداعظم بہت خوش تھے اور انھوں نے ان سے سوال کیا، کہ معلوم ہے کہ میرا نام کس نے تجویز کیا تھا؟ ان کے انکار پر قائداعظم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ" ان کا نام بطور گورنر جنرل پاکستان، انھوں نے خود تجویز کیا تھا"۔ جب قائداعظم کو چوہدری غلام عباس کی گرفتاری کا بتایا گیا تو بقول اسحاق قریشی، قائداعظم نے غصہ میں کہا "یہ سوڈاواٹر سیاست مجھے پسند نہیں ہے"۔ طویل انٹرویو میں

وہ کشمیر پر اظہار کرتے ہیں کہ ''قائداعظم نے ان کو بتایا کہ قائداعظم کا مہاراجہ سے ایک مشترکہ دوست کے ذریعہ رابطہ تھا اور انھوں نے طے کیا تھا، کہ فی الحال کشمیر کے الحاق کا اعلان نہیں کرنا، بلکہ خودمختار ریاست، کا اعلان کرنا تھا۔ قائداعظم اور مہاراجہ کے دوست نواب آف بھوپال تھے''۔ قائداعظم نے ان کو ہدایت کی وہ جموں کشمیر کو خودمختار رکھنے کی حمایت کریں۔ یہ ملاقات جولائی کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی تھی۔ اس کا حوالہ چوہدری محمد علی، سابق وزیراعظم پاکستان نے بھی اپنی کتاب، ایمرجینس آف پاکستان میں صفحہ ۲۸ میں دیا ہے، وہاں یہ ظاہر کیا ہے کہ ''قائداعظم نے مسلم کانفرنس والوں کو بتایا، کہ ریاستوں کو الحاق کرنے یا خودمختار رہنے کا مکمل اختیار تھا اور معروضی حالات کو، سامنے رکھ کر مہاراجہ، کو کشمیر کا فیصلہ کرنا ہوگا''۔

قرارداد الحاق پاکستان ۱۹؍جولائی ۱۹۴۷ء

مسلم کانفرنس اگرچہ الحاق پاکستان کے نظریہ کی حامل رہی ہے اور اس کا دعویٰ رہا ہے کہ جنرل کونسل کے سرینگر میں منعقد کیے گئے اجلاس میں، ۱۹؍جولائی ۱۹۴۷ء کو کثرت رائے سے پاس ہونے والی، قرارداد میں مہاراجہ سے مطالبہ کیا گیا تھا، کہ ریاست کا پاکستان سے الحاق کیا جائے اور مہاراجہ ریاست کا حکمران رہے۔ اس کا اظہار سردار ابراہیم خان نے اپنی کتاب ''کشمیر ساگا'' میں صفحہ ۳۴ پر کیا ہے۔ اس قرارداد کی نقول مہاراجہ اور مسلم لیگ کے صدر کو ارسال کی گئی تھیں، مگر اس کا کیا جواب ملا، اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ خواجہ یوسف صراف صاحب نے ''کشمیریز فائٹ فار فریڈم'' اور چند دیگر مصنفین نے بھی اس قرارداد کا حوالہ دیا ہے۔ بادی النظر میں اس سے، اختلاف کرنا شاید مناسب نہ ہو، مگر چند واقعات اس کی تردید کا باعث ہیں۔ ان کے حوالہ کے بعد نتیجہ مستقبل کے، بے لاگ مؤرخ پر چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔ اول اس قرارداد کے منظور، نہ ہونے کا اظہار مسلم کانفرنس کے سیکریٹری جنرل پروفیسر اسحاق قریشی نے، اپنے انٹرویو انگریزی ماہنامہ ہیرلڈ کراچی ماہ مارچ ۱۹۹۳ء میں کیا ہے۔ دوئم، ۴؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائم کی جانے والی عبوری حکومت اور مہاراجہ کی حکومت کے معزول کیے جانے والے، مسلم کانفرنس کے لیڈروں کی طرف سے، جاری ہونے والے اور ریڈیو پاکستان کی نیوز بلیٹن میں نشر ہونے اور انگریزی روزنامہ سول ملٹری گزٹ لاہور میں ۷؍اکتوبر کو شائع ہونے والے ''اعلان'' میں اس قرارداد کا ذکر نہیں ہے، سوئم، ۲۴؍اکتوبر کو عبوری حکومت کا اعلامیہ، جو سردار ابراہیم کی کتاب ''کشمیر ساگا'' کے صفحہ ۱۱۸ میں درج ہے، اس میں اس کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس کے قطعی برعکس، ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے، ریاست کی آزادی کی جدوجہد کی حمایت کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اور آخر میں کہا گیا کہ جب ریاست، مکمل آزاد ہو جائے گی، تب رائے شماری میں فیصلہ کیا جائے گا، کہ آیا الحاق ہندوستان سے کرنا ہے یا پاکستان کے ساتھ۔ یہ اعلامیہ، سردار ابراہیم صدر عبوری حکومت اور اس کی مسلم کانفرنس کی کابینہ نے جاری کیا تھا، جو اب تک جوں کا توں ہے۔ بالفرض ۱۹؍جولائی کی سفارشی قرارداد

منظور کی گئی تھی، تو عبوری حکومت، جس کو بقول سردار ابراہیم مسلم کانفرنس کی مکمل حمایت حاصل تھی، اس کے اعلامیہ سے، اس کی حیثیت اور اہمیت ختم ہو گئی۔ علاوہ ازیں جب ہندوستان نے، اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر یکم جنوری ۱۹۴۸ء میں، پاکستان کے خلاف پیش کیا، تو پاکستان کی طرف سے ۱۵ر جنوری کو پیش کردہ مفصل جواب میں، پوری تحریک آزادی اور مسلم کانفرنس کے کردار کا تذکرہ ہے۔ لیکن ۱۹ر جولائی کی قرارداد کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی وزیر خارجہ، ظفراللہ خان کی طویل ترین تقریر میں، اور ہندوستان پاکستان کے درمیان، کشمیر سے متعلق خط و کتابت اور ٹیلی گراموں میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ جب مہاراجہ کے ہندوستان کے ساتھ، ریاست کے عبوری الحاق کا دعویٰ کیا گیا، تو بقول صدر، عبوری حکومت سردار ابراہیم، وہ بھاگتے ہوئے کراچی پہنچے اور وزیراعظم لیاقت علی خان کو، ریاست کا پاکستان سے الحاق کرنے کی پیشکش کی، مگر ان کی تجویز کو پذیرائی نہ ملی۔ اگر یہ بات صحیح ہے، تو اس سے پتا چلتا ہے کہ عبوری حکومت کے صدر اور مسلم کانفرنس کی کیا وقعت تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں قائداعظم اور لیاقت علی خان لاہور میں تھے اور سردار ابراہیم کشمیر ساگا، میں شکایت کرتے ہیں کہ بسیار کوشش کے باوجود، ان کی قائداعظم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر پروفیسر اسحاق قریشی کا کہنا تھا، کہ عبوری حکومت کے اعلان اور مظفرآباد پر قبائلیوں کے حملہ کے بعد، چوہدری حمیداللہ اور وہ لاہور میں قائداعظم سے ملے، تو قبائلی حملہ اور عبوری حکومت کے قیام پر، وہ سخت غصہ میں تھے اور حمیداللہ سے ناراض ہوئے اور کہا، کہ اس غلطی کا خمیازہ تمہیں بھگتنا ہوگا، جس پر حمیداللہ کے اپنی ڈائری میں، میٹنگ میں حکومت بنانے کی ان کو جو پیشکش ہوئی، اس کو ٹھکرانے اور انکار کرنے کی تفصیل بتانے پر، قائداعظم خاموش ہو گئے۔ اپنے انٹرویو سے قبل اسحاق قریشی نے، ان ملاقاتوں اور قائداعظم کے اس وقت کے ردعمل کا اظہار، ہمارے ساتھ میرپور میں بھی کیا بلکہ ایک دفعہ، میرپور ہوٹل جبیر میں، مجید نظامی روزنامہ نوائے وقت کی موجودگی میں بھی ذکر کیا۔ نوائے وقت میں ان کے مضامین اور انٹرویو بھی شائع ہوئے تھے، ان کے مطالعہ سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، کہ عبوری حکومت کیسے اور کیوں بنائی گئی تھی؟ اور یہ کہ اس کے بعد، مطلوبہ مقاصد حاصل ہوئے کہ نہیں۔ ایک رائے؛ غلط یا درست یہ بھی ہے، کہ مہاراجہ نے ۳ر جون کے اعلان آزادی اور ۱۵ر اگست کو نفاذ قانون آزادی ہند کے تحت، انتقال اقتدار بحق ہندوستان و پاکستان منتقل ہونے سے لے کر، مظفرآباد اور بارہمولہ پر ۲۲ر اکتوبر سے ۲۶ر اکتوبر کے قبائلی حملہ تک، باوصف وائسرائے ماؤنٹ بیٹن، مہاتما گاندھی اور کانگریسی لیڈروں کے دباؤ کے، ہندوستان سے الحاق نہ کیا تھا۔ اگر قبائلی حملہ نہ کیا جاتا، تو ہندوستان کو کشمیر میں فوج داخل کرنے کی جوازیت نہ ملتی اور جموں کشمیر کی پوزیشن مختلف ہوتی، لیکن سردار پٹیل کی نو جلدوں پر محیط، خط و کتابت اور پروفیسر السٹر لیمب کی کتاب ''ڈسپیوٹڈ لیگیسی'' کی دستاویزی تحقیق سے، پہلی رائے کی تردید ہوتی ہے اور اس بات کو تقویت ملتی ہے، کہ اندرون خانہ مہاراجہ، ہندوستان سے الحاق کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کا صرف یہ پہلو تشنہ تھا، کہ قبائلی غیر منظم تھے۔ ان کی

دلچسپی کشمیر پر تسلط قائم کرنے کی بجائے، لوٹ کھسوٹ میں زیادہ تھی، ان کی مہم غیر سنجیدہ ثابت ہوئی، اس کے برعکس ریاست کے مقامی سابق فوجیوں نے، بہترین فوجی مہارت اور حکمت سے محدود وسائل اور مقامی ساخت کے قدیم اسلحہ کے استعمال سے، آزاد خطہ حاصل کیا اور جواں مردی سے اس کا دفاع کیا۔ ہندوستان کی کثیر تعداد، باقاعدہ جدید اور بھاری اسلحہ سے لیس، ٹینکوں، توپ خانہ اور ہوائی فوج کے بھرپور حملہ کا مقابلہ، اس دور کا تاریخ ساز کارنامہ تھا۔ اگر وہ اسلحہ اور ہوائی مدد، آزاد کشمیر کی فوج کے پاس ہوتی، تو تاریخ مختلف ہوتی۔

میرپور میں تحریک آزادی کے اثرات

میرپور کے عوام زیادہ تر پیشہ زراعت سے وابستہ تھے، اس کے علاوہ فوج، مرچنٹ نیوی، پولیس وغیرہ کی ملازمت میں بھی شامل تھے۔ میرپور میں مسلمان اکثریت میں تھے، ہندو اور سکھ پانچ فیصد تھے، جو میرپور، بھمبر، کوٹلی اور ڈڈیال کے شہروں میں اور چند چھوٹے قصبوں میں آباد تھے۔ چند ہندو جاگیردار بھی تھے۔ علاقہ میں تجارت پر ہندوؤں اور سکھوں کی اجارہ داری تھی۔ میرپور کے ہندو اور سکھ، سُود کے کاروبار پہ چھائے ہوئے تھے، مقروض طبقہ صرف مسلمانوں میں سے تھا۔ گوکہ حکومت نے کسانوں کے تحفظ کے لئے، چند قوانین بھی نافذ کر رکھے تھے، اس کے باوجود ساہوکارہ نظام، مسلمان کسانوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ حکومت کے تمام ٹیکسوں کا بوجھ، بہت زیادہ تھا، جن میں زمین کے لگان میں اضافہ، زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مسلمان عوام جفاکش، محنتی اور دلیر تھے، مگر نچلا طبقہ غربت، قرض اور نادار کیفیت سے دوچار تھا۔ تعلیمی ادارے شہروں تک محدود ہونے کی وجہ سے، ہندو سکھ تعلیم یافتہ تھے۔ جب کہ دیہاتوں میں خاص کر، دور رہنے والے لوگ تعلیم سے محروم تھے۔ میرپور کے کسانوں کا بڑا مسئلہ، لگان اراضی کے ساتھ ساہوکارہ نظام تھا، میں ان حالات اور واقعات کا عینی گواہ ہوں، کہ کسان کی سال بھر کی محنت اور مشقت کے تحت حاصل کردہ فصل، ابھی کھلیان میں ہی ہوتی تو ساہوکار موقع پر پہنچ جاتا اور تمام اناج سابق قرض کے عوض لے لیتا اور کچھ حصہ اسی کسان کو مزید قرض کے عوض دے دیتا۔ کسان اور اس کا قبیلہ اپنی محنت کے حاصلات سے محروم ہو جاتا، کسان اور اس کے بچے سسکیوں اور آنسوؤں کو، دامن میں سمیٹے خالی ہاتھ، گھر لوٹتے، اس پر مزید بوجھ، لگان کا بھی ہوتا۔ غم اور دکھ کی ایسی داستان، ہر گاؤں میں سنی اور دیکھی جاتی۔ اس پس منظر میں، جموں میں عید کے خطبہ پر پابندی اور توہین قرآن کے سانحہ پر، میرپور کے مسلمان، حکومت اور ساہوکارہ نظام کے خلاف سراپا احتجاج ہو گئے۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء میں سنٹرل جیل سرینگر کے سامنے ۲۲ شہدا کے سانحہ نے، جلتی پر تیل کا کام کیا، خطبہ پر پابندی، توہین قرآن اور سرینگر کے شہدا کے واقعات سے میرپور کے عوام میں عدم ادائیگی لگان اور سود کی مخالفت بھی شامل ہوگئی۔ جس کی حمایت پنجاب میں بالخصوص اور ہندوستان میں بالعموم احرار تنظیم نے شروع سے کی۔ اس تحریک نے میرپور میں سیاسی قیادت کو جنم دیا۔

راجہ محمد اکبر خان

محمد اکبر خان نے جرأت، دلیری اور حق گوئی کی وجہ سے، جموں کشمیر کے صف اول کے راہنماؤں میں اعلیٰ مقام حاصل کیا، انھوں نے جموں میں مہاراجہ کے محلات کے سامنے، معاہدہ امرتسر اور مہاراجہ کے اختیار حکمرانی کو چیلنج کیا تھا، ان کے خلاف جموں میں، سیشن جج کی عدالت میں بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا، جس میں انھوں نے بے باکی کے ساتھ اقبال جرم کیا اور جیل میں سزا برداشت کی۔ اتفاق سے ڈڈیال میں تمام سیاسی قائدین کا، قیام و طعام نانا جان کے ہاں ہوتا، جس کے سبب مجھے جموں کشمیر کے تمام لیڈروں کو بہت قریب سے دیکھنے، سننے اور ان کی سیاسی اور اخلاق اقدار سے فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل رہی۔ میرپور میں وکالت شروع کی، تو جموں کشمیر کی تحریک آزادی پر ماہناموں اور ہفت روزوں میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ چنانچہ بزرگ راہنما، اے آر ساغر نے مجھے ملاقات کے لئے راولپنڈی بلایا۔ انھوں نے میری دلجوئی کرتے ہوئے، میرے مضامین کی تعریف کی اور مجھے طلب کرنے کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے کہا، کہ ریاست کے سیاسی راہنماؤں میں، ایک بہت نڈر، بے باک اور سچی بات کرنے والا لیڈر، ہم سب کی توجہ کا مستحق ہے۔ جس کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے۔ اس مرحلہ پر میں نے فی الفور کہا کہ آپ کا اشارہ راجہ محمد اکبر کی طرف ہے؟ تو اس پر ساغر صاحب چونک اٹھے اور کہا ہاں تم ٹھیک سمجھے! ساغر صاحب نے راجہ محمد اکبر کی، بے لاگ تعریف کرتے ہوئے کہا، کہ ریاست کے دو بڑے نامور لیڈر، شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس تھے۔ راجہ محمد اکبر جب تقریر شروع کرتے، تو ان کے چہرے پیلے پڑ جاتے، کیونکہ راجہ اکبر، مہاراجہ اور اس کی حکومت کے خلاف، سخت تنقید کرتے اور عوام کے مسائل اور ان کے حقوق کی ڈٹ کر، جرأت سے بات کرتے۔ مجھے انھوں نے تاکید کی، کہ راجہ اکبر کا تحریک آزادی میں، بڑا نام اور اعلیٰ مقام ہے، لہٰذا ان کی خدمت، جدوجہد اور قربانی ریاست کے عوام اور بالخصوص میرپور پر قرض ہے، کہ ہم سب ان کے کردار اور کارناموں کو بطور مثال، نئی نسل کے سامنے پیش کریں اور ان کے نقش قدم کی پیروی کریں۔ ۳ راگست ۲۰۰۵ء کو میں دہلی میں کشمیر کانفرنس کے بعد چند سیاسی دانشوروں سے، مسئلہ جموں کشمیر کے حل کے سلسلہ میں ملاقات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ نے چائے پر دعوت دی، میرے ساتھ راجہ اکبر کا اکلوتا بیٹا راجہ خالد اکبر اور بھٹو شہید پیپلز پارٹی کے، چوہدری منیر حسین ایڈووکیٹ بھی تھے۔ جب میں نے ان سے خالد اکبر کا تعارف کروایا، تو ڈاکٹر کرن سنگھ نے فوراً کہا خالد اکبر، ہمارے بڑے قومی لیڈر راجہ اکبر کے بیٹے؟ اور دوسری دفعہ خالد سے گلے لگ گئے۔ اس سے قبل جب ہم جموں میں ٹھہرے تھے، تو وید بھسین اور چند دیگر ہندو رہنما ہمیں مہاراجہ کے پرانے سیکریٹریٹ، مبارک منڈی لے گئے۔ وہاں سابق ایک سو سال کا ریکارڈ، آرکائیوز اور میوزیم قائم ہے۔ ساتھ ہی پرانی ہائی کورٹ اور سیشن کورٹ کی عمارتیں ہیں۔ تمام شعبوں کو ملاحظہ کرتے اور تفصیلی تعارف کے بعد، سیشن کورٹ جہاں راجہ اکبر خان کے خلاف

بغاوت کے مقدمہ کی سماعت ہوئی تھی۔ وہاں لے جا کر مقدمہ کی سماعت کی داستان بتائی۔ سماعت کی وقت وید بھسین اور چند دیگر عدالت میں حاضر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ راجہ صاحب پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا تھا اور چارج شیٹ میں بغاوت کا الزام منسوب کیا گیا تھا۔ جموں میں ہندو سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت کے دوران، عدالت کے اندر اور باہر عوام اور وکلاء کا ہجوم تھا۔ استفسار میں جج نے نام اور ولدیت کے بعد قوم یا ذات دریافت کی، تو راجہ اکبر خان نے کہا کہ "میری ذات مسلمان ہے"۔ اس نے دوبارہ ذات پوچھی تو جواب دیا مسلمان۔ تیسری بار سوال پر پھر وہی جواب دیا۔ جج نے سوال کیا تمہارا پیشہ کیا ہے؟ جواب دیا: "میرا پیشہ مہاراجہ کے خلاف بغاوت کرنا ہے"۔ جج نے بلند آواز میں کہا، اکبر خان سوچ کر جواب دو، تم سمجھتے ہو جو تم جواب دیتے ہو اس کا انجام کیا ہے؟ راجہ صاحب نے کہا میں بقائمی ہوش و حواس بیان دے رہا ہوں۔ جج نے دوسری بار اور تیسری بار سوال کیا۔ راجہ صاحب نے تینوں بار اقبال جرم کرتے ہوئے جواب دیا کہ "ان کا پیشہ مہاراجہ کی حکومت کے خلاف بغاوت تھا"۔

جموں میں قیام کے دوران، امر محل میں مہاراجہ کا سرخ ویلوٹ مخمل سونے کی تاروں سے آراستہ، شاہی تخت، دیوان خاص، دیوان عام، شاہی خواب گاہ، ملحق کشادہ غسلخانہ، لائبریری وغیرہ جو میوزیم قرار دیا گیا ہے اور دوسرا حصہ وزیر اعظم وزرا اور انتظامیہ کا سیکریٹریٹ، جو بدستور ڈاکٹر کرن سنگھ کی ملکیت میں ہے، وہاں اس کے بیٹے کا فائیو سٹار ہوٹل ہے۔ وید بھسین کا سابقہ تعلق ضلع میرپور کی تحصیل، بھمبر شہر سے ہے۔ جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں بھی ان کی جائیداد تھی۔ وہ راجہ محمد اکبر کے پیروکار اور شیدائی تھے۔ ان کی وفات گذشتہ سال جموں میں ہوئی۔ وہ ریاست جموں کشمیر کی وحدت اور خودمختار حیثیت کے حامی رہے۔ دو دفعہ راجہ محمد اکبر خان کی، برسی کی تقریب میں شرکت کے لئے وہ اور میرپور کے عظیم سپوت، کرشن دیو سیٹھی میرپور تشریف لائے۔ راجہ محمد اکبر خان نے میرپور سے اردو اخبار ہفت روزہ "سچ" نکالا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سچ اخبار، جموں شہر سے جاری ہوا اور اب روزنامہ کی حیثیت میں، "بیادگار راجہ اکبر خان" شائع ہوتا ہے۔

مولوی محمد عبداللہ سیا کھوی

مولوی محمد عبداللہ سیا کھوی کی، جائے پیدائش علاقہ اندرہل ڈڈیال کا گاؤں سیاکھ ہے۔ ان کو اپنی جائے پیدائش سے، لگن بھی تھی اور میرپور کے قریب لدڑ گاؤں کے مفتی عبدالحکیم کے والد، مولوی عبداللہ اور پوتا کھمباہ کے گاؤں میں مقیم، مولوی عبداللہ سے الگ، ذاتی شناخت کے لئے سیاکھ گاؤں کی نسبت، سے نام کے ساتھ سیا کھوی کا اضافہ کیا۔ ابتدائی تعلیم درویش منش بڑے بھائی، مولوی محمد ابراہیم سے حاصل کی۔ موہڑہ ملکاں ہمارے گاؤں کے اسلامی مکتب میں، مولوی اخونزادہ سے تین سال اسلامی فقہ پڑھنے کے بعد دیوبند مدرسہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے ہی جمعیت علماء ہند اور تحریک احرار میں حصہ لینا شروع ہو گئے۔ اس دوران جموں شہر میں خطبہ عید پر پابندی اور

توہینِ قرآن کے یکے بعد دیگرے دو واقعات رونما ہونے پر، پوری ریاست میں ڈوگرہ آمریت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ اس پر سرینگر میں ۱۳؍ جولائی ۱۹۳۱ء کو عبدالقدیر کے خلاف بغاوت کے مقدمہ کی سماعت کے دن، مسلمان ہجوم پر پولیس کی طرف سے گولی چلانے پر ۲۲ مسلمان شہید اور کئی زخمی ہو گئے تھے، جس نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ میرپور میں جموں کے واقعات سے پہلے ہی ہنگامے ہو رہے تھے۔ ان میں بھی تیزی آ گئی۔ عوام نے حکومت کے خلاف عدم تعاون اور عدم ادائیگی لگان کی تحریک شروع کر دی۔ جس کی قیادت راجہ محمد اکبر، مولوی عبداللہ سیاکھوی، میرپور شہر میں حاجی وہاب الدین اور نوجوان زرگر غازی الٰہی بخش، ان کے علاوہ پنڈ خورد کے مولوی عبدالکریم، مہتہ جاگیر کے مولوی عبدالحق، ڈڈیال رٹہ کے حکیم مولوی حیات علی، پوٹھہ کے مولوی عبدالغنی المعروف مولوی ڈنڈیوالہ، ملک فیض عالم خان، کوٹلی کھوئی رٹہ کے غازی عبدالرحمٰن، کھڑی کے ملک فضل احمد، سید صوبے شاہ، بھمبر کے راجہ ولایت خان، سماہنی کے راجہ محمد زمان المعروف بڈھے خان اور دیگر، کر رہے تھے۔ جموں کے منشی علی گوہر اس کے روحِ رواں تھے۔ سیاکھوی صاحب کو عربی، فارسی، اردو، میرپوری اور گوجری زبانوں میں عبور حاصل تھا، وہ میرپوری میں شعر بھی کہتے۔ ان کا اندازِ خطاب، قد و قامت، لب و لہجہ اور بھاری بھر کم جسم، عطاءاللہ شاہ بخاری سے مماثلت رکھتا تھا۔ ان دنوں ضلع میرپور کے لوگ نمازِ جمعہ، جامع مسجد محلہ گکھڑواں، غربی ہاتھی دروازہ، میرپور شہر میں ادا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں میرے نانا جی ملک فیض عالم نے ڈڈیال شہر کے قریب اپنی زمین وقف کی۔ جہاں جامع مسجد تعمیر کی گئی اور علاقہ اندرہل کے عوام نے یہاں نمازِ جمعہ ادا کرنی شروع کی۔ جامع مسجد میں سیاکھوی صاحب کو امام مسجد مقرر کیا گیا اور اس میں مکتب بھی قائم کیا گیا۔ جامع مسجد بہت بڑے مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی۔ سارے ہندوستان بالخصوص لاہور اور پنجاب کے علما کو مدعو کیا جاتا اور تین تین دن متواتر تقاریر ہوتیں۔ جمعہ اور دیگر ایام میں بچوں سے بھی تقاریر، بطور تربیت کروائی جاتیں۔ عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ اور میں نے، اسی درس گاہ میں تقریر کی تربیت حاصل کی اور فن سیکھا تھا۔ مولوی محمد ابراہیم، جو مدرسہ دیوبند میں چالیس سال استاد رہ چکے تھے۔ قرآن، حدیث، صرف و نحو کے استاد تھے۔ پیر علی جان شاہ اور ہم ان ہی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ سیاکھوی صاحب نے ہی مولانا مودودی صاحب سے بوجوہ، لاہور میں میری پہلی ملاقات کروائی تھی۔ ان میں حد درجہ کی ظرافت بھی تھی۔ جنوری کی ایک صبح کو، ہم بچوں کو اپنے گھر لے گئے اور گرم گرم حلوہ پیش کیا۔ ایک لڑکے نے حلوہ چبانا شروع کیا تو سیاکھوی صاحب نے اس کو ڈانٹ دیا اور کہا، کہ حلوہ اور مکھن چبانا، ان کی توہین ہے۔ اس پر اُس سے حلوہ نہ کھایا گیا تو مسکرا کر کہا، چبالو۔

شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے لیڈر ڈڈیال میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اُن دنوں ڈڈیال سے چوکھ دریا تک سفر پیدل اور گھوڑوں پر ہوتا اور دریا پار سے میرپور شہر تک ۹ میل کا سفر تانگہ پر کیا جاتا تھا۔ جب تمام لیڈر میرپور روانہ ہونے کے لئے دریائے پونچھ کے بائیں کنارے تانگہ اڈہ پر پہنچے تو جس تانگہ میں سیاکھوی صاحب نے سوار

ہونا تھا، اس کی آگے والی سیٹ پر شیخ عبداللہ اور راجہ اکبر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے پیچھے بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے کہا، کہ پیچھے بیٹھنا قرآن کی توہین ہے۔ میرے سینے میں تیس پارے قرآن حفظ ہے۔ اب تم دونوں فیصلہ کرلو کہ تمہاری پشت کس طرف ہوگی؟ اس پر وہ دونوں معذرت کرتے ہوئے نیچے اتر گئے اور مولوی صاحب کو آگے والی سیٹ پیش کردی۔ مولوی صاحب نے شاہانہ انداز میں کہا، کہ اب ما بدولت کے حکم کے تحت، تم دونوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ مسلم کانفرنس جب منظم ہوئی، تو سری نگر کے کنونشن میں، راجہ محمد اکبر خان، مولوی عبداللہ سیاکھوی اور حاجی وہاب الدین شامل تھے۔ ۱۹۳۱ء کی تحریک میں ان کو اور راجہ اکبر کو قید کی سزا ہوئی۔ ۱۹/اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔ جب مسلم کانفرنس کو سری نگر میں نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا تو پہلے اجلاس میں انہوں نے اس کی مخالفت کی اور چوہدری حمید اللہ کا ساتھ دیا۔ دوسرے روز شیخ عبداللہ، راجہ محمد اکبر اور چوہدری غلام عباس کے اصرار پر راضی ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک نیشنل کانفرنس میں رہے۔ راجہ اکبر خان اور سیاکھوی صاحب کی جوڑی بہت نمایاں اور مشہور تھیں۔ بعد میں ان کے ساتھ میر پور شہر کے سردار بدھ سنگھ اور کرشن دیو سیٹھی بھی شامل ہوئے۔

سیاکھوی صاحب نے بتایا کہ وہ پونچھ شہر میں جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران سامنے بیٹھا بکروالی گجر زار و قطار رو رہا تھا۔ مولوی صاحب نے سمجھا کہ مقدم کو ان کی تقریر نے بہت متاثر کیا تھا، کہ وہ اس قدر رو رہا تھا۔ تقریر ختم ہونے پر وہ بکروال گجر ان کے پاس آیا ان کے ہاتھوں کو چوما اور کہا "مولوی عبداللہ جب تم تقریر کرتو اور تمہاری داڑھی ہلتو تو ہم کو ہمارا پچھلے سال مر جانے والا بکرو بہت یاد آتو، جس پر ہم بہت روتو"۔ مولوی صاحب نے کہا پیچھے ہٹ او خناس، تم نے مجھے بکرے سے تشبیہ دی ہے۔ جیل میں ان کو چکی پیسنے کی سزا ملی تھی۔ اُن کی طرف سے مولوی عبدالغنی ڈنڈے والا چکی پیستا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں روتے بہت تھے۔ دیہات کے غریب ان پڑھ عوام کے علاج، عدالتوں میں مقدمات اور پولیس کے پاس ان کی مدد کو، ہر وقت تیار رہتے۔ انہوں نے اور راجہ اکبر خان نے ساہوکارہ سودی نظام کے خلاف بھی بڑا جہاد کیا۔ ان کی نظم لتر نامہ بہت پسند کی جاتی تھی۔ مولوی صاحب زیادہ تر اردو اور کبھی کبھی مقامی زبان میں تقریر کرتے، جب کہ راجہ اکبر زیادہ تر میر پوری زبان میں تقریر کرتے۔ البتہ سری نگر اور کشمیر کے باقی شہروں میں، اردو میں تقریر کرتے تھے۔ مصلحت اور خوف ان کے قریب نہ بھٹکتا۔ کھری اور سچ بات ڈنکے کی چوٹ کرتے۔ مجاہد منزل سری نگر میں راجہ اکبر صاحب کی تصویر آویزاں تھی۔

غازی الٰہی بخش

میر پور شہر میں پیدا ہوئے مگر تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ تحریر پڑھنا نہ آتا تھا، صرف دستخط 'الٰہی بخش' کرنا سیکھا تھا۔ جرأت اور دلیری کا پہاڑ، مستقل مزاج، منہ پر کھری بات کرنا ان کا معمول تھا۔ میر پور شہر میں، مسلمانوں کی حمایت میں ہندوؤں کے خلاف، سینہ سپر رہتے۔ ان کے مزاج اور سوشل انداز سے، ان کے کئی ساتھیوں کو اختلاف

رہا، مگر اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں پیش پیش رہتے۔ مسلم کانفرنس ۱۹۴۲ء میں بحال ہونے کے بعد باقی ہمعصر سیاستدانوں کے برعکس، عروج وزوال کے تمام مرحلوں میں غازی الٰہی بخش نے، مسلم کانفرنس اور چوہدری غلام عباس کا صحیح ساتھ دیا۔ کبھی بھی تذبذب اور لغزش کا شکار نہ ہوئے۔ ہمارے خاندان سے مراسم تھے، مگر ان کو مجھ میں اس قدر اعتماد تھا، کہ تمام سیاسی اور جماعتی امور میں، صبح سویرے مشاورت کے لئے آتے۔ ایک بار وزیر بھی بنے۔ منگلا ڈیم میں متاثرین کے مسائل حل کرنے میں مددگار رہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں میرپور شہر سے ہندوؤں کی نقل مکانی پر شہر اور متروکہ جائیداد کے انچارج بھی رہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے موقع پر، پنجاب میں قتل وغارت شروع ہونے پر پنجاب کے ملحقہ شہروں جہلم، سرائے عالمگیر، گوجرخان اور کچھ راولپنڈی کے ہندو، سکھ، نقل مکانی کرکے ڈوگرہ ہندو حکومت کے تحفظ میں، میرپور آنا شروع ہوئے تو مسلمانوں کے اسلحہ لائسنس منسوخ کر دیئے گئے اور اسلحہ جمع کروانے کا حکم ہوا۔ میرپور میں اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر سید علی احمد شاہ اور غازی الٰہی بخش کے خلاف، ضلع بدر کرنے کا وزیر وزارت، راؤ رتن سنگھ نے، حکم جاری کر دیا۔ جس پر یہ دونوں جہلم شہر منتقل ہو گئے۔ میرپور شہر کے مسلمان بتدریج جہلم منتقل ہو گئے۔ دریا کے کنارے واقع گوردوارہ میں نوجوان سابق فوجیوں کا، میرپور کی آزادی کے لئے کیمپ قائم کیا گیا۔ آزادی کے بعد غازی الٰہی بخش میرپور میں بیت المال کے انچارج اور مکمل کرتا دھرتا رہے، کئی سال بعد چوہدری نور حسین نے ان کا اور مسلم کانفرنس غلام عباس گروپ کا، مقابلہ شروع کیا اور سیاسی توازن قائم ہوا۔

حاجی وہاب دین

ان کا تعلق کسبدار پیشہ کے لوگوں سے تھا، ذات کے دت کشمیری تھے، کھدر اور دوسری اقسام کا کھڈیوں پر کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔ حاجی صاحب سوت، دھاگہ اور کھدر بانی میں تھوک کا کام کرتے تھے اور مالی طور پر خوشحال اور متمول تھے۔ میرپور شہر، کھوئی رٹہ میں کھدر اور مقامی کھڈیوں پر تیار کردہ سوتی کپڑا کے تھوک کا کام کرتے۔ تحریک کے ساتھ حاجی صاحب شروع سے وابستہ تھے وہ مالی معاونت میں پیش پیش رہتے۔ میرپور سے سرینگر کئی بار پیدل سفر کیا، راجہ اکبر خان اور مولوی عبداللہ سیالکوی کے ساتھی تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے میرپور شہر سے ہفت روزہ 'ہمت' اخبار جاری کیا۔ ہندو پریس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے حقوق اور اصلاحات کے نقیب 'ہمت' اور 'سچ' زوردار آواز تھے۔ حاجی صاحب مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے بانی ارکان کی صف اول میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے پسماندگان میں عبداللطیف دت ایڈووکیٹ اور محمد عظیم دت ایڈووکیٹ شامل ہیں۔

مولوی عبدالغنی المعروف مولوی ڈنڈے والا

ان کا تعلق جاٹ قبیلہ اور اندرہل کے گاؤں پوٹھہ شیر سے تھا۔ اتنے زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر صوم وصلوٰۃ

کے پابند سخت عقیدہ کے مسلمان تھے۔ یہ بطور سنت موٹا ڈنڈا ہاتھ میں رکھتے۔ ان کا نمایاں وصف مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد کے علاوہ جموں، میرپور اور ڈڈیال کے بازاروں میں مسلمان خواتین کا آنا جانا بند کرنا تھا۔ ہندو نوجوان تاجروں کے مسلمان نوجوان خواتین سے ٹھٹھہ مذاق کے سدباب کے طور، پر ان کا مقصد مسلمان خواتین کا بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جانے پر پابندی لگانا تھا۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ تمام مسلمان اس کی حمایت کرتے تھے اور خواتین بھی احترام کرتی تھیں۔ یہ ایک قسم کا سوشل جہاد تھا۔ ہمارے ہاں بہت آنا جانا تھا، کھانے کے علاوہ ناشتہ بھی ہمارے ساتھ کرتے تھے، میں ان سے بے تکلفی سے گفتگو کرتا، ان سے پوچھا کہ کبھی کسی خاتون کی طرف سے مزاحمت کا بھی ان کو سامنا ہوا۔ میرے استفسار پر وہ کھل کر ہنسے اور کہا کہ صرف ایک بار وہ بھی ہندو دکانداروں کی سازش کے تحت۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جموں کے بازار میں حسب معمول گشت پر تھے۔ وہاں صبح کے وقت گجر لڑکیاں دودھ فروخت کرنے بازار آتی تھیں، ایک خاتون بہت صحت مند اور طاقت ور تھی، اس کو ہندو لڑکوں نے کچھ رقم دے کر میرا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ اکثر اوقات شہر میں ان کی موجودگی کا سن کر ہی عورتیں بازار نہ آتیں یا آواز سن کر بھاگ جاتیں۔ اس روز جب وہ بازار میں داخل ہوئے تو سب گجریاں ادھر اُدھر بھاگ گئیں، مگر ایک لڑکی مٹک مٹک کر چلتی رہی۔ جس پر کچھ تعجب ضرور ہوا مگر جب اس کے قریب پہنچا، تو وہ گاگر زمین پر رکھ کر اکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ڈنڈا پکڑ لیا اور میرے ساتھ ہاتھا پائی کرتے ہوئے، میرا تہبند کھول دیا، میں نے ننگا ہو جانے سے بچنے کے لئے تہبند سنبھالنے کی کوشش کی، جس پر ہندو دکانداروں نے تماشا دیکھتے ہوئے تالیاں بجائیں، میں نے خاتون سے کہا، کہ ہندو تماشہ دیکھتے ہیں، میری بے عزتی مت کرو۔ یہ سن کر خاتون نے ہاتھا پائی کرنی چھوڑ کر ہاتھ باندھ کر معافی مانگنی شروع کر دی۔ یہ واقعہ سنا کر وہ بہت دیر تک ہنستے رہے اور کہا کہ مسلمان ہونے کے ناطے خاتون نے میری لاج رکھ لی۔ مولوی صاحب دو بار جیل بھی گئے۔ جب بھی راجہ اکبر یا سیالکوٹی صاحب سے ناراض ہوتے تو خوب غصہ نکالتے۔ ان کا بیٹا خلیل گذشتہ سال برمنگھم میں فوت ہوا تھا۔ مولوی صاحب آزاد کشمیر کے قیام کے چند سال بعد وفات پا گئے۔

سردار بدھ سنگھ

میرپور شہر میں اکثریت ہندو آبادی تھی، سکھ دوسرے نمبر پر اور مسلمان ان دونوں سے شہر میں کم، مگر مضافات میں سو فیصد مسلمان ہی آباد تھے۔ سردار بدھ سنگھ کا تعلق بھرمٹ گاؤں سے تھا، رہائش میرپور شہر میں تھی، امیر گھرانہ سے تعلق تھا۔ وہ سول سروس میں تھے بہت قابل افسر تھے، وزیر وزارت کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان دنوں کاشتکار زمین کا مالیہ/ لگان ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے زمین ہی کاشت نہ کرتے۔ سردار بدھ سنگھ نے مہاراجہ کو لگان کی اوسط شرح کم کرنے کی سفارش کی۔ کاشتکار ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ مہاراجہ نے بدھ سنگھ کی سفارشات موصول

ہونے پر اس کو دربار میں طلب کیا اور کہا، کہ اگر آپ کو حکومت کی ہمدردی سے زیادہ دلچسپی اور ہمدردی کسان سے ہے، تو وزیروزارت کے عہدہ کو چھوڑ دو۔ سردار بدھ سنگھ نے اسی وقت استعفیٰ لکھ کر پیش کیا اور کسان بچاؤ تحریک شروع کر دی۔ کھدر کے سنگتری رنگ میں لباس میں ملبوس، ہاتھ میں سوٹی، کندھے پر دو کپڑوں کی پوٹلی باندھے، پانچ فٹ دو انچ قد، گورے سفید رنگ کے خوبصورت، میرپور کے سپوت نے، پوری ریاست میں نادار اور محروم عوام کے لئے پیدل چل کر تحریک شروع کی۔ ڈوگرہ آمریت اور استعمار کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ باغیانہ تقریروں پر گرفتار ہو کر جیل میں سزا کاٹی، وہ اور چوہدری غلام عباس اودھم پور، کدھ جیل میں اکٹھے قید رہے۔ جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا، تو سرینگر میں پہلے اجلاس میں شامل ہوئے اور مجلس عاملہ کے رکن نامزد ہوئے۔ راجہ اکبر خان اور مولوی عبداللہ سیاکھوی صاحب کے ساتھ ساری ریاست میں، ذمہ دارانہ نظام حکومت کے قیام، ساہوکار نظام کے خلاف اور انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں، ڈوگرہ آمریت کے خلاف سینہ سپر رہے۔ ہمارے ہاں اکثر قیام کرتے، مجھے ان کی محفل میں شریک ہونے اور تقاریر سننے کا اعزاز حاصل ہے۔ آخری عمر میں ان کو سنت بدھ سنگھ کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ جولائی ۲۰۰۵ء میں دورہ جموں کے دوران میری تجویز پر، چیف منسٹر مفتی محمد سعید نے، جموں یونیورسٹی میں سنت بدھ سنگھ کے نام پر چیئر قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔

کرشن دیو سیٹھی

میرپور شہر میں ۱۵ رنومبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد شہر کے بڑے تاجر اور ساہوکار تھے۔ سیٹھی صاحب سکول میں طالب علمی کے دور میں ہی نوجوان سیاسی کارکن تھے، وہ نیشنل کانفرنس میں ڈوگرہ آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے قیام کے لئے بہت متحرک تھے۔ راجہ محمد اکبر اور مولوی عبداللہ سیاکھوی کے ہمراہ شیخ عبداللہ، مرزا افضل بیگ، سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد کے ساتھ کام کیا۔ تحریک احرار میں عطاء اللہ شاہ ان کے پسندیدہ لیڈر تھے۔ سیٹھی صاحب کا اسلام اور کمیونزم کا وسیع مطالعہ ہے، تقریر کا انداز عطاء اللہ شاہ بخاری کا سا رہا۔ بولتے ہیں تو خوب بولتے ہیں، تقریر میں قرآنی آیات اور حدیث کے حوالے بھی دیتے ہیں، اکثر مسلمان پہلی دفعہ ان کی تقریر سن کر ان کو مسلمان کہنے لگتے ہیں، مگر وہ کمیونسٹ تحریک سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کو کشمیر چھوڑ دو تحریک میں سزا ہوئی، انھوں نے جیل میں، ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وہ میرپور جیل میں تھے، سید علی احمد شاہ صاحب نے ان کو میرپور جیل سے نکلوا کر، ایک ماہ اپنے گھر رکھا۔ اس کے بعد پنیام کے چوہدری کرمداد کے ذریعے راجوری پہنچایا۔ وہاں سے وہ جموں اپنے خاندان سے ملے۔ جموں شہر کے محلہ دلپتیاں میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کا معروف کارنامہ یہ بھی ہے کہ والد کی وفات پر ماں اور بھائی آر پی سیٹھی سے مشورہ کر کے، والد نے جو لاکھوں روپیہ اس دور میں، مسلمانوں سے قرض لینا تھا۔ قرض اور سود کی تمام پوتھیاں تیل چھڑک کر آگ میں جلا دیں اور قرض کی

رقم مع سود معاف کر دی۔ اس عمل پر ساہوکارہ ہندو برادری ان سے سخت ناراض بھی رہی، مگر انھوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ جموں کشمیر اسمبلی سے وہ ممبر بھی منتخب ہوئے اور شیخ عبداللہ کی کابینہ میں وزیر بھی رہے۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئے، ان کے بھائی رام پرکاش سیٹھی معروف وکیل تھے، وہ جج و چیف جسٹس ہائی کورٹ رہے اور جج سپریم کورٹ آف انڈیا کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ جموں میں ان کی سوشلسٹ تنظیم ہے، وہ اخبار میں مضامین لکھتے ہیں اور ہفت روزہ "جدوجہد" شائع کرتے ہیں جو کسانوں، مزدوروں اور غریب طبقہ کا نقیب ہے۔ انھوں نے یورپ، چین، جاپان اور بیشتر ممالک کا سفر کیا، وہ ٹھیٹھ میرپور کی علامت اور قابل احترام سپوت ہیں۔ میرپور ان کی اور وہ جموں میں رہتے ہوئے بھی، صرف میرپور کی شناخت ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد وہ وید بھسین کے ساتھ تین بار میرپور آئے۔ یہاں پر میرپور کے شہریوں نے ان کا زبردست استقبال کیا۔ پہلی دفعہ ۱۹۹۷ء میں دوسری بار ۱۹۹۹ء میں راجہ اکبر خان کی برسی اور تیسری دفعہ ۲۰۱۲ء میں بھی راجہ اکبر خان کی برسی کی تقریب میں شمولیت کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے خلاف ہیں اور خودمختار ریاست جموں کشمیر کی مؤثر آواز اور حامی ہیں۔

میرپور کے مزید احباب

میرپور کی دھرتی کے صدیوں پر محیط، باعث صد افتخار باسی، جرار و جفاکش، ان کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج، زبان و کلچر، اس کی وسیع و عریض سرسبز و شاداب وادیوں کے سینہ پر، بلند چوٹیوں و ٹیلوں کی اوٹ میں، بہتی ندیوں اور دریا، شمال مشرق اور مغرب میں، بلند و بالا چٹانوں پر سر اٹھاتے محافظ، قلعہ رام کوٹ، منگلا، باغسر، کھسباہ اور تھروچی اور ان کے مضبوط درودیوار میں، گم گشتہ سلطنتوں کی، سپاہ گری کی داستانیں سمیٹے ہوئے ہیں، جو حسن و جمال کا دلفریب مرقع ہیں اور مستقبل کے مؤرخ کی عظیم کھوج کی، کاوش سے تاریخ مرتب کر کے، دامن دنیا پر لا کر اس خطہ کو متعارف کروانے کے لئے، دامن پھیلائے دعوت نظارہ دیئے منتظر ہیں۔ میرپور کی دھرتی کے فلک پر روشن کہکشاں میں بے شمار ستارے درخشاں اوصاف کے حامل ہیں، جن میں ہر ایک اپنے معروف کارناموں کی تفصیل کا متقاضی ہے، تاہم مختصراً تبصرہ/تذکرہ بذیل ہے:

کرنل عدالت خان میرپور کے مضافات میں لدھڑ میں پیدا ہوئے۔ بہت ذہین، خوش شکل، خوش لباس، خوش گفتار۔ اپنی اہلیت کی بنا پر مہاراجہ ہری سنگھ کے اے ڈی سی رہے۔ جموں میں ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں پر حملوں، بلووں اور قتل و غارت کے دوران بھدرواہ، کشتواڑ میں ان کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ جہاں انھوں نے مسلمانوں کو ہندو حملہ آوروں سے مکمل تحفظ فراہم کیا۔ انھوں نے سرینگر میں وزیراعظم، شیخ عبداللہ کو ایک اجلاس میں کہا کہ "کشمیر میں ہندوستان کی فوج کو صرف فوج ہی نکالے گی۔" آزاد کشمیر آنے کے بعد، حکومت کی سروس میں تمام عہدوں پر تعینات رہے۔ منگلا ڈیم

کے متاثرین کے آبادکاری میں، نمایاں فرائض سرانجام دیئے۔ مجھ سے جب ملتے کہتے ''مجید ملک جوانی میں، میں بھی تمہاری طرح خوش لباس تھا اور بلیو سوٹ پہنتا تھا''۔

مرزا نذیر حسین راجوری کے ممبر قانون ساز اسمبلی، مرزا محمد حسین کے بڑے بیٹے، ہجرت کے بعد میرپور آباد ہوئے۔ سیشن جج رہے، ڈپٹی کمشنر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی رہے۔ بہت لائق اور ذہین تھے۔ ان میں میانہ روی، تحمل اور بردباری کے اوصاف تھے۔ وہ مہمان نوازی میں بڑے مقام کے مالک تھے، خوش مزاج مگر اچھے جج تھے۔

پروفیسر خان زمان مرزا ان کا آبائی تعلق لدھڑ گاؤں سے تھا۔ میرے ساتھ ان کا گہرا لگاؤ اور قدر مشترک، نظریہ اور تحریک پاکستان کا مطالعہ اور لگن اور تحریک آزادی کی ساتھ گہرے تعلق کی وجہ سے تھا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے، دیوانگی کے حد تک شیدائی تھے۔ عبدالولی خان نے تحریک پاکستان پر، فیکٹس آر فیکٹس منفی انداز میں کتاب لکھی۔ پاکستان بھر میں کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ خان زمان نے اس کا تاریخی حوالوں سے، ترکی بہ ترکی، کتاب کی شکل میں، جواب دیا، جس کا پیش لفظ لکھنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہمایوں زمان مرزا، ان کے بیٹے، انسانی حقوق کمشن کے چیئرمین کی حیثیت میں کام کرتے ہیں۔

حاجی محمد سلیم میرپور کے معروف مخیّر اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔ ان کا معروف کارنامہ کشمیر انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی کا قیام ہے۔ وہ درپردہ اور ظاہری غربا کی بھرپور مدد کرتے۔ ان کا تحریک آزادی میں بھی اہم کردار ہے۔ انھوں نے برطانوی وزراء اور ممبران پارلیمنٹ سے، میری تحریک آزادی کشمیر کی حمایت حاصل کرنے اور پارلیمنٹ ہاؤس میں لابی کرنے میں، بہت مدد کی۔ لندن میں ہندوستان کے خلاف جلسوں، کانفرنسوں کے انعقاد میں پیش پیش رہے۔ جہاد فنڈ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔

حاجی سردار محمد عالم میرپور میں معروف، غریب پرور اور سوشل امور میں حصّہ لیتے۔ میرے استاد اور دوست تھے۔ لبریشن لیگ میں بھی، کچھ عرصہ متحرک رہے۔ پاکستان کی سطح پر ان کی برادری نے، ان کو سربراہ مقرر کر کے سردار کا خطاب دیا۔ ان کا بیٹا ریاض عالم معروف ایڈووکیٹ ہے۔

ڈاکٹر محی الدین پیرزادہ سرینگر سے ہجرت کے بعد میرپور میں آباد ہوئے۔ ایم بی بی ایس کے بعد فوج میں شامل ہوئے۔ کیپٹن کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر پریکٹس شروع کی۔ تھوڑے عرصے میں ہی بطور ڈاکٹر شہرت حاصل کی۔ بہت ذہین اور جدید ادویات اور طریقہ علاج کے مطالعہ کے عادی۔ ان کی تشخیص پاکستان کے علاوہ برطانیہ میں بھی ڈاکٹروں نے، درست تسلیم کر کے تعریف کی۔ ڈاکٹر پیرزادہ کا حافظہ لاجواب تھا۔ دس سے پندرہ مریضوں کو یکے بعد دیگرے دیکھ کر، بیک وقت ہر ایک کا نام، بیماری اور دوا تجویز و تحریر کرتے، جس میں کبھی غلطی نہ ہوتی۔ غریب

مریضوں کا علاج مفت اور ادویات بھی اپنے پاس سے خرید کر دیتے۔ معائنہ فیس شروع سے آخر تک، برائے نام وصول کرتے رہے۔ میرپور، کوٹلی، بھمبر کے علاوہ گوجرخان سے گجرات پنجاب تک، مریض ان کے پاس آتے۔ سگریٹ اور چائے کے رسیا تحریک آزادی جموں کشمیر میں دلچسپی، ڈاکٹری کے علاوہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جوں ہی فراغت ہوتی، تو میرے ساتھ بہت تنقیدی تبادلہ خیالات کرتے۔ وہ بڑے انسان دوست اور ہمدرد محبت کرنے والے ساتھی تھے۔ ڈاکٹر پیرزادہ ایک بڑا نام اور میرپور کی پہچان تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال قریشی جموں شہر میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد میرپور میں آباد ہوئے۔ نوعمری میں والد کی وفات کے بعد والدہ ممتاز بیگم، ہیلتھ وزیٹر نے اکلوتے بیٹے کو ڈاکٹر کے عہدہ تک پہنچایا۔ ابتدائی سروس، گلگت اور مظفرآباد میں کی۔ وہ بحیثیت انسان اور ڈاکٹر نرم دل، خوش مزاج تھے۔ ہر وقت لبوں پر مسکراہٹ، چوبیس گھنٹے علاج اور خدمت کے لئے حاضر رہتے۔ ڈاکٹر پیرزادہ اور ڈاکٹر اقبال، انمول انسان تھے۔

میر خالد بشیر میرپور میں کونسلر منتخب ہوئے۔ مڈل کلاس سے تعلق تھا، مگر بہت غریب پرور اور ہر دلعزیز۔ ان کو عوامی اصلاحات کے کام سرانجام دینے کی وجہ سے بڑی شہرت ملی۔ تحریک آزادی میں بھی پیش پیش رہے۔ وہ مخلص، محنتی اور سیلف میڈ تھے۔

صوفی محمد زمان میرپور میں عوامی سطح پر سوشل کام کی وجہ سے اور بالخصوص تحریک آزادی میں شمولیت کی وجہ سے بیباک اور نڈر انسان تھے۔ وہ میرپوری کلچر کا نمونہ اور ہر دلعزیز انسان تھے۔ جموں کشمیر کی وحدت اور آزاد خودمختار حیثیت کے علمبردار تھے۔ کئی دفعہ جیل میں رہے۔ میرپور کے مسائل پر احتجاج کرتے۔ تحریک آزادی میں بہت متحرک رہے۔ نوجوانوں میں ہر دلعزیز تھے۔

مولوی عبدالحق مہتہ جاگیر میں پیدا ہوئے۔ قریشی خاندان سے تعلق تھا۔ اسلامی تعلیم میرپور کے مکاتیب میں حاصل کی۔ شعلہ بیان اور کلمۃ الحق میں ننگی تلوار۔ انھوں نے نئے میرپور شہر کی، ویران ہی کی منگلا ڈیم کی تعمیر سے کئی سال قبل نشاندہی کی، کہ یہاں جدید شہر آباد ہوگا۔ درویش منش، خوددار اور بیباک عالم دین تھے۔

چوہدری عبدالرشید کلیال شہرو میں پیدا ہوئے۔ چوہدری عبداللہ ان کے والد، معروف ٹھیکیدار اور چچا محمد یوسف ممبر جموں کشمیر قانون ساز اسمبلی تھے۔ گورڈن کالج میں ہم کلاس فیلو تھے۔ لبریشن لیگ میں شامل رہے۔ دبنگ قسم کے انسان، کھری بات ڈٹ کر کرتے، کسی قسم کی مصلحت کا شکار نہ ہوتے۔ بہترین دوست اور مہمان نواز تھے۔

چوہدری محمد سلیمان ایڈووکیٹ ان کا تعلق چھتروہ گاؤں وادی اندرہل سے ہے۔ وہ کالج میں سٹوڈنٹ لیڈر رہے۔ وکالت شروع کی، تو کے ایچ خورشید کی قیادت میں لبریشن لیگ میں شامل ہوئے۔ سیاست میں خورشید صاحب کے ساتھ رہے اور اب تک جماعت سے وابستہ سینئر نائب صدر ہیں۔ نہایت مخلص اور مخیّر ہیں۔ میرے بعد

لبریشن لیگ کے سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ خورشید صاحب کے ساتھ، یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا اور ممبران پارلیمنٹ اور کانگریس سے ملاقاتوں میں، تحریک آزادی جموں کشمیر کا نکتہ نظر پیش کیا۔ خورشید صاحب کی وفات کے بعد، جماعت قائم رکھنے میں، محمد شریف طارق کا اور بیگم ثریا خورشید کا ساتھ دیا اور لبریشن لیگ کو متحرک رکھا۔ اب تک میرے ساتھ متحد اور متحرک ہیں۔ بھمبر کے ماسٹر بوٹا اور راجہ ذوالفقار، مظفرآباد کے منظور قادر ایڈووکیٹ اور میر لطیف ایڈووکیٹ، چوہدری سلیمان کے شیدائی لبریشن لیگی ہیں۔ یہ مخلص سیاسی کارکن ہیں۔ میرپور میں خواجہ خلیل، طارق مغل، چوہدری شوکت، آصف مرزا، عزیز کائل، شاہد مجید، محمد اسلم عاصی ایڈووکیٹ، مرزا منصب داد بیرسٹر، لبریشن لیگ کا سرمایہ ہیں۔ ڈڈیال لبریشن لیگ کا گڑھ رہا۔ لطیف ثانی، چوہدری اختر، منشی لطیف اور ملک محمد ایوب اس کے روح رواں رہے۔ کوٹلی میں ملک شریف قابل تعریف ہیں۔

انگلینڈ میں ناقابل فراموش احباب

علاقہ اندرہل اور میرپور کے تومند، جفاکش، دلیر اور ذہین لوگ، معاش اور روزگار کی تلاش اور جدوجہد میں، سمندروں کا سینہ چیر کر، امریکہ، آسٹریلیا، انگلینڈ اور یورپ کے دور دراز ممالک کے انجانے کلچر، زبان اور ماحول میں کیسے رچ بس گئے۔ ابتداء میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ انگلینڈ میں پہلی دفعہ ۱۹رجون ۱۹۶۲ء کو گیا اور ۲۴راکتوبر کو واپس آیا۔ دوسری دفعہ اگست ۱۹۷۳ء جس کے بعد ۲۰۰۴ء تک، ہر سال جولائی تا ستمبر وہاں جاتا اور یورپ کے دیگر ممالک اور امریکہ جاتا۔ میرا زیادہ قیام برمنگھم، لندن، لیوٹن، بریڈفورڈ، لیڈز، نیوکاسل، شیفیلڈ، بلیک برن اور گلاسگو میں ہوتا۔ یوں تو میزبانی ہر شہر میں ہوتی، لیکن یہاں صرف ان احباب کی محفل اور میزبانی کا تذکرہ ہے، جن کے ہاں بار بار قیام کیا اور جنہوں نے جموں کشمیر کی تحریک آزادی میں حصہ ڈالا۔ وہاں کانفرنسوں، سیمینارز، جلسوں، جلوسوں، احتجاجی مظاہروں، برطانیہ کی میڈیا اور ممبران پارلیمنٹ سے میٹنگز منعقد کروائیں اور ہندوستان کے استصواب رائے سے انحراف اور کشمیری عوام کے حقوق کی پامالی اور تحریک آزادی کو فوج کی طاقت کے استعمال سے کچلنے کے، گھناؤنے عمل کو، عالمی قوتوں کے سامنے بین الاقوامی سطح پر منظر عام پر لانے میں، حصہ لیا تھا اور جموں کشمیر کے ہندوستان کے زیر قبضہ علاقہ سے نقل مکانی کر کے، آزاد کشمیر میں آنے والے مہاجرین کی، ہر قسم کی مدد اور معاونت میں، میری ہمراہی میں حصہ لیا، صرف ان تک محدود ہے۔

شروع میں ابا جان برمنگھم میں تھے، لہٰذا وہاں ہی ٹھہرتا تھا۔ ان کی اجازت سے اپنے دوست کرامت چوہان کے ہاں زیادہ قیام کیا۔ نجائب چوہان میرے ساتھ پیپلز کانفرنس کے سیکریٹری جنرل تھے۔ انگلینڈ میں تاحیات پیپلز کانفرنس کے صدر اور مقبول حسین بھٹی سیکریٹری جنرل رہے۔ نجائب چوہان اور لبریشن لیگ کے چوہدری محمد صادق پہلے نوجوان تھے، جنہوں نے، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کو، اقوام متحدہ میں کشمیری عوام کی

تحریک آزادی سے متعلق، جامع اور مفصل میمورنڈم ،۱۹۷۹ء میں پیش کر کے، سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ دونوں کا تعلق، سیاکھ اور چھتر وہ، علاقہ اندرہل سے ہے۔ چوہدری یوسف، چوہدری عبدالرحمٰن آف رٹہ، پیپلز پارٹی کے سعید مغل، محمود ہاشمی، محمد اسلم لون، محمد بوٹا شیدائی، حاجی محمد منظور، منظور گابا، چوہدری ظفر، محمد مالک مغل، ملک محمد بشیر، ملک عارف محمود، ملک محمد یوسف، عبدالمالک، غلام نبی رچیال، لندن میں سید سلطان علی شاہ، حبیب الرحمٰن، ذوالفقار علی، ریاض رضا، نوردین صحاف، کرنل عبدالغنی، بگبہار، بیرسٹر محمد اشرف، بیرسٹر اکبر ملک، محمد اکبر ملک، بیرسٹر قادری، میاں ممتاز حسین، محمد یعقوب چشتی، ہمایوں سفیر، راجہ محمود خان آف والسال۔ نوٹنگھم میں لالہ عبدالرحمٰن، ریاض نوید بٹ ایڈووکیٹ، محمود اختر، محمد اسلم، الطاف عباسی، مرزا ارشاد، راجہ خشی خان۔ بلیک برن میں حاجی نذیر عالم صدر لبریشن لیگ، ماسٹر کریم داد ایکرنگٹن، شیفیلیڈ میں ملک محمد صادق، ان کے ساتھ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے تفریحی مقامات کی سیر کی، صابر چغتائی، لارڈ نذیر احمد، جو اقوام متحدہ میں جانے والے وفد میں شامل تھے۔ بریڈفورڈ میں حاجی سلیم، جنہوں نے پارلیمنٹ ہاؤس میں، ممبران پارلیمنٹ اور وزراء کے ساتھ، چوہدری فضل حسین کی معاونت سے، مسئلۂ کشمیر پر میری میٹنگ منعقد کروائی۔ لارڈ میئر محمد عجیب، جو ہمیشہ متحرک رہے۔ ایف ڈی فاروقی، سیکریٹری جنرل پیپلز پارٹی۔ لیڈز میں چوہدری علی شان، غلام رسول عوامی، ان کے ہاں رہنے کا موقع ملا اور کافی سیاحتی مقامات پر جانے کا موقع ملا۔ ان کے بھائی غلام سرور کے ساتھ مالٹا کی سیر کی، انھوں نے اچھی میزبانی کی۔ غلام رسول عوامی کے دوست ممتاز چوہدری، ملک رحمت اور محمد زمان مغل، یونس چوہدری، چوہدری عبدالحکیم، سب احباب نے بہت محبت دی۔ گلاسگو میں بابو عبدالرحیم، محمد بشیر تبسم اور چوہدری عبدالمجید نے کشمیر کی آزادی کے حق میں سکاٹ لینڈ پارلیمنٹ کے ممبران کی حمایت حاصل کرنے میں حمایت کی۔ لیوٹن، لندن کے مضافات میں واقع ہونے کی وجہ سے، جموں کشمیر کی سیاست کا، برمنگھم کے بعد نمایاں مرکز ہے۔ یہاں کوٹلی کے لوگ اکثریت میں ہیں۔ غلام احمد قادری کی دعوتیں، ناقابل فراموش ہیں۔ چوہدری اسلم، چوہدری خوشحال، چوہدری بشیر، چوہدری ولایت المعروف ڈبلیو خان، راجہ ریاض، محمد اسلم، مجید ملک، بابو ولایت حسین، ملک معروف، راجہ بشیر، طاہر ملک، راجہ بنارس خان، ذوالفقار، چوہدری صابر، چوہدری اصغر، چوہدری سائیں۔ راجہ اکبر داد، راجہ شبیر، راجہ بنارس یہاں کی اہم شخصیات ہیں۔

ذوالفقار ڈبلیو خان نے، میرے لئے مکان ریزرو کر رکھا تھا، جہاں دو وقت کھانے پر، ہر روز دس پندرہ لوگ میرے مہمان ہوتے۔ بیگم ڈبلیو خان ہر روز لذیز کھانوں سے خدمت کرتیں۔ ان کی ہمت اور صبر آزما مہمان نوازی کی، جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ڈبلیو خان میرے ہمراہ گاڑی خود ڈرائیور کرتے۔ انگلینڈ میں وقت دینا بڑی قربانی ہے۔ چوہدری بشیر ساتھ ساتھ رہتے۔ وہ بہت ذہین، بے باک اور کھرے ہیں۔ لوٹن شہر کی شان اور پہچان ہیں۔ برطانیہ، پاکستان اور کشمیر کی سیاست میں متحرک، خوب آگاہ اور سب سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ راجہ ریاض،

راجہ اسلم ایڈووکیٹ کے بھائی کے ناطے سے میرے بھائی کی طرح ہیں۔ مجھ سے بہت احترام سے پیش آتے ہیں۔ بڑے مہمان نواز، سوشل اور غریب پرور ہیں۔ میرے ماموں زاد عارف محمود خوش پوش اور مہمان نواز ہیں۔ اس کا چھوٹا بھائی سلطان محمود سینٹ ایلبن ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ ملک محمد بشیر میرے ماموں زاد، برمنگھم میں قیام کے دوران میں بشیر کے ہاں ہی رہتا۔ بشیر بہت سوشل، مہمان نواز تھا۔ یہ وصف اس کو ورثہ میں ملا تھا۔ میری وجہ سے اس کے ہاں مہمانوں کا آنا جانا تھا۔ بشیر اور اس کی بیگم ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ پھوپھو زاد عبدالرحمٰن اور ملک محمد شریف، ان کی بیگم محبت سے مہمان نوازی کرتے۔ نیو کاسل میں چوہدری عبدالغنی، ان کے بھائی صدیق اور سلمان، خواجہ صابر میر، ان کے بیٹے سلیم اور نعیم، چوہدری حکیم، ڈاکٹر عزیز، صابر ملک، یونس ملک، ذوالفقار، چوہدری خورشید اور دیگر جدوجہد میں معاون اور ساتھی رہے۔ مانچسٹر میں چوہدری بشیر اور ان کے ممبر پارلیمنٹ، جیرالڈ کافمین نے جموں کشمیر میں، استصواب رائے اور آزادی کی حمایت میں ساتھ دے کر ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔

پاکستان کا قیام

ہندوستان کی آزادی اور انتقال اقتدار، پاکستان کے قیام سے لازم ہو چکا تھا۔ کانگریس پارٹی نے خود تقسیم ہندوستان کی قرارداد منظور کی، جس پر ۳رجون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے ہند نے، صدر کانگریس پنڈت نہرو اور صدر مسلم لیگ، محمد علی جناح کے ہمراہ ہندوستان اور پاکستان کی دو آزاد مملکتوں کا اعلان کیا۔ اعلان میں مہاراجوں کے ماتحت ریاستوں کی خودمختار حیثیت بحال کرنا، بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ ریاست جموں کشمیر میں نئے نظام اور اس کے دُور رس اثرات کا ادراک کم ہی تھا۔ نیشنل کانفرنس کے شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی بے وقت تحریک کشمیر چھوڑ دو کی وجہ سے، اور ان کی دیکھا دیکھی مسلم کانفرنس کے لیڈر چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھی، بے مقصد پروگرام ڈائریکٹ ایکشن کی حمایت میں گرفتار ہو کر جیل میں چلے گئے اور ان پڑھ سادہ اور پسماندہ عوام کو تیزی سے بدلتے حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ گئے۔ مسلم کانفرنس کے قائمقام صدر چوہدری حمید اللہ نے، بقول ان کے، قائداعظم کی ہدایات پر مہاراجہ کو مختلف بیانات کے ذریعہ مشورہ دیا، کہ ریاست کو خودمختار رکھا جائے۔ اس کے برعکس شیخ عبداللہ نے جیل سے مہاراجہ کو خط ارسال کیا، کہ بجائے ریاست کو خودمختار حیثیت دینے کے، ریاست کا الحاق ہندوستان سے کیا جائے۔ ریاست میں مسلمان عوام کی اکثریت، پاکستان کے ساتھ الحاق کی حامی تھی۔ پاکستان کے ساتھ معاہدہ سٹینڈ سٹل (جوں کا توں) کی وجہ سے ۱۵راگست کو ریاست میں ڈاکخانوں کی عمارتوں پر پاکستان کا پرچم لہرایا گیا، مگر مہاتما گاندھی کی سرینگر آمد کے بعد مہاراجہ کی سوچ بدل چکی تھی۔ وزیراعظم کاک کی فراغت پر، جنک سنگھ اور اس کے بعد جسٹس مہر چند مہاجن، جج پنجاب ہائی کورٹ کی بطور وزیراعظم تقرری پر، مہاراجہ کا ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ واضح ہو چکا تھا، صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔ جموں کٹھوعہ روڈ، جو کچا ٹریک تھی کی کشادگی اور پختہ تعمیر اور ریلوے لائن

بچھانے کے لئے، تیزی سے کام شروع کرنا بھی الحاق ہندوستان کا واضح اقدام تھا۔ اس تناظر میں مسلمان عوام بجا طور پر اپنے علاقہ کو پاکستان کا حصہ تصور کر رہے تھے۔ جبکہ مہاراجہ اور ہندوستان کی پالیسی اس کے قطعی برعکس تھی، سنجیدہ بالخصوص ملازم طبقہ مہاراجہ کی سازش سے آگاہ ہو چکا تھا۔ خصوصاً جب مسلمانوں کو اسلحہ و دیگر ہتھیار حکومت کے پاس جمع کروانے اور مسلمان پولیس کو غیر مسلح کرنے کا حکم جاری ہوا، اس مرحلہ پر پونچھ، میرپور، کوٹلی اور بھمبر میں دوسری جنگ عظیم سے فارغ سابق فوجیوں، مقامی سیاسی کارکنوں نے مہاراجہ کی فوج کے خلاف دفاعی حکمت عملی تیار کرنی شروع کر دی، مسلح جدوجہد کا آغاز میرپور، پونچھ اور کوٹلی سے ہوا۔ ۲۲ اکتوبر کو مظفرآباد میں ڈوگرہ فوج پسپا ہوئی۔

جموں کشمیر کی آزاد ملک کی حیثیت...... مختصر جائزہ

ہندوستان اور پاکستان آزادی ہند قانون کے تحت، اقتدار منتقل ہونے پر آزاد خودمختار ممالک کی حیثیت میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آئے۔ اسی قانون کی دفعہ ۷-ii میں قرار دیا گیا تھا، کہ مقررہ دن یعنی ۱۵ اگست کو ہی تاج برطانیہ (حکومت) اور ریاستوں (راجوں، مہاراجوں، حکمرانوں) کے درمیان تمام معاہدے، عہدنامے اور اقرارنامے، ساقط قرار پائیں گے۔ جس کے نتیجہ میں لامحالہ ریاستیں آزاد خودمختار حیثیت حاصل کر لیں گی، البتہ بطور پالیسی، والیان ریاستوں کو مشورہ دیا گیا، کہ وہ جغرافیائی طور پر ملحق ہونے اور اکثریتی آبادی کی رائے کو ملحوظ رکھ کر، ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں۔ والیان ریاست کو یہ اختیار کانگریس اور مسلم لیگ کی قیادت کے متفقہ مشورہ کے تحت، بطور پالیسی دیا گیا تھا۔ طے شدہ پالیسی کے تحت ریاست جموں کشمیر کا الحاق مہاراجہ کو ۸۷ فیصد مسلمان آبادی اور جغرافیائی طور پر ملحق ہونے کے سبب پاکستان سے ۱۵ اگست سے قبل ہی کر دینا چاہیے تھا، دیگر ریاستوں کے برعکس، جموں کشمیر میں ڈوگرہ مہاراجہ کو حق یا اختیار حکمرانی، ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں کیے گئے معاہدہ امرتسر سے، حاصل ہوا تھا۔ جس کو عوام نے کبھی قبول نہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا معاہدہ مہاراجہ اور تاج برطانیہ کے مابین ۱۹۳۵ء میں، گلگت ایجنسی سے متعلق ہوا تھا، ہر دو معاہدے متذکرہ قانون کے تحت ساقط قرار پا گئے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ قانون آزادیٔ ہند کی اس شق کی روشنی میں، برطانوی حکومت کے ساتھ ۲۶ مارچ ۱۹۳۵ء کو ساٹھ سال کی مدت کے لئے، کیے گئے گلگت لیز کے ساقط قرار پانے پر، اس علاقہ کا انتظام سنبھالنے کے لئے، بریگیڈیئر گھنسارہ سنگھ کو گلگت کا گورنر ۱۷ جولائی کے حکم کے تحت مقرر کیا گیا۔ وہ ریاستی افواج کے کمانڈر انچیف، میجر جنرل سکاٹ کے ہمراہ گلگت پہنچا اور اس نے ۳۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی کرنل بیکن سے، لیز شدہ علاقہ کا انتظام سنبھال لیا۔ بعد میں وہ گرفتار کر لیا گیا اور سیاسی قیدیوں کے تبادلہ میں، جموں واپس گیا، اسی قانون کے تحت معاہدہ امرتسر بھی ۱۵ اگست کو ساقط ہو جانے پر، ڈوگرہ مہاراجہ کا اختیار حکمرانی بھی ساقط ہو گیا اور اقتدار اعلیٰ ریاست کے عوام کو عود کر گیا۔ قانون کی نظر میں ریاست جموں کشمیر، آزاد مملکت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی،

جس کی مزید تائید، سکیورٹی کونسل میں ہندوستان کے نمائندہ، گوپال سوامی آئینگر، نے خود ۱۵ر جنوری ۱۹۴۸ء کو، اپنی تقریر میں کی اور اس کی توثیق، مزید سکیورٹی کونسل کی متعدد قراردادوں میں کی گئی ہے۔

ہندوستان سلامتی کونسل میں، مہاراجہ کے ریاست کے ہندوستان کے ساتھ، فرضی اور بدوں اختیار عبوری نام نہاد الحاق سے تو دست بردار ہو گیا اور حق خود اختیاری کے تحت، جموں کشمیر کے عوام کو اپنا مستقبل، رائے شماری میں طے کرنا تسلیم کر لیا، مگر ساتھ ہی ساتھ سازش کے تحت، استصواب رائے کو ناکام بنانے کے لئے نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل میں، ایک قرارداد منظور کروا کر، سرینگر کی متنازعہ حکومت کے ذریعہ، آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کا فیصلہ کیا اور بلا مقابلہ ایک سو اراکین، پر مشتمل اسمبلی میں آزاد علاقہ کے لئے مختص پچیس سیٹیں خالی چھوڑ کر، پچھہتر سیٹوں کا الیکشن کروایا، تاکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد کے برعکس، ریاست کے ہندوستان کے ساتھ یکطرفہ الحاق کا اعلان کر دیا جائے، مگر بروقت اطلاع پر، اس سازش کو سکیورٹی کونسل کی ۳۰ر مارچ ۱۹۵۱ء کی متفقہ منظور کردہ قرارداد کے ذریعہ، ممنوع قرار دے دیا گیا، دوسری ناجائز کوشش کو، دوسری قرارداد جو ۲۴ر جنوری ۱۹۵۷ء کو ممبران نے اتفاق رائے سے منظور کی، کے ذریعہ ممنوع اور مسترد قرار دے دیا گیا، ان ہر دو قراردادوں کا متن مختصراً یہ ہے کہ "ریاست جموں کشمیر کا یا اس کے کسی حصّہ کا، کسی سیاسی جماعت یا قانون ساز اسمبلی کی تجویز یا سفارش پر، سکیورٹی کونسل اور یو این مشن کی منظور کردہ قراردادوں کے تحت، طے شدہ استصواب رائے کے مغائر، ریاست یا اس کے جزوی حصّہ کا فیصلہ تسلیم نہ ہوگا اور ایسے مجوزہ فیصلہ کو قطعی طور پر مسترد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان و پاکستان ہر دو ممالک نے اور ممبران سکیورٹی کونسل نے، دونوں قراردادوں کو تسلیم کیا ہوا ہے اور وہ ان کے پابند ہیں"۔

ہندوستان کے دستور کے آرٹیکل ۳۷۰ اور پاکستان کے دساتیر ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲۵۷ کے تحت، ریاست جموں کشمیر کی حیثیت اور وجود کو ہر دو ممالک نے اپنے اپنے ملکی مؤقف کے تحت، تسلیم کر رکھا ہے۔ اس صورت حالات میں جموں کشمیر بین الاقوامی قانون، اقوام متحدہ کے چارٹر، قانون آزادی ہند، دساتیر پاکستان اور آرٹیکل ۳۷۰ دستور ہندوستان کے مطابق، کسی ملک کا حصّہ نہ ہے، اس میں ریاست کا قانون باشندہ ریاست ۱۹۲۷ء صرف ریاست میں مقیم عوام کو ہی ریاست کا شہری قرار دیتا ہے، ہندوستان اور پاکستان کے شہری، جموں کشمیر کے شہری یا باشندہ کہلانے کے مجاز نہیں ہیں۔ لہٰذا بین الاقوامی اور ریاستی قوانین کے تحت ریاست کے اقتدار اعلیٰ میں قطعی شریک نہ ہیں اور یہ حیثیت اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کر رکھی ہے۔ جس وجہ سے استصواب رائے سے قبل، غیر ریاستی لوگوں کا انخلا لازمی ہے۔ محض ریاست پر قابض ہونے سے ہندوستان اور پاکستان کو ریاست میں کسی قسم کا حق حاصل نہ ہے اور ریاست کے دونوں حصوں میں قائم حکومتوں میں حکومتی اختیارات میں شراکت داری یا اختیارات کا حق، دونوں ممالک کو حاصل نہیں ہے۔ صرف جنگ بندی کی پابندی کا حکم، ان پر لازم ہے۔

جموں کشمیر حالات کی دُھند میں

اب ماضی کے پس پردہ، رونما ہونے والے واقعات، سیاسی منصوبہ بندیاں اور محلاتی سازشیں، منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس لئے ان واقعات پر تبصرہ کرنا اور نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے۔ اب یہ ماننا لازمی ہے کہ برطانوی استعماریت ہندوستان کو متحد رکھنے پر اصرار کرتی رہی اور یہی مدعا کانگریس کا بھی تھا۔ ان دو بڑی قوتوں کو ایک باشعور اور مستعد سیاسی قیادت مگر پسماندہ اور منتشر سیاسی عوام کی جماعت، مسلم لیگ کا سامنا تھا۔ جس کا مطالبہ تھا کہ مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے، اقتدار اعلیٰ منتقل کیا جائے۔ جب کانگریس اور برطانیہ کی حکومت بے بس ہو کر، پاکستان کے قیام پر رضامند ہوئے، تو اپنے منصوبہ متحدہ ہندوستان میں ناکامی کو، مسلم لیگ کی فتح قرار دے کر اپنی شکست کو تعصب اور نفرت کا نیا روپ دیا، انھوں نے ایک کمزور ناتواں پاکستان بنانے کا پلان تیار کیا، جو چند ماہ کے اندر ہی اپنے ہاتھوں، اپنی موت مر جائے۔ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی سوانح عمری میں یہ تسلیم کیا، کہ اس نے شملہ میں تقسیم کا نقشہ پنڈت نہرو اور کرشنا مینن کو دکھایا اور ان کی تجویز کردہ ہدایات کے تحت اس میں ترمیم کی، جبکہ اس کو محمد علی جناح سے پوشیدہ رکھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں کو پاکستان کا حصہ قرار دینے کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود، پنجاب اور بنگال کو تقسیم کیا اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) اور سلہٹ میں ریفرنڈم کروایا۔ ضلع گورداسپور کے مسلم اکثریتی ضلع میں، صرف تحصیل پٹھانکوٹ میں ہندو اکثریتی آبادی کی آڑ میں ماسوائے شکر گڑھ کے، گورداسپور ہندوستان میں شامل کر دیا۔ اسی طرح ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ، ٹراونکور، جودھپور اور جیسلمیر کا الحاق ہندوستان سے جبراً کروا کر حل کیا۔ جونا گڑھ جس کا الحاق، پاکستان سے ہو چکا تھا اور دکن حیدر آباد جس نے آزاد خود مختار رہنے کا اعلان کر کے، اقوام متحدہ میں اور پاکستان میں اپنا نمائندہ اور سفیر بھی بھیج دیئے تھے، ان پر فوجی حملہ کر کے، ہندوستان نے قبضہ کر لیا۔

جموں کشمیر پر تسلط قائم کرنے کے لئے، پنجاب کے ایوارڈ میں ترمیم کر کے پٹھانکوٹ اور گورداسپور کی دیگر دو مسلم اکثریتی آبادی کی تحصیلوں کو، ہندوستان میں شامل کر کے، راستہ کی معقول سہولت فراہم کر دی گئی۔ مہاراجہ جس نے ۱۵ اگست تک ریاست کے الحاق کا فیصلہ نہ کیا تھا، اس پر مہاراجہ پٹیالہ، کپورتھلہ اور دیگر ذرائع سے دباؤ ڈلوایا جاتا رہا، حتیٰ کہ ماؤنٹ بیٹن بحیثیت وائسرائے اور ممبر شاہی خاندان، خود چار دن سرینگر میں مہاراجہ پر اثر انداز ہوتا رہا اور آخر میں مہاتما گاندھی نے سرینگر میں مہارانی تارا دیوی کے ذریعہ اور خود آپ، ریاست کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لئے چار روز تک، مہاراجہ پر اثر انداز ہو کر دباؤ ڈالا، جس کے بعد وزیر اعظم رام چند کاک کو الگ کروا کر، سردار پٹیل کی وساطت سے، مہر چند مہاجن، جج ہائی کورٹ پنجاب، جو قبل ازیں پنجاب باؤنڈری کمشن میں کانگریس کا نامزد رکن تھا، کو ہائی کورٹ پنجاب سے رخصت دے کر وزیر اعظم جموں کشمیر مقرر کروایا گیا۔ مہاجن

نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے منصوبہ کے تحت، کشمیر میں برف باری کے موسم سے قبل ہی، اسلحہ کی سپلائی اور فوجی دستے خفیہ طور پر جموں کشمیر بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ اس کی تائید پنڈت نہرو اور پٹیل کی خط و کتابت سے ہوتی ہے، جو اب کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مظفرآباد اور بارہمولہ پر ۲۲ اکتوبر کے حملہ کو، ہندوستان نے وجہ ظاہر کر کے اعلانیہ کشمیر میں فوج داخل کر دی، وگرنہ مہر چند مہاجن کی بطور وزیراعظم تقرری سے، مہاراجہ کا ریاست کے مستقبل کا فیصلہ واضح ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ رام چند کاک کے الگ کیے جانے کا سبب بنا۔ قبل ازیں مہاراجہ آزاد و خودمختار رہنے کا ارادہ کر چکا تھا، اس کی تائید، چوہدری حمیداللہ پارلیمانی لیڈر و قائمقام صدر مسلم کانفرنس کے متعدد بیانات اور قائمقام سیکریٹری جنرل، پروفیسر اسحاق قریشی کے، انگریزی ماہنامہ ہیرالڈ میں شائع انٹرویو سے بھی ہوتی ہے۔

ان حالات میں بہت ہی بیدار مغز، متحرک اور باشعور سیاسی قیادت کی ریاست میں، اشد ضرورت تھی، مگر وہ نایاب تھی۔ کانگریس نے سیاسی شکست کے انتقام میں تیسری سازش میں سکھ لیڈر، ماسٹر تارا سنگھ جو ہندو تھا اور اس نے سکھ مذہب اختیار کیا ہوا تھا، اسے استعمال کیا۔ امرتسر اور دیگر مشرقی پنجاب میں سکھ اکثریتی شہروں میں مسلمانوں کے خلاف مذہبی منافرت پھیلائی، بلوے کروائے، گھیراؤ جلاؤ اور قتل و غارت گری شروع کروا دی، جس کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے اور لاکھوں کو مغربی پنجاب میں ہجرت کرنی پڑی اور تاریخ نے سب سے بڑی انسانی نقل مکانی دیکھی، پاکستان کی حکومت ابھی انتقال اقتدار حاصل نہ کر پائی تھی، کہ مہاجرین کی سنگین اور خلاف توقع آمد کا سامنا کرنا پڑا۔ قائداعظم جو گذشتہ کئی سال سے آزادی کی جدوجہد میں صبح و شام مصروف، اپنوں اور مخالفین کی سازشوں کے خلاف برسرپیکار تھے، پاکستان حاصل کرنے کی فتح کے ساتھ ہی نئے ہمہ گیر مسئلوں میں الجھا دیئے گئے تھے۔ وہ مہاجرین کی دیکھ بھال کرنے کے لئے لیاقت علی خان وزیراعظم کو لے کر کراچی سے لاہور میں منتقل ہو گئے۔ والٹن کیمپ میں کٹے پھٹے انسانوں کے جم غفیر کو کراہتے، سسکیاں لیتے دیکھ کر پہلی دفعہ اس مرد آہن کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے اور انھوں نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا، مگر مسلمانوں اور قائداعظم نے آگ و خون کے سیلاب کو ہمت اور ثابت قدمی سے عبور کر کے، دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم قوم اور ایک ملک کی مضبوط بنیاد رکھ دی۔ قائداعظم ان پریشان کن معاملات میں یکسو تھے کہ ہندوستان نے حالات کا فائدہ اٹھا کر، کشمیر میں فوج داخل کر دی اور فوری جوازیت مظفرآباد پر قبائلی حملہ ظاہر کیا۔ اس سازش کا پردہ، یو این کمشن کے چیئرمین جوزف کوربل اور پروفیسر السٹر لیمب، نے اپنی تصانیف میں مثبت ثبوت اور تحقیق سے چاک کیا ہے۔ حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ کے، جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع کردہ وائیٹ پیپر میں ظاہر کردہ واقعات سے، اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔

جموں کشمیر میں مسلم کانفرنس کے لیڈر چوہدری غلام عباس، نوآبادیاتی طرز کو ہن کے تحت، جیل میں آرام فرما رہے تھے۔ جبکہ مہاراجہ پر کانگرس متواتر اثر انداز ہو رہی تھی۔ چوہدری حمیداللہ پارلیمانی لیڈر اور قائمقام صدر

مسلم کانفرنس، متعدد بار ریاست کو آزاد خود مختار حیثیت اختیار کرنے کی پالیسی کے حق میں بیانات دے چکے تھے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ چوہدری غلام عباس سے، جیل سے خط حاصل کیا گیا۔ جس میں اس مؤقف کی تائید حاصل کی گئی تھی اور جنرل کونسل کی حمایت حاصل کرنے کے لیے، ۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء کو سری نگر میں اجلاس طلب کیا گیا، جس میں مسلم لیگ اور قائداعظم کی ہدایت کے نام پر ریاست کی خود مختار حیثیت میں رہنے کی قرارداد پیش کی گئی، جو اختلاف کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے، مگر مسلم کانفرنس الجھن اور ابہام کا شکار رہی۔ مہر چند مہاجن کے ستمبر میں وزیراعظم مقرر ہونے پر مہاراجہ کا رویہ اور پروگرام واضح ہو چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے مہاراجہ کی طرف سے پاکستان کے ساتھ، معاہدہ سٹینڈسٹل طے پانے سے، مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو، مہاراجہ کا کسی بھی ملک سے الحاق نہ کرنے کا تاثر ملا، حالانکہ ہندوستان کو بھی ایسا معاہدہ کرنے کی پیشکش ہوئی تھی مگر وہ ٹال گیا۔ کیونکہ اس کی حکمت عملی مختلف تھی۔ ہندوستان کے رویہ پر توجہ نہ دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرپور کوٹلی اور پونچھ میں فائرنگ وغیرہ اور جلسے جلوس، غیر منظم اور بغیر منصوبہ بندی کے، شروع ہو گئے، جس نے مہاراجہ اور ہندوستان کو چوکنا کر کے، جلدی اقدامات کے لئے مستعد کر دیا۔ اس کی تائید پنڈت نہرو کی طرف سے، سردار پٹیل کے نام ۲۷ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو ارسال کردہ مفصل خط سے بھی ہوتی ہے، جس میں تاکید کی گئی تھی کہ مہاراجہ سے ہر صورت، اکتوبر یا نومبر کے پہلے ہفتہ میں، ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کروایا جائے۔

اعلان ۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

مسلم کانفرنس کے چند ارکان نے، بغیر منصوبہ بندی اور قیادت کو اعتماد میں لیے، راولپنڈی کے افضل ہوٹل، جس کی معمولی سی چائے خانہ کی حیثیت تھی، وہاں ایک اعلامیہ تیار کیا، جس کے تحت ۱۵ر اگست سے مہاراجہ کی حکومت کو ناجائز قرار دے کر، ایک عوامی عبوری حکومت، بطور جانشین حکومت، کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ جس کا دارالحکومت مظفرآباد ظاہر کیا گیا۔ انور کے فرضی نام سے یہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ یہ اعلان مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے، غلام نبی گلکار، سری نگر کے شہری نے کیا، یہ اعلامیہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا اور انگریزی روزنامہ سول ملٹری گزٹ کے ۷ر اکتوبر کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اعلان کے ایک ہفتہ بعد گلکار سری نگر واپس گئے، تو ان کو وہاں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس اعلان نے بھی مہاراجہ اور ہندوستان کو چوکس کر دیا۔

۲۲ر اکتوبر کو مظفرآباد پر قبائلی لشکر کی یلغار

ایک روایت یہ ہے کہ راولپنڈی میں کیے گئے فیصلہ کے تحت، ذوالفقار ممدوٹ چیف منسٹر پنجاب نے، ۲۲ر اکتوبر کو سیالکوٹ شکر گڑھ سے حملہ کر کے ساتھ کٹھوعہ روڈ بلاک کر کے، جموں پر اور خان عبدالقیوم نے قبائلیوں سے مظفرآباد پر حملہ کروا کر، بیک وقت ریاست کا محاصرہ کرنا تھا، نہ جانے ساتھ پٹھان کوٹ روڈ کو بلاک کیوں نہ کیا

گیا۔ سردار شوکت حیات، جو راولپنڈی میٹنگ میں شامل ہونے کے دعویدار ہیں، انہوں نے اپنی سوانح حیات میں اس کی وضاحت کی ہے۔ مگر جموں محاذ پر ایکشن سے پہلو تہی کا، عظیم خمیازہ اب تک بھگتنا پڑ رہا ہے، اس کے علاوہ قبائلی لشکر جو مظفرآباد، بارہمولہ اور پٹن میں، ۲۶ راکتوبر تک لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہا، اس سے غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں میں بھی رنجیدگی اور ناراضگی پیدا ہوئی۔ تمام ایکشن غیر منظم اور جنگی حکمت عملی سے عاری تھا۔ اس سے ہندوستان کی فوج کو سری نگر میں داخل ہو کر دفاع کا موقع مل گیا۔ لوہار گلی اور برار کوٹ میں تعینات جموں کشمیر یونٹ کی کمان، پنجیری، بھمبر کے کرنل اعظم خان کی تھی، بروٹیاں چکسواری کے کیپٹن نواز خان، صوبیدار اقبال خان (ذیلدار) اس یونٹ میں تھے۔ اقبال خان نے نیلم پل پر گیٹ انچارج سکھ حوالدار اور اس کے ساتھیوں کو چائے میں افیون ڈال کر پلائی اور سحری کے وقت قبائلی لشکر کو مظفرآباد میں داخل کیا، یہ واقعہ انہوں نے خود مجھے کئی بار سنایا۔ کرنل اعظم اور کیپٹن نواز خان اس ایکشن کی کامیابی کے دعویدار تھے۔

۲۴ راکتوبر عبوری حکومت کا قیام

۲۴ راکتوبر کو قائم کی گئی عبوری حکومت، از سرِ نو ۲۴ راکتوبر میں قائم کی گئی۔ بقول سردار ابراہیم خان، اس کو مسلم کانفرنس ہائی کمان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ حکومت کی تشکیل کے لئے صدر مسلم کانفرنس چوہدری حمید اللہ کو سری نگر سے مدعو کیا گیا، مگر دہلی میں قائداعظم سے ملی ہوئی ہدایات کی روشنی میں انہوں نے، مظفرآباد پر حملہ اور عبوری حکومت کے قیام کی مخالفت کی اور صدر حکومت بننے سے انکار کر دیا۔ جس کے چند دن بعد جب لاہور میں، ان کی قائداعظم سے ملاقات ہوئی، تو بقول اسحاق قریشی، قائداعظم مظفرآباد پر حملہ کے خلاف سخت غصہ میں تھے، مگر چوہدری حمید اللہ نے راولپنڈی کی میٹنگ میں، کارروائی کے ڈائری میں درج نوٹس دکھا کر اپنی بریت پر، قائداعظم کو قائل تو کیا، مگر ان کا کہنا تھا کہ اس سے بہت نقصان ہوا تھا۔ حکومت کی تشکیل میں سردار ابراہیم صدر، علی احمد شاہ، چوہدری عبداللہ، غلام دین وانی، سید نذیر حسین شاہ، میر واعظ یوسف شاہ اور خواجہ ثناء اللہ شمیم بطور وزیر مقرر ہوئے۔ پلندری کے قریب جونجال ہل گاؤں میں، دارالحکومت قائم ہوا، ریڈیو آزاد کشمیر تراڑکھل کے نام سے قائم ہوا، مگر عملی طور پر راولپنڈی ریڈیو پاکستان کے ایک کمرہ میں، یہ ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا اور صدر حکومت کا دفتر، پونچھ ہاؤس صدر راولپنڈی میں قائم تھا۔ بھمبر، میرپور، کوٹلی اور پونچھ میں ڈوگرہ فوج کو، مقامی سابق فوجی، جنہوں نے اپنے آپ کو متحد اور منظم کیا تھا۔ ان سے سخت ہزیمت کا سامنا تھا۔ غازی دوست محمد وغیرہ نے سید علی احمد شاہ کی قیادت میں میرپور شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ فوج کے فرار سے چند دن قبل، ایک قبائلی لشکر بھی میرپور پہنچا، جو شہر کے جنوب مشرقی حصہ میں مورچہ بند ہوا۔ البتہ شہر کے مغربی حصہ سے حویلی سرداراں کی عقبی دیوار سے دوست محمد اور بھیلی بتھار کے لیفٹیننٹ محمد نبی اور ان کے ساتھی محاصرہ توڑ کر، شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے جہادِ آزادی

میں، کچھ لوگوں کی بہت مالی اور جانی قربانی بھی ہے جس میں کیپٹن حسین خان صفِ اول میں شمار ہیں، بھمبر میں بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن، میجر افضل خان شہید وغیرہ، کوٹلی میں بریگیڈیئر سخی دلیر خان، کرنل محمود خان، کیپٹن نتھہ خان اور ان کے ساتھیوں کا، اس خطہ کی آزادی اور ہندوستانی فوج کے حملوں کا دفاع، بڑے کارنامے ہیں جن پر بہت پہلے تحقیق ہو کر صحیح واقعات قلمبند ہونے چاہئیں تھے، مگر اس پر توجہ نہ ہونے سے، جعلی اور فرضی لوگ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ قبائلی لشکر کی مجاہدین کی صفوں میں شمولیت سے، ابتدا میں نفسیاتی برتری کا فائدہ ضرور ہوا، مگر چند ماہ بعد لشکری واپس ہو گئے، آخری دفاع مقامی، آزاد کشمیر کی فوج نے ہی کیا۔ البتہ جولائی ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی فوج بھی آزاد خطہ میں دفاع کے لئے داخل ہوئی۔

انگریز کی منافقت اور سازش

برطانوی استعماریت نے ہندوستان سے مسلمان مغلیہ حکومت کے خاتمہ اور اپنے تسلط کے قیام کے وقت سے ہی، مسلمانوں کے خلاف تعصب، نفرت، دشمنی اور امتیازی سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے وقت بھی، اسی پالیسی اور رویہ کا مظاہرہ کیا گیا، متوازن پالیسی اختیار کرنے والے وائسرائے، لارڈ ویول کو تبدیل کر کے کانگریس کے حامی اور پنڈت نہرو سے ذاتی تعلق کے حامل، ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ جس نے کشمیر میں ہندوستان کی فوج داخل کرنے کی حمایت کی اور انگریز متحدہ افواج کے سپریم کمانڈر اور ہندوستان فوج کے کمانڈر انچیف نے اس کے حکم پر عمل کر کے، افواج کو ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر پہنچایا، مگر اس کی اطلاع حکومت پاکستان کو نہ دی۔ اس کے برعکس پاکستانی افواج کے انگریزی کمانڈر انچیف، فرینک میسروی رخصت پر تھے اور انچارج کمانڈر جنرل گریسی تھے۔ جب رسل کی کمانڈ میں، انگریز ایئر فورس کے پائلٹ ۲۶ اکتوبر کو ہندوستانی فوج کشمیر میں ہوائی سروس سے منتقل کر رہے تھے، تو لاہور ہیڈ کوارٹر میں فوجی پیغامات سنے گئے، مگر انگریز فوجی افسران نے اس کی اطلاع اس دن لاہور میں موجود، گورنر جنرل قائداعظم اور وزیراعظم لیاقت علی خان کو نہ دی۔ دوسرے روز اطلاع ملنے پر گورنر جنرل پاکستان نے، سپریم کمانڈر جنرل گریسی کو جموں کشمیر میں فوج داخل کرنے کا حکم دیا، تو حکم کی تعمیل کی بجائے اس نے اس کی اطلاع فون پر سپریم کمانڈر متحدہ افواج، جنرل ایکنلیک کو دہلی میں دی، جس کے حکم پر جنرل گریسی نے قائداعظم کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور پاکستان فوج سے انگریز فوجی افسران کے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی، عین اس وقت، جنرل لاکرٹ ہندوستان میں انگریز کمانڈر انچیف کے حکم کی تعمیل میں، فوج کشمیر میں بھیج رہے تھے۔ مزید یہ کہ سرحد میں انگریز گورنر، قبائلی لشکر کو روک رہے تھے اور لشکر کشمیر میں داخل ہونے کی اطلاع متواتر ۲۰ اکتوبر سے دہلی میں ماؤنٹ بیٹن کو دے رہے تھے۔ جموں کشمیر میں ہندوستانی فوج، ماؤنٹ بیٹن کی نگرانی اور ہدایات کے مطابق کارروائی کرتی رہی۔ سردار پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کی ریاستوں کے، ہندوستان سے

الحاق کروانے کی کوششوں اور کشمیر میں ایکشن پر خراج تحسین پیش کیا۔ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن اور انگریز جرنیلوں نے گہری سازش کے تحت پاکستان کو ختم کرنے کے لئے، اس کو عملاً کمزور کیا، مگر ناکام ہوئے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کا گورنر جنرل نہ بنائے جانے پر، انتقام میں پاکستان کے خلاف یہ رویہ اپنایا۔ مجھے اس رائے سے اختلاف ہے، اول تو، دو آزاد ممالک کا مشترک گورنر جنرل، قانونی طور پر ہو نہیں سکتا تھا۔ جبکہ ان کے مفادات متضاد اور متصادم تھے، دوسرا اس کی کیا ضمانت تھی، کہ کانگرس اور ہندوستان کے حمایتی رویہ کی روشنی میں، وہ پاکستان کو مزید بڑا نقصان نہ پہنچاتا لہٰذا قائداعظم کی دوررس، گہری سوچ اور تدبر نے درست فیصلہ کیا تھا۔

(بحوالہ وائٹ پیپر ۱۹۷۷ء وزارت خارجہ پاکستان)

جموں کشمیر جنگ کے شعلوں میں

پاکستان فوج کے انگریز کمانڈر اور افسران کے انکار کے باوجود میر پور، کوٹلی، بھمبر اور پونچھ، کے دوسری جنگ عظیم کے فاتح، فارغ شدہ فوجی جوانوں اور مہاراجہ کی فوج میں ضلع میر پور، پونچھ کے فوجیوں نے، کمال جنگی حکمت عملی سے، لداخ سے لے کر مظفر آباد، اور کوٹلی سے مناور تک کے علاقہ سے ڈوگرہ فوج کو پسپا کر دیا۔ پونچھ میں آزاد کشمیر باغ بریگیڈ اور سدھن بریگیڈ، باغ، پلندری، راولا کوٹ وغیرہ میں کامیابی کے بعد پونچھ شہر کے محاصرہ تک محدود رہے۔ مختلف وجوہات کی بناء پر ہم آہنگی نہ ہونے اور حکمت عملی میں عدم اتفاق اور اعتماد کی وجہ سے دونوں بریگیڈ پونچھ شہر پر قبضہ کرنے میں مکمل ناکام رہے، گو کہ تشہیر اور پروپیگنڈہ سے اپنے آپ کو بڑے بڑے جرأت اور بہادری کے خطابات سے نواز، کر ریاست کے فاتح اور افسانوی داستانوں پر مشتمل کتابوں میں قومی ہیرو بن کر سامنے آئے، حتیٰ کہ میر پور، کوٹلی، بھمبر، مناور اور اکھنور کی لڑائیوں میں بھی پروپیگنڈہ کے ذریعے فاتح کہلاتے ہیں، مگر جن لوگوں نے بہادری، جرأت اور جانی قربانی سے ان علاقوں میں ڈوگرہ اور ہندوستانی فوج کا مقابلہ کر کے، اتنے بڑے علاقہ کا دفاع کیا، ان کے کارناموں کو اخباروں اور کتابوں کے اوراق تلے دفن کر دیا گیا۔ یہ پہلو تحقیق طلب ہے۔

لیہہ، کارگل، سکردو اور ذوجیلہ پاس کے وسیع تر رقبہ اور گلیشیئر، برف پوش چوٹیوں پر جموں کشمیر رجمنٹ سے بغاوت کر کے، میجر محمد خان جرال اور میر پور کے، میجر نیک عالم کی کمانڈ میں قبضہ کیا گیا اور بعد میں گلگت سکاؤٹس کی معاونت سے، ہندوستان کی فوج اور ایئرفورس کا مقابلہ کر کے اس علاقہ کا دفاع کیا گیا۔ گلگت، اور ہنزہ، نگر و دیگر شمالی علاقہ جات وغیرہ پر ریاست کی رجمنٹ کے، کرنل حسن خان اور گلگت سکاؤٹس کے، صوبیدار میجر بابر خان نے، گورنر بریگیڈیئر گھنسارہ سنگھ کو گرفتار کر کے قبضہ کر لیا۔ قبل ازیں ایجنسی کے انگریز انچارج میجر براؤن نے، اپنا چارج گورنر گھنسارہ سنگھ کے حوالہ کر دیا ہوا تھا، ان علاقوں کا دفاع گلگت سکاؤٹس، نے آزاد کشمیر ریگولر فورسز کی مدد سے کیا۔ لداخ، گلگت، مظفر آباد، پونچھ (بدوں شہر)، کوٹلی، راجوری، ڈڈیال، میر پور، بھمبر اور اکھنور کا مضافات کے

وسیع تر خطہ، آزاد کشمیر فوج نے ڈوگرہ فوج سے خالی کروالیا تھا اور ہندوستان کی پیدل زمینی اور ہوائی فوج کے حملوں کا، بہادری سے دفاع کر رہی تھی، جبکہ دوسری طرف دونوں حکومتوں، پاکستان و ہندوستان کے درمیان اعلیٰ سطحی، مذاکرات اور خط و کتابت کا تبادلہ اور ریا کارانہ یقین دہانیوں کا سلسلہ جاری تھا، کہ ہندوستان نے جموں کشمیر میں قبضہ اور تسلط کو طول دے کر، ہتھیانے کی حکمت عملی کے طور پر، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پالیسی کے مطابق، ایک الزامات کا مقدمہ پاکستان کی کشمیر میں مبینہ جارحیت، بدامنی اور جنگ کرنے پر محیط، یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں پیش کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ریاست میں اپنی افواج میں اضافہ شروع کر دیا۔ اس وقت ریاست کا دو تہائی سے زیادہ علاقہ، آزاد کشمیر فوج اور گلگت سکاؤٹس کے قبضہ و کنٹرول میں تھا۔ پاکستان نے اپنا جواب دعویٰ اور متبادل مقدمہ، تین دستاویزات و مسودات پر مشتمل ۱۵ر جنوری کو پیش کیا۔ ان میں ایک، جموں کشمیر، اور دوسرا جوناگڑھ، جس کا الحاق پاکستان سے ہو چکا تھا اور قائداعظم کی وفات کے بعد، اس پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا تھا اور تیسرا مسودہ، حیدرآباد دکن کی ریاست کا، جس نے خود مختار رہنے کا اعلان کیا تھا مگر اس پر بھی جارحیت کر کے قبضہ کر لیا گیا تھا۔ تین مسودات جواباً پیش ہونے پر پاکستان کی نمائندگی چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ اور ہندوستان کی نمائندگی گوپال سوامی آئینگر سابق وزیراعظم کشمیر اور شیخ عبداللہ نے کی۔ دونوں فریقین کو سننے کے بعد صدر سیکیورٹی کونسل نے، ہندوستان کے سفارتی اثر و رسوخ اور سیاسی چال سے متاثر ہوئے بغیر، ۲۰ر جنوری کے اجلاس میں، اتفاق رائے سے، قرار دیا کہ مسئلہ کشمیر کن اصولوں پر طے ہوگا۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں پاکستان نے فوج کے دستے ریاست کے دفاع کے لئے ارسال کیے، جس کی اطلاع یو این کمشن کو کر دی گئی۔ یو این کمشن کے دورہ دہلی، جموں کشمیر، آزاد کشمیر اور کراچی کے دوران جنگ بندی اور رائے شماری سے مسئلہ کشمیر حل کرنے پر اتفاق ہو گیا، چنانچہ جنگ بندی، افواج کے انخلاء اور ریاست میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں، استصواب رائے کے حق میں ۲۱ر اپریل اور یو این کمشن میں ۱۳ر اگست ۱۹۴۸ء کو متفقہ قرارداد منظور ہو گئی۔

طے شدہ قرارداد کی روشنی میں ۱۳ر اگست کو جنگ بندی ہو جانی چاہیے تھی مگر دونوں افواج کے انگریز کمانڈر انچیف، نے آپس میں ریاست کی تقسیم کا فیصلہ کیا۔ ماؤنٹ بیٹن کی سابق ہدایات کے مطابق ہندوستان کے کمانڈر جنرل لاکرٹ نے پاکستان کے کمانڈر جنرل گریسی کی ملی بھگت سے، مزید فوج ریاست میں بھیجی۔ جس نے شمال مشرق میں لیہہ، ذوجیلہ پاس اور جنوب مغرب میں راجوری، مینڈھر کے علاقوں پر ٹینک رجمنٹ اور ہوائی فوج کے ذریعے حملہ کر کے، ستمبر سے دسمبر تک زیادہ سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کے لئے، ایڈوانس کیا اور پاکستان نے پسپائی اختیار کی۔ جنرل گریسی کی ہدایات تھیں کہ اوڑی، پونچھ، نوشہرہ کی لائن تک ہندوستان کی فوج آگے بڑھے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس طرح مینڈھر، راجوری، مناور، لیہہ، کرناہ کے علاقوں پر ہندوستانی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اس سے قبل

جنرل گریسی کی ایما پر پونچھ شہر جو محاصرہ میں تھا، وہاں سے شہریوں کا انخلاء اور تازہ فوج کا ہوائی جہازوں کے ذریعے قبضہ ہو چکا تھا (وائٹ پیپر) انگریز جنرل گریسی، جنرل لاکرٹ اور سپریم کمانڈر جنرل آکنلیک کی سازش کے نتیجہ میں ہی، ہندوستان کا آج تک جموں کشمیر پر قبضہ ہے۔

قائداعظم کا دُکھ

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام دنیا کی تاریخ میں نئی دنیا کی طرح، دنیا کے نقشہ میں ایک نئے ملک اور نئی قوم کا نام رقم ہوا، یہ ایک جمہوری معجزہ تھا۔ تحریک پاکستان جو ابتدا میں صرف حقوق مسلم کے نام پر، اول سرسیّد احمد خان نے اور پھر بتدریج مسلم لیگ کے ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں قیام کی تشکیل میں شروع ہوئی اور ۲۳ رمارچ ۱۹۴۰ء کو ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل حکومت کے قیام کے مطالبہ کی شکل اختیار کی۔ برصغیر میں زبردست سیاسی مدوجذر سے گذر کر پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ یہ قائداعظم و مسلم لیگ کی عظیم سیاسی فتح، ہندو کانگرس اور اس کی ہم نوا، برطانوی استعماریت کی شکست تھی۔ اس شکست کا انتقام ہر سطح پر لیا جا رہا تھا۔ پہلا حملہ ریڈکلف ایوارڈ کی شکل میں، دوسرا نسلی فسادات اور نقل مکانی کے انداز میں، تیسرا پاکستان کے حصہ میں آنے والے مالی اثاثہ جات روک کر، پاکستان کو مالی طور پر فاقہ کشی کا شکار کر کے اور چوتھا جموں کشمیر کے مہاراجہ پر دباؤ ڈال کر سازش کے ذریعے ہندوستان کی فوج کو ریاست میں داخل کر کے قبضہ اور تسلط قائم کرنے کے عمل سے لیا گیا۔ انتقام کی یہ آگ بدستور بھڑک رہی ہے اور جموں کشمیر اور اس میں بسنے والے عوام، انتقام کے شعلوں کی لپیٹ میں ہیں۔ انتقام کے اقدامات نے عمر کے آخری حصہ میں قائداعظم، فولادی عزم اور پہاڑ کے مانند بلند حوصلہ کی مالک شخصیت کو، ہلا کر رکھ دیا۔ ٹی بی جیسی مہلک مرض کو سینہ میں چھپائے جو انسان شب و روز انتھک جدوجہد کر کے منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، وہ جموں کشمیر میں ہندو سازش کے اثرات سے نبرد آزمانہ ہونے کے غم کی، ضرب برداشت نہ کر سکا اور خالق حقیقی کے سپرد ہو گیا۔

بہت سال گذرنے کے بعد، لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے، لندن میں انتقال اقتدار کے حوالہ سے، گذرے واقعات پر تبصرہ کے دوران، ایک صحافی نے سوال کیا کہ پاکستان بنانے کا ذمہ دار کون تھا؟ ماؤنٹ بیٹن نے فی الفور جواب دیا، صرف ایک شخص، محمد علی جناح۔ جب ہندوستان نے پاکستان کے مالی اثاثے روک لیے، تو پاکستان میں حکومتی اخراجات چلانے، ملازموں اور افواج کی تین ماہ سے تنخواہ ادا کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اس پر مہاتما گاندھی نے بھی ہندوستان حکومت سے احتجاج کیا، تو ایک ہندو، گوڈسے نامی آدمی سے، ہندوستان کے عظیم لیڈر کو گولی مروا کر قتل کروا دیا گیا۔ گویا جس مہاتما گاندھی نے، ریاست جموں کشمیر کو مہاراجہ پر دباؤ ڈال کر، ہندوستان میں شامل کروایا، ہندوستان کے متعصب ہندو نے پاکستان کے انتقام میں، اس کو بھی قتل کر دیا۔ آزاد ہندوستان میں آزادی کا یہ پہلا تحفہ تھا۔ قائداعظم نے مالی تنگدستی، میں جب مالی مشکل کا اظہار کیا، تو آئی ایچ اصفہانی، عبداللہ ہارون اور نظام حیدرآباد دکن

نے قائداعظم کو کھلے، بلینک چیک پیش کیے، اس سے حکومت کے واجبات ادا ہوئے۔ کتنا مخلصانہ عظیم جذبہ تھا

مقدور ہو تو موت سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے!

جموں کشمیر اقوام متحدہ میں

جب قائداعظم گورنر جنرل پاکستان کو، ہندوستان کی افواج کی، ہوائی جہازوں سے سری نگر میں داخل کرنے کی، اطلاع ملی اور قائد نے جنرل ڈگلس گریسی کو، فی الفور کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے کا حکم دیا، تو بجائے تعمیل کے، اس نے دہلی میں مقیم متحدہ افواج کے سپریم کمانڈر، جنرل آکنلیک کو فون پر اس حکم کی اطلاع دی، جنرل آکنلیک نے اس کو تعمیل کرنے سے منع کرتے ہوئے، پاکستان فوج سے تمام انگریز افسران کے مستعفی ہونے کی، دھمکی دینے کو کہا، جنرل گریسی نے ایسا ہی کیا۔ ایک طرف سے ہندوستان کی حکومت کے تحت انگریز کمانڈر انچیف جنرل لاکرٹ دہلی میں مقیم، سپریم کمانڈر کے سامنے کشمیر میں فوج ارسال کر رہا تھا، دوسری طرف پاکستان کے، گورنر جنرل کے حکم پر عمل روک دیا گیا تھا۔ ۱۸؍اکتوبر کو جنرل آکنلیک قائداعظم سے ملا تو فیصلہ ہوا، کہ دونوں ممالک کے گورنر جنرل اور وزراءاعظم، یکم نومبر کو لاہور میں مذاکرات میں یہ مسئلہ طے کریں گے، مگر یکم نومبر کو پنڈت نہرو، طبیعت ناساز ہونے کا بہانہ کر کے، میٹنگ میں شامل ہی نہ ہوا، تاہم قائداعظم نے تجویز کیا کہ (۱) دونوں گورنر جنرل، مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے، دونوں ملکوں کی فورسز کو مطلع کریں کہ اڑتالیس گھنٹوں کے اندر جنگ بند کریں، اگر قبائلی اس پر عمل نہ کریں تو دونوں ممالک کی افواج بل کر ان کے خلاف کارروائی کریں۔ (۲) ہندوستانی افواج اور قبائلی بیک وقت ریاست سے انخلاء کریں اور (۳) دونوں گورنر جنرل ہا، کو اختیار دیا جائے، کہ ریاست میں انتظام سنبھال کر اور امن قائم کر کے، اپنی نگرانی میں رائے شماری سے الحاق کا فیصلہ کر دیں۔ ماؤنٹ بیٹن یہ تجاویز ہندوستان حکومت کو پیش کرنے کے لئے وعدہ دے کر گیا، مگر دوسری رات پنڈت نہرو نے ریڈیو پر تقریر کر کے، ان تجاویز کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا۔ دوطرفہ مذاکرات کا پہلا تجربہ ناکام ہو گیا، دونوں طرف وزراءاعظم کی سطح پر، خط و کتابت کے ذریعے پیغامات کا تبادلہ اور ریاست میں جنگ، دونوں جاری رہے، حتیٰ کہ یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان نے یہ مسئلہ، اقوامِ متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں پیش کر دیا۔ ہندوستان کی سیاسی حکمتِ عملی تھی، کہ ہندوستان کے سفارتی تعلقات کے اثر کو استعمال کر کے، پاکستان جیسے نوزائندہ ملک کے نئے کمزور، سفارتی مراسم پر، سبقت حاصل کر کے، قبائلی حملہ کے الزام کے تحت، جموں کشمیر میں حملہ آور جارح فریق قرار دلوایا جا کر، ریاست کو ہندوستان کا حصّہ قرار دلوایا جائے۔ سکیورٹی کونسل نے الزامات، جوابی الزامات اور متعلقہ دستاویزات کے ملاحظہ کے علاوہ بالمقابل طویل تقاریر بھی سنیں۔ ہندوستان کی طرف سے گوپال سوامی آئینگر بطور نمائندہ ہندوستان اور شیخ عبداللہ بحیثیت نائب، سکیورٹی کونسل میں

پیش ہوئے، شیخ عبداللہ نے ہندوستان کی حمایت اور پاکستان کے خلاف بہت جذباتی تقریر کی۔ پاکستان کی نمائندگی ظفر اللہ خان، وزیر خارجہ نے کی، سیکیورٹی کونسل کی تاریخ میں ظفر اللہ کی طویل ترین تقریر تھی مگر سوال کیا جاتا رہا ہے، کہ پاکستان نے آزاد کشمیر کی عبوری حکومت کے صدر سردار ابراہیم یا مسلم کانفرنس کے صدر، چوہدری حمید اللہ کو، جموں کشمیر کے عوام کی ترجمانی اور نمائندگی کے لئے، کیوں نہ سیکیورٹی کونسل میں پیش کیا، خصوصیت کے ساتھ شیخ عبداللہ کے دعویٰ کو مسترد کرنے اور غلط قرار دینے کے لئے، یہ کیوں ضروری نہ سمجھا گیا۔ سردار ابراہیم خان امریکہ میں گئے بھی تھے۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر تاثیر تھے، مگر ان سے صرف ایک پریس کانفرنس ہی کروائی گئی، جس میں فوٹو ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کا شائع ہوا، جبکہ اس کے نیچے نام، سردار ابراہیم خان کا لکھا ہوا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اپنی سوانح حیات آتش چنار میں، اس پر بڑی طنز بھی کی ہے۔ میں نے، سردار ابراہیم خان سے ملاقات میں، اس کی کئی بار وجہ پوچھی، مگر وہ تسلی بخش وضاحت نہ کر سکے، بلکہ ناراضگی کے انداز میں کہا کہ "مجھے تو قائداعظم سے ملاقات کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ سیکیورٹی کونسل میں تقریر تو دور کی بات تھی"۔ انہوں نے بھی تصدیق کی کہ پریس کانفرنس چونکہ دونوں نے کی تھی، جس وجہ سے ڈاکٹر تاثیر کے فوٹو کے نیچے نام سردار صاحب کا، بحیثیت صدر حکومت لکھا گیا، تاہم ان کا فوٹو شائع نہیں کیا گیا تھا۔ ایک دفعہ سردار ابراہیم خان صاحب نے یہ شکایت، خورشید صاحب سے بھی کی اور یہ گلہ بھی کیا، کہ وہ لاہور میں کئی لوگوں کے پاس گئے، مگر کسی نے بھی قائداعظم سے ان کی ملاقات نہ کروائی۔ خورشید صاحب نے کہا، کہ وہ ستمبر کے آخر میں، قائداعظم کی ہدایت پر سری نگر گئے تھے، جہاں شیخ عبداللہ نے ان کو گرفتار کروا کر قلعہ ہری پربت میں قید کروا دیا تھا۔ جہاں سے بعد میں گھنسارا سنگھ، گورنر گلگت بلتستان کے تبادلہ میں، وہ پاکستان آئے۔ تب تک قائداعظم وفات پا چکے تھے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ سردار ابراہیم نوعمر تھے اور سیاست میں شیخ عبداللہ کے مقابلے میں، بالکل نووارد تھے۔ شیخ صاحب ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس کے صدر تھے، ۱۹۳۱ء میں جیل گئے تھے، سردار ابراہیم صاحب جنوری ۱۹۴۷ء میں پہلی بار ممبر اسمبلی، پرجا سبھا منتخب ہوئے تھے، وہ اپنے حلقہ نیابت کے تو لیڈر تسلیم کیے جاسکتے تھے، مگر شیخ عبداللہ جو ریاست کے مسلمہ لیڈر تھے، اس کے مقابلہ میں، سردار ابراہیم صاحب کا سیاسی قد کاٹھ تو کچھ بھی نہ تھا۔ جس وجہ سے ان کو سیکیورٹی کونسل میں پیش نہ کیا گیا، پھر جس شخص کی پہچان قائداعظم کو بھی نہ تھی، اس کو بین الاقوامی فورم پر پیش کرنا غیر مناسب خیال کیا گیا ہوگا۔

چوہدری حمید اللہ معروف مسلمہ لیڈر تھے۔ چوہدری غلام عباس اور شیخ عبداللہ کے ہمعصر بھی تھے۔ چوہدری غلام عباس جیل میں تھے، حمید اللہ ان کی جگہ قائمقام صدر مسلم کانفرنس اور پارلیمانی لیڈر تھے، سینئر ایڈووکیٹ اور بہترین مقرر بھی تھے، قائداعظم کے دورہ کشمیر ۱۹۴۴ء میں ان کے ساتھ رہے، کئی ملاقاتیں کر چکے تھے، مگر ان تمام اوصاف اور صلاحیتوں کے باوصف، ان کو پاکستان کی طرف سے بحیثیت نمائندہ عوام جموں کشمیر، سیکیورٹی کونسل میں

کشمیر کا مقدمہ پیش کرنے کیوں نہ بھیجا گیا؟ باوصف تحقیق اس کی کوئی اطمینان بخش وضاحت نہ مل سکی۔ اغلب امکان یہ ہے، کہ مسلم کانفرنس کی سابقہ پالیسی اور دہلی میں قائداعظم سے ملاقات میں، بقول اسحاق قریشی، قائداعظم کی ہدایت پر چوہدری حمید اللہ نے، لاہور اور جموں میں پریس کانفرنس کے ذریعے، مہاراجہ کو ریاست آزاد خودمختار رکھنے کا مشورہ دیا تھا، جبکہ شیخ عبداللہ نے اس کی مخالفت کی تھی، حتیٰ کہ ۱۸ر جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے سری نگر کے اجلاس میں، جموں کشمیر کو آزاد خودمختار رکھنے کی حمایت میں قرارداد بھی پیش کی گئی تھی۔ جو قائداعظم کی ہدایت کے عدم ثبوت کی وجہ سے منظور نہ ہوسکی تھی۔ اس مؤقف کا تمام ریکارڈ، شیخ عبداللہ کے پاس موجود تھا۔ جس کے برعکس سیکیورٹی کونسل میں، الحاق کے حق میں مؤقف پیش کرنے سے، ان کی پوزیشن کمزور ہوجاتی اور شیخ عبداللہ کے مؤقف کو تقویت ملتی۔ یہ میرا اپنا تجزیہ ہے۔

سیکیورٹی کونسل کا کردار

سیکیورٹی کونسل نے ہندوستان کی طرف سے، یکم جنوری ۱۹۴۸ء کی شکایت، پاکستان کے خلاف قبائلی لشکر کی حمایت، جموں کشمیر میں جارحیت میں اعانت کے الزام، اس کے نمائندہ کو سننے، پاکستان کے دفاع اور بالمقابل الزامات کی تائید میں، طویل تقریر سماعت کرنے اور دونوں طرف سے پیش کیے گئے، مؤقف کا جائزہ لینے کے بعد، ہندوستان کی اختیار کی گئی حکمتِ عملی کے بالکل برعکس، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس کی متفقہ طور پر ۱۷ر جنوری، ۲۰ر جنوری، ۶ر فروری، ۲۱ر اپریل ۱۹۴۸ء کو منظور کی گئی قراردادوں میں ذیل کے اصول طے کیے گئے:

(i) ریاست جموں کشمیر سیاسی اور جغرافیائی تشخص کی حامل ریاست ہے جس کے اقتدارِ اعلیٰ کے حامل اس کے عوام ہیں۔

(ii) ریاست کے الحاق کا فیصلہ آزاد، غیر جانبدار استصوابِ رائے، زیرِ نگرانی اقوامِ متحدہ، کے ذریعے ہونا ہے۔

(iii) اقوامِ متحدہ کے قائم کردہ کمشن نے برصغیر کے دورہ میں باہمی مشاورت سے، بیرونی افواج کے انخلاء کا پروگرام مرتب کرنا ہے۔

(iv) جملہ غیر جانبدار سیاسی جماعتوں پر مشتمل حکومت کا قیام۔

(v) جنگ کے سبب تارکین ریاست کی ریاست میں آزادانہ واپسی اور ریاست میں آبادی اور تمام حقوق اور شہری آزادیوں کا تحفظ فراہم کرنا۔

(vi) اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کا پلیبیسٹ ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنا۔

(vii) استصوابِ رائے کے عمل کے لئے، ہندوستان و پاکستان کی معاونت کرنا۔

(viii) ہندوستان کی طرف سے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی، مہاجرین کی آبادکاری اور اقلیتوں کے تحفظ کی ذمہ داری۔

اقوام متحدہ کے کمشن کی قراردادیں

سیکیورٹی کونسل کی طرف سے مقرر کردہ کمشن نے، ہندوستان و پاکستان کی حکومتوں سے مشاورت اور جموں، سری نگر، مظفر آباد، میر پور کے دورہ اور آزاد حکومت سے مشاورت کے نتیجہ میں، ۱۳راگست ۱۹۴۸ء اور ۵رجنوری ۱۹۴۹ء کو متفقہ تجاویز کی شکل میں سیکیورٹی کونسل میں قراردادیں پیش کیں، جو سب اراکین اور ہندوستان، پاکستان نے اتفاق رائے سے منظور کیں۔ ان میں طے شدہ امور ذیل ہیں:

(i) ریاست میں فی الفور جنگ بندی پر ہندوستان پاکستان کا اتفاق۔

(ii) جنگ بندی کی نگرانی کے لئے، کمشن میں اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی تقرری۔

(iii) آزاد کشمیر سے قبائلیوں اور افواج پاکستان کا انخلاء، پاکستان کی ذمہ داری۔

(iv) ریاست کے مستقبل کے حتمی فیصلہ تک، آزاد جموں کشمیر میں مقامی حکومت کو انتظامی امور چلانے کا اختیار۔

(v) افواج پاکستان اس کے شہریوں اور قبائلیوں کے انخلاء کے بعد، ہندوستان کی افواج کے بڑے حصہ کا انخلاء۔

(vi) سری نگر حکومت کا، قیام امن اور شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری۔

(vii) ریاست کے عوام کی صوابدید کے تابع، ریاست کے مستقبل کا تعین۔

(viii) سیکریٹری جنرل پلبیسٹ ایڈمنسٹریٹر کی تقرری کرے گا، جس کو مقامی عملہ کی تقرری کا اختیار حکومت سری نگر تفویض کرے گی۔

(ix) ریاست میں مکمل امن کے اطمینان پر، ریاست سے ہندوستان کی باقی فوج کے ختم کرنے اور انخلاء کا ٹائم ٹیبل طے کیا جائے گا۔

(x) آزاد جموں کشمیر ریگولر فورسز کی تعداد کا تعین، کمشن آزاد حکومت کی مشاورت سے کرے گا۔

(xi) ریاست کے تمام باشندے گھروں کو واپس ہوں گے، عوام کو مکمل سیاسی آزادی ہوگی، استصواب میں کوئی جبر و دباؤ نہ ہوگا۔ ریاست کے تمام حکومتی ادارے استصواب رائے میں، معاونت اور سہولت کاری مہیا کرنے کے پابند ہوں گے۔

(xii) استصواب رائے کا نتیجہ، پلبیسٹ ایڈمنسٹریٹر یو این کمشن اور جموں کشمیر حکومت کو پیش کرے گا اور سیکریٹری جنرل کو مطلع کرے گا کہ استصواب رائے آزادانہ و منصفانہ ہوا ہے۔

قراردادوں کے مغائر اقدام پر امتناع

یو این کمشن کی تجاویز پر عمل درآمد کے لئے، ۲۲ردسمبر ۱۹۴۸ء کا دن اور ہندوستان کی افواج کی تعداد کے تعین کے لئے، ثالثی کے ذریعہ کوشش جاری تھی، کہ ہندوستان نے ریاست میں آئین ساز اسمبلی کے الیکشن کی حکمت

عملی اختیار کی، بالخصوص عین اس وقت جب ۱۴؍مارچ ۱۹۵۰ء کو صدر سکیورٹی کونسل، جنرل میکناٹن نے استصواب رائے کے ناظم (ایڈمنسٹریٹر) فلیٹ ایڈمرل، جنرل ڈبلیو نمٹز کی سیکریٹری جنرل کی طرف سے تقرری کا اعلان کر دیا اور ۲۲؍دسمبر کو استصواب رائے کے لئے افواج کے فوری انخلاء کی قرارداد منظور کروائی۔ ہندوستان کی کوشش تھی کہ اسمبلی الیکشن، رائے شماری کا بطور متبادل پیش کیا جائے۔ ۱۳؍اگست ۱۹۴۸ء کو جنگ بندی کا فیصلہ ہوا، مگر ہندوستان نے مزید فوج، ٹینک اور ائیر فورس ریاست میں داخل کر کے، زیادہ سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کر لینے کے بعد یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی شروع کی۔ سری نگر حکومت نے، جب نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل کی سفارش پر، الیکشن کا اعلان کیا، تو پاکستان نے اس سازش پر، سکیورٹی کونسل کو متوجہ کیا، کونسل نے دونوں طرف سے، مؤقف پیش ہونے کے بعد، اتفاق رائے سے سکیورٹی کونسل کے اجلاس منعقدہ ۳۰؍مارچ ۱۹۵۱ء میں، قرار دیا کہ ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۰ء کو جنرل کونسل نیشنل کانفرنس کی، منظور کردہ قرارداد کی روشنی میں، آئین ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد کر کے، جب کہ اسمبلی اب ریاست کے ایک حصہ پر مبنی ہے۔ ایسی اسمبلی کو سلامتی کونسل کی منظور کردہ قراردادوں، ۲۱؍اپریل، ۳؍جون ۱۹۴۸ء، ۱۴؍مارچ ۱۹۵۰ء اور یو این کمشن کی منظور کردہ قرارداد ۱۳؍اگست ۱۹۴۸ء اور ۵؍جنوری ۱۹۴۹ء کے مغائر کسی حصہ، ریاست یا پوری ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا، قطعاً اختیار حاصل نہیں ہے۔ اور کسی ملک کے ساتھ ریاست یا اس کے کسی حصہ کو منسلک کرنا کالعدم، باطل اور ناجائز ہوگا۔ دوسری مرتبہ جب ہندوستانی مقبوضہ جموں کشمیر اسمبلی نے، الحاق ہندوستان کی توثیق کی متفقہ قرارداد منظور کی اور پاکستان نے، سکیورٹی کونسل میں یہ عذر اٹھایا۔ اس پر سکیورٹی کونسل نے دونوں ممالک کو، سماعت کرنے کے بعد، برطانیہ اور امریکہ کی پیش کردہ اور اتفاق رائے سے منظور شدہ، ۳۰؍مارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد کا اعادہ کرتے ہوئے، ہر دو فریقین پر واضح کیا، کہ سکیورٹی کونسل اور کمشن کی منظور کردہ قراردادوں کے مغائر، ریاست کی کسی جماعت یا اسمبلی کو، سفارش یا قرارداد کے ذریعے، ریاست کے کسی حصہ یا ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے یا کسی ملک سے منسلک کرنے کا، قطعاً اختیار نہیں ہے اور ایسا ہر اقدام یا عمل کالعدم، غیر مؤثر اور ساقط ہوگا۔ قرارداد ۲۴؍جنوری ۱۹۵۷ء کو، متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

ان دو قراردادوں کے نتیجہ میں پہلا اصول یہ طے ہوا کہ ہندوستان اور کسی مرحلہ پر پاکستان، ہر دو فریقین ریاست کے، ان کے زیر انتظام خطہ میں منعقد ہونے والے اسمبلی انتخابات، سکیورٹی کونسل کی منظور شدہ قراردادوں کے تحت یو این او کی زیر نگرانی ہونے والے مجوزہ استصواب رائے کا نعم البدل نہیں ہیں۔ ہندوستان اپنے زیر تسلط حصہ میں ہونے والے اسمبلی انتخابات کو، متواتر رائے شماری کا بدل قرار دیتا ہے، مگر جموں کشمیر کے عوام، پاکستان اور عالمی ممالک یہ دعویٰ قبول نہیں کرتے اور نہ ہی سکیورٹی کونسل اس کو تسلیم کرتی ہے۔ دوسرا اصول یہ طے شدہ ہے کہ جنگ بندی لائن کے دونوں، بلکہ تینوں حصوں میں قائم سیاسی جماعتوں اور اسمبلیوں کی تجویز اور سفارش کے اثر میں،

ریاست کے کسی حصہ کو ہندوستان یا پاکستان سے منسلک نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کی روش پر جس طرح ہندوستان، ہندوستانی سیاسی جماعتوں کو، ریاست میں منظم کر کے سرمایہ، حکومتی اقتدار کے لالچ اور فوجی قوت کے استعمال سے، اپنے زیر تسلط حصہ کو ہندوستان سے منسلک اور بالآخر مدغم کرنے پر کوشاں ہے۔ کچھ عرصہ قبل بالخصوص معاہدہ شملہ کے بعد، پاکستان کے سیاستدان اور حکمران بھی گلگت بلتستان اور آزاد جموں کشمیر میں، پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو منظم کر کے، سرمایہ کی طاقت اور حکومتی اقتدار کے لالچ کے تحت، ان علاقوں کو پاکستان سے منسلک کرنے کے اقدامات پر عمل پیرا ہیں، پاکستان کی ایسی سوچ خود پاکستان کی قومی اور ملکی مؤقف سے متضاد اور متصادم ہے اور پاکستان کے وسیع تر مفاد اور جموں کشمیر کے عوام کی صدیوں پر محیط قربانی کے ضیاع کے مترادف ہے۔ تیسرا اصول یہ طے ہے کہ قانون کی نظر میں، ریاست کی سیاسی اور جغرافیائی وحدت مسلمہ ہے اور سکیورٹی کونسل نے اپنی قراردادوں کے ذریعے اس کی توثیق کردی ہوئی ہے۔

افواج کے انخلاء پر ثالثی

صدر سکیورٹی کونسل نے افواج کے انخلاء، تعداد کے تعین اور استصواب کے عمل کے لئے فضاء ہموار کرنے کے لئے، آسٹریلیا کے اوون ڈکسن اور اس کے بعد فرینک گراہم، گنار جارنگ اور دوسری دفعہ پھر، فرینک گراہم کو ثالث مقرر کیا، نگران کی تجاویز اور سفارشی رپورٹ کو ہندوستان نے، اور کبھی دونوں ممالک نے قبول نہ کیا۔ اس طرح ثالثی کی مشق بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

پاکستان کی حکمت عملی

اقوام متحدہ کا کمشن برصغیر کے دورہ پر تھا کہ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم وفات پا گئے۔ اس کے بعد ۱۶ را کتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان شہید ہو گئے۔ پاکستان میں جانشین قیادت نے اندرونی اقتدار کی سازشوں میں ملوث ہو کر، جموں کشمیر پر مصالحتی پالیسی اور پنڈت نہرو کی خوشامد کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہو کر، ہندوستان اور پنڈت نہرو کو ''بڑے بھائی'' کا مقام دے دیا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء سے جنوری ۱۹۵۷ء تک سکیورٹی کونسل کو غیر متحرک رکھا گیا۔ جون ۱۹۵۳ء میں ملکہ الزبتھ کی رسم تاج پوشی کے موقع پر پنڈت نہرو اور وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کی ملاقات کے بعد، پنڈت نہرو ۱۵ رجولائی کو کراچی آئے اور آئندہ ملاقات پر، مذاکرات ہونا طے پائے۔ ۹ راگست کو شیخ عبداللہ وزیر اعظم جموں کشمیر کو خود مختار کشمیر کے الزام پر گرفتار کر لیا گیا، جس پر احتجاج کا طوفان کھڑا ہو گیا، اس ماحول میں محمد علی بوگرہ ۱۶ راگست ۱۹۵۳ء کو، دہلی پہنچے اور وزیر اعظم ہندوستان کے ساتھ، ۲۰ راگست کے مشترکہ اعلامیہ میں کشمیری عوام کی خواہش کے مطابق، مسئلہ حل کرنے کا، ذکر کیا گیا اور بڑی طاقتوں کی مداخلت سے، الگ رہنے کا اعلان ہوا، اس کے نتیجہ میں ایڈمرل نمٹز، استصواب ایڈمنسٹریٹر، مستعفی ہو گئے۔ جس کے بعد سکیورٹی کونسل میں آج تک، استصواب رائے کا ناظم مقرر نہ ہو سکا۔

جموں کشمیر معاہدات اور تقسیم کی زد میں

۱۹۵۳ء میں جنرل ایوب اور اس کے بعد، نومبر میں غلام محمد گورنر جنرل کے دورہ امریکہ اور اس سے قبل سیکریٹری سٹیٹ، جان فوسٹر ڈلس اور نائب صدر نکسن کے دورہ پاکستان کے نتیجہ میں، فوجی امداد کے اعلان پر، پنڈت نہرو نے خط کے ذریعے اور پارلیمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے، جنوبی ایشیا میں طاقت کے توازن کے بدلنے کی آڑ میں، کشمیر پر مؤقف بدلنے کا عندیہ دیا۔ ۱۹رمئی ۱۹۵۴ء کو کراچی میں پاکستان امریکہ دفاعی معاہدہ ہوا، اس سے قبل ۲۸رمارچ کو، روس نے پاکستان سے احتجاج کیا تھا، کہ امریکی تعلقات سے پاکستان کو نقصان ہوگا۔ گورنر جنرل نے اس مرحلہ پر، سکندر مرزا اور جنرل ایوب کو کابینہ میں شامل کر کے، سول فوجی حکومت قائم کر لی۔ دوسری طرف ہندوستان سے تعلقات میں، خوشامدی رویہ اپنا لیا۔ لکھنؤ میں قیام پر ۲۴رنومبر ۱۹۵۴ء اور جنوری ۱۹۵۵ء کو دہلی میں یوم ریپبلک کی تقریب میں، پنڈت نہرو کی خوب تعریف کی، جبکہ وزیراعظم بوگرہ نے نہرو جی کو اس سے قبل ۲۶ردسمبر کو خط کے ذریعے یقین دلایا، کہ مسئلہ کشمیر سکیورٹی کونسل میں نہیں اٹھایا جائے گا۔ مئی ۱۹۵۵ء میں، دہلی میں اس پالیسی کا اعادہ کیا گیا، کہ جوں کی توں حیثیت کشمیر میں قائم رہے گی اور استصواب رائے پر، اصرار نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح پاکستان کے کشمیر پر مؤقف سے پہلو تہی کی گئی۔ پاکستان کے معاہدہ دفاع سیٹو اور سینٹو میں شمولیت کے نتیجہ میں، ایک طرف ہندوستان نے مسئلہ کشمیر کے، استصواب رائے کے ذریعے حل کرنے سے، انکار شروع کر دیا۔ دوسری طرف روس جو اس وقت تک سکیورٹی کونسل میں غیر جانبدار تھا، اس کی پالیسی بھی بدل گئی۔ پرائم منسٹر بلگانن اور سیکریٹری اول نے ہندوستان کا دورہ کیا، ۱۰ردسمبر ۱۹۵۵ء کو سری نگر کے اجتماع میں، تقریر کے دوران بلگانن نے کشمیر کو شمالی ہندوستان کا حصہ اور خروشیف نے اس کو ہندوستان کی ریاست قرار دیا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے، پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ کے تحت اقتدار حاصل کر کے، ہندوستان سے مزید نرم رویہ اختیار کر لیا۔ ۲۲رجون ۱۹۶۰ء کو ایک بیان میں شمال کی طرف سے، یعنی چین کے خطرہ کے خلاف، ہندوستان پاکستان مشترکہ دفاع کا اعلان کیا گیا اور جموں کشمیر کا مسئلہ پس پشت ڈال دیا گیا۔ ۲۹رستمبر ۱۹۶۰ء میں سندھ طاس معاہدہ ہوا، جس کے لئے پنڈت نہرو کراچی آئے، اس معاہدہ میں جموں کشمیر کے دریاؤں کے پانی کی بندر بانٹ، جموں کشمیر کے عوام کے حقوق کے مغائر کی گئی اور ہندوستان کا جموں کشمیر پر، غاصبانہ اور جارحانہ قبضہ اور تسلط، جائز مان کر، اپنے زیر قبضہ علاقہ میں بلا تخصیص اور لاتعداد بجلی گھر تعمیر کرنے کا، ہندوستان کو اختیار دے دیا گیا۔ اس پہ مزید یہ کہ مشترکہ اعلامیہ میں، مسئلہ کشمیر کے حل بذریعہ استصواب رائے کے ذکر سے، اجتناب کیا گیا، جبکہ قبل ازیں وزیراعظم فیروز خان نون نے، سری نگر میں بلگانن اور خروشیف کی مخالفانہ تقاریر کے باوجود، ۲۴رجنوری ۱۹۵۷ء کے اجلاس سکیورٹی کونسل میں استصواب کے حق میں، کشمیر میں روس کے مؤقف اور حمایت کو

اپنے حق میں استعمال کروایا۔ اجلاس میں فیروز خان نون نے ہندوستان کے نمائندہ، کرشنا مینن کے اعتراض کے جواب میں، جب یہ برملا پیشکش کی، کہ سکیورٹی کونسل استصواب رائے، پر عمل کے لئے اگر آج ہی ایڈمنسٹریٹر مقرر کرے، تو پاکستان کشمیر سے، آج ہی یک طرفہ افواج کے انخلاء کے لئے تیار تھا۔ کرشنا مینن کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔

امریکن یوٹو جہاز کی پشاور سے مئی ۱۹۶۰ء کو، روس کے علاقہ پر، جاسوسی پرواز کے واقعہ سے، روس اور پاکستان کے باہمی تعلقات میں کشیدگی بڑھ گئی۔ اس سے قبل ایوب خان چین کے خلاف، ہندوستان و پاکستان کے متحدہ دفاع کے حق میں بیان دے چکے تھے۔ اس دوران ہندوستان نے، دسمبر ۱۹۶۱ء میں گوا پر قبضہ کر لیا، اور چین کی فوج لداخ میں، اقصائے چین کے علاقہ میں بارہ ہزار مربع میل رقبہ پر قابض ہو گئی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ہندوستان کے وزیراعظم نے، وہ علاقہ واپس حاصل کرنے کے لئے اپنی فوج کو حکم دیا، مگر ہندوستانی فوج پسپا ہو گئی اور شکست کے نتیجہ میں، پنڈت نہرو نے ۲۶ اکتوبر کو حمایت کے لئے خط ارسال کیا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ کے صدر، کینیڈی نے ۲۸ اکتوبر کو ہندوستان کو فوجی امداد کا اعلان کر دیا، جس کی برطانیہ نے تائید کر دی۔ امریکہ اور برطانیہ سے اس دوران مسلسل رابطہ کے نتیجہ میں، وزیر خارجہ محمد علی بوگرہ نے ہندوستان کو یقین دلایا، کہ پاکستان کی طرف سے، ہندوستان اور کشمیر میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو گی۔ چین و ہندوستان کی نیفا میں جنگ کے دوران، ایوب خان گلگت میں سیر سے لطف اندوز ہوتے رہے اور جنگ بندی کے بعد کراچی لوٹے۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ ایک بہترین موقع تھا، کہ پاکستان، جموں کشمیر پر قبضہ کر سکتا تھا اور اگست ۱۹۶۵ء والی مہم جوئی اگر اکتوبر ۱۹۶۲ء میں کی جاتی، تو کامیابی کا باعث بن سکتی تھی، ایوب خان نے ایک بہتر موقع گنوا دیا۔ اس دوران امریکہ کے صدر کینیڈی اور وزیراعظم برطانیہ میکملن، صدر ایوب خان اور محمد علی بوگرہ وزیر خارجہ سے برائے راست اور سفارتی سطح پر رابطہ میں رہے، پنڈت نہرو دوسری طرف اپنے مؤقف پر اڑے رہے اور سفارتی دباؤ کے تحت، جموں کشمیر میں پاکستان کے حق میں، کسی قسم کی، رعایت دینے سے انکار کر دیا، تاہم متواتر سفارتی کوششوں سے دو طرفہ مذاکرات پر اتفاق ہوا۔ مذاکرات کے چھ دور ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء اور ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء کے درمیان، ہندوستان کی طرف سے، سردار سورن سنگھ وزیر ریلوے اور پاکستان کے وزیر صنعت، ذوالفقار علی بھٹو کے مابین ہوئے۔ ۲۷ سے ۳۰ دسمبر ۱۹۶۲ء راولپنڈی، ۱۶ سے ۱۹ جنوری ۱۹۶۳ء نئی دہلی، ۸ سے ۱۱ فروری کراچی، ۱۲ سے ۱۴ مارچ کلکتہ میں، ۱۲ سے ۲۵ اپریل کراچی اور ۱۵ سے ۱۶ مئی کو نئی دہلی میں ہونے والے مذاکرات، بدوں کسی پیش رفت کے ختم ہو گئے۔ ان مذاکرات میں، ذوالفقار علی بھٹو نے استصواب رائے، علاقائی استصواب، دریا چناب پر تقسیم کی تجاویز پیش کیں، مگر ہندوستان، جنگ بندی لائن کی سطح پر ہی تقسیم کے موقف پر قائم رہا۔

مابعد، صدر ایوب خان نے صدر کینیڈی کے نام خط میں، جموں، وادی کشمیر اور لداخ ہندوستان کو دینے کی

پیشکش کردی۔ یہ خط ۲۶ رجنوری ۱۹۶۳ء کوتحریر کیا گیا۔ ایوب خان کی یہ پیشکش بھی قبول نہ ہوئی۔ ان تمام واقعات سے واضح ہوتا ہے، کہ جنوری ۱۹۵۷ء کے بعد فوجی جرنیل ایوب خان نے پاکستان کے، طے شدہ مؤقف سے روگردانی کر کے، سیکیورٹی کونسل سے باہر کس قدر کمزور پالیسی اختیار کر کے، دوطرفہ مذاکرات میں متبادل تجاویز پیش کر کے اور بالخصوص ۲۶ رجنوری ۱۹۶۳ء کے خط میں ہندوستان کا مؤقف، مان کر پاکستان کا، جموں کشمیر پر مؤقف بہت کمزور کر دیا۔ اس طرح ہندوستان کا کوئی استحقاق نہ ہونے کے باوجود، جموں کشمیر، اس کے پلڑے میں ڈال دیا اور اقوام متحدہ میں ہندوستان کے اقرار اور استصواب رائے کے حق میں متفقہ، مسلمہ قراردادوں کو بھی غیر فعال اور غیر مؤثر کر دیا۔ ایوب خان نے ایک اور بڑی غلطی، اگست ۱۹۶۵ء والی مہم جوئی کی شکل میں کی تھی۔ جموں کشمیر کی دونوں طرف کی سیاسی قیادت سے بنا مشاورت اور اعتماد میں لیے بغیر، ۲۲ راکتوبر ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۶۵ء کی مہم جوئی، دوسرا بڑا غلط فیصلہ تھا۔ جس کا انجام ایک لاکھ مزید مہاجرین کی، آزاد کشمیر میں آمد اور ۱۰ رجنوری ۱۹۶۶ء کے اعلان تاشقند کی شکل میں ہوا۔ بات اس پر بھی ختم نہ ہوئی، جب کہ ہندوستان نے اس کا انتقام مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور قیام بنگلہ دیش کی صورت میں لیا اور ۲ رجولائی ۱۹۷۲ء کو، شملہ معاہدہ کے تحت، جموں کشمیر میں اقوام متحدہ کی قائم کردہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی جنگ بندی لائن کے نقیض، ہندوستان کی فوج کے زیر قبضہ آنے والے اہم ترین دفاعی علاقے، ہندوستان کے زیر قبضہ چھوڑ کر، نئی حد بندی کو، کنٹرول لائن کا نام دے کر، مسئلہ جموں کشمیر جو ڈیڑھ صدی کی جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کی تحریک تھی اور اس تحریک کی یہ حیثیت، ہندوستان اور اقوام متحدہ نے پچاس سال قبل سے تسلیم کر رکھی تھی، اس کو بدل کر، ہندوستان پاکستان کے مابین دوطرفہ تنازعہ کی حیثیت میں قبول کر لی، اور محض ہندوستان و پاکستان کے درمیان مذاکرات کے ذریعہ، اس کا حل مان لیا گیا۔

اس سے قبل چین اور پاکستان کے درمیان ۲ رمارچ ۱۹۶۳ء کو تعین کے لئے مذاکرات ہوئے، جس کے تحت ریاست اور چین کے علاقہ سنکیانگ کی بین الاقوامی سرحد کے تعین کا معاہدہ ہوا، مگر یہ ریاست جموں کشمیر کی توثیق کے تابع ہوا۔ ایک اطلاع کے مطابق اس معاہدہ کے عمل میں، قریب پانچ ہزار مربع میل ریاست کا علاقہ، چین کے قبضہ میں چلا گیا، اس کا فیصلہ پانی کے بہاؤ کے اصول پر طے ہوا۔

معاہدہ شملہ اقوام متحدہ میں رجسٹرڈ ہے، چنانچہ اس معاہدہ کے بعد ہندوستان نے وقت گذارنے کا رویہ اختیار کر لیا اور جموں کشمیر پر قبضہ کو، ہندوستان طول دیتا رہا۔ دونوں ممالک کے درمیان نرم گرم تعلقات، کی کیفیت جاری رہی۔ اس دوران پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو پھر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ جولائی ۱۹۸۴ء میں ہندوستان نے لداخ کے پاکستانی زیر قبضہ علاقہ سیاچن گلیشیر پر قبضہ کر لیا، جس پر نیا تنازعہ شروع ہو گیا، جو بدستور جاری ہے۔ افغانستان میں روس کے قبضہ کے خلاف، افغان قبائل کے ساتھ ساتھ، پاکستان و دیگر مسلم ممالک اور امریکہ نے، روس کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ۱۹۸۴ء میں روس نے افغانستان سے، افواج واپس

کرلیں۔ افغان جہاد میں شامل پاکستان کے جوانوں کو مصروف رکھنے کی حکمت عملی کے تحت، پہلی کوشش میں کشمیر میں الحاق پاکستان کے حامی گروپ سے رابطہ کرکے، کشمیر میں جہاد کرنے کا منصوبہ بنا، مگر الحاق کے حامی گروپ نے اس سے انکار کردیا۔ جس پر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ، جو خود مختار کشمیر کی تحریک میں شامل تھا، ان سے رابطہ کیا گیا اور خود مختار کشمیر کے ایجنڈا پر، کشمیر وادی سے جہاد کا آغاز کیا گیا۔ کشمیر کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے ہزاروں کی تعداد میں، جنگی تربیت کے حصول کے لئے، کپواڑہ کے راستے نوجوان مظفر آباد آنا شروع ہوگئے اور گوریلہ جنگ شروع کردی گئی۔ اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن ہوائی حادثہ یا سازش میں، بہاولپور میں ہلاک ہوگئے، مگر کشمیری نوجوانوں نے جہاد جاری رکھا۔ اس دوران قائم ہونے والی بینظیر حکومت، کی پالیسی بدل گئی۔ جس نے گوریلہ جنگ ختم کرنے کی کوشش کی، مگر اس دوران، جہاد کی تحریک مقبوضہ پونچھ، راجوری، جموں اور بھدرواہ تک پھیل گئی۔ بے نظیر کے بعد، نواز شریف حکومت نے، جماعت اسلامی کو تحریک میں شامل کرکے، لبریشن فرنٹ کو کمزور کردیا۔ اس دوران ۱۹۹۳ء میں ہندوستان، جموں کشمیر میں مکمل بے بس تھا اور سمجھوتہ کا متلاشی تھا، مگر پاکستان کے سیاستدان، اقتدار حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے اور جو ایجنسی گوریلہ جنگ کو کنٹرول کررہی تھی، وہ صرف ہندوستان کا خون رسنے اور جموں کشمیر میں مظاہروں، نظام حکومت کے خاتمہ اور ہنگامہ آرائی سے، لطف اندوز ہورہی تھی۔ حکومت کی سیاسی اور سفارتی سطح پر، کوئی توجہ نہ تھی، اس طرح ہندوستان کی کشمیر میں پسپائی سے، کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاسکا۔ نواز شریف کی حکومت کی دعوت پر وزیر اعظم واجپائی ایک ٹیم کے ساتھ بس پر سوار ہوکر لاہور آیا اور دو دن قیام پر، اعلان لاہور جاری کیا گیا۔ جس کے تحت مسئلہ کشمیر پر، دوبارہ مذاکرات کا آغاز ہوا۔ اس کے مشیر مسٹر مشرہ اور پاکستان کی طرف سے، نیاز اے نائیک کے درمیان، دہلی میں مذاکرات جاری تھے، کہ جنرل پرویز مشرف نے کرگل کی خالی چوٹیوں پر قبضہ کروادیا۔ اور ہندوستان پاکستان کی نئی جنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ نواز شریف کو واشنگٹن جاکر نیا اعلان امن کرنا پڑا، جس پر امریکہ کے صدر نے، ہندوستان کو امن اور کرگل کی چوٹیاں، پاکستان کی طرف سے خالی کرنے کی یقین دہانی پر، جنگ بندی کروادی۔ اس بناء پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف نے وزیر اعظم نواز شریف کو، گرفتار کرکے مارشل لاء کا نفاذ کردیا۔ اسی دوران ہندوستان پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے۔ افغانستان میں نیٹو فورسز داخل ہوگئیں۔ جنرل مشرف نے امریکی ٹیلیفون پر، امریکہ اور نیٹو فورسز کا ساتھ دینے کا فیصلہ کردیا۔ سارک کانفرنس کے موقع پر، وزیر اعظم واجپائی جب اسلام آباد آئے، تو ۶ رجنوری ۲۰۰۴ء کو اسلام آباد میں مشترکہ اعلامیہ میں، جنرل پرویز مشرف نے، ہندوستان کو جموں کشمیر میں جاری جہاد ختم کرنے کی یقین دہانی کروادی اور ہندوستان سے مذاکرات کی نئی مشق کا آغاز ہوا، جو بے نتیجہ رہا۔

جموں کشمیر کی تقسیم کی نئی مہم

پاکستان کا مؤقف بدستور، سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں کے، تابع استصواب رائے رہا۔ قراردادوں میں حق خودارادیت کو، الحاق ہندوستان و پاکستان سے مشروط کیا گیا تھا، جس بنا پر ریاست کے عوام کی، ڈوگرہ آمریت کے خلاف شروع کی گئی، تحریک آزادی کی اساس اور اقوام متحدہ کے چارٹر میں درج، حق خودارادیت کی تعریف اور منشا کے برعکس، جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کے بنیادی حق کو، محدود اور الحاق سے مشروط کر دیا گیا۔ اس کا عملی اثر یہ ہوا، کہ ریاست کے عوام کا حق خودارادیت، اصولی طور پر تسلیم کرنے کے ساتھ عملاً استعمال کرنا بھی مان لیا گیا، مگر اس پر، ہندوستان و پاکستان کی اجارہ داری قائم کر کے، عملاً اس حق کا استعمال ہر دو ممالک کی صوابدید کے، تابع کر دیا گیا، جو کہ بین الاقوامی مسلمہ اصول، اقوام متحدہ کے چارٹر، ریاست کے عوام کی جدوجہد آزادی اور انسانی اخلاقی اقدار سے متصادم اور مغائر ہے۔ اس تمام معاملہ میں کشمیری عوام کی حیثیت اولیں، مگر کردار ثانوی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جموں کشمیر کے عوام، ہندوستان پاکستان کی باہمی کشمکش، مفادات میں اختلافات اور قومی پالیسیوں میں تضادات کے یرغمال بن گئے ہیں۔ ہر دو ممالک جائز و ناجائز طریقہ سے، جموں کشمیر کی زمین اور وسائل پر تسلط اور استحصال کو، اپنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس سوچ اور ذہن کے نتیجہ میں، مقامی اور بین الاقوامی سطح پر، ہر دو ممالک اپنا حق جتا رہے ہیں اور اپنے اپنے زیر کنٹرول علاقہ کے عوام کی، مقامی اقتدار اور مراعات سے، حوصلہ افزائی کر کے، اور مقامی گروہ بندیوں میں تقسیم کر کے، مفادات کی ہوس میں مبتلا کر کے، عوام کی وفاداری کے خریدار اور دعویدار ہیں۔ البتہ ان میں فرق نمایاں ہے، ہندوستان کو یقین ہے کہ ریاست میں جب بھی رائے شماری ہوئی جموں کشمیر کے عوام، مسلم اکثریتی آبادی اور پاکستان سے گہرے رشتوں اور لگاؤ کے تحت پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے۔ لہٰذا ہندوستان شروع سے استصواب رائے کا اصول تسلیم کرنے کے باوجود، اس اصول سے منحرف ہے۔ جب کہ پاکستان کو تسلی اور یقین ہے، کہ جب بھی ریاست میں استصواب رائے ہوا، عوام فیصلہ اکثریت سے پاکستان کے حق میں کریں گے۔ اس وجہ سے پاکستان، جموں کشمیر میں، استصواب رائے کے حق میں رہا مگر عملاً نہ تو ہندوستان نے اور نہ ہی پاکستان نے، اپنے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں قائم جموں کشمیر اور آزاد جموں کشمیر کی حکومتوں کو اختیارات دیئے اور نہ ہی، انسانی حقوق اور زمین اور دریاؤں کے پانی کے وسائل کا معاوضہ اور آمدن کا حصہ دیا۔ اس سے بڑی بے انصافی کیا ہو سکتی ہے، کہ انصاف دلانے کے دعویدار، خود بے انصافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

جنرل ایوب خان کا پاکستان میں دور حکومت قائم ہوتے ہی، شعوری یا غیر شعوری طور پر، جموں کشمیر پر اختیار کردہ مؤقف میں، عملاً تقسیم ریاست کا پہلا قدم سندھ طاس معاہدہ تھا، جس میں ریاست اور عوام کے حقوق کا احترام اور تحفظ ملحوظ رکھے بغیر، ہندوستان کے غاصبانہ تسلط کو جائز قرار دے کر اور ریاست کے دریاؤں کے پانی کے

استعمال اور بجلی گھر بنانے کا اختیار دے دیا گیا۔۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور چین میں نیفا جنگ کے نتیجہ میں، ہندوستان کا، جموں کشمیر پر قبضہ اور جموں سرینگر لیہہ سڑک کو ہندوستان کے زیر تسلط، تسلیم کرتے ہوئے، جنگ بندی کو تسلیم کر کے، ریاست کی مستقل تقسیم کو بالواسطہ تسلیم کیا گیا۔ اگست ۱۹۶۵ء کے بعد ۱۰ ر جنوری ۱۹۶۶ء میں اعلان تاشقند اور اس کے بعد کے ۱۹۶۹ء تک کے تمام اقدامات، تقسیم ریاست کی تائید میں تھے۔

اعلان تاشقند کے بعد، ۲ ر جولائی ۱۹۷۲ء کو معاہدہ شملہ، ذوالفقار علی بھٹو، صدر پاکستان اور اندرا گاندھی، وزیر اعظم ہندوستان کے مابین طے پایا، جس کی توثیق دونوں ممالک کی پارلیمنٹ، نے کی۔ معاہدہ شملہ نے مسئلہ کشمیر کی نئی جہتیں مقرر کیں اور اس کا حل دونوں ممالک کے مابین، مذاکرات پر محیط کر دیا۔ جس کا قبل ازیں تجزیہ کیا جا چکا ہے۔ تب سے اب تک، ہندوستان نے من پسند طرز عمل اختیار کر کے، پاکستان کو مذاکرات کی بھیک کی حیثیت میں لا کھڑا کیا ہے۔ جموں کشمیر عالمی سطح پر ہر دو ممالک کے مابین، زمین کے لین دین کے مسئلہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ پاکستان نے سیکیورٹی کونسل کا رخ تک نہ کیا اور اس رویہ کا استفادہ کرتے ہوئے، ہندوستان نے غاصبانہ، جارحانہ اور ناجائز قبضہ کو، جموں کشمیر پر جائز اور الحاق کی اساس پر، ہندوستان کا جائز حصہ، قرار دیدیا۔

جنرل پرویز مشرف اور جموں کشمیر

جنرل پرویز مشرف، جس نے نواز شریف اور واجپائی کے مقرر کردہ معاونین کے درمیان جاری مذاکرات کو، کرگل جنگ شروع کر کے معطل کروا دیا تھا۔ مارشل لاء کے تحت صدر پاکستان مقرر ہونے پر، اس نے از خود ہندوستان کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر مذاکرات شروع کیے اور ۶ ر جنوری ۲۰۰۴ء کو۔ سارک کانفرنس کے موقع پر واجپائی سے مذاکرات کے نتیجہ میں، اعلان اسلام آباد جاری کیا گیا۔ جس میں، جموں کشمیر کے عوام کی ۱۹۸۸ء سے جاری گوریلہ جدوجہد کو ختم کرنے کی شرط پر، ہندوستان نے پاکستان سے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی۔ پرویز مشرف بھاری وفد لے کر خود مذاکرات کے لئے آگرہ گئے، مگر مذاکرات میں، چند معاملات طے پا جانے کے باوجود، ہندوستان کے وزیر اعظم واجپائی نے معاہدہ یا مشترکہ بیان/ اعلامیہ جاری کرنے سے گریز کیا۔ جس کے بعد، وزیر اعظم منموہن سنگھ سے مذاکرات کی مشق شروع ہوئی۔ پرویز مشرف کی طرف سے، چوہدری طارق عزیز اور منموہن سنگھ کی طرف سے، مسٹر لامبہ، مذاکرات کرتے رہے، بالآخر چار نقاط پر، اتفاق ہونا ظاہر کیا گیا، جو بہت عرصہ تک صیغۂ راز میں رہے اور ہماری کوشش کے باوجود، وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور پرویز مشرف نے، اس بارہ میں کچھ نہ بتایا۔ البتہ سرینگر میں حریت کانفرنس اور آزاد کشمیر میں، سردار عبدالقیوم، سردار سکندر حیات، جنرل سردار انور، بیرسٹر سلطان محمود اور سردار عتیق احمد سے، مشاورت کی گئی تھی۔ چار نقاط میں شامل تھا کہ (۱) ریاست جموں کشمیر کی، خودمختار حیثیت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ (۲) نئی سرحدیں قائم نہیں کی جائیں گی (۳) لائن آف کنٹرول نرم کردی

جائے گی (۴) جموں کشمیر کے دونوں حصوں میں، مشترکہ میکنزم قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی، ان چار مجوزہ نقاط کی تائید، سابق وزیر خارجہ خورشید قصوری نے، اپنی کتاب میں بھی کر دی ہے۔ مسٹر قصوری اب اپنی کتاب اور بیانات میں چار نقاط، اپنی تخلیق ہونے کے دعویدار ہیں، جب کہ مذاکرات طارق عزیز کرتے رہے اور نکتہ نظر پرویز مشرف کا پیش کیا جاتا رہا۔ پرویز مشرف نے مختلف اوقات میں، چار دفعہ آزاد کشمیر کی تمام قیادت کو، مشورہ کے لئے مدعو کیا، میں ان تمام ملاقاتوں میں شامل تھا، مگر ان ملاقاتوں میں ان چار نقاط پر، کوئی مشاورت نہ کی گئی تھی۔ اسلام آباد میں کشمیر پر پگواش کانفرنس کے دوران، پرویز مشرف نے ظہرانہ دیا۔ جس میں عمر عبداللہ، محبوبہ مفتی اور جموں کشمیر سے چالیس مندوبین شامل تھے۔ اس موقع پر پرویز مشرف نے، عمر عبداللہ سے نصف گھنٹہ الگ ملاقات کی تھی اور اپنی تجاویز ظاہر کی تھیں۔ میں نے عمر عبداللہ کو کریدنے کی کوشش کی، مگر وہ بات ٹال گیا، البتہ کچھ عرصہ بعد، اس نے، پرویز مشرف کی تجاویز ظاہر کیے بغیر، ان کی حمایت کی۔ اس سے قبل پرویز مشرف کی دعوت پر، میر واعظ عمر فاروق، پروفیسر عبدالغنی بھٹ، بلال لون وغیرہ، اسلام آباد تشریف لائے۔ ان سے پرویز مشرف نے اپنے منصوبہ پر، مشاورت کی اور ان کو اعتماد میں لیا۔ میر واعظ نے مجھے کشمیر ہاؤس، اسلام آباد آنے کو کہا، وہاں عبدالرشید ترابی اور امان اللہ خان بھی موجود تھے۔ میرے ساتھ، منیر حسین چوہدری بھی تھے۔ میٹنگ میں علیک سلیک کے علاوہ، کوئی بات نہ ہو رہی تھی، میں نے میر واعظ سے، پرویز مشرف سے ہونے والی ملاقات سے متعلق، دو تین دفعہ سوال کیا، مگر وہ پروفیسر بھٹ کی طرف اور پروفیسر بھٹ، میر واعظ کی طرف دیکھتے رہے اور میٹنگ سے متعلق، ہم سے کوئی بات نہ کی، اور چائے پر ہی ملاقات ختم ہو گئی، البتہ اتنی سی بات ہوئی، کہ پرویز مشرف مسئلہ کشمیر پر، ہندوستان سے خفیہ مذاکرات میں مصروف ہیں۔

جموں کشمیر پر ہونے والی، مئی ۲۰۰۶ء میں دہلی کانفرنس کے دوران، معلوم ہوا کہ مسئلہ کشمیر کے حل میں، پیش رفت ہو رہی تھی۔ کانفرنس میں، وزیر اعظم منموہن سنگھ کے معتمد خاص، دیش مکھ بھی شامل تھے، ان سے میں نے علیحدگی میں، مسئلہ کشمیر پر پس پردہ دو طرفہ مذاکرات میں پیش رفت سے، متعلق دریافت کیا، تو معلوم ہوا، کہ بات چیت آگے بڑھ رہی تھی اور کنٹرول لائن بدستور قائم رکھ کر، جموں کشمیر کے دونوں حصوں میں، جزوی معاملات میں اشتراک قائم کر کے، عوام میں میل ملاقات کا راستہ نکالنے کی سوچ پر کام ہو رہا ہے۔ البتہ دونوں حصوں پر کنٹرول، ہندوستان اور پاکستان کا مستقل قائم رہنا تھا۔ میں نے اس کا ذکر جموں کشمیر سے آئے ہوئے، مندوبین سے کیا، چنانچہ ہم نے دہلی کانفرنس میں شامل، ہندوستان کے مندوبین کو بتایا، کہ پرویز مشرف، فوجی آمر ہے اس کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر، طے پانے والا کوئی بھی معاہدہ، جموں کشمیر کے عوام کے علاوہ، پاکستان کے عوام بھی قبول نہیں کریں گے اور پرویز مشرف کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کو بھی خفت کا سامنا ہو گا۔ اس پر ہندوستان کو بھی احساس ہوا۔ واپس

آ کر، ہم ڈاکٹر مبشر حسن سے لاہور میں ملے اوران کو حالات سے آگاہ کیا۔ وہ ٹریک ٹو سفارت کاری، بالخصوص مسئلہ کشمیر کے حل میں بہت متحرک تھے۔ انھوں نے، وزارت خارجہ میں وزیر خارجہ، خورشید قصوری سے ملاقات طے کی۔ ملاقات میں، میں نے دہلی کانفرنس میں حاصل ہونے والی، معلومات کا ذکر کیا، تو خورشید قصوری نے، ایسی کسی بھی پیش رفت سے صاف انکار کر دیا۔ اس ملاقات میں سیکریٹری خارجہ ریاض بھی موجود تھے، جو بالکل خاموش رہے۔ میٹنگ میں امان اللہ خان اور چوہدری منیر حسین بھی موجود تھے، اس کے بعد ایک اور میٹنگ بھی کی، جس میں حریت کانفرنس کے یوسف نسیم بھی تھے، اس میٹنگ میں خورشید قصوری نے کہا، کہ ہندوستان کے ساتھ مذاکرات میں کوئی پیش رفت نہ ہو رہی تھی۔ وہ دانستہ طور پر، ہم سے معاملات کو راز میں رکھ کر، ہندوستان سے، جموں کشمیر کی تقسیم پر معاہدہ طے کر رہے تھے، مگر تقسیم کے خلاف، اٹھنے والے طوفان سے، وہ بے خبر تھے۔ ۲۰۰۷ء میں، جب افتخار محمد چوہدری، چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان کی بحالی کے حق میں، پرویز مشرف کے خلاف تحریک کا عوامی طوفان آیا، تو ہندوستان کے متعلقہ لوگوں نے میری پیش گوئی کو، درست تسلیم کرتے ہوئے، پرویز مشرف سے معاہدہ کرنے سے اجتناب کیا۔ اس طرح اس وقت، جموں کشمیر تقسیم ہونے سے بچ گیا اور عوام کی آزادی کے حق میں دی جانے والی، قربانی کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔

اسلام آباد میں چیئرمین پارلیمانی کشمیر کمیٹی، مولانا فضل الرحمن نے کشمیر کانفرنس طلب کی۔ کانفرنس کے بعد، ان کی رہائش گاہ شہزاد ٹاؤن میں، ظہرانہ تھا۔ وہاں بلوچستان کے ممبران پارلیمنٹ، مولانا شیرانی اور دیگر، مسئلہ کشمیر پر گفتگو کر رہے تھے۔ غالباً ۲۰۱۰ء کا واقعہ ہے۔ آزاد جموں کشمیر کے سابق صدر، سردار محمد انور خان نے مجھے الگ کر کے اعتماد میں کہا، کہ وہ مجھے جموں کشمیر سے متعلق، ایک خاص راز میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ "۲۰۰۷ء میں جب وہ صدر آزاد جموں کشمیر تھے اور سکندر حیات وزیر اعظم تھے، تو ایک رات کشمیر ہاؤس میں، ان کو صدر پرویز مشرف کے ملٹری سیکریٹری نے فون پر پیغام دیا، کہ اگلے روز مظفر آباد جانے کے لئے ہیلی پیڈ پر پہنچ جائیں۔ جب وقت مقررہ پر وہ، ہیلی پیڈ پہنچے تو وہاں پر سردار عبدالقیوم، بیرسٹر سلطان اور سردار عتیق احمد پہلے سے موجود تھے۔ سکندر حیات مظفر آباد میں ہی تھے۔ پرویز مشرف کی آمد پر، وہ ہیلی کاپٹر میں مظفر آباد روانہ ہوئے، سکندر حیات نے استقبال کیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق، ایک کمرہ میں میٹنگ شروع ہوئی۔ جنرل پرویز مشرف نے بتایا، کہ متعلقہ معاملہ کی اہمیت اور رازداری کی خاطر، میٹنگ مظفر آباد میں رکھی گئی تھی، کیونکہ اسلام آباد میں راز افشا ہونے کا احتمال تھا۔ اس کے بعد جنرل پرویز مشرف نے کشمیر سے متعلق ہندوستان اور پاکستان کے مؤقف، رویہ اور مسئلہ کشمیر کے حل میں رکاوٹوں پر، تفصیل سے روشنی ڈال کر، اپنا مدعا بیان کیا کہ اس نے بہت محنت سے اور کمال حکمت عملی کے تحت، ہندوستان کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اب اس کے لئے وہ جموں کشمیر کے، آپ

موجودہ لیڈروں سے اختیار حاصل کرنا چاہتا تھا، تاکہ معاہدہ کرے۔ تفصیل سننے کے بعد، سب نے اختیار دینے پر آمادگی کا اظہار کیا، تو سکندر حیات نے پوچھا، کہ بتایا تو جائے، کہ فیصلہ کیا کیا جارہا تھا، جس پر جواب میں پرویز مشرف نے کہا کہ "یہ طے ہوا تھا کہ آدھا جموں کشمیر ہندوستان کا اور آدھا پاکستان کا ہوگا"۔ اس پر انور خان نے پوچھا، کہ پاکستان کو کونسا حصہ مل رہا تھا؟ تو جنرل پرویز مشرف نے وضاحت میں کہا کہ "پاکستان کے حصہ میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کا علاقہ شامل تھا"۔ اس وضاحت پر صدر انور خان نے کہا کہ "اگر اس علاقہ پر ہی اکتفا کرنا تھا، تو بہتر تھا کہ ۱۹۴۸ء میں ہی تقسیم پر یہ فیصلہ کرلیا جاتا۔ کم از کم کشمیری عوام کی اتنی بڑی جانی اور عفت و ناموس کی قربانی اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کی تباہی سے تو محفوظ رہتے"۔ یہ بات سنتے ہی، پرویز مشرف غصہ میں کھڑا ہوگیا اور لال سرخ چہرہ میں بولا کہ "اچھا اگر میرا فیصلہ ناپسند ہے، تو پھر تم کشمیری ہندوستان سے آزادی حاصل کرلو"۔ اس پر میٹنگ ختم ہوگئی۔ سردار انور خان کی اس بات کی ایک ملاقات پر، میرپور میں بیرسٹر سلطان محمود نے بھی تائید کی۔ میں نے نوائے وقت راولپنڈی کے سینئر صحافی کو، ۲۰۱۰ء میں ایک انٹرویو میں یہ واقعہ بتایا، روزنامہ نوائے وقت نے صفحہ اول پر، سلطان سکندر کی طرف سے میرا انٹرویو شائع کیا، مگر اس میٹنگ میں شامل، کسی لیڈر نے بھی اس واقعہ کی تردید نہیں کی۔ اب خورشید محمود قصوری نے، اپنی کتاب فروخت کرنے کی غرض سے، پرویز مشرف کے چار نکاتی فارمولا کا ذکر کیا ہے۔ جس کا تمام کریڈٹ وہ خود لے رہا ہے۔ جب پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور شاہ محمود قریشی وزیر خارجہ نے، جموں کشمیر کے دونوں حصوں کی قیادت کو، وزارت خارجہ میں کشمیر پالیسی پر مشاورت کے لئے مدعو کیا، میں نے جنرل پرویز مشرف کی طرف سے، کشمیر پر ہندوستان سے مذاکرات اور چار نقاطی فارمولا پر وضاحت طلب کی، تو اس نے سیکریٹری خارجہ سے دریافت کے بعد بتایا کہ "ان مذاکرات کا کوئی ریکارڈ وزارت خارجہ میں موجود نہیں تھا" اور ہوتا بھی کیسے، جب کہ مذاکرات طارق عزیز کررہے تھے۔ جن کا وزارت خارجہ سے کوئی تعلق ہی نہ تھا، وہ پرویز مشرف کے معتمد خاص، بیوروکریٹ تھے۔

مسٹر لامبہ اور عزیز احمد کی رائے

۱۳ فروری ۲۰۱۱ء کو سی ڈی آر کی طلب کردہ کشمیر کانفرنس، دہلی میں ہورہی تھی۔ کانفرنس کے دوران مجھے کہا گیا، کہ کوئی صاحب میرے ساتھ ملاقات کے لئے منتظر تھے۔ ٹرندر لامبہ وزیر اعظم منموہن سنگھ کے معتمد خاص اور جموں کشمیر پر مذاکرات میں، نمائندہ خاص تھے۔ ان سے کسی کانفرنس میں شاید پہلے سے مختصر سی ملاقات تھی۔ بہت بے تکلفانہ انداز میں، شکایت کے لہجہ میں کہنے لگے "جج صاحب آپ مسئلہ کشمیر کیوں حل نہیں ہونے دیتے"۔ میرے لئے یہ بالکل اچنبھے کی بات تھی۔ میں نے ان سے اتنا کہا، کہ جموں کشمیر کے عوام جن میں، میں صرف ایک فرد کی حیثیت میں شامل ہوں۔ صرف آزادی کی جدوجہد کررہے ہیں۔ مسئلہ صرف اور صرف ریاست سے افواج کے

انخلا کا ہے۔ جس طرح انگریز ہندوستان سے نکل گیا، اسی طرح ہندوستان بھی جموں کشمیر سے نکل جائے تو مسئلہ ختم۔ یہ مسٹر این لامبہ تھے، جو طارق عزیز سے دو طرفہ مذاکرات کرتے رہے تھے۔ جب انھوں نے سنجیدگی سے اصرار شروع کیا، تو اس دوران عزیز احمد سابق ہائی کمشنر اور سفیر پاکستان بھی، از خود گفتگو میں شامل ہو گئے۔ اس پر میں سمجھ گیا، کہ ان دونوں کی یا دیگر لوگوں کی، یہ پہلے سے طے شدہ حکمت عملی تھی۔ تاہم ان کے اصرار پر، میں نے حریت کانفرنس کا حوالہ دیا، کہ پہلے حریت کانفرنس سرینگر سے مذاکرات کا آغاز کرنا ہوگا۔ جس پر لامبہ نے کہا ''حریت کانفرنس ماسوائے علی گیلانی اور محمد یٰسین ملک، اور آزاد کشمیر کے تمام لیڈر، جن میں اس نے سردار عبدالقیوم، انور خان، سکندر حیات، بیرسٹر سلطان محمود اور سردار عتیق کے نام لیے، کہ وہ سب ماسوائے، آپ کے اور امان اللہ خان کے، آن بورڈ ہیں۔ جب میں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا، تو عزیز احمد نے لامبہ کی تائید کی اور کہا، کہ جب ان لیڈروں کو اعتماد میں لیا گیا، وہ انڈیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے اور اس کے گواہ تھے۔ لامبہ نے اپنی ڈائری کھول کر، آزاد کشمیر کے تمام لیڈروں کے نام، پتے اور فون نمبر دکھائے اور پیشکش کی، کہ وہ اسی وقت ان سے، فون پر میری گفتگو کروا سکتا تھا۔ ان دونوں نے بیک آواز کہا کہ ''سید علی گیلانی اور یٰسین ملک کو قائل کرنے کی کوشش شروع تھی، کہ چیف جسٹس افتخار کی بحالی، کی تحریک شروع ہو گئی اور مذاکرات میں تعطل پیدا ہو گیا''۔ تاہم ایک گھنٹہ کی گفتگو میں ہم، اپنے اپنے نکتۂ نظر پر قائم رہے اور میٹنگ ختم ہو گئی۔ ان دونوں کی گفتگو اور پرویز مشرف کے مجوزہ چار نکاتی فارمولے کی حمایت میں، میر واعظ عمر فاروق، پروفیسر عبدالغنی بھٹ، عمر عبداللہ اور اس طرف سردار عتیق کے مسلسل بیانات سے مسٹر لامبہ اور عزیز احمد کے مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔ جہاں تک پرویز مشرف کے مجوزہ فارمولہ کا تعلق ہے، ایک طبقہ اس کو پاکستانی فوج کی سوچ اور تائید قرار دیتا ہے، جبکہ کچھ عرصہ قبل جنرل راحیل شریف نے، سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں کے تحت، استصواب رائے کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کے حل پر اصرار کیا ہے تاہم ''میری رائے میں، چار نکاتی تجویز ریاست جموں کشمیر کی مستقل تقسیم کی تجویز ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں ہے''۔

ہندوستان کا ماضی اس بات کا گواہ ہے، کہ ہندوستان نے کبھی بھی وعدوں، اقرار اور معاہدہ کی پاسداری نہیں کی، بلکہ ان کی خلاف ورزی، انحراف اور یوٹرن اس کا وطیرہ رہا ہے۔ جموں کشمیر میں ہندوستان نے، جن سازشوں کے تحت غاصبانہ اور جابرانہ تسلط کو جائز قرار دینا شروع کیا ہے، یہ ایک تاریخ ہے۔ پرویز مشرف ہندوستان کے کردار سے چشم پوشی کر کے، جن چار نکات پر ہندوستان سے معاہدہ کرنے جا رہا تھا، وہ معاہدہ، جموں کشمیر کے عوام کی مستقل غلامی کا معاہدہ ہوتا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی اطلاع ہم کو دہلی میں مل گئی اور ہمارے احتجاج پر ہندوستان محتاط ہو گیا۔ اور اسی دوران افتخار محمد چوہدری، چیف جسٹس کی بحالی کی تحریک کے نتیجہ میں، یہ معاہدہ نہ ہو سکا۔ اس امر پر تعجب ہے، کہ جن مشکل حالات میں، پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور فرد واحد، محمد علی جناح نے علم، عقل، استدلال

اور عزم کے بل بوتے پر، برطانوی استعماریت، ہندو کانگریس کی اکثریت اور مسلم سیاسی قوتوں جمیعت العلمائے ہند، تحریک خاکسار، جماعت اسلامی وغیرہ کی بھرپور مخالفت کا مقابلہ کر کے، ٹی بی کا مریض ہوتے ہوئے بھی، جس طرح پاکستان حاصل کیا، دنیا اس کی معترف ہے، مگر نالائق، نااہل اور کرپٹ جانشین اس کی وحدت قائم نہ رکھ سکے۔ وہی وطیرہ جموں کشمیر کی تحریک آزادی سے بھی، اختیار کیا گیا ہے اور بین الاقوامی سطح پر کامیاب حیثیت سے بتدریج پسپائی اختیار کرتے ہوئے، عوام کی عظیم جدوجہد آزادی اور حق خود ارادیت کے مسئلہ کو ہندوستان کی مرضی کے تابع، دوطرفہ مذاکرات کی سطح پر، زمین کے لین دین کی حیثیت میں لے آیا گیا ہے، مگر آفرین ہے، جموں کشمیر کے عوام پر، جو بدستور ایسی قیادت پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں۔

مستقبل تو روز روشن کی طرح درخشاں ہے اور اس کا واضح پیغام ہے کہ اٹھو کمر بستہ ہو کر اپنا مقدر خود سنوارو، جس طرح ہر قوم نے اپنا مقدر خود بنایا ہے۔ محمد علی جناح اور پاکستان اس کا بہترین نمونہ اور اعلیٰ مثال ہے۔ واقعات بالا اس امر کے گواہ ہیں کہ ہندوستان کی شاطرانہ حکمت عملی کے مقابلہ میں، پاکستانی قیادت کی کم فہمی نے ہندوستان کے کشمیر پر تسلط کو، بتدریج مضبوط کیا ہے۔ البتہ جموں کشمیر کے عوام نے ہندوستان کو ہرگز قبول نہ کیا اور آزادی کی جدوجہد جاری رکھی۔ لبریشن لیگ کی قیادت کا، روز اول سے یہی موقف ہے کہ مسئلہ کشمیر زمین کی تقسیم اور قبضہ کا نہیں، بلکہ ایک قوم اور آزادی کی تحریک ہے اور بالآخر جموں کشمیر کے عوام نے ہی، مقامی اور بین الاقوامی سطح پر کلیدی حیثیت اختیار کر کے آزادی حاصل کرنی ہے۔ اس میں البتہ، پاکستان کے عوام کی حمایت، ماضی کی طرح بدستور جاری رہنی ضروری ہوگی۔

آزادی کے حق میں، میری پہلی تقریر

۱۹۴۶ء سے سکولوں اور کالج میں، مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام پر، خوب جوش و خروش سے مکالمہ بازی اور بحث ہوتی رہتی تھی۔ کالج سٹاف اور طلباء اپنے اپنے مقام اور سطح پر بٹے ہوئے تھے۔ پُر امن بحث میں، کبھی کبھی، تلخی بھی ہو جاتی مگر ۱۹۴۷ء کے اوائل سے، پاکستان کے قیام تک، نسلی منافرت بڑھ گئی تھی جو بعد میں شدت اختیار کر کے نقل مکانی کی شکل اختیار کر گئی۔ نوجوانوں میں جوش زیادہ ہی تھا گو کہ کانگریس میں بہت قد آور راہنما تھے، مگر قیام پاکستان کی کامیابی پر جو عزت اور شہرت قائداعظم محمد علی جناح کو حاصل ہوئی، وہ کانگریس کی شکست قرار پائی تھی۔ سیاست میں قائداعظم کا قد بڑھ گیا تھا۔ اسی تناظر میں، جموں کشمیر میں پاکستان سے الحاق کے حق میں بہت جوش اور ہندوستان کے خلاف نفرت موجزن تھی۔ جموں کشمیر میں سیاسی قیادت بٹ چکی تھی۔ شیخ عبداللہ ہندوستان سے ریاست کے الحاق کے حامی تھے اور چوہدری غلام عباس پاکستان کے حق میں تھے، البتہ پاکستان قائم ہونے کے بعد جموں کشمیر کا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ آزاد کشمیر میں پاکستان کی حمایت

تھی۔ میں ڈڈیال اور میرپور میں ہونے والے جلسوں میں تمام سیاستدانوں اور علماء کی تقاریر سنتا رہتا تھا، اور نعرے لگانے میں مہارت حاصل تھی۔ روزنامہ ''زمیندار''، ''نوائے وقت'' اور انگریزی کے ''ڈان'' اور ''پاکستان ٹائمز'' کا روزانہ مطالعہ کرتا، جس وجہ سے تحریک پاکستان اور جموں کشمیر میں تحریک آزادی کے محرکات سے آگاہی تھی۔ چوہدری غلام عباس، جو جموں جیل سے آزاد ہو کر آئے تھے، پہلے سیالکوٹ میں قیام پذیر ہوئے، بعد میں راولپنڈی منتقل ہوئے۔ آزاد کشمیر میں سب سے پہلے میرپور کے دورہ پر ڈڈیال تشریف لائے، میرپور شہر جنگ میں تباہ ہو چکا تھا جب کہ ڈڈیال بالکل محفوظ اور آباد تھا، لہٰذا ڈڈیال جنگ کے ساز و سامان کی سپلائی اور حکومت کے جلسے جلوسوں کا واحد مرکز تھا۔ چوکھہ پتن سے ڈڈیال، ان کو جلوس کی شکل میں لایا گیا، ہائی سکول گراؤنڈ میں جلسۂ عام منعقد ہوا، مقررین میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ چوہدری غلام عباس کو قائد ملت کا خطاب دیا گیا ہوا تھا۔ حسب روایت ان کے اعزاز میں سپاسنامہ پیش کرنے کے بعد، تیسری تقریر میری تھی۔ میں نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان میں، قائداعظم کی فراست اور استقامت کی بنا پر، قیام پاکستان کی فتح، کانگریس کی شکست اور جموں کشمیر کی آزادی کے موضوع پر پندرہ منٹ تقریر کی، اس دوران خوب نعرہ بازی ہوئی۔ جوں ہی میں نے تقریر ختم کی، تو چوہدری غلام عباس کھڑے ہوئے اور مجھے سینے سے لگا کر تھپکی دی اور پوچھا، کہ تم کس کے بیٹے ہو، وہاں سٹیج پر میرے نانا جان بھی موجود تھے، میرے جواب سے قبل ہی انھوں نے تعارف کروایا، کہ میں ان کا نواسہ ہوں، اس پر چوہدری صاحب نے دوسری بار گلے لگا کر میری تقریر کی تعریف کی۔ جلسہ میں اندر ہل کے سب لوگ موجود تھے اور بالخصوص گاؤں کے لوگوں نے خوب داد دی۔ امی جان کو پہلے ہی اطلاع ہو چکی تھی۔ بہت خوش تھیں، ماں تھیں ناں، صرف اتنا کہا، کہ سائیں بیٹا تقریر کم کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ کسی کی نظر لگ جائے۔ میں نے آرام سے کہا امی، آپ کی دعا ہے ناں، مجھے کسی کی نظر کیوں لگے گی، مگر سب سے زیادہ خوشی، نانا جان کو تھی، جن کو لوگوں نے بڑھ بڑھ کر مبارک دی۔

آغاز سیاست

ابھی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

جموں کشمیر میں ڈوگرہ آمریت کے خلاف، حقوق اور آزادی کی جدوجہد تو معاہدہ امرتسر سے ہی شروع تھی۔ اسی بنا پر دوسروں کی طرح غیر شعوری طور پر، خانگی اور قرب وجوار کے ماحول کے زیر اثر، میں بھی اسی کا حصہ بن گیا۔ یہ غیر روایتی سفر، دراصل حصول آزادی سے لگن کے فطری رجحان کے سبب تھا، اس لئے اس کو، سیاسی سفر کے آغاز، کا نام دیا ہے۔ گورڈن کالج راولپنڈی، گورنمنٹ کالج لاہور، جو اب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہے اور یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں، جموں کشمیر طلباء فیڈریشن کے صدر کی حیثیت سے میں، تحریک

آزادی اور کشمیر کی سیاست میں، بہت متحرک تھا۔ جموں کشمیر اور پاکستان کے سیاستدانوں سے، بہت رابطہ رہتا۔ اس دور میں پاکستان و ہندوستان کی سیاست اور سفارتکاری میں مرکزی حیثیت اور اہمیت، مسئلہ کشمیر کو ہی حاصل تھی۔

آزاد حکومت کا دارالحکومت گو مظفرآباد تھا، مگر عملاً حکومت کا نظام پونچھ ہاؤس، واقع صدر بازار راولپنڈی میں، موجودہ کشمیر ہاؤس اسلام آباد کی طرح ہی چلتا تھا۔ وزارت امور کشمیر بھی راولپنڈی میں تھی، جو آزاد حکومت بنانے، توڑنے اور کنٹرول کرنے کی مجاز تھی۔ چوہدری غلام عباس ریاست میں، شیخ عبداللہ کے ہم پلہ لیڈر تھے، مگر وہ اس وقت جموں جیل میں تھے، جب آزاد حکومت قائم ہوئی اور نوعمر ابراہیم خان کو صدر نامزد کیا گیا۔ چوہدری صاحب کا جموں شہر سے، جب کہ، ابراہیم خان کا باغ کے علاقہ ٹوپہ، جو اَب راولاکوٹ میں شامل ہے، سے تعلق تھا جو آزاد علاقہ کا حصہ ہے۔ چوہدری غلام عباس کا جموں جیل سے، آزاد ہو کر پاکستان آنے پر، کراچی دارالحکومت میں، پورے اعزاز کے ساتھ ۹ رمارچ ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم سے، ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ کچھ ہی مدت کے بعد یہ طے پایا، کہ آزاد حکومت کی تقرری اور سبکدوشی، مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی سفارش کے تابع، وزارت امور کشمیر کرے گی۔ اقوام متحدہ سے، ریاست میں استصواب رائے کے حق میں، فیصلہ ہونے اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی ہونے کے بعد، حکومت پاکستان سے راولپنڈی میں ۲۸ راپریل ۱۹۴۹ء کو ایک انتظامی معاہدہ کے تحت، ماسوائے آزاد کشمیر میں انتظامی امور کے، حکومت آزاد جموں کشمیر کے تمام تر اختیارات، امور خارجہ، دفاع، آزاد افواج، تحریک آزادی اور گلگت بلتستان کا انتظام، پاکستان کے سپرد کر دیئے گئے۔ اس معاہدہ پر وزیر بے محکمہ، مشتاق احمد گورمانی، صدر آزاد کشمیر سردار ابراہیم خان اور صدر مسلم کانفرنس چوہدری غلام عباس نے دستخط کیے۔ اس معاہدہ کے طے پاتے ہی، آزاد حکومت، اپنے اختیارات اور تحریک آزادی اور مسئلہ کشمیر سے دستبردار ہو گئی۔ ریاست اور قوم کی تحریک آزادی کی جدوجہد کے، عین وسط میں، دستبرداری اختیارات کا انوکھا فیصلہ، حیران کن تھا۔ اس وقت کی غلطی کا خمیازہ، حقوق حکمرانی و انسانی آزادیوں سے محرومی اور تحریک آزادی میں مسلمہ اصول استصواب رائے سے، پسپائی اور ہندستان کی صوابدید کے تحت ہندوستان و پاکستان میں دوطرفہ مذاکرات کا یرغمال ہونے کی شکل میں، ریاست کے تینوں حصوں میں منقسم، کشمیری عوام بھگت رہے ہیں۔ غلامی کی یہ غضبناک طویل اندھیری رات، ختم نہ ہو رہی ہے اور جموں کشمیر کے معصوم عوام، آزادی کی سحر کے منتظر ہیں۔

معاہدہ طے ہونے کے بعد، مشتاق احمد گورمانی اور نوکر شاہی نے انگریز کی حکمرانی کی ورثہ میں حاصل کردہ پالیسی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ سب سے اول مسلم کانفرنس کو، غلام عباس اور ابراہیم خان گروپوں میں تقسیم کیا گیا، اسکے ساتھ جموں بمقابلہ آزاد کشمیر، بعد میں تین گروپوں غلام عباس، سردار ابراہیم اور میرواعظ محمد یوسف سرینگر گروپ کو تشکیل دیا گیا۔ اسی گروہ بندی کی بنا پر ۳۰ رمئی کو سردار ابراہیم حکومت کو سبکدوش اور

یکم جون ۱۹۵۰ء کو، سید علی احمد شاہ کی صدارت میں حکومت نامزد ہو کر قائم ہوئی۔ اس کے بعد ۴ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو، میر واعظ یوسف شاہ نے صدر کے عہدہ کا حلف لیا۔ حکومتوں کی تبدیلی کا سلسلہ چلتا رہا۔ ۲۱ر جون ۱۹۵۲ء کو کرنل شیر احمد، یکم جون ۱۹۵۶ء کو دوبارہ میر واعظ محمد یوسف شاہ، ۸ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو سردار عبدالقیوم اور ۱۳ر اپریل ۱۹۵۷ء کو پھر سردار ابراہیم نے اور یکم مئی ۱۹۵۹ء کو، مسٹر کے۔ ایچ خورشید نے صدر حکومت کا حلف لیا۔

پاکستان میں لیاقت علی خان کی ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں شہادت کے بعد، خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ جبکہ غلام محمد گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ مابعد خواجہ ناظم الدین کی حکومت ختم کر کے، امریکہ میں پاکستانی سفیر محمد علی بوگرہ، کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا، جن کے بعد چوہدری محمد علی کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ انھوں نے ۱۱ر اگست ۱۹۵۵ء کو حلف لیا۔ چوہدری محمد علی نے مسئلہ کشمیر کے حل میں، استصواب رائے سے ہندوستان کے، بتدریج انحراف، کے ردعمل میں ۲۶ر نومبر کو کراچی میں کشمیر کانفرنس منعقد کی، مختلف فیصلے ہوئے، اس کے نتیجہ میں، جسٹس شیخ دین محمد کو مسئلہ کشمیر پر، مشیر مقرر کیا گیا اور وزیر کا درجہ دیا گیا۔ شیخ دین محمد نے جموں کشمیر میں سیاستدانوں اور مختلف طبقہ کے لوگوں سے مسئلہ کشمیر، ہندوستان کے رویہ کے خلاف، حکمت عملی اور آزاد کشمیر میں اصلاحات سے متعلق، وسیع تر مشاورت شروع کی۔ لاہور میں انھوں نے ملاقاتوں کا سلسلہ، دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں شروع کیا۔ جسٹس دین محمد، مسلم لیگ کے نامزد ممبر باؤنڈری کمشن تھے۔ جبکہ کانگریس کی طرف سے جسٹس مہر چند مہاجن، جو ستمبر ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ کے وزیر اعظم جموں کشمیر مقرر ہوئے، قبل ازیں ممبر باؤنڈری کمشن مقرر ہوئے تھے۔ جسٹس دین محمد کو مسئلہ کشمیر میں گہری دلچسپی تھی اور اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر عبور حاصل تھا۔ وہ بات غور سے سنتے اور آخر میں بحث مباحثہ اور تجزیہ کرتے۔

جموں کشمیر پیپلز کانفرنس کا قیام

آزاد جموں کشمیر میں، حکمران جماعت مسلم کانفرنس جو وزارت امور کشمیر میں تسلیم شدہ تھی، وہ انفرادی اور علاقائی، قبیلائی گروہ بندی، باہمی منافرت اور روزمرہ کی سازشوں کا بری طرح شکار تھی۔ دوسری طرف ہندوستان کی ترغیب پر، استصواب رائے کے متبادل، شیخ عبداللہ نے ۱۹۵۰ء میں دستور ساز اسمبلی منتخب کروائی تھی، جو ریاست کا دستور بنانے میں مصروف تھی، جس کے خلاف گو کہ سلامتی کونسل نے الحاق کرنے کے خلاف ۳۰ر مارچ ۱۹۵۱ء کو امتناعی قرارداد بھی پاس کر رکھی تھی، مگر شیخ عبداللہ کی ۹ر اگست ۱۹۵۳ء میں معزولی کے بعد بخشی غلام محمد وزیر اعظم اور ڈاکٹر کرن سنگھ صدر ریاست کی نگرانی میں، اسمبلی دستور مرتب کر کے، ریاست کے ہندوستان سے الحاق کی توثیق کرنے کی تیاری میں تھی۔ ان حالات کے پس منظر میں، جسٹس دین محمد کو میری قیادت میں، کشمیری طلبا کا وفد ملا اور مسئلہ کشمیر کے حل میں، ہندوستان کی رکاوٹ کی حکمت عملی، پاکستان کی مشکلات، اور آزاد کشمیر میں سیاسی انتشار پر

تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ دین محمد صاحب نے مجھے اکیلے ملنے کے لئے اور متبادل تجاویز سوچ کر آنے کے لئے کہا۔ میں نے الجزائر، فلسطین اور افریقہ میں جاری آزادی کی دیگر تحریکوں، کے خدوخال کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ دوسری ملاقات، جو سیر حاصل تبادلہ خیالات پر محیط تھی، اس میں اتفاق اس اصول پر ہوا، کہ الحاق پاکستان کی پالیسی جاری رکھ کر ساتھ ہی ساتھ جموں کشمیر کی آزادی کے نام، سے تحریک کا آغاز کیا جائے، جس کے لئے آزاد حکومت کو ریاست کی، جائز حکومت تسلیم کروا کر، الجزائر کی جلاوطن حکومت کی طرح، آزادی کے حق میں عالمی سطح پر، حمایت حاصل کی جائے اور آزادی حاصل ہونے پر پاکستان سے الحاق کیا جائے، چہ جائیکہ ہندوستان کی حکمت عملی کا یرغمال بنا جائے۔ جسٹس دین محمد نے تجویز کیا، کہ اس پروگرام کو عملی شکل دینے کے لئے، نئی سیاسی جماعت قائم کی جانی ضروری تھی۔ یہ بھی طے پایا، کہ ریاست کی دوسری جانب دستور ساز اسمبلی کے مقابلہ میں، آزاد کشمیر میں بھی، دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے، جس میں مہاجرین مقیم پاکستان کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ یہ اصول طے ہو جانے کے بعد انھوں نے یہ ذمہ داری مجھے سونپی کہ، نوجوانوں پر مشتمل، نئی جماعت قائم کی جائے۔ وہ وزیر اعظم پاکستان کے کشمیر کے شعبہ میں مشیر تھے۔ میں اس وقت ایل ایل بی فائنل میں تھا۔ والد صاحب انگلینڈ میں تھے، لہٰذا حسب ہدایت دوستوں سے مشورہ کر کے ۲۵ ردسمبر ۱۹۵۵ء کو، ڈڈیال میں کنونشن منعقد کر کے نئی سیاسی جماعت قائم کر دی گئی۔ اس میں جموں کشمیر کے طلبا کی اکثریت شامل ہوئی۔ جسٹس دین محمد نے میرپور سے آزاد کشمیر کا دورہ شروع کیا۔ اُن کا قیام ریسٹ ہاؤس میں تھا، جہاں وفود سے ملاقات ہونی تھی۔ پیپلز کانفرنس کے دس رکنی وفد میں، سب نوجوان خوبصورت سوٹوں میں ملبوس، البتہ مولوی عبداللہ سیا کھوی صاحب شلوار قمیض اور پگڑی میں تھے۔ وفود کی تعداد نو تھی۔ فہرست میں اول نمبر، مسلم کانفرنس غلام عباس کا تھا، سردار عبدالقیوم صدر حکومت تھے۔ جسٹس دین محمد نے فہرست کے برعکس، سب سے پہلے ہمارے وفد کو دعوت ملاقات دی، وہ بہت خوش تھے۔ میرپور، آزاد کشمیر اور مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں پر مفصل گفتگو کی۔ دو دور چائے، کے چلے۔ باہر مسلم کانفرنس کے تینوں گروپ، وکلاء اور شہریوں نے، ہماری لمبی ملاقات پر شور شروع کر رکھا تھا۔ سردار سید حسن ڈپٹی کمشنر، بار بار اندر آتے، مگر ہمیں گفتگو میں مصروف دیکھ کر واپس لوٹ جاتے۔ وفد میں سیا کھوی صاحب کے علاوہ غازی محمد بخش، کامریڈ محمد حسین، سیٹھ نورزمان، راجہ محمد صدیق ایڈووکیٹ، میر بشیر احمد چارٹرڈ اکونٹنٹ، ڈاکٹر محمد شریف، سیٹھی محمد الیاس اور محمد شریف لون شامل تھے۔

جموں کشمیر پیپلز کانفرنس کے قیام پر، ایک طرف تو اس کے وفد کو مشیر حکومت کی طرف سے دی جانے والی اہمیت، دوسرے اس جماعت کے پروگرام وغیرہ، یعنی آزاد کشمیر میں جمہوریت کے قیام، دستور ساز اسمبلی کا پہلا انتخاب (ii) آزاد حکومت کو پاکستان اور دوست ممالک سے، ریاست کی جائز عوام کی نمائندہ حکومت تسلیم کروا کر، جموں کشمیر کے عوام کی مکمل آزدی کی تحریک، اقوام متحدہ میں اور باہر چلانا (iii) آزاد کشمیر میں جاگیرداری نظام ختم

کر کے، زمین کسانوں میں تقسیم کرنا اور (۱۷) عوام میں تعلیم لازمی قرار دینا۔ اس چار نکاتی پروگرام کی مقبولیت سے، نوجوان تیزی سے جماعت میں شامل ہونا شروع ہو گئے، مگر مسلم کانفرنس کی گروہی، قبیلائی اور علاقائی، مفاداتی سیاست کے اجارہ دار لیڈروں نے، ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کا محاذ قائم کر لیا۔ ۱۹۴۷ء سے وزارت امور کشمیر نے سیاستدانوں اور کارکنوں میں تیس روپیہ سے لے کر، پانچ سو روپیہ ماہوار کی شرح سے، وظیفہ مقرر کر رکھا تھا یہی پالیسی ہندوستان نے اپنے زیر تسلط علاقہ میں اپنا رکھی تھی، جس وجہ سے وظیفہ خور مفاداتی طبقہ، ریاست میں جوں کی توں پالیسی، کا فطری حامی تھا۔ ہم نے وظیفہ پالیسی اور وزارت امور کشمیر کی اجارہ داری ختم کرنے اور تمام اختیارات عوام کو منتقل کرنے کا مطالبہ کیا جس وجہ سے وزارت امور کشمیر، جس نے مجھے گورمانی کے خلاف جلوس نکالنے اور احتجاج کرنے کی وجہ سے ۱۹۵۱ء سے، بلیک لسٹ میں شامل کر رکھا تھا، وہ بھی ہمارے خلاف متحرک ہو گئی۔ ہم نے اپنی جدوجہد زور شور سے جاری رکھی۔ اس وقت باغ نعمان پورہ کے مولوی امیر زمان حنفی، سردار محمد اکرم سوشلسٹ لیڈر، سرینگر کشمیر کے عبدالغنی میر، راولپنڈی سے حمید اختر بیگ، جموں کے محمد انور وغیرہ مرکزی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ محمد عجائب چوہان سیکریٹری جنرل، محمد مقبول بھٹی نائب صدر اور محمد شریف لون، سیکریٹری نشر و اشاعت تھے۔

متحدہ محاذ کا قیام

جموں کشمیر کسان مزدور کانفرنس، ڈوگرہ عہد میں سرینگر میں قائم ہوئی تھی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز، معروف مصنف، محقق اور صحافی اس سے منسلک تھے، اس کے صدر عبدالسلام یاتو، ہجرت کر کے راولپنڈی منتقل ہو گئے تھے۔ غلام نبی گلکار، جنھوں نے مہاراجہ کی حکومت کو معزول کر کے، عبوری حکومت کے قیام کا ۴ راکتوبر کو اعلان کیا تھا، وہ بھی راولپنڈی منتقل ہو گئے تھے۔ ان کی کشمیر ریپبلکن پارٹی تھی۔ سیالکوٹ میں انجمن نوجوانان جموں کشمیر، میرپور میں عبدالخالق انصاری، کی عوامی کانفرنس اور جموں کشمیر پیپلز کانفرنس کا آزاد کشمیر میں جمہوریت کے قیام کے لئے، متحدہ محاذ بنا اور اس کا میرپور میں کنونشن منعقد کرنے اور اس کے بعد تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں، کنونشن سے ایک روز قبل، سردار عبدالقیوم کی حکومت نے، کنونشن پر پابندی لگادی اور جلسہ جلوس پر دفعہ ۱۴۴ کے تحت امتناع عائد کر دیا۔ رات ایک بجے گلکار اور میر عبدالعزیز کو اٹھا کر، جگو ہیڈ کے پار ضلع بدر کر دیا، جس کے خلاف، ہم نے شدید احتجاج کیا۔ اس کے فوراً بعد پاکستان میں حکومت بدل گئی اور حسین شہید سہروردی، وزیراعظم منتخب ہوئے۔

مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات

متحدہ محاذ کے کنونشن پر پابندی عائد کرنے اور آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس کے آمرانہ نظام حکومت کے خاتمہ اور جمہوریت کے قیام کے لئے، متحدہ محاذ نے وزیراعظم پاکستان سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ خواجہ غلام نبی گلکار اور میر عبدالعزیز کے ساتھ، مجھے بھی وفد میں شامل کیا گیا۔ اس وقت میری عمر تیئس (۲۳) سال چھ ماہ تھی۔ ہم کراچی

وزیراعظم ہاؤس پہنچے،تو وزیراعظم چین کے دورہ پر، روانہ ہورہے تھے،مختصر ملاقات میں انہوں نے بتایا، کہ وہ اگلے ماہ راولپنڈی آکر،تفصیل سے حالات سن کر، فیصلہ کریں گے۔وزیراعظم سے ملاقات کے بعد، مادرملت محترمہ فاطمہ جناح سے، فلیگ ہاؤس میں شام کو ملاقات طے ہوئی۔ان سے وقت تو ایک گھنٹہ طے تھا،مگر گفتگو دو گھنٹوں تک پھیل گئی۔ محترمہ نے جموں کشمیر سے، قائداعظم کی گہری وابستگی، بیماری کے دوران، اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر میں دلچسپی پر وضاحت کی۔انہوں نے پاکستان میں سیاسی عدم استحکام پر، عدم اطمینان ظاہر کیا۔آزادکشمیر میں نظام حکومت اور بالخصوص چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم میں اقتدار کی لڑائی اور ان دونوں کا وزارت امور کشمیر کا آلہ کار بن کر، تحریک آزادی سے دستبردار ہونا، ان کو ناپسند تھا اور انہوں نے دونوں لیڈروں پر، سخت تنقید کی۔محترمہ کو قریب سے دیکھنے اور ہمکلام ہونے کا پہلا موقع تھا۔سفید شلوار قمیض اور دوپٹہ میں پُر وقار، بارعب اور سحرآمیز لگ رہی تھیں۔ قائداعظم کے سے نقشِ عزم اور پراعتماد لہجہ میں گفتگو کا انداز تھا۔میں نوجوان تھا، مجھے انہوں نے آزادی حاصل کرنے تک جدوجہد جاری رکھنے کی تاکید کی۔انہوں نے آزادکشمیر آنے اور عوام سے ملنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ وزیراعظم سہروردی سے ملاقات کے علاوہ مادرملت سے ملاقات، گویا قائداعظم سے ملاقات تھی۔زندگی کا یہ عظیم سرمایہ تھا، جو تاریخی یادگار بن گئی۔۱۹۶۵ء کے صدارتی الیکشن میں بھی، ان کی تقاریر سنیں، مگر پہلی ملاقات کا سحر، ہمیشہ قائم رہا۔

وزیراعظم حسین شہید سہروردی سے ملاقات

میں لاء کالج ہوسٹل لاہور میں تھا، جب وزیراعظم سے ملاقات کے لئے اطلاع ملی۔راولپنڈی سرکٹ ہاؤس میں ملاقات طے ہوئی۔میں جوائنٹ سیکریٹری وزارت امور کشمیر کے آفس میں ملاقات کے لئے انتظار میں تھا، کہ اسی دوران آزادکشمیر کے ایک وزیر تشریف لائے۔آفس میں کھڑے کھڑے انہوں نے وزیراعظم سے ملاقات کے لئے جوائنٹ سیکریٹری سے استدعا کی، جو اس نے مسترد کر دی۔میں نے احترام میں اپنی کرسی، وزیر صاحب کو پیش کی تو جوائنٹ سیکریٹری نے مجھے کہا ''ملک صاحب آپ تشریف رکھیں''۔میں بیٹھ گیا، وزیر آزادکشمیر حکومت نے پانچ منٹ تک ملاقات کے لئے اصرار کیا،مگر ان سے کہا گیا، کہ وہ صدر سردار عبدالقیوم کے ہمراہ مل سکتے تھے، الگ ملاقات نہ ہوسکتی تھی۔وزیر کی اس طرح توہین سے، مجھے بہت افسوس ہوا،مگر ایسے رویہ کی مسلم کانفرنس کی قیادت خود ذمہ دار تھی۔سہروردی صاحب بڑے سیاستدان اور عوامی لیڈر تھے۔آزادکشمیر کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔انہوں نے ہمیں تحمل سے سنا، جمہوریت کے تحت حکومت سازی کا وعدہ کیا اور سردار عبدالقیوم کی آمریت ختم کرنے کا فیصلہ سنایا۔چنانچہ ان کی حکومت ختم کر دی گئی اور ۱۳؍اپریل ۱۹۵۷ء کو دوبارہ سردار ابراہیم کو آزادکشمیر کا صدر بنا دیا گیا۔سہروردی گورنمنٹ قریب چھ ماہ رہی بعد میں فیروز خان نون، وزیراعظم پاکستان منتخب ہوگئے۔اس دوران آزادکشمیر میں آمریت قائم رہی۔

کے ایل ایم اور مارشل لاء کا نفاذ

پاکستان میں سیاسی کشمکش جاری تھی، کمانڈر افواج پاکستان ایوب خان، کو مدت ملازمت میں توسیع دے کر کابینہ میں بحیثیت وزیر دفاع شامل کرلیا گیا تھا۔ اس نے صدر سکندر مرزا سے گہرے مراسم قائم کررکھے تھے۔ دونوں مخصوص پروگرام کے تحت، حالات کا رخ متعین کررہے تھے۔ اسی دور میں ایک محفل میں، پنڈت نہرو نے پاکستان کے متعلق تبصرہ کیا تھا کہ ’پاکستان میں اتنے مختصر وقت میں، جتنی حکومتیں تبدیل ہوئی ہیں اُتنے تو میں نے پاجامے نہیں بدلے‘۔ اس دور میں، آزاد کشمیر اور پاکستان سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا اکھاڑہ بنے ہوئے تھے۔ عین اس نازک مرحلہ پر چوہدری غلام عباس نے، وزیراعظم نون کو خط کے ذریعہ مسئلہ کشمیر پر تین مطالبات پیش کیے (۱) امریکی بلاک کی مکمل حمایت حاصل ہونے تک، مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں نہ اٹھایا جائے۔ (۲) جنگ بندی معاہدہ ختم کردیا جائے اور (۳) بھارت کے ساتھ سفارتی، تجارتی اور دیگر تعلقات ختم کرنے کا، اعلان کیا جائے۔ ۴ر مئی ۱۹۵۸ء کے خط کے بعد ۲۸ر مئی کو کراچی میں اعلان کیا، کہ جون کے آخر میں چناری کے مقام سے جنگ بندی لائن توڑ کر، سری نگر کی طرف مارچ کیا جائے گا اور پھر ۲۸ر جون کو مارچ کا اعلان کردیا۔ ان دنوں آزاد کشمیر میں، راؤ عبدالرشید، انسپکٹر جنرل پولیس تعینات تھے۔ انہوں نے دیگر مشاہدات کے علاوہ، اپنی کتاب ’’جو میں نے دیکھا‘‘ میں تحریر کیا، کہ سردار عبدالقیوم جب چکوٹھی پہنچے، تو جنگ بندی لائن کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ میں نے ان سے کہا، کہ آپ نے تو جنگ بندی لائن، توڑنے کا اعلان کیا ہے، تو پار کیوں نہیں جاتے؟ تو انہوں نے جواب دیا، کہ نہیں، ہم نے دوسری طرف نہیں جانا، بلکہ آزاد کشمیر کے اندر ہی رہنا ہے۔ راؤ صاحب نے صاف لکھا ہے کہ وہ تحریک کے ایل ایم کے نام سے، صدر پاکستان سکندر مرزا، جنرل ایوب خان، چوہدری غلام عباس اور صدارتی سیکریٹری، قدرت اللہ شہاب کی طرف سے، مارشل لاء کے نفاذ کی سازش تھی۔ اور وہی ہوا کہ ۷ر اکتوبر کو سکندر مرزا نے آئین معطل کرکے، مارشل لاء نافذ کردیا۔ دو ہفتے بعد سکندر مرزا کو بھی ایوب خان نے پاکستان بدر، کرکے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ قدرت اللہ شہاب اس کے، پرنسپل سیکریٹری تعینات رہے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر اور آزاد کشمیر کو، مارشل لاء کے تحت حصول اقتدار کے لئے، بطور سیڑھی استعمال کیا گیا۔ اس دوران سردار ابراہیم کو بھی، فارغ کردیا گیا۔

کے ایچ خورشید اور آزاد کشمیر

خورشید حسن خورشید جولائی ۱۹۴۴ء میں، قائداعظم کی پسند اور فرمائش پر، ان کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوئے اور قیام پاکستان تک ان کے ساتھ رہے۔ وہ نہایت خوبصورت، ذہین اور محنتی نوجوان تھے۔ نظریہ اور تحریک پاکستان سے، ان کو جنون کی حد تک لگن تھی۔ ان کی شبانہ روز محنت وانتھک کاوش کو، قائداعظم نے ان الفاظ میں تحسین

پیش کی، جب لاہور یونیورسٹی گراؤنڈ میں، جلسہ عام میں اعلان کیا کہ ''پاکستان میں نے، میرے سیکریٹری اور اس کے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا'' اسی طرح لندن میں، ایک انٹرویو میں سابق وائسرائے ہندوستان، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے، ایک سوال کے جواب میں کہا، کہ پاکستان بنانے کا ذمہ دار صرف ایک شخص، مسٹر جناح تھا۔ البتہ قائداعظم نے اس میں کے ایچ خورشید کو بھی شامل کیا۔ خورشید اگرچہ سیاست میں متحرک نہ تھے، مگر الحاق پاکستان کے حامی ہونے کی وجہ سے، ان کی رغبت اور تعلق، مسلم کانفرنس سے تھا۔ کے ایل ایم میں وہ بھی شامل تھے اور گرفتار بھی ہوئے۔ کوہ مری ریسٹ ہاؤس میں، وہ چوہدری غلام عباس کے ساتھ گرفتار تھے۔ پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ، آزاد کشمیر میں بھی تبدیلی لازمی تھی۔ چنانچہ سردار ابراہیم کی سبکدوشی کے بعد خورشید صاحب کے حق میں، ایوب خان نے فیصلہ کیا اور انہوں نے یکم مئی ۱۹۵۹ء کو صدارت کا حلف لیا۔ مسلم کانفرنس میں اس وقت، سردار عبدالقیوم، محمد یوسف صراف، یوسف قریشی، راجہ حیدر خان جو سیاست میں زیادہ متحرک تھے، وہ بھی صدارت کے امیدوار تھے۔ مسلم کانفرنس کا دعویٰ تھا کہ خورشید کا نام چوہدری غلام عباس نے صدارت کے لئے پیش کیا تھا، مگر خورشید صاحب نے کئی بار اظہار کیا، کہ ایوب خان کی مشاورت شیخ یوسف، فیڈرل سیکریٹری سے ہوئی جس کے نتیجہ میں ان کی تقرری ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومتی امور میں خورشید، مسلم کانفرنس کی قیادت سے مشاورت نہ کرتے تھے اور انہوں نے شروعات ہی انقلابی فیصلوں سے کی، جو مسلم کانفرنس کی سوچ اور نظریہ سے متصادم تھے۔ وہ ۲۵ مئی کو میرپور تشریف لائے، عیدگاہ کے میدان میں استقبالیہ/ جلسہ عام تھا، غازی الٰہی بخش صدر جلسہ تھے۔ قائداعظم کے سابق سیکریٹری کے حوالہ سے خورشید کو سننے کا شوق تو تھا، مگر میرا تعلق مسلم کانفرنس سے نہ تھا۔ کراچی میں چوہدری نورحسین کے ضمانت کے مقدمہ میں، سہروردی صاحب اور خورشید، دونوں بطور وکیل پیش ہوئے تھے۔ وہاں ان سے ملاقات ہو چکی تھی، چنانچہ راجہ محمد اسلم مجھے ساتھ لے کر جلسہ میں گئے، غازی الٰہی بخش صاحب نے دیکھتے ہی مجھے سٹیج پر بٹھا دیا۔ خورشید صاحب سے تعارف پھر کروایا گیا، حالانکہ ہم کراچی میں مل چکے تھے۔ میرا فوٹو بھی بنایا گیا تھا۔

کے ایچ خورشید نے سب سے اول زرعی اصلاحات کا قانون ۱۹۶۰ء میں نافذ کیا اور جاگیرداری نظام ختم کر کے، زمین کاشت کاروں کے نام منتقل کر دی، عوام کو ووٹ کا حق بحال کر کے لوکل گورنمنٹ کے الیکشن کروائے۔ اس کے دوسرے سال ۱۹۶۱ء میں قانون ساز کونسل اور صدر کے عہدہ کے لئے الیکشن منعقد کروائے۔ آزاد کشمیر کی تاریخ میں یہ انقلابی اقدامات خورشید صاحب نے ۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء میں کیے، جو مسلم کانفرنس کی پالیسی اور نظریہ سے متصادم تھے بلکہ ان کی نفی تھی۔ مسلم کانفرنس کی حکمرانی کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی، جس سے خورشید کے خلاف، مخالفت کے شعلے بلند ہونے شروع ہو گئے۔ خورشید نے پہلی بار پاکستان سے بیرونی تجارت کا حصہ، منظور کروا کر، آزاد کشمیر کے تاجروں کو امپورٹ لائسنس دلوائے، بسوں ٹرکوں کے چیسز اور کاریں بھی امپورٹ ہوئیں، اور پٹرول پمپ بھی قائم ہوئے۔

لبریشن لیگ کا قیام

صدر کے عہدہ، قانون ساز اسمبلی اور لوکل گورنمنٹ کے انتخابات میں آزاد کشمیر کے علاوہ، جموں کشمیر کے مہاجرین مقیم پاکستان کو بھی، نمائندگی دی گئی تھی۔ خورشید نے تحریک آزادی اور نصب العین کی ساتھ قائم کر دی تھی، جس وجہ سے مسلم کانفرنس کا بااثر گروپ انتخابات میں ان کا حامی تھا۔ قائداعظم کے ساتھ وابستگی اور جمہوری اقدامات کی وجہ سے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اور اقتدار کے پرستار، مفاداتی ہجوم تو پہلے سے ہی ان کے اردگرد تھا۔ اس تناظر میں حاصل شدہ، جدید وسائل کو بروئے کار لاکر، آمریت کی قدیم سوچ کو ختم کرنا، اور اس سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ پر، تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد ہونے کے بعد، اگرچہ ساتھیوں سے رابطہ تو قائم تھا، مگر مالی وسائل میں تنگی اور لاہور سے میرپور منتقلی کی وجہ سے، جموں کشمیر پیپلز کانفرنس کی تنظیم ابھی تک بحال نہ کی تھی۔ اس دوران لوکل گورنمنٹ، قانون ساز کونسل اور صدارت کے انتخابات منعقد ہو گئے۔ لوکل کونسل ڈڈیال کا ممبر منتخب ہونے کے بعد، قانون ساز کونسل کا الیکشن لڑنے کے لئے احباب نے ترغیب دی، مگر اس میں تمام آزاد کشمیر کا ایک حلقہ طے ہوا تھا۔ جس میں چھ ممبران منتخب ہونے تھے۔ الیکشن میں قبیلائی تعصب کو فوقیت اور ترجیح حاصل تھی لہٰذا الیکشن سے پرہیز کیا۔ تحریک آزادی کو صحیح سمت استوار کرنے بالخصوص ہندوستان کے رویہ میں تبدیلی، استصواب رائے سے انحراف اور سندھ طاس معاہدہ میں، ہندوستان کو جموں کشمیر کے دریاؤں پر، اس کے زیر تسلط علاقہ میں، بلاتخصیص، لاتعداد بجلی گھر تعمیر کرنے اور پانی استعمال کرنے کا حق اور اختیار تفویض کرنے کی وجہ سے، بالواسطہ اس کا ریاست پر غاصبانہ قبضہ، جائز قرار دیا گیا تھا۔ اس صورت حال میں پاکستان کے کشمیر سے متعلق، مؤقف میں تبدیلی واقع ہو گئی تھی، جو ہماری نظر میں جموں کشمیر سے متعلق سیکیورٹی کونسل کی ۳۰ رمارچ ۱۹۵۱ء اور ۲۴ رجنوری ۱۹۵۷ء کی قراردادوں کی نفی تھی اور ریاستی عوام کے پانی پر حقوق کی حق تلفی تھی۔ ان حالات میں، آزاد کشمیر کے اندر متذکرہ بالا حقائق کے تدارک کے لئے، ایک فعال سیاسی پلیٹ فارم اور جماعت کی اشد ضرورت تھی۔ میرے ذہن اور شعور میں پیپلز کانفرنس کا نصب العین موجود تھا، لہٰذا ایک میٹنگ، جس میں یوسف صراف، راجہ محمد اسلم اور کوٹلی کے منظور احمد وکلاء تھے۔ اس میں خورشید صاحب کے تجربہ، شہرت اور منتخب صدر کی حیثیت کا استفادہ کر کے، نئی سیاسی جماعت قائم کرنے کی تجویز طے ہوئی۔ ان تینوں کا مسلم کانفرنس سے تعلق تھا۔ یوسف صراف تو کے ایل ایم میں سیکریٹری مقرر تھے اور گرفتار بھی رہے تھے، پہلے تو انہوں نے اس کو ناقابل عمل قرار دیا، کیونکہ ایک تو خورشید صاحب نے جماعت نہ بنانے کا اعلان کیا ہوا تھا، دوسرا، اس وقت ایوب خان کی مخالفت کا بھی امکان تھا۔ دو تین گھنٹے بحث رہی۔ چنانچہ صدارتی الیکشن میں زیادہ متحرک رہ کر کام کرنے اور جماعت کے قیام کی تجویز پیش کرنے پر، مجھے مظفرآباد جا کر خورشید صاحب سے مشورہ کرنے اور جماعت بنانے پر قائل کرنے

کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں خورشید صاحب کونئی جماعت بنانے کی تجویز پیش کی، تو مجھے سننے کے بعد انہوں نے اتفاق نہ کیا۔ دوسری دفعہ فروری ۱۹۶۱ء میں صراف اور راجہ اسلم کے اصرار پر پھر مظفرآباد گیا۔ نئی جماعت کی قومی ضرورت اور جوازیت کے حق میں دلائل سننے کے بعد، خورشید صاحب نے لبریشن لیگ نام تجویز کیا۔ لیگ کی وجہ ان کی پاکستان مسلم لیگ سے وابستگی ولگن، اور لبریشن کے لفظ سے تحریک آزادی کا پیغام تھا۔ مئی کے وسط میں پونچھ ہاؤس راولپنڈی میں، اعلیٰ سطح کے اجلاس میں اس تجویز کی توثیق حاصل کرنا طے پایا، چنانچہ پونچھ ہاؤس میں لبریشن لیگ منظم کرنے کا فیصلہ اس شرط پہ ہوا، کہ جماعت کے قیام کا محرک چونکہ میں تھا، لہٰذا سیکریٹری جنرل کا عہدہ مجھے قبول کرنا ہوگا اور جماعت کو آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقیم مہاجرین جموں کشمیر میں منظم کرنا ہوگا۔ وسیع تر مشاورت اور حتمی فیصلہ کے لئے میٹنگ اگست میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ اس اجلاس میں ۲۹-۳۰ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو تنظیمی کنونشن مظفرآباد، دارالحکومت میں منعقد کرنا طے پایا۔

۱۹ر جون ۱۹۶۲ء کو لندن روانگی

میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھا، تب میں نے لنکنز ان، لندن میں بیرسٹری کے لئے داخلہ لیا تھا اور ۱۹۵۳ء سے پاسپورٹ کے حصول کے لئے، کراچی ہیڈ آفس کے طواف میں سرگرداں رہا تھا، مگر وزارت امور کشمیر کو، میرا بیرسٹر بننا پسند نہ تھا، لہٰذا وہاں سے ہر بار مجھے تعلیم کے لئے پاسپورٹ جاری نہ کرنے کی سفارش، کی گئی تھی۔ اب میں وکالت کر رہا تھا۔ لہٰذا انگلینڈ وزٹ کے لئے پاسپورٹ ملا تھا، والد صاحب وہاں ہی تھے۔ لہٰذا میں خورشید صاحب کو مطلع کرکے، انگلینڈ چلا گیا۔ برمنگھم میں میرے دوست کرامت چوہان صاحب تھے، ان کے پاس رہا۔ والد صاحب کے ساتھ چند دن رہنے کے بعد، انگلینڈ کی سیر کی غرض سے، کرامت چوہان اور عجائب حسین چوہان کی محفل زیادہ میسر تھی۔ کوٹلی روالی کے، ملک محمد صادق، شفیلڈ میں ہوائی ٹریولنگ کا کام کرتے تھے، ان کے ساتھ سکاٹ لینڈ، لیک ڈسٹرکٹ اور لندن کی سیر کی۔ نیوکیسل میں خواجہ صابر، چوہدری عبدالغنی، ڈاکٹر عزیز اور دیگر بہت سے دوست تھے، جنہوں نے بہت وقت دیا اور دیگر احباب کے ساتھ خوب سیر کی۔

دولت مشترکہ کانفرنس میں، کشمیر کے حق میں مظاہرہ

بریڈفورڈ میں اپنے کلاس فیلو عبدالحمید کے ہاں تھا، ان دنوں بریڈفورڈ کو وہاں میرپور ڈڈیال کی کثیر آبادی کی وجہ سے، چھوٹا پاکستان کہا جاتا تھا۔ وہاں ایک اشتہار میں برمنگھم ڈگبتھ ہال میں، منگلا ڈیم کی تعمیر کے خلاف، احتجاجی جلسہ کا تذکرہ تھا۔ ۱۸ر اگست کو جب ڈگبتھ ہال پہنچے، تو چوہدری یوسف رٹہ والے اور دیگر، جو غیر متاثرہ تھے، وہ جلسہ کے منتظم تھے۔ ڈگبتھ ہال بھرا ہوا تھا، میں سٹیج سے فاصلہ پر تھا۔ جلسہ میں تمام لوگ ڈڈیال اور میرپور کے تھے، اگلے ماہ ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں، دولت مشترکہ کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ جلسہ میں اسلم نامی نوجوان کی مخالفانہ

تقریر پر، ہنگامہ ہوگیا، جس پر مجھے سٹیج پر لایا گیا۔ میں نے مجمع میں تجویز دی، کہ دولت مشترکہ کانفرنس کے موقع پر، جموں کشمیر کی آزادی کے حق میں مظاہرہ کیا جائے۔ تمام عوام نے میری تجویز کی حمایت کی اور مظاہرہ میری قیادت میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ سید سلطان علی شاہ لندن سے، لالہ عبدالرحمٰن نوٹنگھم سے، عجائب حسین چوہان اور چوہدری یوسف برمنگھم سے، کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ چنانچہ چوہدری یوسف کے آفس میں، میں نے مسئلہ کشمیر اور جموں کشمیر کی آزادی کے حق میں، چار صفحات پر مشتمل یادداشت تیار کی۔ کانفرنس غالباً ۱۹ ستمبر کے دن صبح دس بجے منعقد ہونا تھی، ہم نے کانفرنس شروع ہونے سے قبل، صبح نو بجے مارلبرو ہاؤس پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے تمام شرکاء رات کو عجائب حسین چوہان کے سینما ہال میں پہنچ گئے۔ رات کو فلم دیکھتے رہے اور صبح روانہ ہو کر نو بجے، کانفرنس ہال کے باہر جمع ہو گئے۔ لندن اور قریب کے شہروں سے بھی، پانچ سو سے زیادہ لوگ مظاہرہ میں، شامل ہو گئے۔ پنڈت نہرو ہندوستان اور ایوب خان پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ شرکاء کانفرنس کی آمد پر جموں کشمیر کی آزادی کے حق میں، خوب جوش و خروش سے نعرے بازی ہوتی رہی۔ جب پنڈت نہرو کی رولز رائیس آئی تو لالہ رحمٰن، چوہدری رحیم پلو، سلطان شاہ اور حبیب الرحمٰن، نمائندہ جنگ اخبار نے، اس کی کار روک کر خوب نعرے لگائے۔ سکاٹ لینڈ یارڈ نے بڑی مشکل سے گاڑی کو جلوس سے نکالا۔ ایوب خان نے ہاتھ ہلا ہلا کر، نعروں کا جواب دیا۔ میں نے ہال کے گیٹ پر جا کر، ہال میں مندوبین کو میمورنڈم پیش کرنا چاہا، تو پنڈت نہرو کے اعتراض کرنے پر، سیکریٹری دولت مشترکہ نے، میرے سامنے میمورنڈم کی کاپیاں مجھ سے لے کر مندوبین میں تقسیم کیں۔ اس کشمکش میں آدھ گھنٹے کی تاخیر کے بعد کانفرنس شروع ہوئی۔ پنڈت نہرو نے ہماری نعرہ بازی اور کار کا گھیراؤ کرنے اور یادداشت پیش کرنے کے خلاف، احتجاج کیا۔ اور یادداشت کی کاپی فرش پر پھینک دی۔ وہاں بین الاقوامی میڈیا، بہت تعداد میں جمع تھا، ایک گھنٹہ کے قریب صحافیوں نے، تفصیل سے مسئلہ کشمیر اور احتجاجی مظاہرہ کرنے اور یادداشت میں مندرج، آزادی کے حق میں نکات پر، سوالات کیے۔ ایک گھنٹہ کے بعد کانفرنس اسی روز ختم ہوگئی۔ واپسی پر پنڈت نہرو کی کار، متبادل راستہ سے لے جائی گئی۔ برطانیہ اور بین الاقوامی میڈیا، بالخصوص پاکستان کی پریس میں، اس مظاہرہ کو ماضی کے مؤقف کے برعکس، جموں کشمیر کو آزاد، خودمختار ملک، قرار دیے جانے کے مطالبہ کی شکل میں، پیش کیا گیا تھا۔ میمورنڈم میں بھی، الحاق کا ذکر نہ تھا اور متفقہ فیصلہ کے تحت، صرف آزادی کا مطالبہ تھا۔ پریس میں فوٹو کے ساتھ، مجھے جموں کشمیر کے، نوعمر لیڈر کے طور پر، پیش کیا گیا تھا۔

نہرو پریس کانفرنس بلیک آؤٹ

مظاہرہ کے دوسرے روز پنڈت نہرو کی، بھارت کے سفارتخانہ، انڈیا ہاؤس میں پریس کانفرنس تھی، میں لندن میں تھا، صبح کے وقت روزنامہ ڈان پاکستان کے نمائندہ خصوصی نے، مجھے اس کی اطلاع دی۔ میں نے

دوستوں کو فون پر مطلع کیا، چنانچہ کانفرنس سے ایک گھنٹہ قبل، ایک سو کے قریب، لندن اور ملحقہ شہروں سے لوگ جمع ہو گئے۔ گذشتہ روز مظاہرہ والے بینرز اور پلے کارڈ موجود تھے، ہم نے انڈیا ہاؤس کے سامنے، دو قطاروں کے درمیان راستہ چھوڑ کر، مظاہرہ شروع کر دیا۔ دراصل یہ ترکیب ہمیں لندن پولیس نے بتائی تھی۔ پنڈت نہرو اور ان کے ہمراہ اندرا گاندھی، جب انڈیا ہاؤس کے پاس پہنچے، تو سامنے ہمیں پلے کارڈ اور بینرز اٹھائے پایا۔ پنڈت نہرو نے، کار سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور پولیس کو ہمیں وہاں سے ہٹانے کا کہا، مگر پولیس نے، مجھ سے نہرو پر حملہ نہ کرنے کی ضمانت لی اور اپنی حفاظت میں، دونوں کو ہمارے درمیان سے گذار کر، انڈیا ہاؤس کے اندر پہنچایا۔ ہم نے آزادی کے حق میں، خوب نعرہ بازی کی۔ میرے ہاتھ میں خود مختار جموں کشمیر کا پلے کارڈ تھا۔ جب پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی میرے سامنے سے گذرے، تو میں نے پلے کارڈ لپک کر پنڈت نہرو کے سر پر، آویزاں کیا، تو پریس فوٹوگرافروں نے، جنھوں نے مجھ کو یہ ایکشن تجویز کیا تھا، کافی فوٹو لیے۔ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی کے چہرے، مایوسی اور پریشانی میں زرد تھے۔ صحافیوں نے بعد میں بتایا کہ اندر، پنڈت نہرو سفیر اور عملہ پر خوب برسے اور پریس کانفرنس منسوخ کر دی، اور مظاہرہ سے متعلق اور مسئلہ کشمیر پر کیے گئے سوالات کا، کوئی جواب نہ دیا۔

ایوب خان سے ملاقات، کے لئے دعوت

ایوب خاں نے مجھے مظاہرہ میں، قیادت کرتے اور بالخصوص کانفرنس روم کے گیٹ پر مندوبین کو میمورنڈم، خود پیش کرنے کے مطالبہ پر، سیکریٹری دولت مشترکہ سے بحث اور اصرار کرتے دیکھا تھا۔ اور دوسرے دن پنڈت نہرو کی پریس کانفرنس کے وقت مظاہرہ اور پریس کانفرنس کی منسوخی کی اطلاع پر، وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے جنرل یوسف ہائی کمشنر پاکستان کو کہا، کہ اس نوجوان سے، میری ملاقات کروائی جائے۔ انھوں نے مجھے برمنگھم میں، تلاش کرنا شروع کر دیا، جب کہ میں لندن میں تھا۔ اس دن ان کو، میں نہ مل سکا تو جنرل یوسف نے، صوبیدار فضل حسین وغیرہ کو ایوب خان کے سامنے پیش کر دیا، ایوب خان نے کہا، ''بھئی وہ نوجوان وکیل، بلیو سوٹ والا، جس نے کانفرنس میں میمورنڈم پیش کیا تھا، اس کو بلاؤ''۔ روزنامہ ڈان کے نمائندہ خصوصی مقیم لندن، نسیم احمد کے نام مجھے خورشید صاحب نے تعارفی خط بھی دیا تھا۔ وہ مظاہروں پر رپورٹنگ بھی کرتا رہا تھا، دوسرے روز پاکستانی سفارتخانہ کی کنٹین میں، اس سے ملاقات ہوئی، تو ایوب خان کی طرف سے ملاقات کی خواہش کا علم ہوا۔ اس کے ساتھ ہوٹل پہنچے، تو معلوم ہوا آدھ گھنٹہ قبل وہ فرانس کے صدر ڈیگال سے ملاقات کرنے، پیرس جا چکے تھے۔ البتہ وہاں پر محمد علی بوگرہ، وزیر خارجہ پاکستان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کافی پیش کی اور مسئلہ کشمیر اور ہمارے مظاہروں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا، کہ ۲۰ راگست ۱۹۵۳ء میں، جب بطور وزیر اعظم، انھوں نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا، پنڈت نہرو نے، جموں کشمیر کو خود مختار ملک قائم کرنے کی تجویز دی تھی، مگر جب یہ تجویز، کراچی میں کابینہ

میں پیش کی گئی، تو پنجاب سے مرکزی وزراء نے اس کو مسترد کر دیا تھا، وگرنہ بقول محمد علی بوگرہ کے، جموں کشمیر کو خود مختاری ملنے کا وہ ایک نادر موقع تھا، جو ضائع کر دیا گیا تھا۔ اب ۱۹۶۲ء میں حالات بہت مختلف تھے اس گفتگو کے وقت، میرے ساتھ عجائب چوہان اور حبیب الرحمٰن بھی موجود تھے۔

شہرت اور حسد، باہمی دشمن

چوہدری نور حسین ان دنوں مارشل لاء کے تحت قائم مقدمہ کی وجہ سے، برمنگھم میں مقیم تھے۔ ان سے میرے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ آزاد کشمیر بالخصوص میرپور کی سیاست میں، مجھ سے سینئر اور بااثر تھے، جاٹ قبیلہ میں ان کے بہت پیروکار تھے۔ جب ہم نے لندن میں، مظاہرہ کا پروگرام ترتیب دیا، تو میں نے ان کو قیادت کی پیش کش کی، مگر انھوں نے یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی، کیونکہ مظاہرہ میری تجویز پر ہو رہا تھا، یہ ان کا بڑا پن تھا۔ دولت مشترکہ اور پنڈت نہرو کی پریس کانفرنس کے موقع پر، منظم اور فعال مظاہرہ، برطانیہ میں پہلی دفعہ منعقد کرنے اور ایوب خان کی طرف سے، مجھ سے ملاقات کی خواہش کی وجہ سے، برطانیہ میں اور بالخصوص میرپور کے لوگوں میں، میری تعریف کا چرچا ہر مقام اور ہر جگہ ہونے لگا، حالانکہ مظاہرین کو لندن بذریعہ کوچ، پہنچانے کا کرایہ چوہدری یوسف نے اور دیگر اخراجات، عجائب چوہان نے ادا کیے تھے۔ مگر میری تعریف نے، غیر شعوری یا شعوری طور پر، بااثر حلقہ میں حسد کی کیفیت کو جنم دیا۔ میں نوجوان تھا، کنبہ، قبیلہ گنتی میں اور غیر اکثریتی تھا، سرمایہ بھی پاس نہ تھا، والد فاؤنڈری میں مزدور تھا، لاہور میں جب وکالت شروع کی تو سردار اقبال صاحب نے بتایا تھا، کہ انسان کی بڑی دشمن اس کی شہرت ہوتی ہے، شہرت اور حسد دونوں، بیک وقت جنم لیتے ہیں، شہرت دائیں ہاتھ اور حسد بائیں ہاتھ انسان کے پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔ اسی ماہ، ۲۸ ستمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا تھا۔ لندن میں مظاہرہ کے بعد، ہم میں خود اعتمادی کچھ زیادہ ہی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے تجویز دی کہ جنرل اسمبلی کے اجلاس کے افتتاح کے موقع پر، آزادی کے حق میں مظاہرہ کیا جائے۔ اس سے سب نے اتفاق کیا اور طے ہوا کہ نیویارک اور نیوجرسی میں مقیم، میرپوریوں کو مظاہرہ کا انتظام سونپا جائے۔ طے ہوا کہ لندن میں مظاہرہ کی تائید مزید، عوام اور پریس کے تعاون کا، شکریہ ادا کرنے اور نیویارک مظاہرہ کا اعلان، لندن میں پریس کانفرنس کے ذریعہ کیا جائے۔ ہم نے نیویارک ۲۶ ستمبر کو روانگی کا پروگرام طے کیا۔ اپنے پاسپورٹ ٹکٹ بکنگ کے لیے، چوہدری یوسف کی ہدایت پر، ان کے آفس انچارج ماسٹر وزیر علی کے سپرد کیے۔ خرچہ اپنا اپنا برداشت کرنا تھا۔ لندن پریس کانفرنس میں انگریز صحافی مدعو تھے، میں نے پریس نوٹ تیار کیا ہوا تھا۔ کانفرنس شروع ہونے سے دس منٹ قبل، مجھے ہال سے باہر بلا کر، چوہدری عبدالرحمٰن رٹوی، عبدالعزیز رٹوی نے، چوہدری یوسف اور محمود ہاشمی کے سامنے کہا، کہ پریس کانفرنس میں نے ایڈریس نہیں کرنی، وجہ پوچھی تو کہا، کہ بس یہ ان کا فیصلہ تھا۔ یہ موقع تکرار کا نہ تھا، میں نے ان سے اتفاق کر لیا۔

چوہدری یوسف اور محمود ہاشمی نے کہا، کہ عجائب چوہان پریس سے خطاب کریں گے۔ قہر درویش بر جان درویش کے مصداق، میں اس عمر میں غصیل تو بہت تھا، مگر اپنا غصہ پی گیا۔ پریس نوٹ عجائب چوہان کے سپرد کیا، جو اس نے پڑھ کر سنایا، مگر انگریز صحافی، مظاہرہ میں مجھ سے شناسا تھے، انھوں نے تمام سوال مجھ سے کیے۔ پریس کانفرنس کے دو دن بعد، اقوام متحدہ کے سامنے مظاہرہ کے لئے جانا تھا، مگر بتایا گیا کہ ذاتی مصروفیت کی وجہ سے، چوہدری یوسف امریکہ نہ جا سکتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بااثر حلقوں میں اندر ہی اندر تحریک چلی کہ کشمیر کی آزادی کا نام استعمال کر کے، مجید ملک بین الاقوامی سطح کا، لیڈر بن رہا تھا، لہٰذا اس کو اسی سطح پر ختم کر دیا جائے۔ اس میں جاٹ اور دیگر قبیلوں کے سرکردہ افراد شامل تھے۔ ہم امریکہ نہ جا سکے۔

وطن واپسی اور بدلہ ہوا زمانہ

انگلینڈ میں زیادہ مصروفیت اور پانچ ماہ گذارنے پر، والد صاحب کو میرے وطن واپس نہ جانے کا شبہ ہونے لگا۔ امی جان بھی واپس آنے پر اصرار کرنے لگیں۔ چنانچہ حسب حکم میں ۲۴ راکتوبر کو واپس میرپور پہنچا۔ عدالتوں میں میرے مقدمے، انتظار میں ملتوی ہوتے رہے، میرے منشی کی اور موکلوں کی قربانی اور مجھ پر، ان کو جو اعتماد تھا۔ میری عدم موجودگی میں اس پر کوئی فرق نہ پڑا۔ اس میں موسم گرما کی تعطیلات کا بھی فائدہ تھا، البتہ لبریشن لیگ کی تنظیم ہو چکی تھی۔ تنظیم میں میرا نام، کسی حیثیت میں بھی شامل نہ تھا۔ مسلم کانفرنس کے کارکن اور دوسرے درجہ کے لوگ، دھڑا دھڑ لبریشن لیگ میں شامل ہو رہے تھے، اقتدار سے الگ رہنے کو، وہ موت قرار دے رہے تھے۔ مجھے رفیعہ اسلم اور دوسرے ساتھیوں سے معلوم ہوا، کہ لندن میں خودمختار کشمیر کے حق میں میمورنڈم پیش کرنے اور مظاہرہ میں نعرہ بازی اور بینرز آویزاں کرنے پر، خورشید مجھ سے ناراض تھے۔ میں جب خورشید صاحب سے مولوی عبداللہ سیاکھوی صاحب کی برسی کی تقریب میں، انہیں مدعو کرنے کے لئے ملا، تو انھوں نے نہ تو مجھے جماعت میں، شامل ہونے کے لئے دعوت دی اور نہ ہی لندن میں مظاہرہ پر کوئی تبصرہ کیا، بلکہ برسی کی تقریب میں، شامل ہونے کی حامی بھر لی۔ اس دوران ان کو میرے سیاسی ہمعصروں نے، برسی میں شامل ہونے سے روکنے کے لئے، بہت کوشش کی، مگر حسب پروگرام وہ جلسہ میں شامل ہوئے۔

انڈیپنڈنٹ کشمیر کمیٹی کا قیام

چند ماہ سے ہندوستان اور چین کی درمیان، نیفا میں فوجی چپقلش بالآخر جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ ہندوستان کی فوج پسپائی پر مجبور ہوئی تو، ہندوستان نے چینی خطرہ کا واویلا شروع کر دیا۔ اس پر امریکہ کے صدر، کینیڈی اور برطانوی وزیراعظم میکملن نے ہندوستان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ایوب خان نے بھی اس مرحلہ پر مصلحت کوشی سے کام لیا، جس پر دسمبر ۱۹۶۲ء پاکستان و ہندوستان کے نمائندوں ذوالفقار علی بھٹو اور سورن سنگھ کے

درمیان مذاکرات کے پانچ دور، ناکامی پر منتج ہوئے اور مئی ۱۹۶۳ء میں جموں کشمیر کے عوام میں نئی مایوسی شروع ہوئی۔ چنانچہ متحرک کشمیری نوجوانوں نے باہمی رابطہ کر کے، نئی مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۶۳ء کو ڈان ہوٹل راولپنڈی میں ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں جی ایم لون، ممبر جموں کشمیر سٹیٹ کونسل کی، صدارت میں انقلابی تنظیم، کشمیر انڈیپینڈنس کمیٹی قائم کی گئی۔ جس کے ممبران، قاضی خورشید عالم ممبر سٹیٹ کونسل، جن کا تعلق ادھم پور جموں سے تھا، اسی طرح جموں سے شیخ سلیم سابق انسپکٹر جنرل پولیس، میر عبدالرشید ایڈیٹر فری کشمیر، مجید امجد بٹ مدیر ولر، جو سیالکوٹ میں مقیم تھے، سرینگر کے غلام نبی گلکار، میر عبدالعزیز، ایڈیٹر انصاف مقیم راولپنڈی، سعید شاہ نازکی، مقیم لاہور، ایم اے فاروق ایڈووکیٹ، مقیم مظفر آباد، میرپور سے عبدالخالق انصاری اور میں، جبکہ گلگت سے امان اللہ خان مقیم کراچی، شامل ہوئے، مگر کشمیر کمیٹی کی جدوجہد صرف چند قراردادوں اور اجلاسوں تک، محدود رہی اور پروگرام اور نصب العین پر کام کرنے اور عوام کو منظم کرنے میں، خاطر خواہ پیش رفت نہ ہو پائی تھی، کہ مقبوضہ جموں کشمیر میں، شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ نے محاذ رائے شماری کے نام سے، نئی سیاسی تنظیم قائم کی۔ ۱۹۳۸ء سے قائم نیشنل کانفرنس، جس پر ۱۹۵۳ء میں گرفتاری کے وقت تک، شیخ عبداللہ کی سیاسی اجارہ داری قائم چلی آ رہی تھی، اس سے الگ ہو کر، محاذ رائے شماری کا قیام، ایک واضح سیاسی تبدیلی کا پیغام اور ہندوستان کے موقف سے لاتعلقی کا اظہار تھا۔ شیخ عبداللہ نے، اپنی تقریروں میں ہندوستان کے کشمیر پر، قبضہ کو چیلنج کیا اور جموں کشمیر کی جغرافیائی اور سیاسی وحدت کی بات کی، جس سے آزاد کشمیر میں یہ تاثر پیدا ہوا، کہ وہ خودمختار کشمیر کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس تاثر اور کچھ لوگوں کے شیخ صاحب سے، بالواسطہ رابطہ کی بنا پر، آزاد کشمیر میں محاذ رائے شماری قائم کر کے، یکجہتی قائم کرنے کی کوشش شروع ہوئی، چنانچہ سیالکوٹ میں کنونشن منعقد ہوا۔ جہاں اپریل ۱۹۶۵ء میں محاذ رائے شماری کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ یہ تنظیم بھی، کچھ مدت کے بعد منقسم ہو کر، لبریشن فرنٹ کی شکل میں، متوازی تنظیم کی حیثیت اختیار کر گئی۔ باقی حالات اپنی مثال آپ کی حیثیت میں، مخصوص مقام کے حامل ہیں، جس کی تفاصیل، امان اللہ خان، عبدالخالق انصاری، محمد یونس تریابی اور راجہ عبدالقیوم کی تصانیف میں دی گئی ہیں۔ تاہم ان میں بھی تحریک آزادی میں، خفیہ ایجنسیوں کے حساس کردار اور ایجنسی کی ہدایات اور معاونت پر، عمداً خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ شاید مہم جوئی میں، ناکامی کے اسباب کو عوام، بالخصوص مستقبل کی نسلوں سے چھپانا مقصود ہو۔

آزاد حکومت کو تسلیم کروانے کی حکمت

قانون آزادی ہندوستان کے تحت، ریاست جموں کشمیر کو مسلمہ طور پر، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مکمل طور پر آزاد و خودمختار حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جو آج تک بدستور قائم ہے، جس کی تائید اور توثیق عالمی ادارہ اقوام متحدہ، ہندوستان و پاکستان نے کر رکھی ہے۔ اس کا واضح ثبوت سلامتی کونسل کی قراردادیں ہیں۔ اس کی تائید ڈوگرہ مہاراجہ

کی انتظامیہ کو معزول کر کے، ۴ ر اکتوبر اور اعلان مزید، ۲۴ ر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے بھی ہوتی ہے۔ آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر، جس کا انتظامی دائرہ اختیار عملاً آزاد خطہ تک ہی تھا، تاہم معنوی اور نظریاتی طور پر یہ حکومت ریاست کے تمام خطوں میں آباد، آزادی کے حامی عوام کی ترجمان اور نمائندہ حیثیت کی حامل ہے۔ ہندوستان مہاراجہ کی جس دعوت پر ریاست میں داخل ہوا تھا۔ وہ دعوت بدون اختیار اور قانون آزادی ہند کے مغائر تھی۔ جس کو ہندوستان نے متعدد بار، سیکیورٹی کونسل کے اندر اور باہر تسلیم کیا ہے اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ریاست کے عوام کو مانا ہے۔

آزاد حکومت کی حیثیت، اقوام متحدہ کے کمشن نے، اپنی قرارداد ۱۳ ر اگست ۱۹۴۸ء کے پارٹ بی، میں تسلیم کی ہوئی ہے اور جہاں پاکستان اور ہندوستان کی افواج کے انخلا کو، لازمی اور استصواب رائے سے مشروط کیا ہے، وہاں آزاد کشمیر حکومت کی ریگولر افواج کے قیام کو، ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کی قرارداد میں تحفظ دیا گیا ہے، اس کی مزید تائید، وزیراعظم ہندوستان کے ۲۰ ر اگست ۱۹۴۸ء کے خط اور کمشن کے چیئرمین جوزف کوربل کے جواب سے ہوتی ہے۔ بحوالہ، سردار پٹیل خط و کتابت، جدول ۴۵ صفحہ ۲۵۸، خط میں وزیراعظم نے دیگر شرائط کے علاوہ اس نکتہ پر متوجہ کیا کہ (i) آزاد کشمیر کی حد تک، جموں کشمیر ریاست کی ساورنٹی/ اقتدار اعلیٰ کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ (ii) آزاد حکومت جموں کشمیر کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اس سے عیاں تھا، کہ آزاد حکومت، جو حقیقت کا روپ دھار چکی تھی، اس کی حیثیت کو تسلیم کرنے میں، پہلا اور بڑا اعتراض، خود جموں کشمیر کی آزادی کے دشمن اور مخالف ملک، ہندوستان کو تھا، مگر چیئرمین کمشن نے، یہ اعتراض مسترد کر دیا۔ اس طرح آزاد کشمیر کی فوج کو ختم کرنے کا، پنڈت نہرو کا مطالبہ بھی، مسترد کیا گیا تھا۔

۴ اور ۲۴ ر اکتوبر کو آزاد کشمیر حکومت، تمام ریاست کی جائز، عوام کی نمائندہ حکومت قرار دے کر، آزاد خطہ کی محافظ اور ہندوستان کے زیر تسلط علاقہ کو، آزاد کروانے کی مجاز اور ذمہ دار قرار دی گئی تھی۔ اس کا دارالحکومت، قومی پرچم، قومی ترانہ، آزاد کشمیر ریگولر فورس، کمانڈر اور ڈپٹی کمانڈر انچیف اور چیئرمین، چیف آف سٹاف، جنرل ہیڈ کوارٹر تک الگ قائم کیے گئے اور حکومت کا سربراہ صدر، بجائے مہاراجہ اور وزیر دفاع مقرر کیے گئے۔ یہ تمام علامتیں اور کوائف، ایک آزاد و خودمختار مملکت کے تھے اور اب تک ہیں۔ حکومت پاکستان نے یہ حیثیت، نہ صرف خود تسلیم کی، بلکہ یہ مؤقف اقوام متحدہ میں، تحریری اور زبانی طور پر بھی تسلیم کر رکھا ہے۔ پاکستان نے کسی مرحلہ پر بھی، آزاد کشمیر مع گلگت بلتستان کے خطہ کو پاکستان کا حصہ قرار نہیں دیا۔ جس کی آئینی تائید، دستور پاکستان ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲۵۷ سے کی گئی ہے۔ پاکستان کا مؤقف صرف یہ رہا ہے، کہ ریاست کے مستقبل کے تعین کے لئے، ریاست کے عوام کو، آزاد، غیر جانبدار ماحول میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی استصواب رائے کا حق استعمال کرنے کا موقع دیا جائے۔ البتہ یہ قیاس غالب رہا ہے، کہ استصواب میں، ریاست میں عوام کی اکثریت، پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو ترجیح اور فوقیت دے گی۔ ایسا ہی تاثر ہندوستان میں بھی، غالب رہا ہے۔ جس وجہ سے ہندوستان

استصواب رائے کے انعقاد سے، انحراف اور روگردانی کر رہا ہے، اس کی تائید مزید آزاد حکومت اور پاکستان کے مابین انتظامی، دفاعی امور اور گلگت بلتستان مع حوالگی امور تحریک آزادی، ۲۸ر اپریل ۱۹۴۹ء کے معاہدہ اول اور اس کے بعد متعدد باہمی تحریری اقدامات سے، ہوتی ہے، جس سے ثابت ہے، کہ حکومت آزاد جموں کشمیر کی قانونی اور آئینی حیثیت، حکومت پاکستان نے، روز اول یعنی ۴ر اکتوبر اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے عملاً اور معناً تسلیم کر رکھی ہے، مزید یہ امر بھی ناقابل تردید ہے کہ، ریاست میں تمام قوانین جو ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد میں بنے ہیں، وہ بدستور لاگو ہیں۔ سٹیٹ سبجیکٹ یعنی باشندہ ریاست کا قانون، ان میں نمایاں ہے اور انتظامیہ، مقننہ کے ساتھ ساتھ عدالت عظمٰی تک، عدلیہ بھی، ریاست کی اور ۱۹۷۰ء کے بعد ۱۹۷۴ء کا عبوری دستور، بھی الگ ہے۔

کے ایچ خورشید نے آزاد کشمیر میں جمہوری نظام کے قیام، زرعی اصلاحات، اداروں، شاہراہوں کی تعمیر، تعلیم عام اور لازمی قرار دینے، شعبہ صحت میں اصلاحات وغیرہ کے لئے، پانچسالہ منصوبہ منظور کیا۔ لوکل اور بڑی صنعتوں کے قیام اور تجارتی ترقی کے لئے، درآمد پالیسی اور زرمبادلہ کا حصہ مقرر کروایا، مگر زیادہ تر توجہ کی محتاج تحریک آزادی تھی۔ سندھ طاس معاہدہ کے بعد، جموں کشمیر کے مسئلہ کا نام لینا، قریب قریب متروک ہو چکا تھا۔ مسلم کانفرنس کو آزاد کشمیر میں، اقتدار پر رولز آف بزنس کے تحت وزارت امور کی سرپرستی اور اس کے تابع اجارہ داری حاصل تھی جس کے لئے ذاتی سطح پر، جوائنٹ سیکریٹری امور کشمیر کی خوشامد اور عوامی سطح پر، الحاق پاکستان کے حق میں، نعرہ بازی، حصول اقتدار کیلئے مؤثر حربہ تھا۔ تمام قیادت کا ذریعہ معاش، وزارت کا نقد ماہوار وظیفہ تھا۔ لہٰذا تحریک آزادی، مسئلہ کشمیر، آزاد حکومت کا اقتدار، وزارت امور کشمیر اور سپیشل خفیہ کے یرغمال تھے۔ اسی طرح آزاد کشمیر کے وسائل اور میرپور کے لئے یورپ میں کمایا ہوا زرمبادلہ اور مقامی سرمایہ وزارت امور کشمیر اور پاکستانی بینکوں کے استعمال و استحصال میں تھا۔ اس صورت حال سے نکلنے کے لئے، انقلابی اور مدبرانہ صراحت کی ضرورت تھی، مگر بدقسمتی سے عوام چھوٹے چھوٹے اور معمولی نوعیت کے مفادات کی دوڑ میں، قبیلائی اور علاقائی تعصب، حسد اور رقابت میں، قیادت کے ساتھ، گروہ بندی میں بٹے ہوئے تھے۔ اس ماحول اور رویہ میں تبدیلی کی اشد ضرورت تھی، جس کا ہمیں احساس تھا اور موقع کی تلاش تھی۔

خورشید کی پیش قدمی

فیلڈ مارشل ایوب خان، خورشید صاحب کے پس منظر، ذہانت، اہلیت اور وجاہت سے متاثر اور خوش تھے۔ مظفرآباد میں، یونیورسٹی گراؤنڈ جو اب خورشید سٹیڈیم ہے، وہاں بڑے جلسہ عام میں، ایوب خان نے خورشید کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "آپ آزاد کشمیر کے لوگ خوش قسمت ہیں، کہ آپ کو خورشید جیسا صدر ملا ہے"۔ ان دنوں لاہور کے معروف قانون دان، شیخ منظور قادر وزیر خارجہ تھے، وہ بھی خورشید صاحب کے بہت معترف تھے۔ لبریشن لیگ کے قیام میں، آزاد کشمیر میں ترقیاتی اصلاحات کی منصوبہ بندی اور مسلم کانفرنس کے الحاق کے حق میں،

استحصالی، پسماندہ، گروہ بندی کی شکار، منجمد تحریک آزادی کو، عالمی سیاسی حالات کے تناظر میں، نئی جہت اور حکمت سے منظم کرنا ہی مقصد تھا، محض رسمی اور روایتی جماعت بنانا مدعا، نہ تھا۔ خورشید صاحب نے شیخ منظور قادر سے مسئلہ کشمیر میں نئی حکمت عملی اختیار کرنے پر، مشاورت کی اور ان کو اس پر قائل کیا، جس کے بعد انھوں نے، بہت محتاط انداز میں ایوب خان کے سامنے، آزاد حکومت کو ریاست کی مجاز حکومت تسلیم کروانے اور جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کی تحریک، کی علمبردار کے طور پر چلانے، جبکہ پاکستان کو اپنے مؤقف پر قائم رہنے کی تجویز پیش کی۔ ایوب خان نے شیخ منظور قادر کو، نئی تجویز کا جائزہ لے کر، رپورٹ پیش کرنے کو کہا۔ بقول خورشید صاحب، وزارت خارجہ نے تین ماہ میں، اس تجویز کا گہرائی میں مطالعہ کر کے، اس کے حق میں سفارش کی۔ وزیر خارجہ منظور قادر نے مظفر آباد کا دورہ کیا۔ سابقہ پروٹوکول کے قطعی برعکس، وزیر خارجہ باقاعدہ پروٹوکول کے تحت، ملاقات کے لئے، پریزیڈنٹ ہاؤس گئے۔ دوسرے روز مذاکرات کے لئے، دو ممالک کے درمیان مذاکرات کے برابر انداز میں، میز ترتیب دیا گیا، اور مذاکرات کے اختتام پر، باقاعدہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس پر پاکستان میں سیاسی حلقے اور پریس چونک گیا، مگر آزاد کشمیر کے سیاستدان، بالخصوص مسلم کانفرنس، پریشان ہو گئے۔ اتفاق سے انہی دنوں، چین اور ہندوستان کی نیفا میں فوجی چپقلش بھی ہوئی تھی اور ماحول میں تلخی بڑھ رہی تھی۔ ایوب خان نے خورشید صاحب کو، کراچی میں مقیم سفارتخانوں میں ایسی تجویز پیش کر کے، ردعمل معلوم کرنے کو کہا۔ چنانچہ کم و بیش ۲۸ ممالک نے آزاد حکومت کو ریاست کی مجاز حکومت تسلیم کرنے کی حامی بھر لی، بلکہ چین کے پیکنگ ریڈیو نے ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو، اپنے تبصرہ میں ہندوستان کو، ایشیا کا بڑا جارح ملک قرار دیا اور کہا، کہ ''اگر آزاد حکومت کو، کشمیر کی مجاز حکومت تسلیم کروانے کی درخواست کی گئی، تو اس پر ہمدردانہ غور ہوگا اور بھارت کے زیر تسلط مقبوضہ، جموں کشمیر کو، آزاد کروانے میں حکومت آزاد کشمیر کو، ہر قسم کی امداد فراہم کی جائے گی''۔ وزیر خارجہ پاکستان اور صدر آزاد کشمیر کے مابین، اپنے اپنے وفود کے ہمراہ، باہمی دلچسپی کے امور پر مذاکرات، اعلیٰ سطح پر زیر بحث لانے اور مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے کے بعد، بیرونی سفارتخانوں سے رابطہ کر کے، حمایت حاصل کرنے کے عمل کے بعد، تیزی سے اقدامات کی کوشش شروع ہوگئی۔ سٹیٹ کونسل کا اجلاس ۲۹ رجون ۱۹۶۲ء کو منعقد ہوا۔ جس میں اتفاق رائے سے، قرارداد منظور کر کے صدر آزاد کشمیر سے مطالبہ کیا گیا، کہ وہ پاکستان سے آزاد حکومت کو، پوری ریاست کی مجاز اور قانونی حکومت تسلیم کرنے کی درخواست کریں۔ کراچی میں مقیم، مسٹر تھیمن جان خان بیرسٹر، ماہر بین الاقوامی قوانین کو، آزاد حکومت کو تسلیم کروانے کے لئے، مشیر مقرر کیا گیا۔

سیاست اور حسد کی آگ میں سب کچھ بھسم

آزاد کشمیر حکومت تسلیم کروانے کی مشق میں، کے۔ ایچ خورشید میڈیا اور سیاسی افق پر، جب صف اول کی

سطح پر کرنیں پھیلانے لگے، تو چین کے رویہ اور ریڈیو پر، آزاد حکومت کو تسلیم کرنے اور امداد کرنے کے اعلان سے قبل، لداخ میں اقصائے چین پر، قبضہ کر کے تبت کو سڑک سے ملانے کی وجہ سے، ہندوستان سخت پریشان تھا۔ چنانچہ وزیر خارجہ اور صدر آزاد کشمیر کے مشترکہ اعلامیہ جاری ہونے پر، ہندوستان نے اس کو سازش قرار دے کر، مناسب اقدام کی دھمکی دی۔ اس دوران ہندوستان اور چین کے درمیان، نیفا میں چپقلش بھی ہوئی تھی، جس وجہ سے آزاد حکومت کو، تسلیم کروانے کا عمل قدرے سست ہو گیا۔ مگر مسلم کانفرنس اور کشمیری سیاستدانوں میں کے۔ ایچ خورشید کی عوام اور حکومتی سطح پر مقبولیت اور سیاسی شہرت کی وجہ سے، سخت حسد اور بغض نے جنم لیا۔ جس کے نتیجہ میں تمام سیاستدان خورشید کے خلاف متحد ہو گئے۔ پاکستان میں تمام سیاستدان ایوب خان کے خلاف تھے، کشمیر کے مسئلہ اور آزاد حکومت کو، تسلیم کروانے کے عمل کو اقوام متحدہ کی قراردادوں سے انحراف اور خود مختار کشمیر کا نام اور روپ ظاہر کر کے، پاکستان میں پراپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا گیا۔ لاہور میں کشمیر کانفرنس، چوہدری غلام عباس نے طلب کی۔ جس میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے تمام سیاستدان شامل ہوئے اور تسلیم حکومت کے نظریہ کے خلاف، سخت تقریریں کیں، ایوب خان کے نام ہزاروں ٹیلیگرام ارسال کی گئیں اور چوہدری غلام عباس خان نے طویل خط ارسال کیا، جس میں آزاد حکومت کو تسلیم کروانے کو، پاکستان کی سالمیت، الحاق پاکستان اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی خلاف، سازش قرار دیا۔ اس سے ملتا جلتا مؤقف ہندوستان کا بھی تھا، جبکہ وزیر اعظم ہندوستان تو آزاد حکومت کو تسلیم کرنے کے خلاف، یو این کمشن کو ۲۰ راگست کے خط میں مخالفت کر چکا ہوا تھا۔ آزاد حکومت کو پوری ریاست کی آئینی اور قانونی حکومت تسلیم کروانے اور سابق ڈوگرہ حکومت کی جگہ عوام کی حکومت تسلیم کروانے کے خلاف، ہندوستان اور مسلم کانفرنس کی تمام قیادت، ایک اور صرف ایک مؤقف پر، متفق اور متحد ہو گئی۔ یہ سیاسی مفاہمت بھی، جموں کشمیر کی، سیاسی اور جغرافیائی اکائی اور وحدت کے مؤقف اور اقدام کے خلاف تھی۔ مسلم کانفرنس اور کشمیری قیادت کا خورشید کی سیاسی شہرت اور انفرادی مقبولیت کے، حسد اور کینہ کی بنا پر، ہٹینس کو، کی ناکام کشمیر پالیسی پر بضد ہونے سے، تحریک آزادی کی کیا خدمت کی گئی؟ سچ تو یہ ہے کہ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"، اور تحریک آزادی کو جو نئی جہت حاصل ہو کر، قوم کو آزادی سے ہمکنار کرنے کا موقع ملنے کو تھا، وہ موقع ذاتی حسد کی بھینٹ چڑھا کر، سب کیا کروایا، بھسم کر دیا گیا۔

شیخ عبداللہ کا عندیہ

جولائی ۲۰۰۵ء کو ڈاکٹر راج موہن گاندھی کی دعوت پر، میں دیگر مندوبین کے ہمراہ دہلی میں، کشمیر کانفرنس میں شامل ہوا، ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے عشائیہ میں مدعو کیا۔ ان کو ۱۹۷۴ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سفیر خصوصی کے طور پر، مسٹر بھٹو وزیر اعظم کے پاس خط دے کر، لاہور روانہ کیا گیا تھا، لاہور روانہ ہوتے وقت، شیخ عبداللہ نے

فاروق کو ذوالفقار علی بھٹو کے نام پیغام دیا تھا، کہ اگر پاکستان کے لیڈر اور بھٹو ہندوستان کے تسلط سے جموں کشمیر کو آزاد کروانے میں سنجیدہ ہیں، تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا، جو کے۔ ایچ خورشید نے آزاد حکومت کو، ریاست کی مجاز حکومت تسلیم کروا کر بین الاقوامی سطح پر آزادی کی تحریک چلانے کی تجویز دی تھی، اس پر عمل کر کے ہی ہندوستان سے ریاست کو آزاد کروایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ فاروق عبداللہ کے بقول، اس نے شیخ صاحب کا پیغام بھٹو کو پہنچایا، مگر بھٹو نے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ "اگر ایک دفعہ کشمیر کے لوگ آزاد ہو گئے، تو پھر وہ قابو نہ ہو سکیں گے"۔ فاروق عبداللہ نے دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر اپنے بیٹے عمر عبداللہ، راجہ خالد اکبر اور بھٹو شہید پیپلز پارٹی کے منیر حسین چوہدری ایڈووکیٹ کی موجودگی میں، ۲راگست ۲۰۰۵ء کو عشائیہ کے دوران یہ بات بتائی تھی۔

خواجہ غلام احمد پنڈت، سابق سیکریٹری آزاد حکومت اپنی کتاب "کشمیر آزادی کی دہلیز پر" صفحہ ۳۰۹ پر "آزاد کشمیر تسلیم کروانے کا مناقشہ، کے عنوان کے تحت خورشید کے معاون کی حیثیت میں تفصیل بیان کرتے ہیں، جس کی تائید پروفیسر سرور عباسی نے بھی اپنی تحقیق "سیاسیات کشمیر" میں صفحہ ۱۵۵-۱۶۲ میں کی ہے، ان کے تنقیدی تجزیہ میں مسلم کانفرنس کی سیاست پر، مخصوص انداز میں واقعاتی روشنی ڈالی گئی ہے، مگر ان حقائق سے اختلاف نہ ہے۔ مسلم کانفرنس کی تمام قیادت ۲۸راپریل ۱۹۴۹ء کے معاہدہ کراچی کے بعد تحریک آزادی کشمیر سے مکمل دستکش ہو گئی تھی اور اس کی تمام تر باہمی، رسہ کشی اور پے در پے اندرونی اور بیرونی سازشیں، آزاد حکومت کے اقتدار کے حصول تک، محدود ہو کر رہ گئیں۔ جس کے تحت پاکستان میں، مقتدر قوتوں سے وفاداری ثابت کرنے کے لئے، الحاق پاکستان کے حق میں نعرہ بازی اور بیانات کو ذریعہ اقتدار بنایا گیا، یہ سنت اب تک بدستور قائم ہے۔ اس سارے ہنگامے کا فکر انگیز پہلو یہ ہے، کہ ریاست کے دونوں طرف کی سیاسی قیادت اپنا فعال کردار اور اعتماد و اعتبار ریاستی عوام کی نظر میں کھو چکی ہے۔ کنٹرول لائن کے دوسری طرف کی تمام سیاسی قیادت، جو ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی حامی ہے۔ کشمیری عوام اور قیادت پر، بھارت کی تمام سیاسی قیادت اور مقتدر قوتوں کو بالکل اعتماد نہ ہے، بالکل اسی طرح آزاد کشمیر میں سیاسی قیادت پر، پاکستان کی قیادت اور مقتدر قوتوں کو اعتماد نہیں ہے، جس کا سب کو شدت سے احساس ہے اور نجی گفتگو میں اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ بظاہر وفاداری، تعلق اور گہرے رشتوں کے بیانات کی اساس، محض منافقت اور ریاکاری ہے، جو لوگ اس تجزیہ سے اختلاف کریں، وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ جموں کشمیر کے عوام کی بڑی اکثریت کی، پاکستان سے محبت، لگن اور خلوص، عوام پاکستان کے برابر بلکہ اُن سے زیادہ ہے۔ اس لئے سیاسی قیادت کے، باہمی استحصالی رویہ، کو عوام کے خلوص اور لگن کے باہمی جذبہ، کو آپس میں غلط ملط نہ کیا جائے۔ دونوں طبقات میں حد فاصل قائم رکھنا، لازمی ہے۔

کے ایچ خورشید کا حکومت سے استعفیٰ

ایوب خان جب تک، خورشید سے خوش رہا، وہ ان کا ظاہر باہر مداح تھا، وہ ان کو اکثر چھوٹا صدر کہتا، مگر

دونوں کی سوچ اور تربیت میں بہت تفاوت تھی۔ ایوب خان فیلڈ مارشل اور واحد مقتدر قوت کی حیثیت میں، مطلق العنان اور عقل کل کی نفسیات کا حامل تھا۔ خورشید ذہین، صاحب الرائے اور قائداعظم کی نظریاتی، عوامی، جمہوری سوچ اور دوٹوک بچ بات کرنے اور حق پر جرأت سے، مؤقف اختیار کرنے کی تربیت کا حامل تھا، جن اوصاف کے بل بوتے پر وہ ایوب خان کا معتمد بنا، ان ہی اوصاف پر عمل پیرا ہونے کے سبب، اختلاف اور دوری بھی پیدا ہوئی، مگر اس میں تین قوتوں کا عمل دخل، بہت واضح تھا، چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کی قیادت ۱۹۶۰ء سے ہی، اس کی عوام میں مقبولیت اور پاکستان اور جموں کشمیر کے تینوں حصوں میں شہرت سے، خاصی خائف اور حاسد تھی۔ لہٰذا وہ بدستور سازش میں متحرک تھی۔ ایوب خان کے ساتھ، براہ راست رسائی کی وجہ سے، وہ وزارت امور کشمیر، جس کی حیثیت انھوں نے ثانوی کردی تھی، اس کے وزیر اور سیکریٹری کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے، جس سے وہاں بھی مخالفت کا لاوہ پک رہا تھا۔ مسلم کانفرنس کی مراعات یافتہ قیادت اور وزارت امور کشمیر کا، شروع سے چولی دامن کا ساتھ تھا، وہ دونوں زخم خوردہ، متحد ہو کر سازش اور تخریب کاری میں مصروف تھے۔ اسی دوران میرپور میں، منگلا ڈیم کی تعمیر سے متاثرین کے مسائل اور آبادکاری کے مسئلہ نے سر اٹھایا تھا۔ ایوب خان منگلا ڈیم سے متعلقہ امور سے متعلق تین بار اعلیٰ سطح کے اجلاس منعقد کر چکے تھے۔ اپریل ۱۹۶۴ء میں، ایوب خان نے میرپور کالج کی بلڈنگ میں اجلاس رکھا، ابھی طلبا کی کلاسیں کالج میں منتقل نہ ہوئی تھیں۔ خواجہ غفور چیف انجینئر تھے۔ وہ انتظامی اور آبادی کاری امور سے وابستہ تھے، غلام فاروق، چیئرمین واپڈا تھے، ایوب خان کے ساتھ عبدالمنعم خان، گورنر مشرقی پاکستان بھی تھے۔ میرپور کی متاثرہ اراضی بہت زرخیز تھی، جس میں، سال میں دو فصلیں پیدا ہوتیں، اس میں باغات اور پھلدار پودوں کے علاوہ، ہر قسم کی سبزیاں پیدا ہوتیں، جن میں میرپور اور ڈڈیال کے لوگ، خود کفیل تھے۔ زمین بہت مہنگی تھی۔ معاوضہ کے بازاری شرح کے تحت نرخ، زیادہ تھے جب کہ واپڈا، آزاد کشمیر کو پاکستان کا، مفتوحہ علاقہ سمجھ کر، سستی قیمت پر اراضی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ انگریز دور حکومت میں، مہاراجہ نے منگلا ڈیم کی تعمیر کی اجازت دینے سے، انکار کر دیا تھا۔ بریفنگ کی دوران، چیف انجینئر خواجہ غفور نے شکایت کی کہ معاوضہ کے نرخ زیادہ تھے، جبکہ گلاب سنگھ مہاراجہ نے تمام ریاست، پچھتر لاکھ روپیہ میں خرید کی تھی۔ اس پر ایوب خان ہنسا، مگر یہ طعنہ خورشید کا خون گرما گیا، جب اس کے ساتھ ہی خواجہ غفور نے کہا، کہ بنجر زمین کی، بھاری قیمت مقرر کی جا رہی تھی، تو خورشید نے خواجہ غفور کو ڈانٹ دیا، کہ وہ جھوٹ بول کر صدر ایوب کو، غلط ترغیب مت دے، جبکہ میرپور کی بہترین زرعی اور دو دو فصلیں دینے والی، سبزیاں پیدا کرنے والی اور باغات کی زمین حاصل کی جا رہی تھی، جس کا معاوضہ برائے نام اور مارکیٹ کی شرح سے، کم مقرر کیا جا رہا تھا، اس پر غفور، تو جواب نہ دے سکا، مگر ایوب خان نے تاؤ میں کہا ”دیکھیے پاکستان، کسی جگہ بھی بلیک میل نہیں ہوگا“۔ اسی تلخ ماحول میں، بریفنگ ختم ہوگئی۔

خورشید کا ایوب خان کے ساتھ سفر کرنے سے انکار

اس بریفنگ کی اطلاع ہم کو بھی ملی، بلکہ میرپور شہر میں پھیل گئی۔ اسی شام واپڈا نے ایوب خان کے اعزاز میں، منگلا ریسٹ ہاؤس کے لان میں استقبالیہ میں چائے رکھی تھی، میرپور شہر سے صرف، یوسف صراف اور مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ خورشید کینال ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے، ہم ان سے ملنے گئے وہ سخت غصہ میں تھے، ہم نے ان کی دلجوئی کی کوشش کی، نگران کو شکایت تھی، کہ میرپور کے لوگوں کے ساتھ حق تلفی اور زیادتی ہو رہی تھی۔ انھوں نے بتایا، کہ وہ میرپور کے عوام کے حقوق کا، آخری دم تک تحفظ کریں گے۔ استقبالیہ میں مہمان خصوصی کے لئے، بڑے میز پر ایوب خان کے دائیں خورشید صاحب اور بائیں، گورنر منعم کی کرسی رکھی گئی تھی، ساتھ ہی دوسری میز پر یوسف صراف اور میری نشست مختص تھی۔ ہم پہلے پہنچے، پانچ منٹ بعد خورشید آئے اور مخصوص کرسی کی بجائے ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر ایوب خان اور گورنر منعم آئے۔ ایوب خان نے خورشید کو آواز دے کر بتایا، کہ ان کی سیٹ بھی، وہاں بڑے میز پر تھی، مگر خورشید نہیں آئے۔ صرف اتنا کہا کہ شکریہ، میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ چائے کے بعد، ایوب خان ہماری میز پر آئے، مصافحہ کیا اور خورشید سے مخاطب ہو کر کہا، آپ نے ہمارے ساتھ، ہیلی کاپٹر پر واپس چلنا ہے۔ خورشید نے کہا، آپ کا شکریہ، میں اپنی گاڑی میں سفر کروں گا۔ مجھے اس وقت محمد علی جناح کی خودداری یاد آ گئی۔ خورشید نے خودداری کا ثبوت دیا، صدارت کی قربانی پر۔ صدارت تو ایک دن ختم ہونی ہی تھی مگر

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

شیخ محمد عبداللہ اور خورشید حسن خورشید

پنڈت نہرو کی ایما پر، شیخ عبداللہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے دورے پر تیار ہوئے۔ ہندوستان پاکستان کے تعلقات، جو مئی ۱۹۶۳ء میں، سورن سنگھ بھٹو، دوطرفہ مذاکرات کی ناکامی سے، سرد مہری کا شکار تھے ان میں یکلخت گرم جوشی پیدا ہو گئی، بالخصوص آزاد کشمیر کے دورہ میں، مظفرآباد، میرپور اور کوٹلی میں پرانے سیاسی اور تعلق دار شخصیات کے نام شیخ صاحب کی طرف سے، ان سے ملاقات کے لئے، دعوت نامے جاری کیے گئے، جن میں ڈڈیال سے، مولوی عبداللہ سیاکھوی اور ملک فیض عالم خان، میرے نانا جان کے نام بھی شامل تھے۔ آزاد کشمیر میں، مسئلہ کشمیر حل ہونے اور ریاست کے دونوں حصوں کے درمیان، تمام راستے کھل جانے، تجارت اور آمد و رفت بحال ہونے کی، خوب افواہ چلی، لوگوں کے چہرے خوشی میں کھل اٹھے۔ شیخ صاحب نے اپنے دیرینہ ساتھی، راجہ اکبر خان کے بیٹے خالد اکبر کو راولپنڈی، میں بلوا لیا تھا۔ دلی سے ۲۵ رمئی ۱۹۶۴ء کو راولپنڈی ہوائی سفر سے پہنچنا طے ہوا۔ ان کے استقبال میں، دیگر کے علاوہ شہریوں کا استقبالیہ، جلسہ عام سے خطاب، ایوب خان سے مذاکرات اور ۲۷ رمئی مظفرآباد

اور ۲۹ کو میر پور آنا شامل تھا۔ بریگیڈیئر حبیب الرحمن، انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) میں دوسری جنگ عظیم کے دوران، جاپان میں، ڈپٹی کمانڈر انچیف تھے، آزاد کشمیر ریگولر فورس کے، چیف آف سٹاف تھے۔ ان کا تعلق پنجیروی گاؤں، بھمبر کے جب راجپوت، فوجی خاندان سے تھا۔ پنڈت نہرو کی، تاحیات وزارت کی پیشکش، ٹھکرا کر تحریک آزادی میں شامل ہوئے تھے، بھمبر شہر آزاد کروانے کا سہرہ ان کے سر تھا۔ ان دنوں وزارت امور کشمیر میں ڈپٹی سیکریٹری تھے، میرا ان سے تعلق تھا۔ آزاد کشمیر کی اعلیٰ سیاسی قیادت میں، میرا نام سرفہرست تھا۔ میں تمام تقریبات میں مدعو تھا۔ عبدالخالق انصاری، شیخ صاحب کے بڑے پیروکار تھے۔ ان کے استقبال میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ انصاری صاحب نے دعوت ناموں اور جلوس لے جانے کے لئے دو بسوں کی فرمائش کی۔ حاجی سلیم، سعید بس سروس سے دو بسیں اور پچیس دعوت نامے ان کے سپرد کیے، ان دنوں لاؤڈ سپیکر پر پابندی تھی، اس لئے ڈپٹی کمشنر راولپنڈی سے خصوصی اجازت، استعمال برائے لاؤڈ سپیکر لا کر دی، مگر انصاری صاحب سے غلطی یہ ہوئی، کہ وہ صدر ایوب کی سرکاری رہائش گاہ کے سامنے نعرہ بازی کر رہے تھے، جس پر سیکیورٹی پولیس نے انصاری صاحب اور دیگر ساتھیوں کو گرفتار کر کے، تھانہ وارث خان میں پہنچا دیا اور دوسرے دن انہیں رہا کیا گیا۔ شیخ عبداللہ کے چارٹرڈ ہوائی جہاز نے، چکلالہ ہوائی اڈہ پر لینڈ کیا۔ بہت پرہجوم استقبال ہوا، ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ، چوہدری غلام عباس خان، میرواعظ محمد یوسف شاہ ان مخصوص لوگوں میں شامل تھے۔ شیخ صاحب کے وفد میں، مرزا افضل بیگ، محمد سعید مسعودی، مبارک شاہ، باغسر بھمبر کے کامریڈ محمد شفیع اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ وغیرہ شامل تھے۔ شیخ صاحب نے استقبالیہ میں شمولیت کے بعد، ایوب خان سے مذاکرات کیے۔ چوہدری غلام عباس خان، میرواعظ محمد یوسف شاہ کی رہائش گاہوں پر، ان سے الگ الگ ملاقات کی اور ظہر کے بعد، لیاقت باغ کے وسیع میدان میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ جلسہ میں ایک لاکھ کے قریب لوگ موجود تھے۔ دوسرے روز ۲۷ مئی کو شیخ صاحب کا قافلہ مظفر آباد کے لئے روانہ ہوا، مظفر آباد پہنچنے کے بعد شیخ صاحب کو پنڈت نہرو کی رحلت کی اطلاع پہنچی، چنانچہ خورشید سٹیڈیم میں جم غفیر، جو شیخ صاحب سے جموں کشمیر کے مسئلہ کے حل کی خبر سننے کے لئے منتظر تھا۔ وہ صرف نہرو کی موت کی خبر سن کر مایوسی میں منتشر ہو گیا، شیخ صاحب آزاد کشمیر کا دورہ کیے بغیر واپس لوٹ گئے۔ مسلم کانفرنس نے، حفیظ جالندھری کو، خورشید کے خلاف استعمال کر کے، ایوب خان کے کانوں میں یہ بات پہنچائی، کہ خورشید نے کشمیری زبان میں خودمختار کشمیر کے حق میں اور الحاق پاکستان کے خلاف سرگوشی کی تھی، حبیب اللہ خان وزیر امور کشمیر اور امان اللہ نیازی، جوائنٹ سیکریٹری نے، جن کو خان عبدالقیوم کی حمایت بھی حاصل تھی، خورشید سے استعفیٰ دلوا کر عبدالحمید خان، چیف جسٹس کو عبوری صدر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ امان اللہ خان نیازی کے بھتیجے جو میرے دوست، رشید کا دوست تھا، اس سے اس فیصلہ کا علم ہوا۔ خورشید پونچھ ہاؤس میں سٹیٹ کونسل سے خطاب کر رہے تھے، میں نے ان کو آگاہ کیا، کہ ان سے استعفیٰ لینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا، تو انہوں نے میرے ساتھ اتفاق نہ کیا، مگر دو ہی دن بعد، وہ مستعفی ہو گئے۔

بے وفا ممبران سٹیٹ کونسل

خورشید سٹیٹ کونسل سے، پونچھ ہاؤس راولپنڈی میں خطاب کر رہے تھے، جب میں نے وزیر امور کشمیر حبیب اللہ اور جوائنٹ سیکریٹری کی ان سے استعفیٰ کی، ایوب خان سے سازش کی اطلاع دی تھی، خورشید کے حمایتی ممبران سٹیٹ کونسل نے، ان پر اعتماد کی قرارداد منظور کر کے، ایوب خان کو ارسال کی۔ خورشید نے استعفیٰ بھی منتخب سٹیٹ کونسل کے نام دیا تھا۔ ایک ہفتہ بعد، خورشید نے راولپنڈی پیرس ہوٹل میں، لبریشن لیگ کی مجلس عملہ کا اجلاس طلب کیا۔ سٹیٹ کونسل کے جی ایم لون اور میجر فیروز دین کے سوا، دس ممبران مجلس عاملہ کے رکن تھے، جن میں سے کشمیر ویلی کے خواجہ منظور الحق ڈار اور میر پور کے راجہ اسلم اور چوہدری حسین علی شامل ہوئے، جب کہ دیگر حسن علی گردیزی اور میں، شامل ہوئے باقی تمام اقتدار پرست، غائب تھے۔ خورشید کو پہلی دفعہ میں نے سخت پریشان پایا، مایوسی کی کیفیت میں وہ کراچی میں اپنی رہائش پر چلے گئے۔ دوسرے روز مظفر آباد میں حمید خان نے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے، سٹیٹ کونسل کا اجلاس طلب کیا ہوا تھا۔ وہاں راجہ اسلم اور چوہدری حسین علی، مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اجلاس منعقد کیے بغیر ہی، قرارداد پر دستخط حاصل کیے گئے تھے۔ اس وقت تک صرف سات ممبران نے دستخط کیے تھے، رات کو چوہدری صحبت علی نے، قرارداد راجہ اسلم کے سپرد کی، دوسرے ہی دن وہ قرارداد لے کر ہم میر پور واپس آ گئے۔ اس طرح حمید خان کے حق میں، اعتماد کی قرارداد پاس نہ ہو سکی، بلکہ ایک ماہ بعد، بی ڈی ممبران سے اعتماد کا ووٹ، حاصل کیا گیا تھا۔

خورشید دولائی میں قید

سال ۱۹۶۵ء پاکستان کی تاریخ میں، بہت اہمیت کا حامل ہے، اس سال صدر، حکومت پاکستان کے عہدہ کا، دستور ۱۹۶۲ء کے تحت الیکشن ہوا، ایوب خان امیدوار تھے، جبکہ وہ پہلے سے ہی اس عہدہ پر قابض تھے، تمام سیاسی جماعتوں نے اتحاد اور اتفاق سے، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو، ایوب خان کے مقابلہ میں امیدوار نامزد کیا۔ مادر ملت نے خورشید کو الیکشن انچارج مقرر کیا۔ مشرقی پاکستان میں مادر ملت کو، اکثریت میں ووٹ حاصل ہوئے، جبکہ مغربی پاکستان میں نوکر شاہی اور محکمہ خفیہ نے، ایوب خان کو کامیاب کروا دیا۔ اس کے بعد کشمیر میں، آپریشن جبرالٹر کے نام سے، گوریلا مہم شروع کی گئی، انقلابی کونسل کے قیام کا اعلان ہوا، خورشید کراچی میں، مادر ملت کے ساتھ فلیگ سٹاف ہاؤس میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے پریس میں بیان دیا، کہ کشمیر کی دونوں طرف کے سیاسی قیادت کو، اعتماد میں لیے بغیر، جو مہم شروع کی گئی ہے، اس کی کامیابی کے امکانات کم تھے۔ ایوب خان اس بیان سے سخت ناراض ہوئے، صدارتی الیکشن کی وجہ سے پہلے سے ناراض تھے، لہذا سازش کے تحت خورشید کو راولپنڈی بلوایا گیا، عشاء کے بعد میر واعظ کے گھر سے، آزاد کشمیر پولیس کے اے آئی جی چوہدری عزیز نے، ان کو پولیس نفری

کی مدد سے، زبردستی اٹھوا کر، پلندری جیل میں بند کر دیا۔ راجہ عبدالخالق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے، وارنٹ گرفتاری حاصل کیا گیا، اور دو دن بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مظفرآباد، اے آر سلیم سے حکم گرفتاری حاصل کر کے، دولائی کی اندھیری جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ خورشید نے اپنی گرفتاری کے خلاف، حبس بے جا کی درخواست ہائی کورٹ میں دائر کی۔ اس پر حکومت نے امن عامہ کا قانون نافذ کر کے، اس کے تحت گرفتاری ظاہر کی۔ خورشید نے، اس قانون کے خلاف بھی، درخواست دی، ان کی طرف سے، ایم اے فاروق ایڈووکیٹ، جب کہ حکومت کی طرف سے مسلم کانفرنس وکلاء، شیخ عبدالحئی اور خواجہ محمد شفیع، پیروی کرتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو، سردار بہادر خان، ایس ایم ظفر سے ملاقات

خورشید کو آخر مئی میں گرفتار کیا گیا تھا، اسی دوران شیخ خورشید، وزیر قانون کی وفات پر، ایس ایم ظفر کو، ایوب خان نے وزیر قانون مقرر کیا تھا۔ ظفر صاحب سے میں نے ملاقات کر کے خورشید کی، دولائی کیمپ جیل سے رہائی کے لئے، کوشش شروع کر دی، مگر دلچسپ اور سبق آموز بات یہ تھی، کہ آزاد کشمیر میں کسی سیاستدان نے خورشید صاحب کی خلاف قانون گرفتاری اور حبس بے جا کے خلاف، آواز بلند نہ کی۔ لبریشن لیگ کے دور اقتدار کے دوران ان کے حواری اور مفاد پرست طبقہ، اب حمید خان کا حواری بن بیٹھا تھا۔ پاکستان میں حزب اختلاف کے تمام سیاستدان، بھی لاتعلق رہے۔ صرف مادر ملت نے، ان کی گرفتاری کی مذمت کی اور رہائی کا مطالبہ کیا۔ آزاد کشمیر میں راجہ اسلم اور چوہدری حسین علی میرے ہمراہ، ایس ایم ظفر کے پاس ایک دفعہ گئے، ایس ایم ظفر بہت ذہین اور معاملہ فہم تھے۔ بہت محتاط حکمت عملی کے تحت، انہوں نے ان سے ملاقات، راز میں رکھتے ہوئے، اسمبلی اجلاس جو ان دنوں جاری تھا، کے دوران، لابی میں مرکزی وزراء خواجہ شہاب الدین، جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور ذوالفقار علی بھٹو سے ملنے، اور خورشید کی رہائی کا معاملہ کابینہ اجلاس میں، پیش کرنے کی استدعا کرنے کی، تجویز دی۔ دوسری صبح میں اسمبلی ہال، جو ان دنوں عارضی طور پر، لال کرتی میں تھا، وہاں گیا تو، اتفاق سے سردار بہادر خان، ایوب خان کے بھائی اور کونسل مسلم لیگ کے لیڈر اور پارلیمنٹ میں، قائد حزب اختلاف کو، لابی میں اکیلے کافی پیتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور ان سے، خورشید صاحب کی گرفتاری سے رہائی میں، معاونت کی استدعا کی۔ انہوں نے شفقت سے، میرے لئے کافی اور سینڈوچ منگوائے اور ساتھ ہی ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک، خورشید صاحب کی قائداعظم کے ساتھ بطور سیکریٹری، معاونت کے دنوں کے چند اہم واقعات کا ذکر کر کے کہا، کہ قائداعظم سے ملاقات، صرف خورشید کی مہربانی کی محتاج ہوتی تھی۔ بات کرتے ہوئے، ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

انہوں نے کہا کہ، وہ اسی دن پارلیمنٹ میں معاملہ اٹھائیں گے، اسی دوران بھٹو اور مصطفیٰ کھر، لابی میں داخل ہوئے، سردار خان بہادر کا شکریہ ادا کیا اور بھٹو صاحب سے ملاقات کے لئے ان سے اجازت لی۔ ۱۹۶۵ء

میں، میں بہت سمارٹ تھا اور شروع کالج کے زمانہ سے، مجھ میں خود اعتمادی بہت تھی، جو میری بڑی مخالفت اور دشمنی یا رقابت کا باعث تھی۔ بھٹو صاحب اور غلام مصطفیٰ کھر میں دوستی تھی، دونوں سمارٹ اور خوبصورت تھے۔ میں نے تعارف کروایا، تو بھٹو صاحب نے کرسی پیش کرتے ہوئے، کافی اور سینڈوچ کا مزید آرڈر دیا۔ بھٹو صاحب نے لنکنز ان، لندن اور کراچی میں ایک ہی چیمبر میں وکالت شروع کرنے تک، خورشید صاحب سے، ذاتی دوستی کے مراسم کا ذکر کیا اور خورشید صاحب کی گرفتاری پر، افسوس کرتے ہوئے تجویز کیا، کہ میں ایس ایم ظفر اور خواجہ شہاب الدین سے، ضرور ملوں اور ان کو تجویز دوں، کہ وہ کابینہ کے اجلاس میں، ان کی (بھٹو کی) تجویز کی حمایت کریں۔ بھٹو صاحب نے بتایا کہ شروع میں، ایوب خان خورشید کا، بہت مداح تھا، مگر بعد میں، اچانک خلاف ہو گیا اور خورشید جب اپنے نام کے ساتھ، صدر جموں کشمیر لکھتا، تو ایوب خان کہتا "اس ملک میں صرف ایک ہی صدر تھا، اور وہ ایوب خان تھا"۔ بھٹو صاحب نے، خوشگوار انداز میں لطیفے بھی سنائے، چنانچہ ان ملاقاتوں کی رپورٹ، میں نے ظفر صاحب کو دے دی۔ وہ بہت مطمئن اور خوش ہوئے۔ ان ملاقاتوں کے ایک ہفتہ بعد، خورشید صاحب کے خلاف، مقدمہ واپس کر کے، معذرت کے ساتھ پورے احترام سے ان کو گھر پہنچایا گیا، ان کو حکومتی سطح پر میری کاوش بتائی گئی۔ میں ابھی ان سے ملا ہی نہ تھا، کہ انہوں نے لاہور پہنچتے ہی، مجھے شکریہ کا خط ارسال کیا، جس میں ایس ایم ظفر اور میری، ہم دونوں کا، ان کی رہائی میں، معاونت پر شکریہ ادا کیا گیا۔

لبریشن لیگ کا احیاء ۱۹۶۷ء

حمید خان کی حکومت سے آزاد کشمیر کے عوام میں، بہت مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ خورشید صاحب نے، جو تعمیر و ترقی اور اصلاحات شروع کی تھیں وہ رک گئیں، عوام کو حاصل شدہ مراعات ختم ہو گئیں، انتظامیہ نے حکمرانی میں سبقت حاصل کر لی، جس سے لوگوں میں، خورشید کی چاہت نے انگڑائی لی اور لبریشن لیگ کے احیاء کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ وہ دوسری سطح کے کارکن اور ممبران سٹیٹ کونسل، جو آزمائش میں خورشید کا ساتھ چھوڑ گئے تھے، وہ پھر خورشید سے ملنے لاہور گئے اور لبریشن لیگ کو متحرک کرنے پر زور دیا۔ پاکستان میں ۱۹۶۵ء کی کشمیر مہم ناکام ہونے اور اعلان تاشقند کے سبب، ایوب خان اور بھٹو میں اختلافات پر بھٹو، حکومت کے خلاف، محاذ قائم کیے ہوئے تھے۔ جنگ کی وجہ سے راجوری اور مینڈھر پونچھ سے آئے ہوئے، ایک لاکھ مہاجر، میر پور کے گلی کوچوں میں غیر آباد، حکومت کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ اس کیفیت میں، خورشید صاحب نے مجھے، لاہور بلا کر لبریشن لیگ منظم کرنے کا فیصلہ کیا اور میٹنگ میں، راجہ اسلم، چوہدری حسین علی اور چوہدری صحبت علی سے مشاورت پر، مجھے چیف آرگنائزر نامزد کیا گیا۔ ان دنوں میری وکالت عروج پر تھی، میں نے ٹالنے کی کوشش کی، مگر خورشید صاحب نے، جماعت بحال کرنے کو مجھ سے مشروط کر دیا۔ میں نے آزاد کشمیر کے تمام اضلاع میں، تنظیمیں بحال کر کے، خورشید صاحب کا بھمبر سے نیلم ویلی تک

دورہ کروایا، بڑے بڑے جلوسوں اور جلسوں میں ان کا استقبال کیا گیا، جس کے بعد مرکزی تنظیم، جو بدستور سابق تھی، کے لئے کنونشن رکھا۔

میرپور کنونشن ۱۹۶۷ء

کم و بیش آٹھ ماہ میں، آزاد کشمیر اور پشاور، کراچی، کوئٹہ تک پاکستان میں تنظیم مکمل کر کے ستمبر کے آخر میں، میرپور میں مرکزی کنونشن منعقد کیا گیا۔ دو روزہ کنونشن میں ممبران جنرل کونسل اور تحصیل و اضلاع کے عہدیداروں کے علاوہ، دو ہزار مندوبین نے شرکت کی، سابق مرکزی عہدیدار بھی شامل ہوئے، جن میں ممبران سٹیٹ کونسل بھی شامل تھے۔ ہم خورشید صاحب کو، کاروں کے بڑے جلوس میں، منگلا سے بینک سکوائر تا گی پنڈال تک لائے۔ میرپور میں یہ پہلی روایت تھی، اس وقت تک بینکوں کی عمارتیں تعمیر نہ ہوئی تھیں۔ پنڈال رنگ برنگے، بڑے بڑے بینروں اور جماعت کے پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ پاکستان پریس، لاہور اور راولپنڈی سے، خصوصی طور پر مدعو تھا۔ ابتدائی اجلاس میں، میں نے تنظیمی رپورٹ پیش کی، کیونکہ سیکریٹری جنرل نے، سابقہ کارگذاری کی رپورٹ مرتب ہی نہ کی تھی اور حقیقت یہ تھی، کہ اگست ۱۹۶۴ء سے اوائل ۱۹۶۷ء تک لبریشن لیگ غیر فعال رہی تھی، خورشید کے، صدر حکومت کے عہدہ سے، مستعفی ہونے کے بعد، لبریشن لیگ کے کارکن، جماعت سے لاتعلق رہے۔

دوسرے تنظیمی اجلاس میں ہنگامہ

دوسرے اجلاس میں، مرکزی عہدیداران کا انتخاب ہونا تھا، پنڈال میرے مکان کے سامنے تھا، میں خود جملہ انتظامات میں مصروف تھا میری رہائش گاہ پر اعلیٰ قیادت نے مستقبل کے لئے، مرکزی عہدیداروں کے ناموں کا فیصلہ کیا، بالخصوص جنرل سیکریٹری کے لئے حسب سابق، رفیعہ ذوالقرنین کا فیصلہ ہوا، اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اجلاس میں، میں سٹیج سیکریٹری تھا۔ صدر، سینئر نائب صدر اور نائب صدر کا انتخاب، بلا مقابلہ ہو گیا، جب سیکریٹری جنرل کی تجویز طلب ہوئی، تو پنڈال میں یونس سرکھوی (سابق چیف جسٹس)، ڈڈیال سے سینتھی محمد الیاس، محمد شریف لون، کوٹلی سے منظور احمد وکیل، مرزا نثار وکیل اسی طرح پونچھ اور پاکستان سے مندوبین نے، میرا نام پیش کیا، جب کہ دوسرا نام، رفیعہ ذوالقرنین صاحب کا تجویز ہوا۔ ذوالقرنین کالج فیلو، پڑوسی اور دوست تھے، مجھے بہت محترم تھے۔ میں کھڑا ہوا اور ان کے حق میں اپنا نام واپس لینا ہی چاہتا تھا، میرے کھڑے ہوتے ہی، خورشید صاحب نے قدرے تحکمانہ لہجہ میں زور سے کہا ''ملک صاحب اپنا نام واپس لیں'' اس عمر میں، میں بہت انا پسند واقع ہوا تھا اور حکم اور دھمکی پر ڈٹ جاتا تھا، جو ٹھیک نہ تھا، مگر یہ میری کمزوری تھی۔ خورشید صاحب کے، ایسا کہنے پر میں نے، فوراً ارادہ بدل لیا اور مائیک پر اعلان کیا، کہ میرا نام واپس لینے کا اختیار، تجویز کنندگان کو ہی تھا، اس پر پنڈال میں، میرے حق میں نعرے بازی شروع ہو گئی، لوگ کھڑے ہو گئے۔ ذوالقرنین کھڑے ہوئے اور انہوں نے میرے حق میں، اپنا نام واپس لے لیا۔

اصولاً تو میں، بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا تھا، مگر خورشید صاحب کی ہدایت پر، سردار رحمت اللہ چیئرمین پارلیمانی بورڈ نے، سیکریٹری جنرل کا الیکشن منسوخ کرنے اور ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا اور خورشید صاحب نے، صدارتی تقریر شروع کر دی، مگر پنڈال میں، شور شرابہ اور میرے حق میں نعرہ بازی، ہوتی رہی۔

مسلم کانفرنس کی پیشکش اور دستور میں ترمیم

مسلم کانفرنس کے لیڈر، کنونشن کی تمام کارروائی، سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔ غازی الٰہی بخش، چوہدری غلام عباس خان کے معتمد خاص تھے، میرے سوا میرے خاندان کے لوگ شروع سے بدستور، مسلم کانفرنس میں تھے، رات کو اختلاف کی خبر، سارے آزاد کشمیر میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ صبح سویرے، غازی الٰہی بخش میرے گھر آئے اور حکمیہ انداز میں کہا، کہ فوراً تیار ہو جاؤ، تمہیں چوہدری غلام عباس خان نے راولپنڈی بلایا ہے اور تمہیں مسلم کانفرنس کا، مرکزی سیکریٹری جنرل بنانے کا، فیصلہ کیا ہے، تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نے ہنس کر، غازی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور راولپنڈی جانے سے معذرت کی، مگر وہ بضد تھے، ساتھ ہی وہ خورشید صاحب پر تنقید بھی کر رہے تھے۔ غازی صاحب کو میں بتا رہا تھا، کہ جس مسلم کانفرنس کی، آمرانہ اور وزارت امور کشمیر کی خوشامدانہ پالیسی کے خلاف، لبریشن لیگ بنائی تھی، اس جماعت کی صدارت بھی قبول نہ تھی۔ ہماری بحث جاری تھی، کہ راجہ اسلم آ گئے اور ناشتہ پر چلنے کو کہا، جہاں خورشید صاحب اور دیگر منتظر تھے۔ اس طرح غازی الٰہی بخش، جو کھونڈی لے کر راولپنڈی لے جانے کے لئے، بضد تھے، ان کو وقتی طور پر ٹالا۔ میری عدم موجودگی میں، چوہدری فرمان علی اور سلطان علی، جو سیالکوٹ سے تھے، انہوں نے گذشتہ رات کے اجلاس میں، تلخی کا الزام مجھ پر ڈال دیا۔ سردار رحمت اللہ اور چوہدری صحبت علی وغیرہ یک زبان ہو کر بولے، کہ آزاد کشمیر اور مہاجرین میں بڑے قبائل گجر، جاٹ، سدھن، کشمیری اور راجپوت تھے، جن سے میرا تعلق نہ تھا۔ میں غیر اکثریتی قبیلہ سے تھا۔ خورشید خاموش لاتعلق انداز میں، ساری گفتگو سن رہے تھے، جب سب نے، سیکریٹری جنرل کے عہدہ سے، نام واپس لینے کے لئے زور دیا، تو اس وقت غصہ اور قبیلائی طعنہ زنی سے، دماغ میں آمرانہ ذہنیت کے خلاف، اعلان جنگ کرتے ہوئے، میں صرف اتنا کہہ کر، کہ فیصلہ عوام پنڈال میں کریں گے اور بغیر ناشتہ، کے چلا آیا۔ میں گھر میں قائداعظم کے سیاسی اور جمہوری تربیت یافتہ، کے ایچ خورشید کے رویہ اور ماضی قریب میں اپنا، لبریشن لیگ کو منظم کر کے عظیم الشان کنونشن منعقد کرواتے پر، سوچ دبچار کر رہا تھا اور پنڈال میں میرے پہنچنے سے قبل ہی، دستور میں سیکریٹری جنرل کے عہدہ پر، صدر جماعت کی صوابدیدی تقرری کی، ترمیم کر دالی گئی۔ جب مندوبین نے انتخاب کا مطالبہ کیا، تو بتایا گیا کہ دستور میں، ترمیم کے ذریعہ سیکریٹری جنرل کا انتخاب ختم کر دیا گیا تھا۔ صدر جماعت خورشید صاحب نے، ایک سال کے لئے چوہدری صحبت علی کو سیکریٹری جنرل نامزد کر دیا۔ یہ مرحلہ سخت آزمائش کا تھا۔ میں نے، مسلم کانفرنس کی ہر قسم کی پیشکش، مسترد کر دی اور

حسب معمول لبریشن لیگ میں، بحیثیت چیف آرگنائزر متحرک رہا۔ ۱۹۶۸ء کے سالانہ اجلاس میں بلا مقابلہ، سیکریٹری جنرل منتخب ہوگیا، مگر خورشید صاحب کا اپنا، کسی بڑے اکثریتی قبیلہ سے تعلق نہ تھا، ان کی سیاسی حکمت عملی پر، افسوس ضرور ہوا۔

چین کے وزیرِ خارجہ کی پیشکش

خورشید کے مستعفی ہونے اور حمید خان کے عبوری صدر مقرر ہونے کے بعد، اکتوبر ۱۹۶۴ء میں چین کے وزیرِ خارجہ، لیوشاؤچی پاکستان کے دورہ پر آئے۔ ان دنوں ۱۹۶۲ء میں بھارت اور چین کے درمیان نیفا میں جنگ کی وجہ سے، دونوں ملکوں کے تعلقات بدستور کشیدہ تھے۔ چین کے وزیر نے، جموں کشمیر کی سیاسی قیادت سے، الگ ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ لبریشن لیگ کے ممبر سٹیٹ کونسل، راجہ محمد اسلم اور مجھے راولپنڈی بلایا گیا۔ مسلم کانفرنس کے سردار عبدالقیوم اور کشمیر سے پیر مقبول بلائے گئے۔ آخر میں سردار ابراہیم اور مجھے، ملاقات میں شامل نہ کیا گیا۔ تین گھنٹے کی ملاقات میں، بقول راجہ اسلم، چین کی طرف سے لیوشاؤچی اور بیگم لیوشاؤچی نے تجویز کیا کہ کشمیری قیادت، چین کو کشمیری نوجوان فراہم کرے، جن کو گوریلہ جنگ کی تربیت چین کے ماہرین دیں گے اور اسلحہ اور متعلقہ وسائل بھی چین مہیا کرے گا۔ میٹنگ میں مرحلہ وار حکمت عملی بھی تفصیل سے زیرِ بحث رہی۔ وفد میں کشمیری قیادت نے، چین کے راہنما سے کہا، کہ" یہ تجویز پاکستان کو دی جائے، کشمیری از خود اس میں فیصلہ نہیں کرسکتے"۔ جس پر چینی لیڈر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا،" کہ تحریک جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کی ہے للہذا یہ فیصلہ کشمیری قیادت نے کرنا ہے، اسی وجہ سے کشمیری قیادت سے الگ خصوصی ملاقات طے کی گئی تھی"۔ کشمیری قیادت کی طرف سے معذرت پر، میٹنگ ختم ہوگئی، البتہ چین پر جموں کشمیر کی قیادت کی طفیلی حیثیت، کھوکھلے نعروں اور اخباری بیانات کی حقیقت واضح ہوگئی۔ کاش یہ پیشکش ایک سال قبل، خورشید کو کی گئی ہوتی، تو حالات مختلف ہوتے۔

ذوالفقار علی بھٹو میرپور میں

اپریشن جبرالٹر کی مہم جوئی، جس کے خالق جنرل اختر ملک اور محرک و معاون ذوالفقار علی بھٹو وزیرِ خارجہ اور عزیز احمد سیکریٹری خارجہ تھے، کی ناکامی کے نتیجہ میں ۱۰ر جنوری ۱۹۶۶ء کو اعلان تاشقند ہوا، جس کی وجہ سے، اختلاف کرتے ہوئے وزارت سے الگ ہو کر بھٹو نے، ایوب خان کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ پاکستان بالخصوص پنجاب میں بھٹو صاحب کو خاصی پذیرائی حاصل ہو رہی تھی۔ محمد شریف ڈمیالوی، ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ان کے ذریعہ ہم نے، بھٹو صاحب کو میرپور آنے کی دعوت دی، وہ ممتاز بھٹو اور مصطفٰے کھر کو بھی ساتھ لائے۔ عصر کے وقت، ہوٹل کلیال میں ان کی آمد پر کالج کے طلباء اور ۱۹۶۵ء کے متاثرین، مہاجرین ہوٹل کے باہر جمع ہوگئے اور بھٹو کے حق میں نعرہ بازی شروع کردی۔ بھٹو فوراً باہر آگئے اور دھواں دار تقریر شروع کردی۔ میری ان سے،

خورشید صاحب کی دولائی جیل سے رہائی سے متعلق، پارلیمنٹ لابی میں ملاقات ہو چکی تھی اور میرپور میں دعوت بھی ہماری طرف سے تھی۔ ہوٹل میں، عشائیہ میں میرپور کے تمام سیاسی قائدین، وکلاء، اور دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر میں ان کے دائیں اور شریف ڈمیالوی بائیں نشست پر بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد، میں نے استقبالیہ خطاب میں، ان کی میرپور آمد اور مسئلہ کشمیر کو، اقوام متحدہ میں جرأت سے پیش کرنے اور اعلان تاشقند میں ایوب خان کی پسپائی کو، عوام میں منظرعام پر لانے کی، تعریف کی۔ ان دنوں بھٹو کی سیاست کا محور اور مرکز ہی، مسئلہ کشمیر تھا۔ یہ محض اتفاق ہے یا طے شدہ حکمت عملی، کہ پاکستان کے سیاستدان اور فوجی حکمران، شروع سے ہی حصول اقتدار اور طوالت واستحکام اقتدار کے لئے، مسئلہ کشمیر کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے مسئلہ کشمیر کو ایوب خان کے خلاف، خوب استعمال کیا۔ انھوں نے تقریر کا آغاز ہی جموں کشمیر کے مسئلہ سے کیا اور اس کی ذمہ داری شیخ عبداللہ پر ڈال دی۔ انھوں نے شیخ صاحب پر تنقید شروع کی، تو عبدالخالق انصاری اور صوفی زمان نے شیخ عبداللہ زندہ باد، خودمختار کشمیر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان کے بالمقابل، راجہ نجیب اور کیپٹن سرفراز نے کشمیر بنے گا پاکستان، کا نعرہ لگایا۔ ہال میں شور پڑ گیا۔ بھٹو صاحب، بدستور کھڑے رہے اور مجھے بٹھا دیا۔ کھر اور ممتاز بھٹو نے لپک کر، انصاری صاحب اور صوفی زمان کو بغل میں پستول رکھ کر، ہال سے باہر نکال دیا۔ بھٹو نے ایک گھنٹہ تقریر کی اور آخر میں، ہمارا شکریہ ادا کیا اور اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ یہ میرپور میں، ان کی پہلی آمد تھی۔

اتحاد ثلاثہ ۱۹۶۸ء

نیرنگی سیاست کا اعجاز یا مرور زمانہ کے اثرات کا کمال تھا، کہ ایوب خان کے مقرر کردہ حمید خان کی، حکمرانی سے دل برداشتہ سردار صاحبان نے، خورشید سے رابطہ قائم کر کے سیاسی اتحاد تجویز کیا۔ خورشید نے، وزارت امور کشمیر کی انتظامی اجارہ داری ختم کر کے، جو جمہوریت اور جمہوری ادارے قائم کیے تھے اور تحریک آزادی کو، اعلان ۲۴ و ۴ ر اکتوبر کی پالیسی، کے مطابق چلانے کی خاطر، آزاد حکومت کو، تمام ریاست کی جائز حکومت تسلیم کروا کر عالمی اداروں اور ممالک میں مسئلہ کشمیر پیش کرنے کی، پالیسی اختیار کرنے کا، جو اعادہ کیا تھا، ماضی میں مسلم کانفرنس کی قیادت کی، مخالفت کی وجہ سے ہی، اس پروگرام اور جمہوریت کی بساط، لپیٹ دی گئی تھی اور حمید خان کو آزاد حکومت کا صدر، مقرر کیا گیا تھا۔ اس کی حکومت ختم کرنے اور جمہوریت کی بحالی کے لئے، مسلم کانفرنس کے سردار عبدالقیوم، آزاد مسلم کانفرنس کے، سردار ابراہیم اور لبریشن لیگ کے صدر، کے ایچ خورشید نے، تین جماعتی اتحاد قائم کر کے، ۵ راگست ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی سلور گرل ریسٹورنٹ میں، مشترکہ چار نکاتی اعلامیہ جاری کیا، جس کی توثیق، تینوں جماعتوں کی مجلس عاملہ کے ممبران نے، راولپنڈی پریس کلب کے احاطہ میں، منعقدہ مشترکہ اجلاس میں ۸ راگست کو ذیل امور پر مشتمل کی:-

۱۔ کہ ریاست جموں کشمیر نا قابل تقسیم وحدت وسیاسی اکائی ہے۔

۲۔ کہ جموں کشمیر کے اقتدار اعلیٰ کے مالک ریاست کے عوام ہیں اور وہ ہی اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں جس کے مغائر کوئی فیصلہ قبول نہ ہوگا۔

۳۔ کہ ریاست کے عوام کی قربانی کے باعث، قائم ہونے والی حکومت کے ادارے، جمہوری شکل میں ترتیب دیئے جائیں اور استصواب رائے ہونے تک آزاد حکومت کو، تمام ریاست کی جائز اور مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کی، جانشین مجاز حکومت تسلیم کیا جائے۔

۴۔ اور یہ کہ اگر شیخ محمد عبداللہ اور مولوی محمد فاروق اور دیگر کشمیری لیڈر، ریاست پر ہندوستانی تسلط کے خلاف آزادی اور حق خود ارادیت کے حق میں تحریک شروع کریں تو حد متارکہ کے اس طرف کی جماعتیں ان کی مدد کرنے کی کوشش کریں گی۔

اس اتحاد کے پس منظر میں، ایک تو سٹیٹ کونسل کے الیکشن میں راولاکوٹ کے غازی امیر محمد، خان حمید خان کے حمایت یافتہ امیدوار سے، سردار ابراہیم خان اور سردار عبدالقیوم، دونوں کی شکست تھی دوسرا، چیئرمین کونسل یعنی صدر حکومت کے الیکشن میں بھی حمید خان کے مقابلہ میں، سردار عبدالقیوم کی شکست تھی۔ دلچسپ پہلو یہ تھا، کہ مسلم کانفرنس کے رکن سردار فتح محمد کریلوی نے بھی، اپنا ووٹ مسلم کانفرنس کے امیدوار سردار عبدالقیوم خان کے مخالف امیدوار، عبدالحمید خان کے حق میں دیا تھا۔ اتحاد ثلاثہ میں آزاد حکومت کو، ریاست کی مجاز حکومت تسلیم کروانے کی تجویز پیش کرنے پر، جس مسلم کانفرنس کی قیادت نے خورشید پر پاکستان کے خلاف ہونے کا الزام لگایا تھا، اسی قیادت نے یہ تجویز تسلیم کرلی تھی مگر بعد میں اس کی افادیت کا احساس، لاہور میں، اسلامی ممالک کی کانفرنس جو ۱۹۷۴ء میں منعقد ہوئی تھی، میں ہوا۔ اس میں مسئلہ فلسطین شامل تھا، یاسر عرفات شریک تھے، مگر پاکستان کی طلب کردہ کانفرنس میں، آزاد کشمیر حکومت کا منتخب صدر سردار عبدالقیوم مدعو نہ تھا اور نہ ہی ایجنڈا میں مسئلہ کشمیر شامل تھا۔ پاکستان اور بھٹو صاحب کے کشمیریوں کی سیاسی، سفارتی اور اخلاقی حمایت کے تمام دعوے جھوٹ، فریب اور نقش بر آب ثابت ہوئے۔ آزاد حکومت، کی بطور ریاست کی مجاز حکومت، تسلیم نہ ہونے کا احساس، شدت اختیار کر گیا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

قانون ساز اسمبلی کی تحریک

جموں کشمیر میں ڈوگرہ آمریت کے خلاف اور انسانی حقوق کے حصول کے لئے ۱۹۳۱ء میں، شروع کی گئی تحریک کے نتیجہ میں، ریاست میں ۱۹۳۴ء میں قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں، ریاست دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ میں، ۱۹۵۰ء میں دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی، جس کے برعکس آزاد کشمیر میں، ۱۹۵۰ء میں رولز آف بزنس

کے تحت، مسلم کانفرنس کی تجویز پر، وزارت امور کشمیر حکومت پاکستان کو، صدر حکومت اور کابینہ کی نامزدگی کا اختیار تفویض کیا گیا۔ بحیثیت طالب علم لیڈر، راولپنڈی میں ہم نے، اسمبلی کے قیام کا مطالبہ شروع کیا تھا۔ پیپلز کانفرنس کا صدر منتخب ہونے پر، آزاد حکومت کو ساری ریاست کی جائز حکومت تسلیم کروانے اور دستور ساز منتخب اسمبلی کے قیام کی جدوجہد شروع کر رکھی تھی، مگر مسلم کانفرنس کی اجارہ داری، اس میں بڑی رکاوٹ تھی۔ خورشید صاحب نے قانون ساز سٹیٹ کونسل اور صدر کے انتخاب کا قانون نافذ کر کے، یہ اجارہ داری ختم کر دی تھی۔ ایوب خان کے بعد، جنرل یحییٰ خان کا مارشل لاء نافذ تھا۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کے چھ نکات جاری تھے، ہم نے لبریشن لیگ کے میر پور میں منعقدہ اجلاس میں فیصلہ کے بعد، قانون ساز اسمبلی کے قیام کی تحریک شروع کر دی۔ میر پور، مظفر آباد اور راولپنڈی میں جلسوں کے بعد، پشاور چوک یادگار میں رات گیارہ بجے، جلسہ ختم ہوا ہی تھا، کہ انسپکٹر جنرل پولیس نے اطلاع دی، کہ دوسری صبح دس بجے، جنرل یحییٰ خان نے ہمیں جنرل ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں طلب کیا تھا۔ خورشید، حسن شاہ گردیزی اور میں، تینوں راولپنڈی پہنچے۔ جنرل یحییٰ سے ملاقات میں ہمارا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا۔ وفاقی سیکریٹری، احمد موسیٰ کو ڈرافٹ تیار کرنے اور سردار ابراہیم خان و سردار عبدالقیوم سے بھی مشاورت کرنے کا کہا گیا، چنانچہ سب کی مشاورت سے، ایکٹ ۱۹۷۰ء نافذ کیا گیا۔ حمید خان کی جگہ جنرل عبدالرحمن کو صدر حکومت مقرر کیا گیا۔ تین رکنی کابینہ میں، لبریشن لیگ کے، راجہ ذوالقرنین، مسلم کانفرنس کے سید عبداللہ شاہ، آزاد مسلم کانفرنس کے سید نذیر حسین شاہ، وزیر مقرر ہوئے۔

سردار عبدالقیوم کا دلچسپ انکشاف

۱۹۷۰ء میں صدارتی نظام نافذ تھا۔ صدر کے عہدہ کے لئے سردار عبدالقیوم، کے۔ ایچ خورشید اور سردار ابراہیم کے درمیان مقابلہ تھا۔ خورشید صاحب کی طرف سے، میں الیکشن کا انچارج تھا۔ خورشید صاحب کے حق میں، الیکشن مہم کامیابی سے جاری تھی۔ الیکشن سے ایک ہفتہ قبل، پاکستان کے وزیر داخلہ محمود ہارون نے خورشید صاحب کو راولپنڈی ملاقات کے لئے بلایا۔ عبداللہ ہارون فیملی کے ساتھ، قائداعظم اور مادرملت کی وساطت سے، خورشید صاحب کے ذاتی تعلقات تھے۔ محمود ہارون نے خورشید کو اعتماد میں لے کر بتایا، کہ جنرل یحییٰ نے کابینہ اور خفیہ اداروں کو ہدایات دی ہیں، کہ صدارتی انتخاب میں، سردار قیوم کو ہر حال میں کامیاب کروانا ہے۔ خورشید صاحب نے مجھے فون پر دینہ ملنے کے لئے کہا۔ میرے ساتھ الیکشن آفس سے راجہ اسلم، میر خالد بشیر، یونس سرکھوی اور چوہدری مجید بھی دینہ پہنچے۔ خورشید صاحب نے، مجھے الگ کر کے، محمود ہارون سے ملاقات بارے بتا کر، اسے راز میں رکھنے اور الیکشن ٹیم کو بدستور قائم رکھنے کی تاکید کی اور لاہور روانہ ہوگئے۔ میر پور، کوٹلی، بھمبر اور مظفر آباد میں ہم جیت گئے، مگر پنجاب میں، جہاں مہاجرین میں ہماری بھاری حمایت تھی، وہاں نوکر شاہی اور خفیہ اداروں نے،

سردار قیوم کو بھاری اکثریت سے کامیاب کروادیا۔ بہت بعد میں، جبکہ میں چیف جسٹس تھا۔ کشمیر ہاؤس اسلام آباد میں، سردار عبدالقیوم نے، ہائی کورٹ کے جج صاحبان خواجہ محمد سعید، ریاض اختر اور مجھے کھانے پر دعوت دی۔ دوران گفتگو، خورشید صاحب، جو اس وقت وفات پا چکے تھے، ان کا ذکر آیا، تو سردار صاحب نے بہت رواداری سے، ان کی تعریف کی اور کہا، کہ سیاست میں خورشید صاحب کا مقابلہ کرنا، بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ انھوں نے ماضی کے چند واقعات سنائے۔ میرے استفسار پر، انھوں نے بتایا، کہ جب ان کو یقین ہوگیا کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں خورشید کو اکثریت حاصل تھی، تو انھوں نے اپنے ہمنوا، ایک جرنیل کے ذریعہ یحییٰ خان سے ملاقات کا وقت مانگا، مگر یحییٰ خان مشرقی پاکستان کے معاملات میں، بہت زیادہ مصروف تھا۔ چنانچہ مختصر ترین، دو منٹ کا وقت، بہت مشکل سے ملا، جس میں کھڑے کھڑے، میں نے صرف اتنا کہا، کہ جنرل صاحب آپ نے، آزاد کشمیر کے صدارتی الیکشن میں، خود مختار کشمیر اور کشمیر کے الحاق پاکستان کے درمیان، کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا ہے۔ یحییٰ خان نے کہا، اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کہ "مطلب واضح ہے کہ میں، جموں کشمیر کے، پاکستان سے الحاق کا حامی ہوں اور خورشید خود مختار کشمیر چاہتا ہے۔ وہ آزاد حکومت کو، ریاست کی مجاز حکومت تسلیم کروا کر خود مختار کشمیر کا پراپیگنڈا اور مطالبہ کر رہا ہے"۔ سردار صاحب نے کہا "یحییٰ خان چند سیکنڈ خموشی کے بعد بولا، کہ ہم نے تو الحاق کی حمایت کرنی ہے"۔ جس پر، اس نے ہوم منسٹر محمود ہارون کو، اپنا فیصلہ سنا دیا۔ سردار قیوم نے کہا، کہ اس حکمت عملی سے، انھوں نے الیکشن میں اپنی شکست کو، کامیابی میں بدل دیا۔

ایکٹ ۱۹۷۴ء کا نفاذ وصوبہ کی تجویز

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد، ہندوستان و پاکستان میں جنگ کے اثرات، ختم کرنے کے اقدامات میں، بہت تیزی آئی۔ جموں کشمیر کا مستقبل، تاشقند کے جھٹکے کے بعد، زیادہ زیر توجہ تھا۔ اتفاق سے سیمابی طبع کے حامل، سردار عبدالقیوم آزاد کشمیر کے صدر تھے۔ پاکستان میں جنرل یحییٰ کی جگہ، بھٹو صاحب سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی، حیثیت میں حکمران تھے۔ پاکستان نئے غیر یقینی حالات سے دوچار تھا۔ مسلم لیگ نے ۱۹۰۶ء میں جہاں پر جنم لیا، اور جنہوں نے قرارداد پاکستان تجویز کی اور سب سے اول، مسلم لیگ کی صوبائی حکومت قائم کی۔ پاکستان بنانے میں سیاسی کردار ادا کیا اور جانوں کی قربان دی تھی، وہ خطہ پاکستان نہ رہا اور وہ عوام پاکستانی نہ رہے تھے۔ جس خطہ کے عوام، کانگریس اور یونینسٹ پارٹی اور انگریز حکومت اور فوج کے وفادار، مراعات یافتہ جاگیردار، اطاعت پسند رہے، وہ پاکستان اور پاکستانی ہوگئے۔ بیسویں صدی کا یہ انوکھا اور سبق آموز تاریخ کا دھارا تھا۔ اس پس منظر میں، ہندوستان اور اس کی وزیراعظم، فتح کے غرور اور سرور میں دو قومی نظریہ کو بحیرہ عرب میں ڈبونے کے اعلان کے ساتھ ساتھ، تحریک آزادی جموں کشمیر کے تابوت میں آخری میخ گاڑھ، کر اس کو

ہمیشہ کے لئے اٹوٹ انگ قرار دے رہے تھے، جس کے لئے، شملہ کے پُر فضا مقام کو منتخب کیا گیا تھا، شکست خوردہ قوم کے صدر جو، خود خوبصورت، خوش لباس، خوش خوراک اور خوش گفتار، مگر بلا کا ذہین، تیز رفتار اور ڈرامائی اطوار کا حامل تھا۔ اس کے استقبال کے لئے، شملہ شہر کو، دلہن کی طرح سنوارا اور سجایا گیا تھا۔ اندرا جی نے مہمان خاص کے ذوق وشوق کو ملحوظ رکھ کر، پھانسنے کا سنہری جال، بہت دانش اور تدبر سے بچھایا تھا۔ اس کے مشیر، کشمیر اور ہندوستان کے بہترین دماغ تھے۔ پنڈت نہرو کے بعد، پہلی دفعہ ہندوستان اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کو، پاکستان پر ۱۹۷۲ء میں مکمل گرفت حاصل تھی، اور وہ پاکستان پر من پسند فیصلہ مسلط کرنے کی حیثیت میں تھی۔ لبریشن لیگ، خورشید اور ہم نے اپنی جگہ، جموں کشمیر میں تحریک آزادی کو بچانے کے لئے، آزاد کشمیر، پاکستان اور برطانیہ میں مکمل حکمت عملی تیار کر رکھی تھی، کیونکہ کشمیری قوم کے لئے یہ بڑی کٹھن آزمائش کا مرحلہ تھا۔ یہ بات مشاورت کے دوران، بھٹو صاحب کو بھی بتادی گئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بنگلہ دیش تو حقیقت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ شملہ میں نام، مسئلہ بنگلہ دیش کا تھا، مگر فیصلہ جموں کشمیر کا ہونے جا رہا تھا۔ بھٹو نے روانگی سے قبل ریڈیو پر مختصر تقریر میں، ہندوستان و پاکستان میں، پُر امن دوستانہ تعلقات کی بحالی کو خوش آئند قرار دیا، مگر مکمل خود اعتمادی سے اعلان کیا، کہ جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت پر، کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ اس واضح اعلان کے باوجود، ہم چوکس اور مستعد تھے۔ مذاکرات میں تعطل کے باوصف بھٹو نے اندرا گاندھی کو یقین دلایا، کہ "مسئلہ کشمیر ختم ہے، مگر معاہدہ میں اس کو دوطرفہ مذاکرات کے تحت، حل طلب مسئلہ ضرور ظاہر کیا جائے، وگرنہ وہ پاکستان میں واپس نہ جا سکیں گے"۔ بھٹو نے زبانی یقین دہانی کروائی، کہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنالیا جائے گا''۔ ایم جے اکبر ہندوستان کے معروف صحافی، اپنی کتاب "کشمیر" کے صفحہ نمبر ۱۷۹ پر رقمطراز ہیں، کہ بھٹو نے یہ کہہ کر کہ "بھروسہ کیجئے" اپنا پتہ خوبصورتی سے کھیلا۔ معاہدہ شملہ ۲ رجولائی ۱۹۷۲ء کو ہوا، شرائط کے تحت، تب سے پاکستان نے، کشمیر پر صرف دوطرفہ مذاکرات کی مشق ہی جاری رکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سیکیورٹی کونسل میں، کبھی بھی مسئلہ کشمیر، پیش نہیں کیا گیا۔ معاہدہ شملہ میں، یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی سیز فائر لائن کے بجائے ۱۷ردسمبر ۱۹۷۱ء کی، سیز فائر کا احترام ملحوظ رکھا گیا تھا، جس وجہ سے لداخ، کرگل، منی مرگ، لیپہ اور پونچھ میں اہم دفاعی چوکیوں پر، مشتمل ۳۴۱ مربع میل آزاد کشمیر کے جس علاقہ پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ علاقہ آزاد کشمیر کو واپس نہ کیا گیا، بلکہ اس کے متبادل چھمب، بھمبر، اکھنور کا ۵۸ مربع میل علاقہ آزاد کشمیر کے زیر قبضہ آ گیا۔ سیز فائر لائن کو، لائن آف کنٹرول کا نام دیا گیا اور مسئلہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان کے مابین دوطرفہ مذاکرات میں، طے کرنے کے تابع کر دیا گیا۔ ان اقدامات سے مسئلہ کشمیر ختم کرنے کا تاثر واضح تھا۔ مسلم کانفرنس نے معاہدہ شملہ کو خوش آئند قرار دیا تھا۔ لبریشن لیگ اور ہم نے قراردادوں کے ذریعہ، اس کی مذمت کی اور اسے، حق خودارادیت اور تحریک آزادی کے خلاف سازش اور اقوام متحدہ کی قراردادوں سے، پاکستان کی پسپائی قرار دیا۔

سردار عبدالقیوم کی برق رفتاری کے نتیجہ میں، مسلم کانفرنس کو، آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ قرار دیئے جانے کی جلدی تھی۔ چنانچہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو راولپنڈی کے کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کا دائرہ کار آزاد کشمیر تک بڑھا کر، ڈڈیال حلقہ سے مسلم کانفرنس کے سینئر اور تجربہ کار ممبر اسمبلی، پیر علی جان شاہ کو آزاد کشمیر میں پارٹی صدر بنایا گیا۔ جموں کشمیر میں، کانگریس پارٹی پہلے ہی، منظم ہو چکی تھی، اس کے متوازی آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی قائم ہو گئی۔ ریاست کی عملاً تقسیم، معاہدہ شملہ کی تائید میں، منصۂ شہود پر آنے لگی۔

مظفرآباد میں ۱۷ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اسمبلی اجلاس طلب ہوا جس میں آزاد کشمیر صوبہ کی افواہ کو، عملی شکل دیئے جانے کا گمان تھا۔ اسی دن لبریشن لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہم نے طلب کیا تھا۔ سردار عبدالقیوم نے، آزاد کشمیر کو صوبہ کی حیثیت دینے، جموں کشمیر ریاست کے عوام کو، پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینیٹ میں نمائندگی دینے کا، مطالبہ کیا اور صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو سے استدعا کی، کہ اس کو مجوزہ، دستور پاکستان کا حصہ بنایا جائے۔ یہ قرارداد شام کے اجلاس میں، بند ایوان یعنی ان کیمرہ پیش کرنے اور منظور کرنے کا سپیکر اسمبلی، شیخ منظر مسعود سے مشاورت سے طے ہوا تھا۔ لبریشن لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا، جس دوران، چوہدری سلطان علی، قائد حزب اختلاف نے اس قرارداد کے متعلق ہمیں اطلاع دی۔ ہم نے اجلاس میں مجوزہ قرارداد کو، خفیہ سازش قرار دے کر اس کی مذمت کی اور اس کو واپس لینے یا مسترد کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور اجلاس میں وقفہ کر کے، خواجہ عثمان کے مکان سے جلوس براستہ اپر اڈہ۔ مظفرآباد بازار سے ڈھکی اڈہ تک خورشید حسن شاہ گردیزی اور میری قیادت میں لایا اور خفیہ قرارداد کی، تقریروں میں بھرپور مذمت کی گئی اور اس کو تقسیم ریاست اور تحریک آزادی سے انحراف قرار دیا گیا۔ مظفرآباد شہر کے لوگ امڈ کر آ گئے اور جلوس جم غفیر کی شکل اختیار کر گیا، سردار قیوم نے فوری قرارداد واپس لے کر شام کو مجوزہ قرارداد کی تردید کی۔

لبریشن لیگ نے، خفیہ قرارداد کے خلاف، مہم شروع کی اور سارے آزاد کشمیر اور پاکستان میں، اس کے خلاف عوامی جلسے کیے اور پریس کانفرنسیں کیں۔ دوسری کوشش میں، مسلم کانفرنس نے ایک کمیٹی بنائی، جس کو، صوبہ کی حیثیت حاصل کرنے اور پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ میں نمائندگی کی تجویز پر، رپورٹ پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اسی دوران ہندوستان کی خفیہ کا انسپکٹر ریشپال سنگھ، نام اور کوائف بدل کر مرزا افضل بیگ کے بھتیجے کی حیثیت میں، سردار عبدالقیوم سے ملا اور کئی دن صدر ہاؤس میں مقیم رہا۔ یہ ملاقات دفتر سے ظاہر ہونے پر، لبریشن لیگ نے حکومت کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔ سردار عبدالقیوم کو نہ جانے کیا سوجھی، کہ انھوں نے آزاد کشمیر کا، پرچم ہی تبدیل کر دیا، جس پر لبریشن لیگ نے شدید احتجاج کیا، چنانچہ پہلے والا پرچم بحال ہوا۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں میرپور ٹاؤن ہال میں، اسمبلی اجلاس منعقد کرنے کا اعلان ہوا۔ اسی دوران بدوں ابتدائی مشاورت، چیف جسٹس، سردار شریف اور راجہ خورشید کو ہائی کورٹ جج مقرر کر دیا گیا، جس سے مظفرآباد بار اور میرپور بار میں غم و غصہ اور ناراضگی پیدا ہوئی۔

ساتھ ہی بدوں سفارش پبلک سروس کمشن ، اسسٹنٹ کمشنروں کی تقرریاں کی گئیں ، جس میں رشوت کا الزام لگایا گیا۔ میر پور میں اسمبلی اجلاس سے چند روز قبل ، جائیداد اور تجارتی ٹیکس کا ، نفاذ بھی کر دیا گیا ، جس کی زد میں صرف میر پور آتا تھا۔ میر پور کے عوام نے منگلا ڈیم کی وجہ سے صدیوں پر محیط ، اپنی بستیوں سے نقل مکانی کے صبر آزما انقلابی دور سے گذر کر ، اپنی تہذیب وتمدن ، آباؤاجداد کی قبروں کو منگلا ڈیم کی تہہ میں ڈوبتا چھوڑ کر ، بغیر روزگار و وسائل کے بلاہ گالہ کے ویران سنگلاخ پہاڑی اور گھاٹیوں میں تمام سرمایہ خرچ کر کے مشکل سے مکانات و دکانات تعمیر کر کے ، میر پور کو جدید خوبصورت شہر کی شکل دی تھی۔ ان متاثرین ، اور نقل مکانی کرنے والے عوام پر ، جائیداد ٹیکس نافذ کرنا ظلم تھا ، جس وجہ سے میر پور میں غصہ تھا۔

میر پور کے وکلاء جیل میں :

اسمبلی اجلاس شروع ہونے سے قبل ، میری تجویز پر وکلاء نے اجلاس میں جائیداد ٹیکس واپس لینے کی ، یادداشت تیار کی اور جلوس کی شکل میں ، اسمبلی میں یادداشت پیش کرنے روانہ ہوئے۔ جلوس پُرامن تھا ، جب ٹاؤن ہال سے ، فرلانگ کے فاصلہ پر تھا ، تو پولیس نے راستہ روک لیا۔ اس دوران کالج کے طلباء اور شہریوں کے جلوس بھی ، موقع پر پہنچ گئے۔ صدر کے حکم پر ، یادداشت پیش کرنے کے بعد ، وکلاء بار روم میں جمع ہو رہے تھے ، کہ پولیس نے فائرنگ شروع کر دی۔ بار روم اور کالج پر فائرنگ سے ، چند طلباء زخمی ہوئے ، جس پر عوام نے سخت احتجاج کیا۔ اسی دوران ، وکلاء کی گرفتاری شروع کر دی گئی۔ مجھے تھانہ کی حوالات میں بند کیا گیا۔ جبکہ دیگر جیل میں منتقل کیے گئے۔ اس سے میر پور شہر ، دیہاتوں کے عوام نے شہر میں مکمل ہڑتال کی اور احتجاجی جلوس نکالے۔ میر پور ، پولیس اور عوام میں ، میدان جنگ بن گیا۔ انگلینڈ میں مقیم میر پور والوں نے احتجاج کیا۔ ہندوستان نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ، دوسری بار ، سیکیورٹی کونسل کو میر پور کے عوام پر تشدد اور گرفتاریوں پر متوجہ کیا۔ پہلی بار ۱۹۶۰ء میں ، جب منگلا ڈیم کی تعمیر کے خلاف تحریک میں ۹ ر اگست کو ہمیں گرفتار کیا گیا تھا ، تب بھی ہندوستان نے ، سیکیورٹی کونسل میں ، میر پور کے عوام پر تشدد کا معاملہ اٹھایا تھا۔ حکومت آزاد کشمیر نے ہمارے خلاف مقدمہ ، تھانہ میں درج کروایا ، اس میں ملزم نمبر ایک ، مجھے نامزد کیا گیا اور تمام ہنگامہ آرائی ، فائرنگ اور طلباء کے مضروب ہونے کی ذمہ داری اور سازش کا مرتکب ، مجھے قرار دیا گیا۔ تین دن کے بعد ہمیں آزاد کیا گیا۔ بھٹو صاحب ، ان تمام حالات سے آگاہ تھے ، چنانچہ انھوں نے سب وکلاء کو راولپنڈی طلب کیا۔ رفیع رضا ، بھٹو کے مشیر بحیثیت وزیر نے ، تمام واقعات کی رپورٹ ، بھٹو کو پیش کی اور ٹیکس ختم کر دیا گیا۔

۲۴ ر نومبر ۱۹۷۴ء کو بھٹو نے ، نیلم سٹیڈیم مظفر آباد سے جلسۂ عام میں ، خطاب کے دوران آزاد کشمیر کو ، صوبہ کی حیثیت دینے کی ، تجویز ہی نہ دی بلکہ فیصلہ سنا دیا۔ میں وہاں موجود نہ تھا ، البتہ پریس میں آیا ، کہ بھٹو نے سردار قیوم

سے ،مظفرآباد میں گورنر ہاؤس تعمیر کرنے کے لئے ،زمین مختص کرنے کا کہا ،جس کی سردار صاحب نے حامی بھرلی تھی ، البتہ بھٹو نے لاہور شیخوپورہ میں واقع ،کشمیر پراپرٹی ،آزاد حکومت کے سپرد کرنے اور وزارت امور کشمیر کو ختم کرنے کا اعلان بھی کیا تھا ،جس پر اب تک عمل نہ ہوا ہے۔

راولاکوٹ بنجوسہ میں خطاب میں ،بھٹو صاحب نے جہاں سردار ابراہیم خان اور سردار عبدالقیوم ان کے ساتھ تھے ،پونچھ کے عوام ،جن میں خواتین بھی بڑی تعداد میں تھیں پر زور دے کر ،آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ عوام نے ان کے حق میں خوب نعرہ بازی کی ،اس کے چند روز بعد ،بھٹو میر پور میں خطاب کرنے آئے۔ میر پور سٹیڈیم جو ابھی تعمیر نہ ہوا تھا ، کے کھلے میدان میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ سٹیج پر آزاد کشمیر کے تمام لیڈر موجود تھے۔ کے ایچ خورشید اور میں ،لبریشن لیگ کے نمائندوں کی حیثیت میں پہلی دفعہ سٹیج پر تھے۔ میر پور میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن بہت مضبوط اور متحرک تنظیم تھی۔ محاذ رائے شماری بھی مضبوط تنظیم تھی ، اسی طرح میر پور ،لبریشن لیگ کا گڑھ تھا۔ بھٹو صاحب کے جلسوں میں یہ ایک بڑا مجمع تھا ،اور اس میں حسب ہدایت ، پنجاب سے بھی بہت نفری شامل تھی۔ بھٹو صاحب نے مظفرآباد اور پونچھ کے عوام اور سیاسی قیادت کی ہمنوائی اور پذیرائی کے گمان میں ، میر پور میں پُر جوش خطاب کے دوران ، آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کا اعلان کیا ،تو مظفرآباد اور پونچھ کے عوام کے ردعمل کے قطعی برعکس ، جلسہ گاہ کے شمال ،مشرق اور جنوبی کونوں سے صوبہ نامنظور ، نامنظور کے بیک وقت زور زور سے نعرے بلند ہوئے۔ بھٹو نے ہاتھ سے اشارہ کیا ،تو فیڈرل سیکیورٹی فورس نے ان پر حملہ بول دیا۔ بھٹو نے تقریر بند کر دی اور دس منٹ خاموش کھڑے رہے ،اس دوران خوب ہنگامہ ، پکڑ دھکڑ اور لاٹھی چارج جاری رکھا۔ بھٹو نے کہا ،اب بند کرو ، تو خاموشی چھا گئی۔ جب دوبارہ بھٹو نے تقریر شروع کی تو پھر صوبہ نامنظور ، نامنظور کے نعرے بلند ہوئے۔ بھٹو نے بہت ہی چابکدستی سے اپنا موقف فی الفور بدل کر کہا ، کہ" آزاد کشمیر کا صوبہ آپ کو نامنظور ،تو مجھے بھی نامنظور۔ اب کشمیر کا صوبہ نہیں بنے گا"۔ اس پر زوردار نعرے بلند ہوئے اور زوردار تالیاں بجیں جس پر جلسہ ختم ہوا۔ این ایس ایف ، لبریشن لیگ اور محاذ رائے شماری کے جن نوجوانوں کو رات کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں صف اول میں طارق عزیز ملک ، غفار انقلابی ، صابر انصاری ، فاروق سہیل تھے۔ ان کو دوسرے دن میں نے پولیس حراست سے آزاد کروایا تھا۔ یہاں یہ بات کہنی ہے کہ بعد میں پونچھ اور دھیرکوٹ کے چند لوگوں نے دعویٰ کیا ہے ، کہ سردار قیوم اور انھوں نے ، صوبہ بنانے کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے یہ غلط بیانی کر کے ، اپنے ساتھ اور سردار عبدالقیوم کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب کیا ہے ،صوبہ بنانے کی مخالفت ،صرف اور صرف میر پور میں ہوئی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے آزاد کشمیر کو اپنی گرفت میں لانے کے لئے ، یہاں پیپلز پارٹی کی داغ بیل ڈالی تھی ، مگر آزاد کشمیر کے سیاستدان اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود ، آپس میں بٹے ہوئے تھے اور راولپنڈی کو روز

اول سے اقتدار کا منبع سمجھتے ہوئے، حکمرانوں کا طواف کرتے رہتے۔ اس دوران اندرا گاندھی نے، بھٹو کو شملہ میں آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے اور عملاً مسئلہ کشمیر ختم کرنے کے وعدہ پر، متوجہ کرنے کے لئے، فاروق عبداللہ کو خط دے کر بطور پیغام رساں، پاکستان بھیجا۔ لاہور میں ملاقات طے ہوئی، جہاں خط پہنچایا گیا۔ فاروق عبداللہ نے اس ملاقات کی تفصیل مجھے، دہلی میں اکبر روڈ پر واقع اپنی رہائشگاہ میں راجہ خالد اکبر اور چوہدری منیر حسین وکیل کی موجودگی میں سنائی تھی۔ ایک طرف سردار قیوم کی حوصلہ افزائی اور دوسری طرف مسلم کانفرنس میں نقب زنی جاری رہی۔ بالآخر صوبہ کا منصوبہ ختم کرنے اور آزاد کشمیر کو، شملہ معاہدہ کے تحت کنٹرول میں لانے کے لئے، ایکٹ ۱۹۷۰ء میں ترمیم کے ذریعہ، بجائے جموں کشمیر کے عوام کو پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ میں نمائندگی دینے کے، جموں کشمیر کونسل کا ادارہ قائم کر کے، وزیراعظم پاکستان کو اس کا چیئرمین، صدر آزاد کشمیر وائس چیئرمین، چار ممبران پاکستان اسمبلی اور وزیراعظم آزاد کشمیر اور چھ بالواسطہ منتخب آزاد کشمیر کونسل کے ممبران پر مشتمل، آزاد جموں کشمیر کونسل قائم کر دی گئی تھی۔ آزاد کشمیر حکومت کو، ایکٹ ۱۹۷۰ء کے تحت، حاصل شدہ ۵۲ شعبوں سے متعلق اختیارات، کشمیر کونسل کو، تفویض کر دیئے گئے۔ بھٹو صاحب نے حفیظ پیرزادہ کو، نمائندہ مقرر کر رکھا تھا۔ سردار عبدالقیوم، سردار ابراہیم خان اور چوہدری نور حسین کا تعلق، آزاد کشمیر سے تھا۔ یہ عوامی قوت کے علمبردار تھے۔ خورشید مہاجر تھے، گو کہ لبریشن لیگ آزاد کشمیر میں، دوسری بڑی جماعت تھی اور اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بھی، لبریشن لیگ ہی سے تھا۔ اعلیٰ سطح کے اجلاس، جس کی صدارت، بھٹو نے کی اس میں، سردار عبدالقیوم، سردار ابراہیم خان، کے ایچ خورشید، چوہدری نور حسین، پیر علی جان شاہ اور میر واعظ محمد احمد شامل تھے، اجلاس میں ایکٹ ۱۹۷۴ء کا مسودہ منظور ہوا۔ اسمبلی کے اجلاس میں ،مسودہ پیش ہوا، میں سپیکر گیلری میں موجود تھا، قواعد کے برعکس، بدوں ریڈنگ کے اسمبلی نے مسودہ منظور کر لیا۔ جس کا اعلان سپیکر اسمبلی، شیخ منظر مسعود نے کیا اور اسمبلی اجلاس ملتوی ہو گیا۔ صدر حکومت، سردار عبدالقیوم نے اسی روز اس کی منظوری دی اور ۲۴ راگست ۱۹۷۴ء کو، صدارتی کے بجائے، آزاد کشمیر میں پارلیمانی نظام حکومت، نافذ ہو گیا۔

لبریشن لیگ کا میں، سیکریٹری جنرل تھا۔ ہم سے اور مرکزی مجلس عاملہ سے کوئی مشاورت نہ ہوئی، صرف اسمبلی ممبران سے مشاورت کا بھی مجھے گمان ہے۔ البتہ جب میں نے خورشید صاحب سے شکوہ کیا، تو انھوں نے جواز یت پیش کی، کہ ہم نے آزاد کشمیر کو صوبہ بننے سے بچایا اور ایکٹ ۱۹۷۴ء کی شکل میں پارلیمانی نظام قائم کر کے، صدارتی نظام کے آمرانہ اختیارات میں، اعتدال پیدا کیا ہے۔ یہ خورشید صاحب کا استدلال تھا، جس سے مجھے اور راجہ اسلم کو اتفاق نہ تھا۔ ہماری رائے میں، جو کچھ ہم نے ۱۹۷۰ء میں فوجی جنرل یحییٰ خان سے اور ۱۹۷۴ء میں، میرپور سٹیڈیم کے عوامی جلسہ میں حاصل کیا تھا، وہ ۱۰ رجون ۱۹۷۴ء کو بھٹو کے سامنے، کانفرنس میں اور ۲۴ راگست ۱۹۷۴ء کو، ایوان اسمبلی میں کھو دیا تھا، مگر فیصلہ، ہو چکا تھا۔

سردار عبدالقیوم کے ایکٹ ۱۹۷۴ء کی تجویز اور اکثریتی پارلیمانی پارٹی کے قائد کی حیثیت میں نفاذ میں، عزم، ذوق وشوق اور برق رفتاری پر تبصرہ میں، ان کے اپنے عزیز ومداح، پروفیسر سرور عباسی نے "سیاست کشمیر" میں کہا کہ "سردار عبدالقیوم اقتدار کی آرزو سے اس قدر مغلوب ہوئے، کہ ایکٹ ۱۹۷۰ء جو آزاد کشمیر کی سربلندی اور سرفرازی کی علامت بن گیا تھا، میں نقب لگانے کے لئے شریک ہوگئے"۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی، کہ معاہدہ شملہ ہونے کے ساتھ ہی، سردار قیوم اور مسلم کانفرنس، آزاد کشمیر کی حیثیت تبدیل کرنے کے لئے، بیتاب و بیقرار تھے۔ انسان کی نیت پر، فیصلے ہوتے ہیں۔ سردار صاحبان نے آئندہ الیکشن میں، بھٹو صاحب سے، اندر ہی اندر معاہدہ کرلیا تھا، مگر تقسیم اقتدار، میں اختلاف رائے پر، مظفر آباد کے ایوان نے، بے تاج حکمران صدر کے خلاف، اپنے پروردہ ساتھیوں سے ہی عدم اعتماد ہونے، پر توہین آمیز انداز میں، رسوا ہوکر تخت شاہی سے، رخصت ہوتے دیکھا۔ حکمرانی کے تمام نام ونشان مٹ گئے۔

لبریشن لیگ کا عروج وزوال

دولائی کیمپ جیل سے خورشید صاحب کی رہائی اور ۱۹۶۷ء کے درمیان لبریشن لیگ ساقط رہی، مگر میرپور کنونشن اور بالخصوص ۱۹۶۹ء کی میرپور سے شروع کی گئی، قانون ساز اسمبلی کے قیام کی تحریک اور ایکٹ ۱۹۷۰ء کے نفاذ کے سبب لبریشن لیگ میں عوام، جوق در جوق شامل ہوئے۔ اگست ۱۹۶۸ء میں اتحاد ثلاثہ میں، مسلم کانفرنس کے سردار عبدالقیوم اور آزاد مسلم کانفرنس کے صدر، سردار ابراہیم کی، لبریشن لیگ کے نکتہ نظر، کہ آزاد حکومت کو ساری ریاست کی مجاز حکومت، تسلیم کیا جائے اور تحریک آزادی اس کے سپرد کی جائے، یا دائرہ اختیار میں دی جائے، کو تسلیم کرلینے پر، سیاسی شعور کے قائل، عوام پر واضح ہوگیا، کہ جموں کشمیر کی آزادی کا لائحہ عمل، صرف لبریشن لیگ کے پاس تھا۔ اس کے بعد شملہ معاہدہ، آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی، قدم قدم پر مخالفت، سردار قیوم کے آزاد کشمیر میں پرچم تبدیل کرنے پر احتجاج، پرچم کی بحالی، میرپور میں منگلا ڈیم متاثرین کی آبادکاری اور پراپرٹی ٹیکس کی منسوخی اور سب سے بڑھ کر، خورشید صاحب کی پرکشش شخصیت، ذہانت، دیانت اور جرأت کے اوصاف، دوسروں پر فوقیت، رکھتے تھے۔ اس پر مزید یہ کہ آزاد کشمیر اور بالخصوص میرپور کے ساتھیوں کی، مالی مدد سے، جماعت کے پروگرام میں رکاوٹ پیدا نہ ہونے پائی۔ لبریشن لیگ اور مسلم کانفرنس یکے بعد دیگرے، اول دوم پوزیشن میں، عوام میں مقبول رہیں۔ مسلم کانفرنس پاکستان کی مقتدر قوتوں اور وزارت امور کشمیر کی اعانت سے، زیادہ تر، اقتدار میں رہی۔ اس کو یہ فوقیت ہمیشہ حاصل رہی، جبکہ لبریشن لیگ ایسی معاونت سے نہ صرف محروم رہی، بلکہ کھلی مخالفت کا، سامنا کرتی رہی۔

اسلامی ممالک کی کانفرنس، لاہور میں ۱۹۷۴ء میں، شملہ معاہدہ کے بعد منعقد ہوئی، جس میں دنیا بھر کے مسلم ممالک کے سربراہان مدعو تھے، جن میں شاہ فیصل سعودی عربیہ، لیبیا کے کرنل قذافی، شام کے حافظ الاسد،

الجزائر کے بومدین اور فلسطین کی الفتح کے لیڈر یاسر عرفات وغیرہ شامل ہوئے۔ لبریشن لیگ نے تمام مندوبین کو مسئلہ کشمیر پر یادداشت پیش کی۔ سردار قیوم منتخب صدر حکومت تھے، ان کو پاکستان میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں، بطور مبصر بھی دعوت نہ ملی۔ وہ لاہور میں میاں منظر بشیر، ملک اسلم کے ہم زلف کے گھر پر ٹھہر کر، کشمیر سے متعلق پمفلٹ تقسیم کرتے رہے۔ حالانکہ سیاسی اور قانونی طور پر، وہ یاسر عرفات سے، اگر بہتر حیثیت میں نہ تھے، تو کم حیثیت میں بھی نہ تھے، جس وجہ سے جموں کشمیر کے عوام کو، بہت دکھ ہوا اور وہیں لبریشن لیگ کے سیاسی پروگرام کی اہمیت کا احساس ہوا۔

لبریشن لیگ، برطانیہ میں

۸ راگست ۱۹۷۳ء کو میں نے، خورشید صاحب کی قیادت میں، لبریشن لیگ کے وفد کا دورہ برطانیہ کا پروگرام مرتب کیا۔ میں نے اول تو ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے دورہ کے دوران، اپنے دوست احباب پر مشتمل، لبریشن لیگ کی تنظیم قائم کردی تھی، مگر میرے پارٹی کے سیکریٹری جنرل منتخب ہونے پر وہاں کی تنظیم فعال اور متحرک ہوئی تھی۔ گذشتہ کئی سال سے ان کی طرف سے، دورہ کی دعوت تھی، مگر پاکستان کے حالات اور آزاد کشمیر میں سیاسی کشمکش کی وجہ سے، وہاں نہ جاسکے تھے۔ ہم سے قبل، پاکستان کے ائیر مارشل اصغر خان، کشمیر سے شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ اور سردار قیوم، برطانیہ کا دورہ چند ماہ قبل کر آئے تھے۔ وفد میں خورشید صاحب اور میرے علاوہ، مظفر آباد سے، سردار رحمت اللہ، کوٹلی سے سید شبیر حسین شاہ اور میرپور سے محمد یونس سرکھوی، میر خالد بشیر، چوہدری پنوں خان شائق، چوہدری عبدالمجید، چوہدری عاشق حسین اور حاجی چوہدری ذوالفقار شامل تھے، سب نوجوان تھے۔ حاجی نذیر عالم، صدر لبریشن لیگ برطانیہ، ماسٹر کریمداد، چوہدری غلام نبی رچیال، چوہدری محمد صادق اور دیگر عہدیداران نے مانچسٹر ایئرپورٹ پر، ہمارا زبردست استقبال کیا اور ہمیں ہماری قیام گاہ تک، سیکڑوں کاروں کے جلوس میں لایا گیا۔ انگریز اتنا بڑا جلوس دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے، دو ماہ کا پروگرام تھا، تمام شہروں میں استقبالیے اور پبلک جلسے منعقد ہوئے، مگر سب سے بڑے تاریخی اجتماع، ٹاؤن ہال بریڈفورڈ، ٹاؤن ہال مانچسٹر، ٹاؤن ہال برمنگھم، نوٹنگھم، گلاسگو اور کاکسٹن ہال لندن میں، منعقد ہوئے۔ میرپور کے برطانیہ میں مقیم عوام نے، استقبال میں دل و جان نچھاور کردیئے۔ کاکسٹن ہال لندن، ٹاؤن ہال برمنگھم اور بریڈفورڈ میں جس قدر عوام ہال کے اندر تھے، اس سے زیادہ باہر کھڑے تھے۔ برطانیہ میں پیپلز پارٹی قائم ہوچکی تھی، اس کے صدر، چوہدری حکمداد، اور سیکریٹری جنرل ایف ڈی فاروقی تھے۔ بھٹو صاحب کی ہدایت پر، ہماری تمام مصروفیات، وہ بھٹو صاحب کو رپورٹ کرتے۔ جلسے جلوسوں کے علاوہ، ہر ٹاؤن میں ممبران پارلیمنٹ اور کونسلرز سے اور لیبر، لبرل سوشلسٹ اور کنزرویٹو پارٹیز کے ممبران اور قائدین سے مل کر تحریک آزادی کشمیر میں ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے، ان کو بریفنگ کرنے کی، اطلاع دیتے۔

انگریز، بھارتی اور پاکستانی سفارتکاروں اور صحافیوں کے اجتماع سے خطاب، ایک تاریخ ساز مرحلہ تھا۔ لندن میں سید سلطان علی شاہ، محمود ہاشمی، حبیب الرحمٰن اور دیگر احباب نے کانوے ہال لندن کے خصوصی اجتماع میں، ممبران پارلیمنٹ، سفارت کاروں، اور سینئر صحافیوں کو مدعو کیا ہوا تھا، وہاں بغیر بلائے تینوں ممالک کی ایجنسیوں کے مخبر بھی، داخل ہو گئے تھے، وہاں صرف اول پندرہ منٹ میری اور دوسری خورشید صاحب کی مسئلہ کشمیر پر تقریر تھی، جس کے آخر میں سوالات جوابات بھی ہوئے۔ اس شام خورشید پورے جوبن اور عروج پر تھے، جس منطقی اور حقائق کے اسلوب میں، انھوں نے مسئلہ کشمیر پیش کیا، وہ اپنی نوعیت کا انوکھا انداز تھا۔ انھوں نے، ہندوستان کے پیشہ ور سفارتکاروں اور صحافیوں کو لاجواب کر دیا۔ مجھے یاد ہے، شہریار خان اس وقت فرانس، پیرس میں، پاکستانی سفارتخانہ میں، بطور تھرڈ سیکریٹری، تعینات تھے، وہاں سے آ کر جلسہ میں شریک ہوئے تھے اور خورشید صاحب سے، سوالات بھی کیے تھے۔ بعد میں، میری ان سے برطانیہ میں، متعدد ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

برطانیہ کی پیپلز پارٹی نے، ہمارے اعزاز میں عشائیہ، بھٹو صاحب کی جانب سے دیا۔ ایف ڈی فاروقی نے، استقبالیہ خطاب میں دوٹوک کہا، کہ بھٹو صاحب کی ہدایت پر وہ ہماری مصروفیات کی رپورٹ، بھٹو صاحب کو دیتے تھے دوسرا، انھوں نے کہا کہ بھٹو صاحب نے ان سے دریافت کیا تھا، کہ خورشید کے جلسوں میں، اتنے زیادہ لوگ کیوں شامل ہوتے تھے حالانکہ اتنا اچھا استقبال نہ خود بھٹو کا، نہ ایئر مارشل اصغر خان، شیخ عبداللہ اور سردار قیوم کا ہوا تھا۔ فاروقی نے کہا، کہ اس نے بھٹو کو میرے متعلق بتایا، کہ میرے دوست اور احباب یہ استقبال، میری وجہ سے کر رہے تھے۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد، بھٹو صاحب جو اس وقت تک مسلم کانفرنس کی جماعت میں، بڑی حد تک نقب زنی کر چکے تھے۔ سردار ابراہیم خان، سردار یوسف، ممتاز راٹھور اور دیگر سردار قیوم کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، اب ان کی نظر لبریشن لیگ پر تھی۔ ۱۹۷۵ء کے الیکشن میں، پیپلز پارٹی، لبریشن لیگ اور آزاد مسلم کانفرنس کا اتحاد ہو گیا۔ اس کا مجھ پر، دوسری دفعہ اثر پڑا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں، اتحاد کی وجہ سے مجھے، اپنے نامزدگی کے کاغذات، واپس لینا پڑے، اس دفعہ بھٹو صاحب نے، میرپور شہر سے میرے حق میں خود فیصلہ کیا تھا، مگر چوہدری نور حسین کے اتحاد میں شامل ہونے پر، دوسری دفعہ مجھے ٹکٹ سے محروم کر دیا گیا تھا، تاہم تین جماعتوں کے اتحاد کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو گئی۔ سردار ابراہیم خان صدر اور حمید خان وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ کرنل منشا خان سپیکر بنے۔ تینوں کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔

ممبر جموں کشمیر کونسل نامزدگی

اسمبلی کے بعد، کشمیر کونسل کے ممبران کا انتخاب، ہونا تھا، چھ میں سے تین سیٹیں خالی تھیں۔ اس طرح ایک ایک سیٹ، تینوں جماعتوں کے حصہ میں آئی۔ دس بجے تینوں پارٹی سربراہان اور ممبران اسمبلی کے اجلاس کی، بھٹو نے صدارت کی، اجلاس میں، لبریشن لیگ کے کوٹہ میں بھٹو صاحب نے، از خود خورشید صاحب سے کہا، کہ لبریشن لیگ کا

ممبر عبدالمجید ملک، سیکریٹری جنرل ہوگا۔ میں اتفاق سے اجلاس میں شامل نہ تھا، کیونکہ میں امیدوار بھی نہ تھا، بلکہ حسن شاہ گردیزی اور چوہدری انور متوقع امیدوار تھے، جب میٹنگ ختم ہوئی، تو میں چند دوستوں کے ساتھ، مال روڈ پر واقع ریسٹورنٹ سلور گرل میں لنچ کے لئے، خورشید صاحب کا منتظر تھا، وہ سب آئے اور کھانے میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے میری نامزدگی کا اظہار نہ کیا۔ دس منٹ بعد، پیپلز پارٹی کے شیخ منظر مسعود، سردار یوسف اور ممتاز راٹھور لنچ کے لئے داخل ہوئے، وہ مجھے دیکھتے ہی، بغل گیر ہوکر مبارک باد دینے لگے اور بیک آواز کہا، کہ میرا نام، بھٹو صاحب نے، خود تجویز کیا تھا۔ ان کو نام تجویز ہونے پر بہت کم، مگر میرا نام بھٹو کی طرف سے تجویز کیے جانے پر، زیادہ خوشی اور فخر تھا۔ اس مرحلہ پر خورشید صاحب نے بھی، ان کی تائید کی، مگر لبریشن لیگ کے چوہدری سلطان علی اور سردار رحمت اللہ کچھ پریشان سے تھے۔ چوہدری مجید، یونس سرکھوی، راجہ اسلم اور چوہدری رشید بہت خوش تھے۔ خورشید صاحب نے چوہدری سلیمان، جو اسی وقت میرپور سے پہنچے تھے کو ووٹر لسٹ لانے کے لئے، دوبارہ میرپور بھیجا، کیونکہ دوسرے دن کاغذات نامزدگی مظفرآباد داخل کرنے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد، اجلاس دوبارہ شروع ہونا تھا، تاکہ باقی سیٹوں کا بھی فیصلہ ہو جائے۔ اجلاس کی صدارت، حفیظ پیرزادہ کر رہے تھے، کیونکہ بھٹو صاحب نہ آسکے تھے۔ چوہدری سلطان علی، سردار رحمت اللہ، خواجہ فاروق اور خورشید صاحب نے آپس میں میٹنگ کر کے، میری بجائے سردار رحمت اللہ کا نام، پیش کر دیا۔ میں فلیش مین ہوٹل میں تھا، وہاں راجہ اسلم، چوہدری مجید، یونس سرکھوی، چوہدری رشید، چوہدری انور، حسن شاہ گردیزی، خورشید صاحب کے ساتھ جھگڑا کر کے پہنچے۔ وہ تمام غصہ میں تھے اور بہت بھرے ہوئے، پارٹی چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہوگئے۔ ان کی شکایت جائز تھی، کیونکہ سردار رحمت اللہ کو، مظفرآباد کے حلقہ کا مشترکہ ٹکٹ اور پیسہ ملا تھا، مگر وہ، اسمبلی کی سیٹ ہار چکا تھا۔ اب کونسل کی سیٹ، جس کا فیصلہ ہو چکا تھا، اس پر اس کا حق نہ بنتا تھا۔ بالفرض میری نامزدگی قبول نہ تھی تو، فیصلہ پہلے اجلاس میں کر دیا جاتا، بصورت دیگر، حسن شاہ گردیزی، چوہدری رشید یا چوہدری انور میں سے، کوئی نامزد ہوتا، اس وجہ سے سب نے، خورشید صاحب کا فیصلہ ناپسند کیا، مگر میں راضی ہی رہا اور خورشید صاحب کا فیصلہ قبول کر لیا، مگر باقی سب، نالاں رہے۔

لبریشن لیگ کا ادغام

مسلم کانفرنس میں دراڑیں ڈالنے اور قدآور سیاستدانوں، جن میں صدر مسلم کانفرنس سردار ابراہیم خان اور ان کے دیگر ممبران اسمبلی اور شیخ منظر مسعود وغیرہ تھے، پیپلز پارٹی میں شامل کر لینے کے بعد، حکومت پیپلز پارٹی کی بن گئی۔ گو کہ الیکشن داغ دار اور متنازعہ ہی تھا مگر شکایت کہاں کی جاتی؟ سردار قیوم جن کو بھٹو کی قربت اور اعتماد کا فخر تھا، ان کو تنہا کر کے، الیکشن میں بائیکاٹ پر مجبور کر دیا گیا تھا، ان کا انجام سب کے لئے مثال عبرت تھا۔ مگر دنیا حرص و ہوس کی دلکش اور دلفریب تجربہ گاہ ہے۔ مسلم کانفرنس میں توڑ پھوڑ کے بعد بھٹو کا نشانہ اب لبریشن لیگ تھی۔ مظفرآباد دورہ

کے دوران بھٹو نے خورشید صاحب کو پاکستان میں سیاسی انتشار اور اختلافی جماعتوں کے رویہ کی شکایت کی اور مسئلہ کشمیر کے حل میں، ہندوستان کی ہٹ دھرمی، دہراتے ہوئے ماضی میں دوستانہ تعلقات اور گذشتہ الیکشن میں اتحاد کی مثال دے کر، ان کو مل کر ملکی مسائل کے تحت، مسئلہ کشمیر کے حل میں متحد ہو کر کام کرنے اور وزیر اعظم آزاد کشمیر بننے کی، نہ صرف پیشکش کی بلکہ اصرار کیا۔ خورشید صاحب نے پارٹی کی مجلس عاملہ سے، مشاورت کی مہلت کے نام پر، سوچ اور مشاورت کے لئے وقت مانگا۔ ان دنوں بھٹو صاحب نے، اجلال حسین چیف سیکریٹری اور ہزارہ کے ایک میجر اورنگزیب نامی کو، خصوصی مشیر برائے وزیر اعظم، مظفر آباد میں تعینات کر رکھا تھا۔ یہ دونوں سرکاری کام کم مگر پیپلز پارٹی میں، لوگوں کو لالچ اور دباؤ کے تحت، شامل کرنے کے مشن پر زیادہ مصروف تھے۔

کے ایچ خورشید، بھٹو صاحب سے ملاقات کے بعد، جب باہر لبریشن لیگ کے ساتھیوں سردار رحمت اللہ، سید حسن شاہ گردیزی، خواجہ محمد عثمان، غلام نبی زرگر اور سردار شاہ سے ملے اور ان کے استفسار پر، بھٹو صاحب کی وزارت عظمیٰ آزاد کشمیر کی پیشکش اور اس کے عوض لبریشن لیگ کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کی بات کی، تو بقول خورشید صاحب، سب نے بیک آواز کہا، کہ آپ کو بھٹو صاحب کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے تھی۔ ۲۲ رفروری ۱۹۷۵ء کو وزیر اعظم بھارت، اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان، اقتدار کے اشتراک کا معاہدہ ہوا، جس پر بھٹو صاحب نے، فوری ردعمل میں، ۲۸ رفروری کو ہڑتال کا اعلان کیا، کہ اگر آزاد اور مقبوضہ جموں کشمیر کے عوام نے، آزادی کے حق میں کامیاب ہڑتال کی تو ٹھیک، وگرنہ مسئلہ کشمیر ختم تصور ہوگا۔ اس مشروط ہڑتال کے دن، ساری ریاست جموں کشمیر کے تینوں حصوں اور پاکستان بھر میں تمام کاروبار، رک گئے اور مکمل ہڑتال ہوئی۔ برصغیر کی تاریخ میں، شاید اس طرح کی کامیاب ہڑتال، وقت کے لحاظ سے بمشکل ہی دیکھی ہو۔ بھٹو صاحب کو کہنا پڑا، کہ ''جموں کشمیر کے عوام، یقیناً آزادی سے کم جموں کشمیر کا فیصلہ، قبول کرنے کو تیار نہ تھے، لہٰذا مسئلہ کشمیر حل طلب تھا''۔

سندھ کے سید قائم علی شاہ وزیر امور کشمیر تھے۔ بھٹو صاحب نے قائم علی شاہ، حمید خان اور چیف سیکریٹری کو لبریشن لیگ کے، معروف قائدین کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے، کا حکم دے رکھا تھا۔ ایک طرف تو، بھٹو نے خورشید صاحب کو مذاکرات میں مصروف رکھا، دوسری طرف ان کے ساتھیوں کو، حکومت میں لالچ اور مقامی دباؤ کے تحت، پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کی مہم جاری رکھی۔ خورشید مشاورت کی آڑ میں، وقت لیتے رہے، مگر اس دوران، ان کے بہت قریبی ساتھی اور معتبر مشیر، سیالکوٹ کے فرمان علی اور چوہدری سلطان علی، اپنے قبیلائی لاؤ لشکر کی اکثریت کے ساتھ، پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بھمبر کے چوہدری صحبت اور اشرف دونوں بھائی بھی جاٹ قبیلہ کو لے کر، ساتھ چھوڑ چکے تھے، حمید خان نے اپنے خانگی تعلق کی بنا پر، مجھے بھٹو صاحب سے ملاقات کی دعوت دے دی۔ میں نے معذرت کی، مگر وہ ہر ہفتے ملاقات کے لئے مصر رہے، کئی ماہ بعد، میرے ماموں عبدالعزیز، جن سے حمید خان

کے ذاتی مراسم تھے، انہوں نے، مجھے اس پر قائل کیا، کہ ملاقات میں انکار، غیر اخلاقی بات تھی، اس لئے ایک ملاقات، کر لینی چاہیے تھی۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۷۶ء کو راولپنڈی میں، ملاقات طے ہوئی۔ میرے ساتھی وکیل، عبداللطیف دت، میر پور کے معروف سیاستدان، حاجی وہاب الدین کے نواسہ، میرے ساتھ تھے۔ حمید خان نے تعلقات کی طویل داستان کی روشنی میں، میرے روشن مستقبل پر، ہمدردانہ لیکچر دے کر فیصلہ سنایا، کہ بھٹو صاحب کا حکم تھا، کہ مجھے ہر قیمت پر پیپلز پارٹی میں شامل کرنا تھا اور پیشکش اول یہ تھی، کہ پیپلز پارٹی کا، سیکریٹری جنرل کا عہدہ اور متبادل تجویز ہائی کورٹ جج کے عہدہ پر تقرری، ان میں سے کسی عہدہ پر، تقرری میری صوابدید تھی۔ ان دنوں میری وکالت عروج پر تھی اور اس سے قبل، دو چیف جسٹس صاحبان ہائی کورٹ جج کی تقرری کے لئے، میرے حق میں سفارش کر چکے تھے۔ حمید خان، بطور چیف جسٹس اور صدر حکومت، اس سے آگاہ تھے۔ ممتاز راٹھور نے، البتہ یہ رائے دی، کہ مجھے، پیپلز پارٹی میں شامل کیے بغیر ہی، ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا جائے، تاکہ عہدہ کا تقدس قائم رہے۔ میں نے، حمید خان کی ہمدردانہ مشاورت اور بھٹو صاحب کی پیشکش کا شکریہ ادا کر کے اجازت چاہی، تو وہ وزیر امور کشمیر قائم علی شاہ، جو اپنے طور پر، ملاقات کے منتظر تھے، ان سے ملاقات کے لئے، ساتھ لے گئے، وہاں چیف سیکریٹری، اجلال حسین زیدی، میجر اورنگزیب اور ڈی آئی جی پولیس چوہدری فضل حسین بھی موجود تھے۔ قائم علی شاہ بہت خوش ہوئے اور گلے مل کر، میرا استقبال کیا، پر تکلف چائے کا پہلے سے انتظام تھا۔ انہوں نے مجھے، بھٹو صاحب کے میرے متعلق اچھے خیالات سے آگاہ کرتے ہوئے، مجھے پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کا، ان کا حکم بھی سنایا۔ ساتھ ہی حمید خان نے، اپنی مشاورت اور سفارش کا ذکر کیا، وزیر صاحب نے مبارکباد دی اور میری شمولیت کا خود ہی اعلان کر کے، مبارکباد بھی دی اور استقبالیہ خوش آمدید بھی کہا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا، کہ میں نے تو، پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا، جس پر تمام، ایک ہی آواز میں بولے کہ نہیں جی، اب فیصلہ ہو چکا ہے اور آپ کا پریس اور پی ٹی وی والوں کو، پرل کانٹی نینٹل ہوٹل راولپنڈی میں شدت سے انتظار تھا۔ میں نے اس تمام یرغمالی ڈرامہ بازی کی، سنجیدگی سے مخالفت کی اور جب بات چیخ میں، شدت پیدا ہونے لگی، تو میں نے ساتھیوں سے، مشاورت کے بہانہ پر، ایک ہفتہ کی مہلت طلب کی اس پر چیف سیکریٹری نے پھر اصرار کیا، کہ وہ اور وزیر صاحب تو، میری شمولیت کی بھٹو صاحب کو اطلاع بھی دے چکے تھے، اور اگر اس دن کانفرنس نہ ہوئی، تو بھٹو صاحب سخت ناراض ہوں گے۔ ان تمام مکالمات کے بعد، میں اپنی کار میں بیٹھا اور جان چھڑا کر، تیز رفتاری سے بھاگا کہ، کہیں ایف ایس ایف نے مزید، ناکہ نہ لگا رکھا ہو۔

میں نے میر پور پہنچتے ہی، خورشید صاحب کو، لاہور فون کر کے تمام سرگذشت سے آگاہ کیا۔ اتفاق سے اس روز صبح سے، طوفانی بارش تھی اور رات بھر مسلسل موسلا دار بارش ہوتی رہی۔ رات کو باغ سے، حسن شاہ گردیزی

بھی میرے گھر آ گئے۔ دوسرے روز گجرات میں، خورشید صاحب سے ملاقات کا فیصلہ ہوا۔ خورشید صاحب میری تمام داستان سننے کے بعد، سخت پریشان ہوئے، میں نے ان کو پہلی دفعہ گم سم کیفیت میں پاکر محسوس کیا، کہ وہ سخت ذہنی دباؤ میں تھے۔ حسن شاہ صاحب، میرے حکومتی چنگل سے نکلنے پر داد دے رہے تھے، مگر خورشید خاموش تھے، میں ان کو بار بار، بھٹو کی چالاکی اور لبریشن لیگ کو ختم کرنے کے، خطرہ سے آگاہ کر رہا تھا اور لبریشن لیگ کو بچانے کے لئے، اصرار کر رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد، انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ "پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" ان کے سوال پر میں نے کہا، "خورشید صاحب، لبریشن لیگ، اس کے سیاسی نظریہ اور آپ سے وابستگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اگر قیمت وصول کرنی ہوتی اور لبریشن لیگ کو، چھوڑنا ہوتا تو اس وقت میں، آپ کے پاس نہ ہوتا۔ اکثریتی قبائل والے آپ کے، سابق ساتھیوں کی طرح اقتدار، کی مسند پر براجمان ہوتا"۔ انہوں نے اور ان کے بعد حسن شاہ گردیزی نے مجھے گلے لگالیا، البتہ مجھے، اس دن احساس ہوا کہ خورشید جیسے، تجربہ کار، قائداعظم کی سیاسی تربیت گاہ میں پروان چڑھنے والا زیرک سیاستدان، ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک آزاد کشمیر کے سیاسی مدو جزر سے گذرنے کے باوجود، مجھے پہچان نہ سکا اور سیاست کے جنگل میں، مجھے دوسروں کی طرح عام جنس سمجھ کر، عامیانہ سلوک روا رکھے رہا اور اپنے آپ پر غصہ اور ترس بھی آیا، کہ میں کس بنجر زمین کی، آبیاری کر کے، میٹھے پھلوں کی توقع کرتا رہا۔

راجہ محمد اسلم بھی گئے

غالباً ۲۲ رمارچ ۱۹۷۶ء کو رات دس بجے، منگلا ریسٹ ہاؤس سے، حمید خان وزیراعظم کا فون آیا، کہ وہ میرے گھر آنا چاہتے تھے، میں نے ان سے کہا، کہ آپ تکلیف نہ کریں، میں خود آ جاؤں گا۔ انہوں نے گھنٹہ بھر انتظار کیا، اس دوران ان کو ملنے دیگر لوگ آ گئے۔ انہوں نے، کرنل یوسف، بابو شفیع ایم ایل اے مظفرآباد، معروف اختر عباسی وغیرہ کو مجھے ان کے پاس لے جانے کے لئے بھیجا۔ میں نے تو جانا ہی نہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دوسرے روز، چڑھوئی جلسہ میں راجہ محمد اسلم خان، میرے ۱۹۵۸ء سے دوست اور ساتھی، ممبر اسمبلی، لبریشن لیگ چھوڑ کر، پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہے تھے اور ان کو وزیر بنایا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہی نہ آیا، کہ راجہ اسلم جو مجھے ۱۹۶۰ء میں خورشید کی الیکشن میں حمایت کرنے اور ان سے ملاقات کے لئے، لے کر گئے، جو لبریشن لیگ بنانے میں محرک تھے، لبریشن لیگ کو ۱۹۷۶ء میں بحال کرنے میں پیش پیش تھے، وہ خورشید اور مجھے بتائے بغیر، اس طرح پیپلز پارٹی میں کیسے شامل ہو سکتے تھے، ان کے ساتھ ناڑ کے شبیر شاہ بھی شمولیت کا اعلان کر رہے تھے۔ شبیر شاہ کا بیٹا، شفقت شاہ تھا، جس کو اے ایس پی یا اے سی مقرر کیا جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی میں شمولیت کا نیلام عام عروج پر تھا، ان لوگوں نے رات ایک بجے تک بہت زور لگایا، مگر میں نہ گیا۔ دوسرے روز واقعی جلسہ عام میں، راجہ اسلم چلے گئے، راجہ ذوالقرنین خان تو بہت عرصہ پہلے ہی، لبریشن لیگ چھوڑ کر، پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے۔ قبائل کی سیاست کو چوہدری غلام عباس خان

نے، بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور بڑے قبائل سدھن، گجر، جاٹ اور راجپوت کو نظر انداز کر کے، غیر اکثریتی قبیلہ ڈھونڈ
حال عباسی کے نوجوان، سردار عبدالقیوم کو، مسلم کانفرنس کی قیادت سونپی، جو تاحیات اس کے قائد رہے۔

خورشید صاحب پر، ایک طرف اقتدار کے پرستار ساتھیوں، دوسرے ایک ایک کر کے، ساتھ چھوڑنے والے ساتھیوں اور تیسرا ذوالفقار علی بھٹو کا سخت دباؤ تھا، جس وجہ سے انہوں نے، اپنے طور پر ہی لبریشن لیگ کو، پیپلز پارٹی میں مدغم کرنے اور اس کی تاریخ اور جگہ کے تعین کا فیصلہ کیا۔ دو دفعہ مجھے، بحیثیت سیکریٹری جنرل، اعتماد میں نہ لیا گیا۔ پہلی دفعہ، جب ایکٹ ۱۹۷۰ء میں ترمیم، ایکٹ ۱۹۷۴ء کی شکل میں کی گئی اور دوسری دفعہ، لبریشن لیگ کے ادغام کرنے اور جلال آباد پارک میں ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۶ء میں بھٹو صاحب کو مدعو کرنے سے قبل۔ میں نے یہ خبر، اخبار میں پڑھی اور دوسرے روز فون پر خورشید صاحب نے اس کی اطلاع دی۔ مجھے پہلی بار، جب اطلاع ملی تو یقین ہی نہ آیا، مگر وہ احساس بہت عارضی ثابت ہوا۔ خبر کی صحیح اطلاع پر، میرا بلڈ پریشر بالکل نیچے چلا گیا۔ ڈاکٹر پیرزادہ نے دوائی کھلا کر، توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، تو حالت قدرے بہتر ہوئی۔ اب مظفرآباد پہنچنا تھا۔ ڈاکٹر پیرزادہ اور گھر والوں نے، زور دے کر سفر کرنے سے منع کیا، مگر اس مرحلہ پر، میرے موجود نہ ہونے سے، خورشید صاحب کی پوزیشن کمزور رہ جاتی۔ لہٰذا میں دوائی کی طاقت اور خود ہمتی کے بل بوتے پر، نہ صرف مظفرآباد پہنچا، بلکہ صبح کے جنرل کونسل کے اجلاس اور شام کے اجلاس کی، نظامت کا فرض بھی ادا کیا۔ لبریشن لیگ کی حیثیت میں جموں کشمیر کی فعال اور روشن خیال سیاسی قوت، پیپلز پارٹی کے کفن میں ملفوف، جلال آباد کے خوبصورت پارک میں دفن ہو گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خورشید صاحب نے خطبہ استقبالیہ میں اور بھٹو صاحب نے، اپنے خطاب میں جو جموں کشمیر کی آزادی اور آزاد کشمیر میں تعمیر و ترقی کا، دلکش نقشہ پیش کیا، وہ نقش بر آب ثابت ہوا اور سہانے خواب، بے تعبیر ہی رہے۔ نہ خورشید صاحب وزیراعظم بنے اور نہ ہی، جموں کشمیر کو آزادی ملی۔

پاکستان کی سیاست کا غلبہ

ریاست جموں کشمیر جو اکبر اعظم کے تسلط سے قبل، کشمیر کے نام سے الگ ملک اور سلطنت تھی۔ معاہدہ امرتسر کے تحت ڈوگرہ آمریت میں بھی، برطانوی ہندوستان سے الگ حیثیت میں، تاج برطانیہ کی پیرامونٹسی میں قائم رہی۔ یہاں کے اکثریتی عوام، مسلمانوں پر ڈوگرہ مظالم کے خلاف ہندوستان بالخصوص لاہور اور پنجاب کے مسلم پریس اور سیاسی قیادت نے بھرپور آواز بلند کی اور حمایت میں احتجاج کیا۔ البتہ ہندوستان میں آزادی کی تحریک میں، برسرپیکار سیاسی جماعتوں کے پروگرام سے متاثر اور نکتہ نظر سے متفق ہونے کے باوجود، ریاست میں انڈین کانگرس اور مسلم لیگ کی تنظیم قائم کرنے کے بجائے اول ۱۶ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو، سری نگر پتھر مسجد میں، مسلم کانفرنس قائم کی گئی، جس کو ۱۰ر جون ۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا، مگر اختلاف رائے کی وجہ سے، ۱۹ر اپریل ۱۹۴۲ء کو جموں

میں، چوہدری غلام عباس خان کی قیادت اور صدارت میں، مسلم کانفرنس کو بحال کردیا گیا۔ اس طرح مسلمان سیاسی قوت بٹ گئی۔ نیشنل کانفرنس شیخ عبداللہ کی قیادت میں، انڈین کانگرس کی ہم نوا، اور مسلم کانفرنس مسلم لیگ کی، ہم خیال ہوگئی، مگر ریاست میں، ان کا اپنا اپنا وجود قائم رہا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام اور آزادی، جو برطانوی پارلیمنٹ اور تاج برطانیہ کی پالیسی اور قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے تحت، وجود میں آئی۔ اسی کے تحت تاج برطانیہ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ کے مابین طے پانے والا ۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء کا معاہدہ امرتسر، ساقط ہوگیا، جس کے ساتھ ہی ریاست پر، تاج برطانیہ کی پیراموئنسی اور ڈوگرہ مہاراجہ کا اختیار حکمرانی بھی، ساقط اور ختم ہوگیا، اور ریاست کا اقتدار اعلیٰ ریاست کے عوام کو منتقل ہوگیا۔ قانون آزادی ہند کے تحت، ریاست جموں کشمیر اور اس کے عوام کی، بطور آزاد و خود مختار مملکت والی، حیثیت قائم ہوگئی، جیسے کہ آزاد خود مختار، ہر دو ممالک، ہندوستان اور پاکستان کی حیثیت ہے اور یہ حیثیت، آج تک بدستور قائم ہے۔

برصغیر میں راجوں مہاراجوں کی ۵۶۲ ریاستیں تھیں، ۴۲۲ بہت چھوٹی اور ۱۴۰ بڑی۔ ان ریاستوں میں، اندرونی خود مختاری تھی، ان میں سب سے بڑی، جموں کشمیر، حیدرآباد اور میسور کی ریاستیں تھیں، جو نیم خود مختار تھیں۔ حیدرآباد کے نظام نے تو، اپنے سفیر اقوام متحدہ اور پاکستان میں تعینات کر دیئے تھے۔ ٹراونکور کا حکمران اعلان کرنے ہی والا تھا، کہ ہندوستان نے پستول کی نوک پر الحاق نامہ پر دستخط کروالیے اور فوج کے ذریعے حیدرآباد اور میسور پر قبضہ کرلیا۔

جموں کشمیر میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی، استصواب رائے کے تحت حتمی فیصلہ ہونا قرار پایا تھا، مگر ہندوستان کی بدنیتی اور سازش کے نتیجہ میں، بجائے فوجوں کے انخلاء کے، سری نگر کی حکومت نے ۱۹۵۰ء میں دستور ساز اسمبلی منتخب کرلی، اور دستور کے نفاذ سے قبل ہی شیخ عبداللہ کو بغاوت کے الزام میں، ۹/اگست ۱۹۵۳ء کو گرفتار کر کے جیل میں قید کرلیا۔ بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس ختم کروا کر، جموں کشمیر انڈین کانگرس قائم کروادی، تب سے کانگرس کے بعد، ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی، ریاست کے اس حصہ میں اپنی اپنی جماعتوں کو منظم کرلیا ہوا ہے، جن میں جنتا پارٹی بھی، سرفہرست ہے۔ ہندوستان تو شروع ۱۹۴۷ء سے ہی، ہر طریقہ سے، جموں کشمیر پر، اپنے قبضہ کو طول دینے اور مسئلہ کے حل میں رخنہ ڈالنے کی حکمت عملی پر، قائم ہے۔ بالخصوص اپنے زیر قبضہ علاقہ کو، اٹوٹ انگ قرار دینے پر بضد ہے۔ بھارت کی سیاسی جماعتوں کو، ریاست میں منظم کرنا، اس کی اسی پالیسی کا حصہ ہے، مگر پاکستان، جس سے الحاق کے لئے، ریاست کے عوام نے ۱۹۴۷ء سے لاکھوں جانوں کی قربانی، مسلسل جاری رکھی ہوئی ہے۔ ان حالات میں پاکستان کے سیاستدان اور حکمران، آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں کا وجود کیوں ختم کرنے پر عمل پیرا ہیں؟ تاثر یہ ملتا ہے کہ پاکستان، اعلان تاشقند سے قبل، ۱۹۶۰ء میں۔ سندھ طاس معاہدہ اور ۱۹۷۲ء میں، معاہدہ شملہ کے بعد سے، استصواب رائے کے حق سے دست کش ہو چکا ہے اور سیاسی قیادت ہندوستان سے

مذاکرات میں، کشمیر حاصل کرنے سے، مایوس ہو چکی ہے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے، کہ بھٹو صاحب نے معاہدہ شملہ کے بعد، آزاد کشمیر میں، پیپلز پارٹی کو منظم کر کے، آزاد کشمیر کو صوبہ پاکستان بنانے کی مہم، چلانے سے قبل ہی، آزاد کشمیر کی ریگولر فوج کو ختم کر دیا تھا۔ صدر حکومت سردار ابراہیم اور صدر مسلم کانفرنس چوہدری غلام عباس سے ۲۸ راپریل ۱۹۴۹ء کو تمام اختیارات لے لینا، ۱۹۷۴ء میں وزیراعظم پاکستان کا چیئرمین کشمیر کونسل مقرر ہونا اور پاکستانی ممبران پارلیمنٹ کو، کشمیر کونسل کا ممبر مقرر کرنا اور آزاد حکومت کے اختیارات کونسل کو منتقل کرنا، گلگت بلتستان کو بدوں ترمیم دستور، پاکستان کا صوبہ ظاہر کرنا اور پیپلز پارٹی کے بعد مسلم لیگ، تحریک انصاف اور پاکستان کی دیگر جماعتوں کو آزاد کشمیر میں منظم کرنے کے عمل سے، ظاہر ہوتا ہے کہ کنٹرول لائن کو عملی طور پر سرحد تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھارت نے سیز فائر لائن پر فولادی باڑ قائم کر دی ہے۔ ان تمام امور اور دیگر شواہد، بالخصوص جنرل پرویز مشرف کے تجویز کردہ، چار نکاتی فارمولہ کا حل، ریاست کی تقسیم کی دلالت کرتے ہیں۔ مگر یہ تو ہندوستان اور پاکستان کی کشمیر پالیسی ہے، جن کا جموں کشمیر حصہ ہی نہ ہے اور ان ممالک کے عوام، جموں کشمیر کے آج تک شہری ہی نہیں ہیں، تو وہ ریاست کے مالک کیسے کہلاتے ہیں؟ جموں کشمیر کے عوام اپنی آزادی کے لئے بدستور جدوجہد میں سینہ سپر اور پرعزم ہیں اور ان شاء اللہ آزادی ان کا مقدر ہے۔

عوام کا ردعمل

لبریشن لیگ تحریک آزادی کو ایک درست سمت میں لے جانے والی جماعت کی حیثیت میں، بہت مقبول تھی اور اس کی قیادت کے ایچ خورشید جیسی روشن خیال، دیانتدار، جرأت مند، قائداعظم کے تربیت یافتہ دانشور اور سیاسی شعور کی حامل شخصیت کے پاس تھی، اس لئے اس نازک مرحلہ پر، جب کہ مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل کے ایوانوں میں حل کرنے اور جموں کشمیر کے عوام کو، آزادی دینے کے بجائے انہیں بھارت و پاکستان، دو ممالک میں دوطرفہ مذاکرات کا، یرغمال بنا دیا گیا تھا۔ اس وقت تو کشمیری عوام کو۔ عالمی سطح پر جرأت مند قیادت کی ضرورت تھی، جو ان کی صحیح نمائندگی کرتی اور وہ اس وقت صرف کے ایچ خورشید اور لبریشن لیگ ہی کر سکتی تھی۔ عوام اس بات پر سخت مایوس ہوئے اور آج تک لوگ پوچھتے ہیں کہ خورشید پر کیا دباؤ تھا، کہ انہوں نے خود بھی سیاسی خودکشی کی اور تحریک آزادی کو بھی گزند پہنچائی۔ بدقسمتی کی انتہا یہ تھی کہ جس طبقہ کو وزارت عظمٰی ملنے کی امید تھی۔ ان کی بدنیتی کی وجہ سے اقتدار بھی نہ ملا، بلکہ بھٹو اقتدار سے محروم ہو کر جیل چلے گئے۔ لبریشن لیگ کا انجام "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے!" کے مصداق تھا۔ جموں کشمیر کے تینوں حصوں میں عوام سخت مایوس ہو گئے۔

۷راگست ۱۹۷۷ء کو لبریشن لیگ کی بحالی

پیپلز پارٹی میں ادغام کے بعد، میں نے تمام تر توجہ وکالت پر دینی شروع کر دی۔ خورشید صاحب اور دیگر

ساتھی پیپلز پارٹی کی مجالس میں جاتے رہے، اب ان کی امیدوں کا مرکز بھٹو اور پیپلز پارٹی ہی تھے۔ پیر ظہیر الدین کے، لاہور میں میرے سوال کے جواب کے عین مطابق، ۵رجولائی ۱۹۷۷ء کی سحری کے وقت بھٹو کے اقتدار کا ستارہ غروب ہو گیا۔ مجھے اس کا سخت صدمہ ہوا، کہ پاکستان میں جمہوریت پھر مارشل لاء کے اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ اس صبح کو کئی ماہ کے بعد، خورشید صاحب کی آواز فون پر سنائی دی، مختصر پیغام تھا کہ گیارہ بجے تک سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی، پروفیسر ظفر، ان کے بھائی کے گھر پہنچوں۔ حسب فرمائش وہاں پہنچا تو خورشید اور حسن شاہ گردیزی، بے تابی سے منتظر تھے، غالباً ان کو میرے آنے کا یقین نہ تھا۔ کیونکہ کئی ماہ سے رابطہ ہی نہ تھا اور مزید یہ کہ، پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے بعد، ہمارے راستے اور ترجیحات ہی الگ ہو چکی تھیں۔ اس دوران نوائے وقت، جنگ اور دیگر پریس کے رپورٹر آ گئے۔ خورشید صاحب نے لبریشن لیگ، بحال کرنے کا اعلان کر دیا۔ چائے وغیرہ اور صحافیوں کے چلے جانے کے بعد، میں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اور پھر اتنی جلدی میں جماعت کے سابق اہم لوگوں کی مشاورت کے بغیر ہی جماعت بحال کر دی۔ خورشید صاحب نے جواب میں بتایا، کہ بھٹو کی گرفتاری کے بعد، کوثر نیازی نے ان کو مشورہ دیا تھا، کہ بھٹو کے اب باہر آنے اور حکومت میں واپسی کے امکانات ختم تھے، اس لئے، کوثر نیازی کا کہنا تھا کہ لبریشن لیگ کو بحال کر لو۔ میں تو اس عجلت میں جماعت کی بحالی، کوثر نیازی کی بھٹو صاحب کے مستقبل کے خاتمہ کی پیش گوئی اور ماضی کی وابستگی اور دیگر امور پر سوچ میں پڑ گیا۔ بہر حال خورشید صاحب کے ساتھ کئی بار کڑی آزمائش اور زوال کے لمحات میں ساتھ رہ کر، حسب معمول پھر ساتھ دینے کی حامی بھر لی۔ کئی لوگوں نے میرے تیسری دفعہ وفا کرنے کو حماقت قرار دیا، کچھ نے طعنے بھی دیئے، مگر میرے دل اور دماغ نے اتفاق کیا، کہ مجھے خورشید کا ساتھ ہر صورت دینا تھا، میں نے اور حسن شاہ گردیزی نے ساتھ دیا، سردار رحمت اللہ، منظور الحق ڈار، عباسپور کے خواجہ محمد شفیع اور دیگر چھوٹے کارکن ہمارے ساتھ کھڑے تو ہوئے، مگر ہزاروں کارکن، مایوسی میں، واپس ساتھ نہ آئے۔ اس مرحلہ پر پشاور کے صوفی سبحان، کوئٹہ کے سید علی اکبر شاہ، کراچی سے غلام حسن پنجابی، راجہ عنایت خان وغیرہ، راولپنڈی سے خواجہ منظور الحق ڈار، شیخ محی الدین وغیرہ، میرپور سے غلام نبی پنڈت، محمد شریف طارق، چوہدری محمد سلیمان، چوہدری اختر حسین، منشی لطیف (ڈڈیال)، مظفرآباد میں خواجہ عثمان، سردار شاہ، سردار رحمت اللہ، غلام محمد لالہ، میر عبدالعزیز، غلام نبی زرگر وغیرہ پارٹی میں واپس شامل ہوئے۔

خورشید صاحب کی حادثہ میں وفات

آزاد کشمیر میں لوکل گورنمنٹ کے انتخابات میں، وسیع پیمانہ پر دھاندلی کا الزام عائد ہوا۔ سکندر حیات وزیر اعظم اور سردار قیوم صدر حکومت تھے، ان کی حکومت کے خلاف لبریشن لیگ، پیپلز پارٹی، آزاد مسلم کانفرنس، تحریک عمل اور جماعت اسلامی کے متحدہ محاذ کے تحت، احتجاجی تحریک شروع ہوئی، اور جلسے جلوسوں کا وسیع سلسلہ

شروع ہوگیا، درجنوں کارکن گرفتار ہوئے، مظفرآباد جیل سے عوام نے ممتاز راٹھور وغیرہ کو آزاد کروالیا تھا، مسلم کانفرنس حکومت سخت دباؤ میں تھی۔ میر پور میں احتجاجی وکلاء کنونشن تھا، جس میں خورشید صاحب، عابد حسین منٹو اور پاکستان کے دیگر سینئر وکلاء بھی شامل ہوئے تھے، وہ ۱۱ر مارچ ۱۹۸۸ء کا دن تھا۔ کنونشن میں خطاب کے بعد، خورشید لاہور کے لئے عام ٹرانسپورٹ کوسٹر میں سفر کرتے ہوئے، گوجرانوالہ بائی پاس روڈ پر کوسٹر اور ٹریکٹر کے حادثہ میں وفات پاگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ میں اگلے روز ہی عمرہ کر کے لوٹا تھا، بخار اور زکام کی شدت میں بیہوش پڑا تھا کہ بار بار فون کی گھنٹی پر نیم بیدار ہوا، تو روتے ہوئے آواز سنی، کہ خورشید صاحب حادثہ میں وفات پاگئے تھے، یہ آواز فاروق سہیل کی تھی۔ نیند اور بخار کا غلبہ ختم ہوگیا۔ اسی حالت میں اٹھا مگر معلوم نہ تھا، کہ کدھر جانا تھا، اسی دوران کسی نے اطلاع دی، کہ ان کی تدفین مظفرآباد میں کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ گذشتہ دو روز سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، جو حادثہ کی وجہ بھی بنی۔ میں اس اطلاع پر مظفرآباد روانہ ہوگیا، کوہ مری برفباری میں راستہ بند ہوا، مگر کچھ توقف کے بعد گنجائش پیدا ہوگئی، کوہالہ، دولائی اور رراڑہ کے مقام پر لینڈ سلائیڈ ہو رہی تھی، گاڑیاں رکی ہوئی تھیں، مگر ڈرائیور نے خطرہ مول لیتے ہوئے سفر جاری رکھا۔ مظفرآباد میں پہلے سے ہی کہرام مچا ہوا تھا، میرے پہنچنے پر، آہ وزاری کا طوفان بپا ہوگیا۔ دوسرے روز بھی، برفباری اور بارش جاری رہی کوہالہ روڈ، جہلم ویلی چناری روڈ اور نیلم ویلی روڈ بند ہوگئی۔ بارش کی وجہ سے، ہیلی کاپٹر کے بجائے ایمبولینس میں خورشید صاحب کا تابوت، براستہ ایبٹ آباد لوہار گلی لایا گیا، اس تمام راستہ کے دونوں اطراف، لوگ امڈ کر آگئے، لوگ گاڑیوں میں اور پیدل چل کر مظفرآباد پہنچ رہے تھے، شہر کی تمام سڑکوں اور یونیورسٹی گراؤنڈ، حال خورشید سٹیڈیم میں جم غفیر جمع ہوگیا۔ دفن کرنے کے لئے، میں اور چیف سیکریٹری راحت اللہ جرال نے ہائی کورٹ کے جنوب میں، اسمبلی عمارت کے سامنے وسیع جگہ کا انتخاب کیا۔ وزیراعظم سکندر حیات اور سردار قیوم نے بھی اتفاق کیا، مگر خواجہ فاروق اور شہر کے کارکن بضد ہوگئے، کہ شہر میں دفن کریں گے۔ سردار ابراہیم خان نے بھی کارکنوں کا ساتھ دیا، جس پر، موجودہ مزار کی جگہ پر دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔

خورشید صاحب کا جنازہ تین بار پڑھایا گیا۔ عوام کی تعداد لاکھوں میں تھی، صدر سردار عبدالقیوم، وزیراعظم سکندر حیات اور حکومت پاکستان کے نمائندے وزیر امور کشمیر اور تمام سیاستدانوں، عدلیہ، انتظامیہ، ممبران اسمبلی وکونسل نے جنازہ میں شرکت کی۔ جنازہ میں سڑکوں اور چھتوں پر مرد اور خواتین موجود تھیں۔ جدھر نگاہ اٹھتی عوام ہی عوام دکھائی دیتے تھے، اس منظر سے متاثر ہوکر سردار ابراہیم خان نے بے ساختہ کہا، کہ ''اگر میرے جنازہ میں اتنے لوگ شامل ہوں تو میں ابھی مرنے کے لئے تیار ہوں''۔ آزاد کشمیر اور پاکستان کے عوام نے خورشید صاحب کو، تحریک قیام پاکستان، تحریک آزادی کشمیر، آزاد کشمیر میں بحیثیت صدر تعمیر وترقی کرنے، عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور حکومت کا تشخص قائم کرتے پر زبردست خراج عقیدت اور خراج تحسین پیش کیا، جس کا ان

کا مقبرہ، عکاس اور علمبردار ہے۔

پاکستان کے صدر ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو، معروف دانشور قانون دان اے کے بروہی، ائیر مارشل اصغر خان، نواب زادہ نصر اللہ خان، شاہ احمد نورانی، بے نظیر بھٹو صاحبہ، ہزاروں معروف دانشوروں، قائدین اور صحافیوں نے ان کو خراج تحسین پیش کیا۔ وزیراعظم جونیجو کو جب ان کے ملٹری سیکریٹری، بھمبر جنجیری کے بریگیڈیئر سعید نے کوچ کے حادثہ میں خورشید کی رحلت کی اطلاع دی، تو بقول بریگیڈیئر سعید، جونیجو کو یقین نہیں ہو رہا تھا، کہ کے ایچ خورشید کے پاس گاڑی بھی نہ تھی اور مسافر کوچ میں سفر کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوئے۔ ریاست کے نامور سیاستدان، دانشور اور عظیم صحافی، اے آر ساغر نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا، کہ جموں کشمیر میں نامور سیاستدان شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس خان تھے، ان دونوں کی خوبیاں اور اچھے اوصاف بیک وقت کے ایچ خورشید میں موجود تھے۔

محمد شریف طارق کا ابتدائی تعلق موضع کالابن تحصیل مینڈھر پونچھ سے تھا، مگر وہ راجوری میں شعبہ وکالت سے وابستہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے دباؤ اور تشدد سے نقل مکانی کر کے میرپور میں آباد ہوئے۔ علی گڑھ سے ایل ایل بی کی تھی، یہاں وکالت شروع کی۔ ۱۹۷۰ء میں حکومت کی صدارت کے انتخاب میں حصہ لیا تحریک آزادی میں بہت متحرک تھے، میرے ساتھ برادرانہ تعلق تھا، خورشید صاحب ان کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ ۱۹۷۷ء میں میری تحریک پر وہ لبریشن لیگ میں شامل ہوئے اور نائب صدر مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں میرپور شہر کے حلقہ میں لبریشن لیگ کے نامزد امیدوار کے طور پر، اسمبلی الیکشن میں حصہ بھی لیا تھا۔ میں اس وقت چیف جسٹس تھا۔ خورشید صاحب کی تدفین کے بعد، شریف طارق صاحب کو، لبریشن لیگ کا صدر مقرر کر دیا گیا تھا، انہوں نے بہت محنت سے پارٹی کو متحد اور منظم رکھا۔

پارٹی کے چند نوجوانوں نے، بیرسٹر سلطان محمود سے مشاورت کر کے، ان کو لبریشن لیگ کی قیادت کی پیشکش کی۔ چنانچہ بیرسٹر سلطان محمود نے آزاد مسلم کانفرنس کو، لبریشن لیگ میں ضم کر کے، لبریشن لیگ کی صدارت سنبھالی۔ وہ اقتدار کے متمنی تھے۔ انہوں نے اسلام آباد میں مقتدر قوتوں کی ترغیب پر، محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ سے رابطہ کر کے، وزارت عظمیٰ آزاد کشمیر کے بدلہ میں، لبریشن لیگ کو پیپلز پارٹی میں ضم کر دیا۔ لبریشن لیگ کے ساتھ یہ تیسرا حادثہ تھا۔ اول ۱۹۷۶ء میں پیپلز پارٹی میں ادغام، دوسرا ۱۹۸۸ء میں خورشید صاحب کی وفات اور تیسرا جماعت کا دوسری دفعہ پیپلز پارٹی میں ۱۹۹۴ء میں ضم کرنا۔ جماعت کے دیرینہ مخلص کارکنوں نے متحد ہو کر، بیگم ثریا خورشید صاحبہ سے رابطہ قائم کیا اور جماعت کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آزاد کشمیر کا دورہ کیا، مگر بہت ہی قلیل تعداد میں، سیاسی کارکنوں نے ان کا ساتھ دیا، مایوس کن حالت میں بھی چند کارکن، لبریشن لیگ بحال کرنے پر کمربستہ تھے۔

لبریشن لیگ میں مراجعت

مجھ میں طالب علمی کے دور سے ہی، جموں کشمیر کی آزادی کا جنون تھا، گورڈن کالج میں ۱۹۵۰ء سے طلبہ اور سیاستدانوں کے جلو میں، جدوجہد کر رہا تھا، جموں کشمیر کی آزادی کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں، جمہوریت کے قیام کی دھن بھی تھی۔ یہ جذبہ گورنمنٹ کالج لاہور اور یونیورسٹی لاء کالج میں بھی قائم رہا۔ اس جدوجہد نے ''جموں کشمیر پیپلز کانفرنس'' کو جنم دیا اور اسی تسلسل میں، لبریشن لیگ معرض وجود میں آئی تھی۔ عجب اتفاق تھا، کہ جج اور چیف جسٹس کے عہدہ پر، فائز ہونے کے بعد بیرون اور اندرون پاکستان، مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے منعقدہ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بحیثیت مہمان خصوصی، مجھے خصوصیت سے مدعو کیا جاتا تھا۔ سردار عبدالقیوم کی حکومت کے خلاف کوئی فیصلہ کرتا، تو نجی محفلوں میں تذکرہ کرتے کہ ''جسٹس ملک، جج کم اور سیاستدان زیادہ ہے''۔ جب تک میں جج اور چیف جسٹس تھا، باہر غیر ممالک سے آنے والے تمام وفود اور افراد سے، مسئلہ کشمیر پر گفتگو اور وضاحت کے لئے، مجھے ضرور شمولیت کی دعوت دی جاتی۔ سردار قیوم اور سردار ابراہیم اس کا ضرور اہتمام کرتے۔ باہر سے آنے والے سفارتکار اور میڈیا کے لوگوں کی مظفرآباد کے دورہ میں میرے ساتھ ملاقات، ان کے پروگرام میں شامل ہوتی۔ اس کی دوسری بڑی وجہ انسانی حقوق کے تحفظ میں، میرے فیصلوں کا چرچا بھی تھا۔

یورپ، امریکہ، بالخصوص برطانیہ میں میرے کافی دوست، تحریک آزادی سے وابستہ تھے۔ انگلینڈ میں ہر سال، موسم گرما کی تعطیلات کے دوران، دو ماہ وہاں رہنا ہوتا، وہاں میڈیا میں مسئلہ کشمیر پر میرے تبصرے، برطانوی ارکان پارلیمنٹ سے ملاقاتیں، اور لابی کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں میری کتاب ''جج آف دی ایسٹ'' جو لندن کی ایک کمپنی نے شائع کی تھی، کانوے ہال لندن میں اس کی تقریب رونمائی میں، وہاں مقیم پاکستانی کمیونٹی، بیرسٹرز، دانشوروں، خالصتان جلاوطن حکومت کے صدر، ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان، جنرل فیض علی چشتی، ممبران پارلیمنٹ، لارڈ ایوبری وغیرہ نے جموں کشمیر کی آزادی کی تحریک کے لئے، لندن میں مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ بہت سے احباب نے، کشمیر فنڈ قائم کرنے اور اس میں، متواتر شراکت کی یقین دہانی بھی کروائی، چند نوجوان جو جدید ٹیکنالوجی میں ماہر اور اس سے وابستہ تھے، انھوں نے بھی، اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ قریب قریب لندن میں، مرکز کے قیام کا فیصلہ ہوگیا تھا اور وہاں ابتدائی انتظامات بھی ہوگئے تھے۔

مظفرآباد میں ۱۵ ستمبر ۱۹۹۴ء کو ریٹائر ہونے پر صدر، وزیراعظم، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ اور وکلاء بار ایسوسی ایشن ہا، اور سٹاف کی طرف سے الوداعی تقریبات سے فارغ ہو کر، میر پور پہنچا، تو دوسرے روز لبریشن لیگ کے پرانے ساتھی گھر آ پہنچے اور بیٹھتے ہی میری پرانی رفاقت، خورشید صاحب سے رشتہ کا واسطہ دے کر، لبریشن لیگ کی قیادت سنبھالنے پر اصرار شروع کر دیا۔ اس اچانک یلغار نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ

نہ تھا۔ان میں پشاور سے،صوفی عبدالسبحان،راولپنڈی سے منظور الحق ڈار،عباسپور کے خواجہ شفیع،کہوٹہ سے شیخ شفیع، حوالدار حبیب اللہ،گوجرانوالہ کے حاجی علی اکبر،ڈاکٹر صغیر،راجہ خورشید،ڈڈیال کے چوہدری سلیمان،عبداللطیف ثانی، خواجہ غلام نبی پنڈت اور چوہدری محمد شریف طارق شامل تھے۔ان کی آمد اور مطالبہ،اس قدر ہنگامی انداز میں تھا،کہ سوچنے کی گنجائش ہی نہ تھی،مگر دو باتوں کا مجھے،شدت سے احساس تھا۔اول میری عمر اور عدلیہ کی سروس میں عوام سے دوری و منقطع رابطہ۔جس دن میری تقرری بطور جج ہوئی،اس دن پیدا ہونے والا بچہ،اب جوان تھا،جو مجھے جانتا تک نہ تھا اور جو جوان تھے،وہ ضعیف ہو چکے تھے۔میں خود ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے،ناکارہ ہو چکا تھا۔سیاست میں جدوجہد کرنی ہوتی تھی اور خاصا متحرک ہونا پڑتا تھا۔سیاست میں رہ کر عوام کی خواہشات کے مطابق،ان کے مسائل حل کرنے ضروری تھے،اور دوسری وجہ سرمایہ نہ ہونے کی تھی۔ان دو خامیوں کا لبریشن لیگ والوں کو احساس ہی نہ تھا، وہ ساٹھ اور ستر کی دہائی والا مجید ملک سمجھ کر آئے تھے۔جب وکالت میں آمدن اور جواں سال ہونے کے بل بوتے پر،لبریشن لیگ میں بڑی جماعت کے طور پر دم خم پیدا کر رکھا تھا۔پیپلز پارٹی میں ضم ہونے کے بعد،تو خورشید صاحب بھی جماعت کو پہلی سطح پر نہ لا سکے تھے۔ان کی وفات اور دوسری دفعہ بیرسٹر سلطان کی طرف سے ضم کرنے کے بعد لبریشن لیگ کا صرف نام ہی باقی رہ گیا تھا،جو اَب تک موجود ہے،مگر افرادی قوت غائب ہوکر، مفادات کی سیاست میں گم ہوگئی تھی۔یہ تمام لوگ میرے پارٹی میں آنے کے لئے اصرار کر رہے تھے اور میں مان نہیں رہا تھا۔مجھے اپنی کمزوریوں کا ادراک تھا کہ اسی دوران بیگم ثریا خورشید کا فون آیا،انھوں نے خورشید صاحب اور لبریشن لیگ کے ساتھ میری طویل رفاقت اور جدوجہد کا ذکر کرکے،جماعت کی قیادت سنبھالنے پر زور دیا۔میں نے اپنی وضاحت پیش کی،مگر ان کے اصرار اور بھرائی ہوئی آواز پر میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

۱۶ نومبر کو پریس کلب راولپنڈی میں کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا،مگر چند ہی دن بعد بیگم ثریا خورشید کو مقتدر قوتوں نے وفد میں،اقوام متحدہ کی،کمیٹی میٹنگ میں بھیج دیا۔ایک کوشش کی گئی،کہ بیگم ثریا ہی جماعت کی قیادت کریں،میں تو خوش تھا کہ سیاست کے جھنجھٹ سے بچ جاؤں،مگر بیگم صاحبہ اور کارکنوں نے جماعت کی قیادت میرے سپرد کر دی۔۱۸ سال بعد سیاسی اقدار بدل چکی تھیں۔نائب صدر اور سیکریٹری جنرل کے عہدوں کے چناؤ پر تنازع پیدا ہوگیا،بیگم صاحبہ نے فیصلہ کیا،مگر ان کا فیصلہ دل سے قبول نہ کیا گیا اور دو گروپ اسی روز ناراض ہوگئے، یوں جماعت ابتدا ہی میں انتشار کا شکار ہوگئی۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

عہدہ چیف جسٹس اور ماضی میں،سیکریٹری جنرل لبریشن لیگ کی،میری شہرت کام آئی اور آزاد کشمیر بھر سے دورہ کرنے کی دعوت ملی۔میں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا،مگر مخالف قوتیں بہت متحرک ہوگئیں۔میں نے

روایتی باتوں اور نعرہ بازی کی سیاست سے ہٹ کر، بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کے حقائق، جو عوام کے علم میں نہ تھے، ان سے پردہ اٹھایا اور بتایا، کہ اعلان تاشقند اور معاہدہ شملہ کے بعد، جموں کشمیر کے عوام جو ریاست کے شہری اور مالک تھے اور ان کی حیثیت مسلمہ تھی، وہ اب ثانوی پوزیشن میں، دھکیل دیئے گئے تھے۔ ان کے حق خودارادیت اور استصواب کی جگہ، ہندوستان پاکستان کے مابین دوطرفہ مذاکرات نے حاصل کر لی تھی۔ جس کا واضح ثبوت یہ تھا، کہ اُن دنوں کشمیر میں زور وشور سے جاری مقامی گوریلا جدوجہد، کے نتیجہ میں ہندوستان فوج کو، ہر مقام پر سخت ہزیمت کے باوجود، پاکستان سفارتی اور سیاسی محاذ پر محض تماش بین کے طور پر، خاموش تھا، وگرنہ مجاہدین کی عسکری کامیابیوں کو سفارتی اور سیاسی محاذ پر ہم آہنگی، پیدا کر کے ۱۹۹۳ء-۱۹۹۴ء میں جموں کشمیر کے عوام کو ہندوستان کے تسلط سے، آزاد کروایا جاسکتا تھا۔ میرے انداز بیان سے، متعلقہ شعبے متحرک ہو گئے۔ مظفر آباد، باغ، عباسپور، کہوٹہ، کوٹلی، بھمبر، ڈڈیال اور میرپور کے علاوہ پاکستان میں، پشاور، راولپنڈی، جہلم، گجرات، گوجرانوالہ، لاہور، سیالکوٹ اور کراچی میں زبردست استقبال اور خیر مقدمی جلوس اور جلسے ہوئے۔ مخالف کیمپ میں بھی خاصی ہلچل پیدا ہو گئی اور لبریشن لیگ میں نئی جان آ گئی۔ پاکستان اور مقامی پریس نے بہت ہی معاونت کی۔ اسلام آباد پریس کلب میں صحافیوں نے گپ شپ کے دوران کہا، کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں لبریشن لیگ واحد سیاسی جماعت تھی اور میں واحد سیاستدان تھا، جن کی خبریں اور بیانات بدوں چائے کے کپ کے، شائع ہوتے تھے اور یہ حقیقت بھی تھی۔

خصوصی شعبہ کا رابطہ اور ملاقات

ڈاکٹر مسفر حسن، میڈیکل پریکٹیشنر تھے، وہ خورشید صاحب کے رشتہ میں بھتیجا ہیں، ان سے ریٹائرمنٹ کے بعد، تعارف ہوا تھا۔ وہ راولپنڈی میں پریکٹس کرتے تھے۔ لبریشن لیگ میں بہت متحرک تھے۔ جس وجہ سے پارٹی کے سیکریٹری جنرل چنے گئے تھے۔ اگرچہ آزاد کشمیر میں ان کی شناخت، صرف خورشید صاحب کی وجہ سے تھی، مگر راولپنڈی اور اسلام آباد میں ان کے رابطے وسیع تر تھے۔ اچھی سیاسی سوچ اور سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، ان دنوں انگلینڈ میں ہیں۔ ان کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں اور وہاں سروس میں ہیں، ڈاکٹر مسفر کونٹی کونسلر ہیں، لیبر پارٹی میں شامل ہیں۔ وہاں لبریشن لیگ برطانیہ یورپ کے صدر ہیں۔ کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں بہت متحرک ہیں، جموں اور سرینگر میں حریت کانفرنس سے بھی رابطہ میں ہیں۔ یورپین یونین اور برطانوی ممبران پارلیمنٹ میں مسئلہ کشمیر پر لابی کرنے اور میڈیا میں مصروف رہتے ہیں۔

ڈاکٹر مسفر نے اطلاع دی، کہ راولپنڈی میں، ''خصوصی لوگ''، مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے، اس سے قبل چند لوگ مختلف اوقات میں ملاقات کر چکے تھے۔ وہ لبریشن لیگ کا تحریک آزادی سے متعلق، خاص نکتہ نظر جاننا چاہتے تھے۔ بالخصوص آزاد حکومت کو ساری ریاست کی مجاز اور نمائندہ حکومت تسلیم کروانے، اس کے مضمرات

اور طرزِ عمل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چونکہ لبریشن لیگ کا غیر روایتی پروگرام اور انداز تھا، جس وجہ سے معلوماتی ملاقاتیں مطلوب تھیں۔ ملاقات بند کمرہ میں تھی، ایک صاحب، جنھوں نے تعارف اپنے مخصوص نام اور عہدہ سے کروایا، جو میرے خیال میں فرضی تھے، تاہم رسمی جملوں کے تبادلہ کے بعد، سوالات و جوابات کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہنے کے بعد، دوسری ملاقات طے ہوئی جو دو ہفتے بعد، دوسرے مقام پر، دو مختلف اشخاص سے، اتنا ہی وقت نئے سوالات کی شکل میں جاری رہ کر، تیسری ملاقات طے ہوئی۔ اس میں چار نئے اشخاص شامل تھے، جنھوں نے بین الاقوامی امور اور مسئلہ کشمیر کے تناظر میں، تبادلہ خیال کیا۔ جس کے بعد چوتھی اور پھر پانچویں ملاقات ہوئی۔ ہر ملاقات میں مختلف لوگ، جو بہت ماہر اور تمام شعبوں، میں مخصوص تجربہ اور علم کے حامل تھے، شامل تھے۔ آخر میں دو ملاقاتیں بریگیڈیئر گلزار اور ان کے بیٹے بریگیڈیئر فاروق سے ان کے گھر میں کھانے پر ہوئیں، جن میں صاف الفاظ میں، جموں کشمیر میں جاری عسکری تحریک میں شامل ہو کر قیادت کی پیش کش کی گئی۔ ان سے بہت ہی کھل کر دوٹوک بات ہوئی۔ بریگیڈیئر گلزار بہت محبِ وطن اور جموں کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے حامی تھے۔ ان کی خواہش تھی، کہ میں ان کے پروگرام اور حکمتِ عملی میں شریک ہو جاؤں۔ میں نے ان کو، لبریشن لیگ کے مؤقف اور حکمتِ عملی کی تفصیل سے آگاہ کیا، کہ مسئلہ کشمیر کی اساس سیاست پر ہے اور اس کو سیاسی انداز میں ہی حل ہونا ہے، عسکری حربہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء میں ناکام ہو چکا تھا۔ ۲۲ راکتوبر ۱۹۴۷ء کی مہم کے نتیجہ میں، ہندوستان کو، کشمیر میں فوج داخل کرنے کا، موقع فراہم ہو گیا اور ۱۹۶۵ء کی عسکری مہم، کے نتیجہ میں سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں اور ثالثی کی کاوش کو، اول اعلان تاشقند اور بعد میں، معاہدہ شملہ کے تحت، جموں کشمیر کے عوام کے صوابدیدی حق خودارادیت اور استصواب رائے کو ختم کر کے، زمین کے تنازعہ کی شکل میں، بھارت اور پاکستان کے درمیان، مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کی شکل میں محدود کر دیا گیا تھا، اور مذاکرات کو، بھارت کی صوابدید اور سہولت کا یرغمال بنا دیا گیا تھا۔ اور یہ کہ بھارت کبھی بھی جموں کشمیر کو الگ نہیں کرے گا۔ عالمی اور خود برصغیر میں تحریک آزادی کے حوالہ سے ان کو بتایا، کہ ریاست کا مسئلہ، ریاست کے عوام کی آزادی کا مسئلہ ہے اور اس کی جدوجہد میں ریاست کے عوام اور ان کی قیادت نے ہی اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہے۔ یہ زمین کے قطعہ یا دریاؤں کے پانی کی، تقسیم کا مسئلہ نہیں تھا۔ اگر وہ لبریشن لیگ کی پالیسی اپنا کر، تحریک کا دھارا بدل لیں، تو میں اور لبریشن لیگ ان کے ساتھ چلنے کو تیار تھے، لیکن انھوں نے اس وقت کی، اپنی مسلح حکمتِ عملی کو کامیاب قرار دیا، جس وجہ سے، اُن سے رابطہ منقطع ہو گیا اور چند سال بعد مسلح جدوجہد، تاریخ کا حصہ بن گئی۔

اسمبلی الیکشن میں ناکامی

مئی ۱۹۹۶ء میں اسمبلی کے انتخابات منعقد کرنے کا اعلان ہوا۔ میرے استقبالیہ، جلوسوں اور جلسوں سے پارٹی نوجوانوں میں، لبریشن لیگ کی مقبولیت کی غلط فہمی تھی، سب نے زور شور سے الیکشن میں حصہ لینے کا مطالبہ

شروع کر دیا۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد الیکشن میں حصہ لینے پر دو سال کی پابندی تھی، مگر صدر حکومت کو، شرط میں نرمی کرنے اور اجازت دینے کا اختیار تھا۔ میرے پاس الیکشن کے اخراجات کے لئے سرمایہ ہی نہ تھا، مگر میرے ماضی کی وکالت میں آمدن اور انگلینڈ میں والد صاحب کی آمدن سے سرمایہ کافی ہونے کا، فرضی تاثر تھا۔ بطور جج ہائی کورٹ، اس وقت چار ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، پٹرول کا خرچ اپنا تھا۔ اس میں سے انکم ٹیکس بھی ادا کیا جاتا تھا۔ میرے بچے کالج اور یونیورسٹی میں، لاہور اور کراچی میں زیر تعلیم تھے۔ وہ بہت کفایت شعاری سے با عزت گذر بسر کرتے۔ میر پور اور مظفر آباد کے علاوہ امی ابو، ڈڈیال میں رہائش پذیر تھے، تین گھروں کے اخراجات کا بوجھ تھا۔ ریٹائرمنٹ پر ساڑھے بارہ ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی تھی۔ جبکہ اب، پنشن اور میڈیکل الاؤنس ملا کر، آٹھ لاکھ روپیہ ماہوار کے قریب بنتی ہے۔ میں نے مالی کمزوری اور جماعتی کمزوری کی وجہ سے کوشش کی، کہ الیکشن میں حصہ نہ لیا جائے، مگر جماعت کے سب لوگ بضد ہو گئے اور بغیر تیاری کے افرا تفری میں میر پور شہر، کوٹلی شہر اور کھوئی رٹہ تحصیل حویلی، تین حلقوں سے، الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ سنا دیا، اور کاغذات نامزدگی بھی داخل کروا دیئے۔ جب اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا، تو میرے پاس تو ایک حلقہ کے اخراجات بھی نہ تھے۔ کسی دوست ساتھی سے قرض حسنہ لے لینے کی ہمت بھی نہ تھی۔ لبریشن لیگ تو شروع سے ہی نادار جماعت تھی۔ مصیبت جب آتی ہے، تو اکیلی نہیں آتی اور یہی میرے ساتھ ہونا تھا۔

ایک گروپ کی رائے تھی کہ میر پور شہر کے حلقہ سے، الیکشن میں حصہ لیا جائے، ان کے ذہن میں عوام میں ۱۹۷۰ء اور ۷۵ء میں، لبریشن لیگ اور میری مقبولیت کا تصور تھا۔ حالانکہ اس کے بعد ۱۹۷۶ء اور ۱۹۹۳ء میں، لبریشن لیگ، پیپلز پارٹی میں انضمام کی وجہ سے، عوامی حمایت کھو چکی تھی اور ۱۹۸۵ء میں، لبریشن لیگ کے امیدوار، محمد شریف طارق، نائب صدر اس حلقہ میں خورشید صاحب کے، خود الیکشن میں مہم چلانے کے، باوجود ان کی بڑی قبیلائی گجر برادری اور مہاجرین طبقہ کی حمایت حاصل ہونے کے، وہ کامیاب نہ ہوئے تھے۔ اب وہ ہی مجھ پر اسی حلقہ کیلئے بضد تھے۔ چوہدری سلیمان بھی ان کی تائید کرتے تھے۔ دوسرا گروپ تحصیل حویلی، کھوئی رٹہ کے حلقہ سے، حصہ لینے پر اصرار کر رہا تھا۔ سردار قیوم اور سکندر حیات نے کوٹلی شہر، جہاں ملک قبیلہ اکثریت میں تھا، اس حلقہ میں مسلم کانفرنس کی طرف سے حمایت کا یقین دلایا۔ فیصلہ یہ ہوا، کہ تینوں حلقوں سے الیکشن میں حصہ لیا جائے اور آخر میں انتخابی اتحاد کی شکل میں، زیادہ عوامی حمایت کے حلقہ سے، الیکشن میں حصہ لیا جائے۔ کارکنوں کے جوش اور ہنگامہ میں میری ذاتی مشکلات پر مبنی رائے کو، کوئی وقعت نہ ملی۔ خاندان میں والدین میں سے ابوجان ۹ رجون ۱۹۸۲ء اور امی جان ۵ رفروری ۱۹۹۵ء میں، وفات پا چکے تھے۔ بچے نوجوان تھے، دونوں بھائی اور بیگم کی رائے جماعت کے ساتھ تھی۔ خاندان کے درجن کے قریب افراد، پر مشتمل خواتین و حضرات نے دن رات مہم میں تیزی سے حصہ لیا۔ افرادی قوت بہت کم تھی۔ اس طرح انجام سے باخبر، مگر مقابلہ کے عزم کے تحت، مقابلہ میں کود پڑے۔

پیپلز پارٹی کی پیشکش

کھوئیرٹہ کے حلقہ میں ممتاز حسین راٹھور، پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے۔ پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، جس کا الیکشن میں بہت دباؤ تھا۔ ممتاز راٹھور نے وزیر اعظم بینظیر بھٹو کو قائل کیا، کہ اس کی کامیابی صرف لبریشن لیگ کے اتحاد اور حمایت سے ہی ممکن تھی۔ اس کے اصرار پر بینظیر بھٹو نے، خورشید شاہ وزیر حکومت کے ذریعہ میرے ساتھ رابطہ کیا۔ میں کوٹلی میں تھا، وہاں ایک اور غیر متوقع، چائے پر ملاقات کی دعوت ملی۔ دو فوجی افسران، ایک میجر اور ایک کپتان، جن کا تعلق آئی ایس آئی سے تھا، نے مجھے بحیثیت سابق چیف جسٹس اور انسانی رواداری کے تحت، اعتماد میں لے کر بتایا، کہ مسلم کانفرنس، جو اس وقت آزاد کشمیر میں حکومت میں تھی، اس کے امیدواروں میں سے چند ایک کو، کامیاب اور اکثریت کو ناکام کروانے اور پیپلز پارٹی کی اکثریت کو کامیاب کروانے کا فیصلہ اوپر، مرکز کی سطح پر ہو چکا تھا، اور مجھے صیغہ راز میں بتایا، کہ مجھے تینوں حلقوں سے قطعی طور پر ناکام کروانے کے لئے اوپر سے ہدایات جاری ہو چکی تھیں، ان میں وہ بھی شامل تھے۔ انھوں نے اس گفتگو اور اطلاع کو راز میں رکھنے کی استدعا کی۔ ماضی کے تمام انتخابات میں، مقتدر قوتوں کے فیصلہ کے تحت، الیکشن میں کیے گئے فیصلوں پر عملدرآمد اور انجام سے، میں بخوبی آگاہ تھا۔ میرے ناپسندیدہ ہونے کی، واضح طور پر دو وجوہات تھیں، نمبر ایک۔ لبریشن لیگ کا، مسئلہ کشمیر کے حل میں، مخصوص سیاسی نظریہ اور آزاد حکومت کی سطح سے تحریک آزادی کو، متنازعہ زمین کے بجائے، عوامی آزادی کا مقام دے کر چلانے کا پروگرام اور دوسری بڑی وجہ، گلگت بلتستان کا فیصلہ ہائی کورٹ تھا۔ یہ دونوں معاملات میری کامیابی میں رکاوٹ تھے، جس سے میں بخوبی آگاہ تھا۔

بینظیر بھٹو وزیر اعظم کی دعوت پر، خورشید شاہ کے آفس میں گیا، جبکہ بی بی سے اس دن، امریکی مہمانوں کے ساتھ مصروفیت کی وجہ سے، دوسرے روز صبح دس بجے ملاقات وزیر اعظم ہاؤس میں طے ہوئی۔ خورشید شاہ بحیثیت مرکزی وزیر، الیکشن کے انچارج تھے۔ ان سے معلوم ہوا، کہ بے نظیر صاحبہ کی تجویز تھی، کہ کھوئیرٹہ میں ممتاز راٹھور اور میر پور میں، سلطان محمود کو کامیاب کروایا جائے، جس کے عوض مجھے ٹیکنوکریٹ کی سیٹ دی جائے۔ ٹیکنوکریٹ سیٹ کا انتخاب، منتخب ممبران اسمبلی کے ووٹ سے ہوتا ہے۔ ماضی قریب میں، میں ایک دفعہ بے نظیر صاحبہ کا، تلخ اور انتقامی رویہ دیکھ چکا تھا۔ گلگت بلتستان کے فیصلہ پر، وہ غصہ میں اس قدر آگ بگولہ ہوئیں، کہ انھوں نے سپریم کورٹ میں میری تقرری کی فائل پھینک دی اور میری بجائے پیپلز پارٹی کے وکیل کو، براہ راست جج سپریم کورٹ مقرر کر دیا۔ جس کی تقرری کا نوٹیفکیشن جاری کرنے سے، سردار قیوم صدر حکومت نے، اعتراض لگا کر انکار کر دیا تھا، مگر مداخلت، اثر رسوخ و مفاہمت کے بعد، بمشکل نوٹیفکیشن جاری ہوا تھا۔ میں وڈیرہ شاہی کے، رویہ، سوچ اور انتقام و کینہ کی نفسیات سے آگاہ تھا۔ بینظیر بھٹو کے ماضی کے کینہ اور انتقام کے رویہ نے میری سوچ بدل دی تھی۔ مجھے اس پر اعتماد

نہ ہوسکا کہ وہ وعدہ وفا کرے گی، بلکہ یہ سوچ غالب آ گئی، کہ الیکشن میں کامیابی کے بعد ٹیکنوکریٹ کی سیٹ بھی، مجھے نہ دی جائے گی اور میں عوام میں تماشا بن جاؤں گا۔ لہٰذا میں نے دوسرے دن ملاقات سے اجتناب کیا۔ خورشید شاہ صاحب نے کئی فون کیے، مگر میں نے ملاقات ٹال دی۔ انھوں نے گلے شکوے بھی کیے، مگر میرا اُن پر اعتماد بحال نہ ہوسکا۔

پاکستانی جماعتوں کا قیام

آزاد جموں کشمیر حکومت کے قیام سے قبل ۱۹۳۴ء میں، جموں کشمیر قانون ساز اسمبلی کا قیام عمل میں آیا۔ مہاراجہ نے ۱۹۳۹ء میں اسمبلی کی، نمائندگی میں اضافہ کیا اور ریاست کا دستور مرتب ہوا۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں اسمبلی الیکشن کے بعد، ۱۹۵۱ء میں بھارت کے زیر قبضہ جموں کشمیر کے حصہ میں، دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء میں، ریاست کا دستور نافذ ہوا، جو تا حال نافذ العمل ہے۔ اس کے برعکس، آزاد جموں کشمیر جو آزادی اور جمہوریت کے حصول کا دعویدار خطہ ہے، یہاں مہاراجہ کا دیا ہوا، حق رائے دہی معزول کر دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ حق بحال تو ہوا، مگر لوکل گورنمنٹ کے نظام کی شکل میں، البتہ ۱۹۷۰ء میں، قانون ساز اسمبلی اور صدر کے عہدہ کے انتخاب کا قانون نافذ ہوا اور ۱۹۷۴ء میں، اس میں ترمیم کر کے، صدارتی کے بجائے پارلیمانی نظام قائم ہوا، مگر دستور نافذ کرنے کے بجائے، عبوری ایکٹ سے، اب تک اسمبلی، کونسل اور صدر کے عہدہ کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۲ رجولائی ۱۹۷۲ء کے معاہد شملہ سے قبل، یہاں پر صرف ریاست کی سیاسی جماعتیں قائم تھیں، مگر ۱۹۷۳ء میں پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے بعد جماعت اسلامی، آزاد جموں کشمیر میں منظم ہوئی۔ ۲۰۱۱ء میں متحدہ قومی موومنٹ، ۲۰۱۳ء میں مسلم لیگ نون اور ۲۰۱۴ء میں تحریک انصاف معرض وجود میں آئیں۔ اس سے پیشتر پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو، گلگت بلتستان میں بھی منظم کیا گیا تھا۔ آزاد کشمیر میں بالعموم قبیلہ برادری کی فوقیت کے تحت اور خفیہ مقتدر اداروں کی ایما، پر ممبران اسمبلی اور کونسل چنے جاتے تھے۔ جبکہ پاکستانی جماعتوں کے قیام کے بعد، قبائل و برادری کے تعصب کے علاوہ بڑی سطح کی کرپشن نے، جگہ لے لی ہے اور اسمبلی و کونسل کی رکنیت، سرمایہ اور دولت کی کھلی پیشکش سے، نیلام عام ہوتی ہے۔ اس کا آغاز لاکھوں روپے سے ہوا تھا۔ اب کروڑوں میں اور مستقبل قریب میں اربوں روپیہ تک پہنچنے کو ہے، اس کے نتیجہ میں، کالے دھندہ میں ملوث مافیا حکومت کے تمام شعبوں میں دیمک کی طرح سرایت کر گیا ہے۔ تجارتی اشیاء میں ملاوٹ کسی حد تک قابل برداشت تو ہوسکتی ہے، مگر خوراک کی تمام اشیا حتیٰ کہ جعلی ادویات تک نوبت پہنچ چکی ہے، اسی طرح تمام حکومتی اداروں میں اہلیت کے بجائے رشوت کی بولی کے تابع، تقرریاں تبادلے اور ترقیابیاں، معمول بن چکا ہے۔ تمام قومی ادارے بتدریج، سیاسی وابستگیوں کی وجہ سے تنزلی اور تباہی کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ اب تو مسلط شدہ مقتدر مافیا بھی، اپنے آپ کے خلاف نالاں اور شاکی نظر آتا ہے۔

سفارتی محاذ پر جدوجہد

ہائی کورٹ جج اور چیف جسٹس کے عہدہ پر، فائز ہوتے ہوئے بھی، جموں کشمیر کی آزادی کی جدوجہد سے وابستہ رہا اور ملک کے اندر اور بیرون ملک مسئلہ کشمیر اور ہندوستان پاکستان کے مابین تعلقات اور روابط سے متعلق، سیمینارز اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہوتا رہا۔ سفارتی شعبہ کے اہلکار مظفرآباد اور میرپور میں آمد پر، مجھ سے خصوصیت سے ملتے اور مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال کرتے، جس وجہ سے اسلام آباد میں سفارتی حلقوں میں پہلے سے شناسائی اور رسائی تھی۔ مقامی سیاست کے ساتھ ساتھ، سفارتی حلقہ میں ازسرنو میں نے مہم شروع کی۔ جس کے لئے لبریشن لیگ کی، سیکیورٹی کونسل کی مسلمہ قراردادوں کے تحت استصواب رائے اور افواج کے ریاست سے انخلا کی، حکمت عملی پر، عملدرآمد اور حصول آزادی کے اقدام کی حمایت، حاصل کرنا مقصد تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں، برطانیہ کے ہائی کمشنر سے ملاقات کا آغاز کیا گیا۔ ان سے ملاقات میں، بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ اس میٹنگ کے نتیجہ میں، لندن فارن آفس سے یکے بعد دیگرے، دوبار میری میٹنگ ہوئی۔ فرانس کے سفیر کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی اور سفیر نے میری میٹنگ فرانس کی فارن آفس پیرس میں، فارن سیکریٹری سے طے کی، چنانچہ پیرس فارن آفس میں ہماری میٹنگ چار گھنٹے تک رہی۔ اس میٹنگ میں، میری معاونت ڈاکٹر مسفر حسن اور ڈڈیال ایب کے، میاں ممتاز حسین نے کی تھی۔ امریکہ کے سفارتی عملہ سے میری زیادہ شناسائی تھی، کیونکہ مظفرآباد اور اسلام آباد میں، اُن سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی، تاہم امریکی سفیر سے تین دفعہ ملاقات ہوئی۔ جرمنی کے سفیر اور سوئٹزرلینڈ کے سفیر سے، ایک بار اور دوسری بار فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے سفیروں سے، مشترکہ ملاقات ہوئی۔ چین کے سفیر اور ایران کے سفیروں سے ملاقات کافی طویل تھی۔ ان تمام ملاقاتوں میں ڈاکٹر مسفر حسن، لبریشن لیگ کے سیکریٹری جنرل اور جماعت کے فارن سیکریٹری، عبداللطیف ثانی آف ڈڈیال، میرے معاون کے طور پر شامل تھے۔ یوکرین کے سفیر سے ملاقات خاصی دلچسپ رہی۔ اس کو جموں کشمیر کے گلیشیرز، دریاؤں کے پانی اور معدنی ذخائر تک کا علم تھا۔ اس نے بتایا کہ ایشیا میں کشمیر اور یوکرین میں پانی، معدنی اور تیل و گیس کے ذخائر زیادہ ہیں، جس سے کئی ہزار میگاواٹ بجلی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے پڑوسی ممالک حریص نیت سے، جموں کشمیر کو آزادی مشکل سے ہی دیں گے۔ جبکہ یوکرین کو چار سو سال کے بعد آزادی ملی تھی، جو پھر خطرہ میں تھی۔ چنانچہ اب یوکرین پھر تقسیم ہو گیا ہے۔

ان تمام ملاقاتوں میں ہندوستان و پاکستان کی پالیسی، جموں کشمیر کی تقسیم کی نشاندہی کرتی ہوئی ظاہر کی گئی تھی، تاہم یہ تسلیم کیا گیا، کہ جموں کشمیر وہاں کے آباد عوام کا ملک ہے، یہ متحد اور غیر منقسم، صرف آزاد ملک کی حیثیت سے ہی رہ سکتا ہے، جس کا تمام دارومدار، جموں کشمیر کے باشندوں کی اجتماعی سوچ اور فیصلہ پر ہے۔ بصورت دیگر شملہ معاہدہ کے بعد، اب جموں کشمیر میں استصواب رائے کے بجائے، ہندوستان اور پاکستان صرف مذاکرات سے

ہی، مسئلہ کشمیر حل کرنے کے مجاز ہیں۔ گو کہ کشمیری عوام معاہدہ شملہ میں فریق نہیں ہیں، تاہم ان کی رائے کا احترام ان کی آزادی کے مطالبہ کے تابع ہے۔ البتہ تمام سفیروں سے ملاقات اور تبادلہ خیالات میں، معاہدہ شملہ کی اثرات غالب رہے۔

گریٹ ہال کشمیر کانفرنس

اس امر کا ذکر ہو چکا ہے کہ، برطانوی ممبران پارلیمنٹ نے، پارلیمنٹری کشمیر کمیٹی ۱۹۹۰ء میں، لارڈ ایوبری کی صدارت میں قائم کی تھی، جس نے پارلیمنٹ کے ایوانوں کے اندر اور باہر، جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت اور آزادی کی جدوجہد کو کامیاب کروانے کے لئے، بھرپور مہم کا آغاز کیا۔ یہ گروپ ۶۵ ممبران سے شروع ہو کر، ۱۶۰ کی حد تک منظم ہوا تھا، مگر اس میں کمی بیشی کا عمل جاری رہا۔ ابتداء میں، اس میں کلیدی کردار، لارڈ ایوبری کے ساتھ ساتھ، بریڈفورڈ سے ممبر پارلیمنٹ، میکس میڈن، برمنگھم سے روجر گاڈسیف اور مانچسٹر کے جیرالڈ کوفمین نے، پرعزم طریقہ سے ادا کیا۔ جموں کشمیر کے عوام، ان کے ممنون احسان ہیں، اب میرپور کے لارڈ نذیر احمد اور راجہ دھانی کے لارڈ قربان حسین بھی خاصے متحرک ہیں۔ برطانوی ممبران پارلیمنٹ، جن کا نام لیا گیا ہے، جموں کشمیر کے دونوں حصوں کا، دورہ کر چکے ہیں اور عوام کے سب طبقوں سے مل چکے ہیں۔ برطانوی پارلیمانی گروپ کی طرز پر، یورپین پارلیمنٹ کے اندر بھی، کشمیری عوام کی آزادی کے حق میں گروپ منظم ہو چکا ہے، جس میں پاکستانی نژاد مسٹر کریم، ممبر پارلیمنٹ بہت متحرک ہے۔ لارڈ ایوبری، روجر گاڈسیف، جمی بوئیس اور یورپین پارلیمنٹ کے ممبر نارمن ویسٹ لارڈ نذیر اور مجھے وفد میں شامل کر کے، یو این سیکریٹری جنرل بطروس غالی، ڈپٹی اور اسسٹنٹ سیکریٹریز سے اقوام متحدہ میں، مسئلہ کشمیر کے حل اور ریاستی عوام کی آزادی کے حق میں، ملاقات بھی کر چکے ہیں۔ یہ ملاقات ۴ر نومبر ۱۹۹۳ء کو ہوئی تھی اور ۵ر نومبر کو امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، جنوبی ایشیا کے شعبہ کے انچارج، اور سینیٹر براؤن اور فارن افیئرز کے انچارج سینیٹر منی ہون سے بھی، جموں کشمیر کی آزادی پر مفصل تبادلہ خیال ہوا تھا۔ ان ملاقاتوں میں تحریک آزادی کی جدوجہد اور موجودہ صورت حال پر گفتگو کی ذمہ داری، مجھے سونپی گئی تھی۔

چیئرمین کشمیر پارلیمنٹری کمیٹی یا گروپ، روجر گاڈسف نے گریٹ ہال لندن میں ایک کشمیر کانفرنس ۲ر جولائی ۱۹۹۶ء کو منعقد کی، جس میں تمام ممبران برطانوی پارلیمنٹ پاکستان کے وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی، ممبر پارلیمنٹ ملک قاسم اور آزاد کشمیر کے وزیر اعظم بیرسٹر سلطان محمود، حریت کانفرنس کے غلام محمد صفی اور مجھے مدعو کیا گیا۔ ذاتی مصروفیت کی وجہ سے، میں نے معذرت کی، مگر انھوں نے میری شمولیت پر اصرار کیا، جس وجہ سے جانا پڑا۔ چیئرمین کمیٹی، روجر گاڈسف نے استقبالیہ کلمات میں، مسئلہ کشمیر کے حل کی اہمیت، اس مسئلہ سے ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ، تحریک آزادی کے صحیح ترجمان اور، جموں کشمیر کے مسئلہ کو، عوامی امنگوں اور تاریخی حقائق کے پیرائے میں

پیش کرنے اور قائل کرنے کی، میری اہلیت اور ذہانت کی، زبردست تعریف کی، بلکہ جوشِ خطابت میں، مسئلہ کشمیر پر مجھے مکمل اتھارٹی اور اپنا استاد تک کہہ دیا۔ جس پر زبردست تالیاں بجیں اور اجتماع میں ڈڈیال کے گاؤں تاجپور، کے گلاسگو سے آئے ہوئے، چوہدری مجید نے، جذبات میں میرے نام سے، نعرہ بازی شروع کردی۔ کانفرنس دو تین وقفوں سے، تمام دن جاری رہی اور متفقہ اعلامیہ میں ''جموں کشمیر سے افواج کے مکمل انخلا اور عوام کی آزادی کی، حمایت کی گئی''۔ کانفرنس میں ابتدائی مرحلہ پر منتظمین کو، پاکستان کی اس وقت کی حکومتی قیادت کے خلاف، شکایت اور مسئلہ کشمیر سے عدم دلچسپی پر، اظہارِ ناراضگی کا موقع تب ملا، جب وزیر خارجہ آصف احمد علی، سینیٹر ملک قاسم اور بیرسٹر سلطان محمود، نے ابتداء ہی میں تقریر کرنے اور رخصت ہونے کا مطالبہ کیا اور کانفرنس سے چلے گئے اور قریب میں واقع پب، شراب خانہ میں داخل ہوتے دیکھے گئے۔ ممبران پارلیمنٹ کی اس برہمی کا، ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

کانفرنس میں برطانوی ممبران پارلیمنٹ کی کثیر تعداد نے حصہ لے کر، جموں کشمیر کے عوام کی آزادی اور بیرونی افواج کے انخلا پر زور دیا۔ اعلامیہ میں ہندوستان کے سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں سے انحراف، اور شملہ معاہدہ کے تحت مذاکرات سے لیت ولعل کی مذمت کی گئی اور برطانوی حکومت کو بحیثیت مستقل رکن سیکیورٹی کونسل، سربراہ دولت مشترکہ اور سابق حکمران برصغیر، مسئلہ کشمیر کے حل اور جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کے حق میں، کردار ادا کرنے کی تاکید کی گئی۔ گریٹ ہال کانفرنس، برطانیہ کے عوامی نمائندگان کی طرف سے، پہلی عظیم کوشش تھی۔ ہندوستان نے سفارتی سطح پر، اس کانفرنس کے انعقاد کے خلاف، زبردست مہم چلائی اور حکومتی سطح پر بھی، اثر رسوخ بروئے کار لایا، مگر ناکام رہا۔ ہندوستان کے باشندے، لاکھوں کی تعداد میں، برطانیہ میں آباد ہیں۔ ان کی اور ہندوستانی نژاد ممبران پارلیمنٹ کی کوشش ناکام رہی۔ دوسری طرف پاکستان میں سیاستدان، اس کانفرنس کی اہمیت سے قطعی لاتعلق، اقتدار کی جنگ میں برسرِ پیکار تھے، ان کو کانفرنس کی اہمیت کا احساس ہی نہ تھا۔ محترمہ بینظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں، وہ اس سے قبل مسٹر راجیو گاندھی، وزیر اعظم ہندوستان کی اسلام آباد آمد کے موقع پر، ان سے اس قدر متاثر تھیں، کہ ان کے حکم پر، کشمیر کے نام پر آویزاں تمام بینرز حتیٰ کہ کشمیر ہاؤس کے بورڈ تک اتروا دیئے گئے تھے۔ بعدازاں نومبر ۱۹۹۳ء میں امریکہ کی پیش کردہ، خودمختار جموں کشمیر کی تجویز بھی، انہوں نے مسترد کردی تھی، جس کے نتیجہ میں، ہندوستان نے ریاست پر اپنی گرفت، مزید مضبوط کرلی تھی۔

ولنگٹن کانفرنس انگلینڈ

مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے مجھے پاکستان میں، اور باہر کے ممالک امریکہ، یورپ بالخصوص برطانیہ، نیپال کھٹمنڈو، ہندوستان، سرینگر اور جموں میں اکثر اوقات بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا اور معروف دانشوروں، علماء، سفارتکاروں اور مختلف ممالک کے ماہرین قانون امور خارجہ اور بین الاقوامی تنازعات کے ماہرین

سے ملاقات ہوئی۔ ولنگٹن کانفرنس اعلیٰ سطح کے دانشوروں اور عالمی ماہرین کی شرکت کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کا ایجنڈا برصغیر ہندوستان و پاکستان کے تعلقات، جنوبی ایشیا کی سیکیورٹی اور مسئلہ کشمیر کے مستقل حل پر مشتمل تھا۔ ہندوستان، پاکستان، جموں کشمیر، امریکہ، چین اور برطانیہ سے ماہرین اس میں مدعو تھے۔ آزاد کشمیر سے سردار عبدالقیوم خان اور مجھے مدعو کیا گیا تھا، پاکستان کے سیکریٹری امور خارجہ، قائداعظم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رفعت حسین اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر افتخار وغیرہ کو بھی دعوت ملی تھی۔ ہندوستان سے، سیکریٹری خارجہ کے علاوہ سینئر صحافی، ایم جے اکبر، سابق کمانڈر انچیف، جنرل ویدپرکاش ملک، جنرل اشوک مہتہ، سابق سیکریٹری خارجہ اور ہندوستانی سفیر سلیمان حیدر، جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر متو، کشمیر ٹائمز جموں کشمیر کے چیف ایڈیٹر، وید بھسین اور دیگر، امریکہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، جنوبی ایشیا شعبہ کی انچارج، ڈاکٹر رابن رافیل اور پروفیسر ورسنگ، اسی طرح دیگر ممالک سے ایک سو کے قریب مندوبین بھی، کانفرنس میں شامل ہوئے۔

۲۴ تا ۲۸ رفروری سال ۲۰۰۳ء میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسلام آباد سے ۲۲ رفروری کو لندن تک ہم نے اکٹھے سفر کیا۔ ہیتھرو میں پاکستان کے سفارتی عملہ نے ہمارا استقبال کیا۔ کانفرنس انتظامیہ کی کاریں منتظر تھیں۔ چنانچہ ہم آرام سے ولنگٹن پہنچے۔ سردار عبدالقیوم کے ساتھ، کرنل فاروق بحیثیت معاون کے علاوہ، دولڑکے بھی بطور ذاتی عملہ سفر کر رہے تھے، جن کو امیگریشن کے عملہ نے روک کر، انکوائری شروع کر دی، جس پر کافی پریشانی اور تاخیر بھی ہوئی، مگر ہائی کمشنر پاکستان کی مداخلت اور ضمانت پر ان کو اجازت ملی۔ شاید وہ برطانیہ میں ہی رہ گئے اور واپس نہ آئے۔ میرا نواسہ احسن ممتاز، میرے معاون کے طور پر کانفرنس میں شامل ہوا۔

سلیمان حیدر سے ملاقات

ولنگٹن کی وسیع و بلند وبالا عمارت کے استقبالیہ میں، مندوبین کانفرنس کی آمد جاری تھی۔ مجھے رہائشی کمرہ دوسری منزل پر ملا۔ ابھی جیکٹ اتار کر ٹکٹائی کھول ہی رہا تھا، کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سفید کرتہ پاجامہ میں ملبوس، موٹے فریم کی عینک لگائے، گندمی رنگ، میانہ قد، پُر وقار شخصیت کے حامل آدمی، جس کی شکل ناآشنا سی تھی مگر آنکھوں میں چاہت کی چمک تھی، بولے آپ جسٹس ملک ہیں؟ میں نے ہاں ہی کہا تھا، کہ وہ لپک کر گلے لگ گئے اور طمطراق سے کہا "سلیمان حیدر"۔ سلیمان حیدر ہندوستان میں، مسلمانوں میں معروف دانشور، ادبی، علمی، سفارتی حلقوں میں مشہور نام تھا، کئی کانفرنسوں میں ان کی ذہانت، معاملہ فہمی اور تدبر کا چرچا ہوا کرتا، جس وجہ سے ان سے ملاقات کی تمنا بھی تھی۔ اس پس منظر میں، اچانک ملاقات سے، دونوں جانب مسرت دوبالا ہوگئی وہ میری طرف اور میں، ان کی طرف دیکھ کر، دوبارہ گلے لگ گئے۔ ہندوستان کے سفارتی شعبہ میں، سلیمان حیدر بڑا نام تھا، وہ کافی عرصہ سیکریٹری خارجہ اور سفیر کے عہدہ پر فائز رہے۔ اسلام آباد میں بھی ہائی کمشنر رہ چکے تھے، اتفاق سے اوائل عمر سے ہی مجھے

معروف لوگوں سے ملاقات کا شوق بھی تھا اور اس جذبہ کی وجہ سے، بزرگوں سے سیکھنے سمجھنے کا تجربہ، بہت فائدہ مند رہا۔

عشاء کے وقت کھانے کے ہال میں داخل ہوا تو ڈاکٹر متو، جن سے پہلے سے ملاقات تھی دیکھتے ہی، تپاک سے ملے، کشمیر اور ہندوستان سے آنے والوں سے میرا تعارف کروایا۔ وید بھسین سے پہلے سے شناسائی تھی، وہ میر پور سے ۱۹۴۷ء میں نقل مکانی کر گئے تھے، سری نگر سے انھوں نے، روزنامہ کشمیر ٹائمز کا اجراء کیا تھا۔ ان دنوں ہندوستان، پاکستان اور جموں کشمیر میں گلگت بلتستان سے متعلق، میرے ہائی کورٹ میں فیصلہ کا، بہت چرچا تھا، یہ فیصلہ عدلیہ کے علاوہ سفارتی اور سیاسی حلقوں میں بھی، میری شہرت اور شناخت بن گیا تھا، جس وجہ سے ہر مقام پر پذیرائی ہوتی اور لوگ ملاقات کے، متمنی اور خواہشمند ہوتے۔

کانفرنس کے میزبان نے، کانفرنس کے ابتدائیہ میں، ایجنڈا کی روشنی میں مندوبین کو خوش آمدید کہا اور مجھے دعوت خطاب دی۔ میں نے مسئلہ کشمیر پر، جدوجہد آزادی، کشمیر کی تاریخ، معاہدہ امرتسر، اس کے خلاف عوامی ردعمل، قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے تحت ریاست کی آزاد و خودمختار حیثیت کا قیام، اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل اور کمشن کی قراردادوں اور ان کے نقیض اعلان تاشقند، بالخصوص معاہدہ شملہ کے حوالہ سے، یو این او چارٹر کے تحت حق خودارادیت کی روشنی میں، افواج کے مکمل انخلا اور جموں کشمیر کے عوام کی آزادیوں سے محرومی، انسانی حقوق کی شب و روز پامالی، بالخصوص خواتین کی عصمت دری اور ہندوستان کی ریاستی دہشت گردی کی نشاندہی کی تو کانفرنس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ تمام حقائق برجستہ اور دقیق پیرائے میں بیان کرنے پر زبردست تائیدی داد ملی۔ رات کو کھانے پر امریکہ کی رابن رافیل اور میزبان خاتون نے، ریاست میں معروضی حالات کے پیش نظر ہندوستان و پاکستان کے درمیان، معاہدہ شملہ کی روشنی میں، سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں سے ہٹ کر، دیگر موزوں حل قبول کرنے پر دلائل پیش کیے، مگر میں حق خودارادیت کی حمایت پر، قائم رہا۔ بالآخر، میں نے رابن رافیل کی ۱۹۹۳ء کی رپورٹ کی یاددہانی کرواتے ہوئے، ریاست کی مکمل خودمختاری کی تجویز پر اتفاق کیا، تو وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ کانفرنس میں میرا نواسہ احسن ممتاز بھی شامل تھا۔

دوسری صبح ناشتہ کے بڑے میز پر کوئی خالی نشست نہ پا کر، میں چھوٹے ٹیبل پر بیٹھا ہی تھا کہ سلیمان حیدر اور رابن رافیل اور پروفیسر ورسنگ بھی اسی میز پر آ گئے۔ صبح بخیر کہنے کے بعد، سلیمان حیدر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، کہ جسٹس ملک، گذشتہ روز جب آپ جموں کشمیر کی جدوجہد آزادی، عوام پر تشدد اور ان کے حقوق کی پامالی بیان کر رہے تھے، تو جذبات میں میرے آنسو چھلک پڑے اور میں نے ان پر مشکل سے قابو پایا۔

سلیمان حیدر کی تجویز

سلیمان حیدر نے بتایا، کہ ''مسئلہ کشمیر کے متعلق ہندوستان کی پالیسی مرتب کرنے میں، ان کی ذہانت اور

خون پسینہ بھی شامل ہے۔ ہندوستان کی کشمیر پالیسی بقول ان کے، 'سٹینس کو' قائم رکھنا اور اس کو طول دینا تھا، کیونکہ مسئلہ جب بھی طے یا حل ہوگا، ہندوستان کو تمام جموں کشمیر یا اس کا بڑا حصہ چھوڑنا ہوگا۔ ہندوستان نے دینا ہی دینا تھا، لینا کچھ بھی نہ تھا۔ ہندوستان کے حق میں، کسی مرحلہ پر، اگر کشمیری عوام کی اکثریت ہوتی، تو ہندوستان استصواب رائے پر متفق ہوگیا ہوتا۔ لہٰذا ہندوستان مذاکرات وغیرہ کے ذریعہ وقت گذارنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ انھوں نے کہا، کہ شاید میں اتفاق نہ کروں، مگر پاکستان کے سیاسی اور فوجی حکمران بھی، مسئلہ کشمیر کو اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار میں رہنے کے لئے پاکستانی عوام میں، استعمال کرتے چلے آرہے تھے اور آئندہ بھی وہی رویہ قائم رہے گا''۔ ناشتہ کے بڑے میز پر بیٹھے، فاروق عبداللہ کی طرف اس نے اشارہ کر کے کہا، کہ'' کشمیری عوام کو کنٹرول کرنے اور ان پر تسلط قائم رکھنے کے لئے ہندوستان اس کو استعمال کرتا اور اقتدار میں لاتا چلا آرہا تھا۔ اور وہ سمجھ رہا تھا، کہ وہ ہندوستان کو بلیک میل کرنے میں کامیاب تھا''۔ اسی طرح اس نے سردار قیوم کی طرف اشارہ کر کے کہا، کہ'' اس کو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ استعمال کرتی چلی آرہی تھی، اور اس کو آزاد کشمیر میں مقتدر کر کے، وہاں تسلط قائم کر رکھا تھا اور سردار قیوم الحاق پاکستان کے نعرہ سے، پاکستان کو مسلسل بلیک میل کرنے میں کامیاب تھا''۔ اس نے کہا کہ'' جموں کشمیر کے عوام کی تحریک آزادی ان چار اجارہ دار قوتوں نے ہائی جیک کر رکھی تھی''۔ اس نے مزید کہا کہ'' میں نے تحریک آزادی کے ساتھ آپ کا خلوص محسوس کر کے اپنا دل کھول کر حقیقت بیان کر دی تھی''۔ اس نے تجویز دی کہ '' جسٹس ملک تم کو اور جموں کشمیر کے عوام کو متفق اور متحد ہو کر، ان چار قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے سے ہی آزادی حاصل ہوگی''۔ سلیمان حیدر کی تجویز کی ہر دو، رابن رافیل اور پروفیسر ورسنگ نے بھی مکمل تائید کی۔ رابن رافیل گذشتہ شام بھی، مجھ سے بحث میں، سلیمان حیدر سے ملتے جلتے دلائل دے رہی تھی۔ پروفیسر ورسنگ '' جموں کشمیر کے دریاؤں کے پانی سے متعلق، سندھ طاس معاہدہ جس میں ہمارے حقوق کا قطعی تحفظ نہیں کیا گیا تھا اور ہمیں فریق ہی نہیں بنایا گیا تھا، اس کے متعلق اس حد تک مجھ سے متفق تھے، کہ دریاؤں سے پیدا ہونے والی بجلی کی پیداوار اور آمدن کا حق، جموں کشمیر کا تھا، البتہ آبپاشی کا جزوی حق پاکستان کا بھی تھا۔ تاہم ہندوستان کسی طرح بھی، اس کا حقدار نہ تھا، تاوقتیکہ ریاست کا الحاق اس کے ساتھ نہ ہو''۔ ناشتہ کے دوران، ہماری گفتگو بہت معلوماتی رہی۔ آخر میں آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے اور سیاسی و سفارتی محاذ پر، فوکس قائم رکھنے پر توجہ دلائے جانے پر، بات ختم ہوئی۔

جنرل وید پرکاش ملک اور جنرل اشوک مہتہ کی پیدائش کوہاٹ اور کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ ان کے خاندانوں نے، ۱۹۴۷ء میں نقل مکانی کی تھی، جنرل وید ملک، کمانڈر انچیف کے عہدہ سے ریٹائر ہونے تھے۔ کانفرنس کے دوران وہ سادہ لباس میں ہی ملبوس رہے۔ پاکستان کے جرنیلوں کی، کئی کئی مربع اراضی حاصل کرنے سے متعلق، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جرنیلوں کو اتنی زمین کیسے حاصل ہوئی تھی؟ ان دنوں جنرل پرویز مشرف پاکستان کے

صدر تھے۔ میں نے جنرل ویدسے کہا، کہ آپ جرنیلوں کے کئی کئی مربع زمینوں پر قابض ہونے کی وجہ دریافت کر رہے ہیں، جبکہ پاکستان میں ایک جرنیل نے سارے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا، اس جواب پر وہ کھل کر ہنسا۔ جنرل وید ملک نے بتایا، کہ ریٹائرمنٹ پر دہلی میں پنشن کے علاوہ، فوجی افسروں کی کالونی میں دو بیڈروم پر مشتمل رہائشی کوارٹر، اس کو حکومت سے ملا تھا۔ دہلی شہر میں مہنگائی کی وجہ سے، پنشن کی رقم سے، ان خاوند بیوی کی گذر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ چنانچہ مہنگائی سے تنگ ہوکر، دہلی کا کوارٹر فروخت کر کے، چندی گڑھ میں مکان لیا، چندی گڑھ نسبتاً سستا شہر تھا، جہاں ان کی باعزت گذر بسر ہو رہی تھی، کوہاٹ میں پیدائش کی وجہ سے ان کی قد وقامت پٹھانوں جیسی ہی تھی۔ بہت سادہ مزاج اور معتدل طبع کے مالک تھے۔ ان کا کہنا تھا، کہ پاکستان کے جرنیل ریٹائرمنٹ پر امریکہ اور یورپ میں منتقل ہو کر وہاں کاروبار اور بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک بنے ہوئے ہیں، ان کی تو خوب عیش ہے۔ میں نے وضاحت کی، کہ سبھی ایسے نہیں ہیں، بلکہ چند ایک ایسے ہیں، مگر انہوں نے میرے ساتھ اتفاق نہ کیا۔

جنرل مہتہ کی پیدائش کوئٹہ کی ہے۔ جنرل وید کی نسبت وہ زیادہ تیز طرار تھا اور لداخ میں، چین کے قبضہ اور بھارت کے شمال مشرقی حصہ تبت سے، منسلک ہونے کی وجہ سے چین کے خلاف دفاع کے لئے، سیاچن اور جموں کشمیر پر، ہندوستان کے تسلط کو لازمی سمجھتا تھا۔ ہندوستان کی سیکیورٹی بہ نسبت پاکستان، بقول اس کے، زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اس نے کانفرنس میں بھی یہی مؤقف اپنایا۔

احسن ممتاز، میرا نواسہ میرے ساتھ بحیثیت معاون کے، کانفرنس میں شامل ہوا تھا۔ دو دن کے بعد گروپ میٹنگوں میں، وہ سردار عبدالقیوم گروپ اور میں، دوسرے گروپ میں شامل رہا۔ اکثر میرے ہمراہ مختلف مجالس اور جلسوں میں شریک ہونے اور فیملی میں سیاسی امور پر بحث مباحثہ سے، مسئلہ کشمیر اور پاکستان ہندوستان کے مابین، متنازعہ امور پر میرے بیٹوں، شوکت مجید، شاہد اور ارشد کی طرح، اس کو بھی عبور حاصل ہے اور وہ، اپنی سوچ اور رائے رکھتا ہے۔ گروپ میٹنگوں میں، اس نے بھی خوب حصہ لیا، جس سے سردار عبدالقیوم اور کرنل فاروق بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کی بہت تعریف کی۔ بین الاقوامی کانفرنس میں معروف دانشوروں اور ماہرین کی گفتگو، ان کے رویہ اور تہذیبی اقدار سے اس کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ میری وجہ سے اس کو شفقت اور پیار ملا۔

لیسٹر، انگلینڈ کشمیر کانفرنس

۱۹۹۵ء میں انگلینڈ کے شہر لیسٹر میں، ایوب ٹھاکر اور پروفیسر خورشید احمد نے جموں کشمیر کے تینوں حصوں، پاکستان اور ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی، آل پارٹیز کشمیر کانفرنس منعقد کی۔ تین روزہ کانفرنس میں، پاکستان اور ہندوستان کے وزراء، اور لندن میں مقیم ہائی کمشنر بھی مدعو تھے۔ کانفرنس میں، پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں، دلائل پیش کیے گئے۔ میں نے ہندوستان کی، پاکستان سے دشمنی کی وجہ سے، افواج کے انخلاء اور

استصواب سے انکار پر، ہٹ دھرمی کے رویہ کی روشنی میں، الحاق سے ہٹ کر، عوام کی آزادی اور ریاست کو خودمختار حیثیت دینے کی، تجویز پیش کی۔ جس کی تائید جموں اور سری نگر کے مندوبین نے بھی کی۔

کانفرنس میں ہندوستان کے ہوم منسٹر، مسٹر ونود بھی شامل تھے۔ اس نے وقفہ کے دوران ملاقات کی خواہش کی، ملاقات میں اس نے، ریاست کو خودمختار بنانے پر اس میں نظام حکومت، غیر مسلم شہریوں کے حقوق کے تعین اور ضمانت، ریاست کی معیشت اور دفاع کے بنیادی امور کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان سے ریاست کے تعلقات سے متعلق سوالات کیے۔ ابتدائی تبادلہ خیالات کے بعد، اس نے مجھے، دہلی آنے کی دعوت دی، مگر مجھے تو ہندوستان نے تین بار، سری نگر جانے کے لئے ویزہ دینے سے، ناپسندیدہ قرار دے کر، انکار کر رکھا تھا۔ یہ بتانے پر وہ مسکرایا اور دہلی دعوت دینے کا وعدہ کیا، مگر حسب عادت وعدہ ایفانہ کر پایا۔

پاکستان انڈیا، پیپلز ٹو پیپلز کنٹیکٹ گروپ فورم میٹنگ لاہور

ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر، پاکستان پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں، ۱۹۶۷ء میں منظم اور قائم ہوئی، بھٹو حکومت میں ڈاکٹر مبشر وزیر خزانہ تھے۔ اب بھٹو شہید پیپلز پارٹی (غنوئی بھٹو گروپ) میں سینئر رہنما ہیں۔ ضعیف العمر ہونے کے باوجود بہت متحرک ہیں۔ ان کی تجویز پر، پاکستان انڈیا عوام گروپ فورم کی شکل میں قائم ہوا، جس کے ہزاروں رکن ہیں۔ اس فورم میں، سول سوسائٹی اور بیشتر دانشور شامل ہیں۔ ڈاکٹر مبشر کی دعوت پر میں نے، ۲۰ رجون ۲۰۰۴ء کو لاہور میں پہلی دفعہ، فورم کے اجلاس میں شرکت کی۔ دوسری دفعہ ۵ سے ۷ رستمبر ۲۰۰۴ء میں، لاہور میں ہی دسویں سالانہ کنونشن کی تقریبات میں شرکت کی۔ میرے ہمراہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھی، آزاد کشمیر بھٹو شہید پیپلز پارٹی کے چیئرمین، منیر حسین چوہدری ایڈووکیٹ بھی تھے۔ ہندوستان سے دو سو سے زائد مندوبین آئے تھے۔ ہندوستان و پاکستان کے مابین، مختلف اہم امور پر تقاریر اور سوال و جواب ہوئے۔ ان میں اہم ترین معاملہ، مسئلہ کشمیر بھی، ایجنڈا میں سرفہرست تھا۔ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کے لئے، مجھے دعوت دی گئی۔ غالباً یہ تجویز، ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی تھی۔ میرے مخصوص نظریہ اور سیاسی فکر سے، ڈاکٹر مبشر حسن بخوبی آگاہ تھے۔ میں نے اپنا نکتہ نظر، بیعنامہ امرتسر کے خلاف عوامی تحریک کے پس منظر، قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء اور سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان و پاکستان کے مؤقف اور متفقہ مسلمہ متعدد، قراردادوں کی روشنی میں، واضح کیا، کہ ریاست آزاد خودمختار حیثیت میں ہے، جس کے اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہیں اور یہ کہ ریاست میں موجود، افواج ہندوستان و پاکستان، دونوں انخلاء کے پابند ہیں اور تینوں منقسم حصوں کا متحد ہو کر، قومی حکومت کے قیام کے بعد، عوام نے آزاد رہنے یا الحاق کرنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ تقریر کے بعد، سوالات جوابات ہوئے اور اجلاس میں وقفہ ہوا۔

ڈاکٹر راج موہن گاندھی سے تعارف

ڈاکٹر مبشر حسن اور چند دیگر، پاکستان اور جموں کشمیر سے آئے احباب، میری تقریر کا تعریفی تجزیہ کرنے میں مصروف تھے، کہ اس دوران، ایک دبلا پتلا، لمبے کرتا پاجامہ میں ملبوس، چہرہ پر موٹے فریم کی عینک لگائے اور کندھے پر لمبا سا کپڑے کا بیگ لٹکائے شخص، محفل میں داخل ہوا۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے، تعارف کرواتے ہوئے کہا ''جسٹس ملک، ڈاکٹر راج موہن گاندھی''، نام سنتے ہی غائبانہ تعارف پر، میں کھڑا ہو گیا، ہاتھ ملایا تو ڈاکٹر راج موہن گلے ملے۔ میری تقریر پر تعریفی تبصرہ کے ساتھ ہی کہا کہ ''آپ کے خیالات اور نکتہ نظر، دہلی کے حکمرانوں تک پہنچنا ضروری ہیں، جس کے لئے آپ کو دہلی آنا ہوگا''۔ میں نے بتایا کہ دہلی کی حکومت نے، مجھے ناپسندیدہ قرار دے کر، بلیک لسٹ قرار دے رکھا تھا، لہٰذا وہاں جانا ممکن نہ تھا۔ اس پر انہوں نے سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، کہ ''اس کا انتظام وہ کریں گے''۔ ہم میرپور اپنے چیمبر میں محوِ گفتگو تھے، کہ دہلی سے ڈاکٹر راج موہن کا فون آیا۔ انہوں نے میرے اور چند دیگر ساتھیوں کے کوائف طلب کیے جنہیں دہلی مدعو کیا جا سکے۔ اس وقت میرے پاس، راجہ خالد اکبر، چوہدری منیر حسین اور پروفیسر نذیر انجم بھی موجود تھے، انہوں نے بھی وہاں جانے کی حامی بھری۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو مطلوبہ کوائف سے آگاہ کر دیا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ''سرینگر کانفرنس'' کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ جموں کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھنا، بادی النظر میں، ہندوستان کے رویہ کی روشنی میں تقریباً ناممکن تھا۔ ہمیں جولائی کے وسط میں، بھارت کے سفارتخانہ میں، ویزہ کے لئے پاسپورٹ ارسال کرنے کا کہا گیا۔ یہ ذمہ داری چوہدری منیر حسین کو سونپی گئی۔ یہاں یہ ذکر کر دوں کہ ڈاکٹر راج موہن، ہندوستان کے عظیم لیڈر، مہاتما گاندھی کے پوتے ہیں۔ ان کا شمار، دنیا کے معروف دانشوروں اور مفکرین میں ہوتا ہے، وہ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں لیکچر دینے کے لئے، مدعو کیے جاتے ہیں، وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کو بطور سکالر، کئی بین الاقوامی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ لاہور کنونشن میں ان سے ملاقات، میرے ہندوستان جانے کا، قدرت کی طرف سے سبب بنا تھا، وگرنہ تو وہاں جانا ممکن نہ تھا۔

سری نگر میں کشمیر کانفرنس

ہم کو بتایا گیا، کہ کانفرنس ۲۹ رجولائی سے ۳۱ رجولائی ۲۰۰۵ء کو سری نگر میں ہوگی اور واپسی پر، تین دن قیام جموں میں بھی ہوگا۔ خالد اکبر، ریاست کے معروف لیڈر، راجہ اکبر خان کے بیٹے ہیں، وہ آزادی سے قبل راجہ صاحب کے ساتھ، سری نگر اور جموں میں جا چکے تھے، شیخ عبداللہ کے خاندان سے، ان کے ذاتی مراسم تھے۔ چوہدری منیر حسین بھی ڈاکٹر بھیم سنگھ کی دعوت پر، جموں و سری نگر جا چکے تھے، البتہ میرا یہ پہلا سفر تھا۔ جموں کشمیر میں ویدبھسین صحافی اور سیاستدان کرشن دیو سیٹھی، کا تعلق میرپور سے تھا، بلراج پوری صحافی اور سیاستدان سے شناسائی

اور ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی۔ میرپور سے نقل مکانی کرنے والے ہندو اور سکھ، جموں شہر، پٹھانکوٹ، امرتسر، چنڈی گڑھ، اور دہلی میں آباد تھے۔ رلیہ اکبر صاحب میرپور سے ہفت روزہ اخبار ''سچ'' نکالتے تھے۔ ان کی یاد میں، ان کے ساتھی، ترلوک چند، پنڈی سکھروال، کھڑی سے نقل مکانی کرنے والے، اب جموں سے روزنامہ کے طور پر شائع کرتے تھے۔ جموں اور سری نگر میں سیاسی، عدلیہ اور وکلاء میں لوگ میرے نام اور خاندان سے شناسا تھے، اس کا مجھے کم ہی علم تھا۔ کانفرنس کا موضوع ''انٹرا کشمیر ڈائیلاگ'' تھا۔ اس کے میزبان سینٹر فار ڈائیلاگ اینڈ ری کنسیلیشن اور دہلی پالیسی گروپ، دو این جی اوز کے ممبران اور ڈائریکٹرز تھے۔ پہلی این جی او، ڈاکٹر راج موہن کی نگرانی میں، ممبئی کی میڈم سوشوبھا بھاروے کے زیر انتظام اور دوسری میڈم ڈاکٹر رادھا کے زیر انتظام کام کرتی ہیں، جن کی مالی معاونت غالباً جرمنی اور امریکہ سے ہوتی تھی۔

۲۷ر جولائی ۲۰۰۵ء کی صبح میرپور سے، واہگہ کے لئے روانہ ہوئے، اس سے قبل متحدہ ہندوستان یا آزادی کے بعد، واہگہ سے آگے جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ امرتسر میں مختصر قیام اور اشوک ہوٹل میں لنچ کے بعد، گورداسپور سے گذر کر، مادھو پور سے راوی عبور کر کے، لکھن پور کٹھوعہ میں داخل ہوئے۔ پنجاب سے ریاست میں داخل ہوتے وقت، عجیب اپنائیت اور خود اعتمادی کا احساس پیدا ہوا، رات دس بجے کے قریب، جموں پہنچے۔ عشائیہ کی میزبانی، جموں چیمبر آف کامرس کی تھی۔ پریس کلب کے بڑے ہال میں انتظام تھا۔ ہمارے انتظار میں شہر کے مرد و خواتین امڈ کر آ گئے۔ جموں شہر اور اس کے مضافات میں، نومبر ۱۹۴۷ء میں مسلمان لاکھوں کی تعداد میں، شہید کر دیے گئے تھے اور نوجوان خواتین کو اغواء کیا گیا تھا۔ ماضی کے اندوہناک واقعات کے احساسات کی یلغار میں، شہر میں داخل ہوئے تھے، مگر استقبال میں منتظر، جم غفیر دیکھ کر، ششدر رہ گئے۔ مرد و خواتین سگے بہن بھائیوں کی طرح، گمشدہ بھائی کے کنبہ میں واپس آ جانے پر، خوشی میں نڈھال ہو جانے کی طرح، بغل گیر ہو رہے تھے اور ہاتھ اور منہ چومتے تھے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں، خوشی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ عجب پُر مسرت مگر، حیران کن ماحول اور سماں تھا، جس کی عکاسی کے لئے، موزوں الفاظ نہ ہیں۔ سبھی لوگ میرے خاندان اور میری زندگی سے متعلق شناسا اور واقف معلوم ہوئے۔ عشائیہ میں استقبالیہ کلمات میں مختصر تعریفی اور خوش آمدید کے کلمات کے ساتھ مجھ سے، میرپور کی زبان میں، اپنے تاثرات بیان کرنے پر اصرار کیا گیا۔ شفیقانہ اور محبت و خلوص کے اس ماحول میں، فرط جذبات میں، جب میں نے اتنا کہا کہ ''بہنو اور بھائیو! جموں آ کر یہ محسوس ہوا، کہ کئی سالوں کی جدائی کے بعد اپنے گھر لوٹا ہوں''۔ یہ الفاظ میرپوری زبان، جو پوٹھوہاری، ہندکو اور ڈوگری زبان کا اختلاط ہے، میں نے ادا کیے ہی تھے، کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ دوسرے روز جموں کے تمام اخباروں میں سرخی میں رپورٹ ہوا ''جسٹس مجید ملک کی جموں، اپنے گھر میں آمد'' ہندوستان کے ٹیلی ویژن پر، یہ پروگرام لائیو نشر ہو رہا تھا۔ کانفرنس کے میزبانوں کو، جموں میں ہمارا استقبال دیکھ

کر بہت تعجب ہوا۔ خوشی کی لہر دیکھ کر، ان کو یقین نہ آ رہا تھا، کہ جموں کی ہندو اکثریتی آبادی، ہمارا اس طرح استقبال کرے گی۔ اس کا انہوں نے، نہ صرف برملا اظہار کیا، بلکہ انہوں نے ہندوستان کے وزیراعظم کو مطلع کیا کہ ''جسٹس ملک نے، جموں میں جوش وخروش اور ہلچل پیدا کر دی''۔

دوسری صبح ہوائی جہاز سے سری نگر کے لئے روانہ ہوئے۔ پنجال کی چوٹیوں سے کشمیر کی وادی اور جھیل ڈل کا، پہلی دفعہ، فضائی نظارہ بہت دلکش لگا۔ جوں ہی جہاز نے اترنا شروع کیا تو بلندی سے وادی کا خوبصورت منظر، میدان جنگ کی شکل اختیار کرتا ہوا، محسوس ہونے لگا، ایئر پورٹ کے اردگرد توپیں، آرمرڈ گاڑیاں اور ہر طرف مسلح سیکیورٹی کا غلبہ تھا۔ جموں کے کھلے ڈھلے، ماحول کے بالکل برعکس، خاموشی، سراسیمگی اور گھٹن کی کیفیت دکھائی دی۔ ہمارے پہلے سے جانے والے، چند مرد و خواتین، ہمارے جہاز سے اترنے کے بعد انگلیوں کے اشاروں سے، ہم سے ناآشنا افراد سے، ہمارا تعارف کرواتے دکھائی دیئے۔ خاموشی سے استقبالیہ الفاظ کہے اور سنے گئے اور وہ بھی بہت محتاط اور انجانے خوف میں مبتلا، کیفیت میں، میں اس ماحول سے ناواقف، اس سوچ میں گم تھا کہ سرینگر کے میزبانوں کے دلوں میں پیار، کشش، تڑپ اور گرم جوشی کیوں نہ تھی؟ جب کہ ہمارے دل ان سے ملنے کے لئے بے قراری سے، سینے میں اچھل رہے تھے۔ ہندوستان کی سیکیورٹی فورسز، سول لباس اور یونیفارم میں حفاظت سے زیادہ معلومات کی غرض سے، میرے اردگرد موجود تھیں۔ ایئر پورٹ سے ہوٹل تک، ہمیں سخت حفاظت میں، لے جایا گیا، راستہ میں قدم قدم پر، فوجی مسلح چوکیاں قائم دیکھ کر، سری نگر کے عوام کی حالت پر، ترس آیا اور بہت دکھ بھی ہوا۔ مگر اس کے علاوہ، وہاں ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟ خیالات کے ہجوم اور سیکیورٹی فورسز کے حصار میں، سری نگر کا قدرتی حسن بھی، افسردہ افسردہ سا تھا۔

سنتور ہوٹل میں قیام

سیکیورٹی کی حفاظت میں، جھیل ڈل میں واقع، فائیو سٹار ہوٹل میں پہنچے۔ موسم معتدل، آسمان صاف، ہلکی ہلکی ہوا کی سرسراہٹ میں، ڈل میں لہریں سرگوشیاں کرتے سر اٹھاتیں اور تہہ میں غائب ہو جاتیں۔ یہ خواب تھا کہ حقیقت! اس کیفیت میں چناروں اور سرو کی آغوش میں، کئی رنگوں کے پھولوں کے درمیان، گاڑی اچانک رکی اور ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو میں چونک گیا، تب احساس ہوا کہ میں فی الحقیقت سرینگر کی دھرتی پہ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر راج موہن مسکراتے ہوئے، آگے بڑھے اور میرا بازو تھام کر بولے ''جسٹس ملک، آپ سری نگر میں ہیں''۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ ''اللہ کا شکر ہے کہ ناممکن، ممکن ہوا اور ایک بچپن کی تمنا، بارآور ہوئی'' اور پھر ان کا بھی شکریہ ادا کیا۔ زعفران کا کشمیری قہوہ پیش کیا گیا، اُس کی خوشبو اور خوش ذائقہ ہونے کی وجہ سے، خلاف ادب، بجائے ایک کے، دو کپ پی گیا۔

حضرت بل، خواب کی تعبیر

نجانے کیوں شروع سے ہی، جب کشمیر جانے والے خاندان کے کسی بزرگ، خاص کر ماموں عبدالعزیز، جنہوں نے وہاں ملازمت کی تھی اور ماموں نور محمد، جو ایس پی کالج میں، طالب علم رہ چکے تھے۔ ان سے کشمیر وادی کے حسن کی تعریف سنتا، تو امنگ پیدا ہوتی، کہ کالج جانے کی عمر میں، سری نگر کے کالج میں، داخل ہوں گا۔ مگر ابھی میٹرک تک ہی پہنچا تھا کہ تاریخ کا دھارا بدل گیا۔ کشمیر کی تاریخ میں، دیگر اعلیٰ مقامات کے ساتھ ساتھ، حضرت بل کو، جناب رسول پاک ﷺ کے موئے مبارک کی وجہ سے، خاص اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔ بچپن سے ایک آرزو نے دل و دماغ میں بسیرا کر رکھا تھا، کہ جب کبھی سری نگر، جانے کا اتفاق ہوا، تو شکرانے کے نوافل، حضرت بل کی مسجد میں ادا کروں گا۔ قہوہ کی پہلی سُر کی پر فوراً، ماضی کی تمنا نمودار ہوئی، میں نے وہاں موجود میزبانوں اور ملاقات کے لئے آنے والوں سے کنی کترا کر، شلوار قمیض تبدیل کی اور پہلے سے شناسا خاتون، دل افروز سے رازدارانہ سرگوشی کی، کہ مجھے حضرت بل ابھی جانا تھا۔ اس نے چپکے سے مجھے اپنی کار میں بٹھایا اور دونوں بغیر کسی کو بتائے، سرپٹ جھیل ڈل کے شمال مشرقی کنارے والی سڑک سے، حضرت بل جا پہنچے۔ میں نے ظہر کی قضا اور عصر کی نماز سے قبل نوافل ادا کر کے شکرانے کی دعا کی، مسجد کا غور سے جائزہ لے کر، اس کی ماضی کی تاریخ اور عظمت کا جائزہ لے ہی رہا تھا، کہ سری نگر کے نوجوانوں کو، میری وہاں موجودگی کا علم ہو گیا، اچانک بہت سے لوگ جمع ہو گئے، چہ جائیکہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو، میں جلدی جلدی ہاتھ ملاتے ہوئے کار تک پہنچا۔ دل افروز لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر پریشان تھی، مگر ہم وہاں سے پُرامن نکل آئے اور حضرت بل میں، نماز ادا کرنے کی تمنا پوری ہونے پر، میں بے حد مسرور و مخمور تھا۔ ہوٹل پہنچے تو میرے اچانک غائب ہونے پر سب پریشان تھے۔ ہمیں دیکھ کر، ان کی جان میں جان آئی۔ سب ناراض ہوئے، کہ اس طرح بغیر سیکیورٹی کے میرا جانا خطرناک تھا، مگر دل و دماغ پر سکون اور مطمئن تھا، گویا کہ میں میرپور اپنے گھر میں تھا۔ ہوٹل میں وکلاء، طلباء اور دیگر کے علاوہ، یٰسین ملک بھی تشریف فرما تھے۔ ان میں چند ایک شناسا تھے، باقیوں میں کچھ سے غائبانہ تعارف تھا، زیادہ تر نئے چہرے تھے۔

ہندوستان شرمندہ تھا

۲۹ رجولائی ۲۰۰۵ء صبح نو بجے کانفرنس کا آغاز ہوا۔ ۱۱۵ مندوبین، جموں کشمیر کے تینوں منقسم حصوں، پاکستان اور ہندوستان سے، ۱۹۴۷ء کے بعد، پہلی دفعہ سری نگر میں مسئلہ جموں کشمیر کے حل پر، سوچ و بچار کے لئے، جمع ہوئے تھے۔ ان ممالک کے علاوہ، دنیا بھر کی توجہ، کانفرنس کے نتائج پر تھی۔ سری نگر میں کانفرنس کی اجازت اور ہندوستان کی کشمیر پالیسی میں، تبدیلی یا نرمی کو، سراہا گیا تھا۔ ہمارا وہاں جانا بالخصوص، مجھے اجازت ملنا، پاکستان اور جموں کشمیر میں باعث حیرت تھا۔ محترمہ سوشوبھا بھاروے نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور کانفرنس کے

پہلے سیشن کا ایجنڈا پیش کیا۔ ڈاکٹر راج موہن گاندھی نے تقریر کا آغاز ان الفاظ میں کیا، ''ہم آج بہت شرمندہ ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے مقامی اور بین الاقوامی سطح پر، جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت اور آزادی کا جو عہد کیا تھا، وہ ہم پورا نہ کر سکے''۔ انہوں نے مسئلہ کی تفصیل اور حالات حاضرہ پر، تنقیدی تجزیہ پیش کیا۔ ان کے ابتدائی کلمات سے، سب لوگ چونک گئے کہ ہندوستان میں، حق اور برجستہ سچ کہنے والا، کوئی شخص موجود تھا۔ اس کے بعد، مجھے دعوت دی گئی، میں نے ریاست کے تاریخی پس منظر، قانون آزادی ہند اور ہندوستان و پاکستان کے اقوام متحدہ میں موقف اور قراردادوں کی روشنی میں، تجزیہ پیش کرتے ہوئے، اپنی گفتگو، تین نکات پر ختم کی۔ اول معاہدہ امرتسر، قانون آزادی ہند کے تحت، ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ساقط ہو جانے پر، ریاست کو آزاد خودمختار حیثیت حاصل ہو گئی اور اقتدار اعلیٰ ریاست جموں کشمیر کے عوام کو از خود عود ہو گیا، جس طرح ہندوستان و پاکستان آزاد ہو گئے اسی قانونی و اخلاقی اور سیاسی اصول کے تحت، ریاست کو بھی آزادی حاصل ہو گئی۔ مہاراجہ کا اختیار حکمرانی اور الحاق بھی ساقط اور ختم ہو گیا۔ یہ پوزیشن ہندوستان کی کانگریسی قیادت، مسلم لیگ اور قائداعظم، برطانوی پارلیمنٹ اور کیبنٹ مشن نے تسلیم کر رکھی تھی اور سیکیورٹی کونسل میں، ۱۵ر جنوری ۱۹۴۸ء میں گوپال سوامی آئینگر، نمائندہ ہندوستان نے اپنی تقریر میں تجویز کیا تھا، کہ جموں کشمیر کے عوام کو، حق اور اختیار حاصل تھا، کہ وہ پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کریں یا آزاد و خودمختار حیثیت اختیار کریں اور اقوام متحدہ میں رکنیت بھی حاصل کر لیں، جس پر چوہدری ظفراللہ خان نے۔ الحاق کی تجویز دی، چنانچہ اتفاق رائے سے الحاق کرنے کے متعلق قرارداد منظور ہوئی۔ دوئم یہ کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو سیز فائر یا جنگ بندی، دونوں ممالک کی افواج کے درمیان ہوئی تھی، اس کا اطلاق ریاست کے عوام کے نقل و حمل، باہمی تجارت، بنیادی انسانی حقوق اور تعلقات پر نہ تھا۔ لہٰذا دونوں بلکہ تینوں حصوں کے ریاستی عوام کو، ساری ریاست میں آزادانہ آنے جانے کا اختیار حاصل ہے اور تیسرا نظریہ یہ تھا کہ جموں کشمیر کے عوام، سیکیورٹی کونسل میں، بطور فریق شامل نہ تھے، جب کہ کسی ایک ملک سے الحاق کی قراردادیں، یو این چارٹر کے تحت محض تجویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ لازم نہ تھا، کہ الحاق ضرور کیا جائے، اس صورت میں لازم تھا، کہ اب، جبکہ ریاست میں جنگ ختم ہو چکی تھی، امن بحال ہو چکا تھا، تو دونوں ممالک کی افواج اپنے اپنے ملک کی سرحد پر چلی جائیں اور ریاست کے اندرونی امن اور سلامتی کے لئے، مقامی فورس قائم کی جائے، جو بالآخر ریاست کے تمام خطوں اور عوام کی رائے سے، بڑی جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل قومی حکومت و ریاست میں دستور ساز اسمبلی منتخب کروا کر، آئینی نمائندہ حکومت قائم کرے۔ میری ان تجاویز پر سٹینفس کو کے حامی، خاصے جز بز ہوئے، مگر تاخیر سے میری بات سمجھ آنے پر، راضی ہوئے۔ کانفرنس کے چار سیشن، شام تک ہوتے رہے، شام کو کافی لوگ ہمیں ملنے آئے۔ ان میں طلباء، وکلاء اور سیاسی کارکنوں کے علاوہ تاجر بھی تھے۔ سب کی گفتگو میں، ہندوستان کے رویہ کے خلاف اور شہر میں فوجی چوکیوں

کی بھتات، ہر چوکی پر پڑتال اور تلاشی کے خلاف سخت نفرت کا اظہار تھا۔ سری نگر کانفرنس سے لوگوں کو نئی امید ملی، کہ شاید کوئی راستہ نکلنے والا تھا، مگر یہ خام خیالی تھی، جو نوجوان ملتے، صرف یہ ہی سوال کرتے کہ ''ملک صاحب ہمیں آزادی کب ملے گی''۔ کشمیر کی وادی شمال مشرق میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور بلند پہاڑوں اور جنوب مغرب میں پیر پنجال کے بلند و بالا جنگلات کی اوٹ میں دامن سمیٹے ہوئے ہے، ماحولیاتی گہرائی کو کہ خوبصورت مرغزاروں، میٹھے، زود ہضم، ٹھنڈے پانی کے چشموں، باغات اور درمیان میں حسین جھیل ڈل سے نکلتا، دریائے جہلم جاذب نظر اور دلفریب، منظر پیش کرتے ہیں، مگر ہندوستان کے سیاہ فام، ناپسندیدہ خدوخال والے، پستہ قد فوجی، بھدی وردی میں، کشمیر کے حسن کو، پامال اور آلودہ کیے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے، کشمیر میں بہت گھٹن تھی۔ ایک ہفتہ قیام کے دوران ماسوائے چند محافل اور ضیافتوں کے زیادہ وقت کانفرنس میں منفی و پیچیدہ معاملات کے حل اور سہولتوں پر سوچ و بچار میں صرف ہوا۔

علی گیلانی، یٰسین ملک اور حریت رہنماؤں سے ملاقات

علی گیلانی صاحب، بزرگ رہنما ہیں، کشمیر کی آزادی کی تحریک کا مرکز اور محور خیال کیے جاتے ہیں، ان کے ظہرانہ پر، بہت تفصیل سے تبادلہ خیال ہوا، وہ پہلے سے ہی میری سوچ سے آگاہ تھے۔ وہ سیکیورٹی کونسل کے تحت استصواب رائے اور الحاق پاکستان کے پاکستانیوں سے کہیں زیادہ، دل و جان سے حامی ہیں، جب کہ یٰسین ملک، آزاد و خودمختار ریاست کا علمبردار ہے، باقی حریت، مصلحت اور متضاد نظریات پر، اکتفا کرنے والی ہے۔ شبیر شاہ، میر واعظ عمر فاروق اور دیگر سے رسمی ملاقات تھی۔ علی گیلانی دل و دماغ کو یکجا کر کے بات کرتے، یہی پوزیشن یٰسین ملک کی تھی، باقی لوگ آدھی بات کرتے، جس کا مطلب دونوں طرف نکالا جا سکتا تھا، اسی وجہ سے، ہندوستان اور پاکستان، کشمیر کی قیادت پر مکمل بھروسہ نہیں کرتے اور اپنے اپنے مقاصد کی، سہولت کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ علی گیلانی اس بات پر مصر تھے، کہ کشمیر کو متنازعہ تسلیم کیا جائے، تبھی پاکستان ہندوستان سے مذاکرات کرے، وگرنہ مذاکرات سے گریز کیا جائے۔ راجہ خالد اکبر اور منیر حسین چوہدری ان سے ایک گھنٹہ تبادلہ خیالات کرتے رہے، مگر وہ کشمیر کو متنازعہ پہلے، تسلیم کروانے پر بضد تھے۔ میں نے ان کو ذہن نشین کروایا، کہ یہ ہندوستان کا مؤقف تھا، کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان، کشمیر کے خطہ یا زمین کے لین دین کا جھگڑا، یا تنازع تھا اور دانستہ یا غیر دانستہ، پاکستان بھی اسی مؤقف کے انداز میں، ہمارے حق خود ارادیت کے استعمال پر، زور دیتا ہے مگر عملاً، ہندوستان کو، مذاکرات میں جموں کشمیر کی، زمین کی تقسیم، کی متعدد تجاویز ریاست کے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر، پاکستان کافی پیش رفت کر چکا تھا اور ان دنوں سر کریک کے تنازعہ کے انداز میں، صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم منموہن سنگھ، حتمی تقسیم کشمیر کرنے کے لئے تیار بھی ہو چکے تھے۔ جبکہ ریاست کے عوام کی تحریک ڈوگرہ مہاراجہ اور بعد میں، ۱۹۴۷ء سے ہندوستان کے خلاف، آزادی کی تحریک تھی، الحاق کا فیصلہ آزادی کی حیثیت کے تابع تھا۔ اور الحاق کرنا یا نہ کرنا اور کن کن شعبوں میں کرنا

تھا، صرف عوام کی صوابدید کے تابع تھا۔ الحاق کرنا لازمی نہیں، بلکہ صوابدیدی تھا۔ قریب چار گھنٹے بہت تفصیل سے تبادلہ خیالات کے بعد، ہم میں اول آزادی اور بعد میں الحاق، کے اصول پر اتفاق ہوا۔ تاہم علی گیلانی کو ریاست کے، پاکستان سے الحاق میں یقین ہے اور ان کی جدوجہد، الحاق پاکستان کے حق میں ہے۔

دیگر ملاقاتیں

میر واعظ عمر فاروق، پروفیسر عبدالغنی بھٹ اور حریت کے دیگر قائدین سے، حریت کے دفتر میں چائے پر ملاقات ہوئی۔ ان کی گفتگو بہت ہی محتاط تھی۔ اس کے بعد شبیر شاہ سے، ان کی رہائش پر ایک گھنٹہ تک ملاقات رہی۔ ان سے یہ پہلی ملاقات تھی البتہ قبل ازیں، فون پر ان سے تفصیلی بات ہو چکی تھی۔ عبدالغنی لون معروف کشمیری قائد تحریک آزادی، جن کو اسلام آباد، مظفر آباد اور میرپور کا دورہ کرنے کے بعد شہید کر دیا گیا تھا۔ ان سے ہماری بہت نظریاتی ہم آہنگی تھی۔ وہ میرے گھر بھی تشریف لائے تھے۔ بہت زیرک، دلیر اور مخلص راہنما تھے۔ سجاد لون اور بلال لون ان کے بیٹے ہیں، مگر مختلف سوچ کے حامل ہیں۔ عبدالغنی لون کی بیوہ سے تعزیت کی۔ محمد اعظم انقلابی بھی تحریک میں ایک بڑا نام ہے، ان سے ملاقات، پہلے سے تھی۔ ان کے ہاں بھی لمبی محفل رہی۔ جہاد کے گذشتہ سالوں میں اعظم انقلابی اور ڈاکٹر غلام قادر وانی، دو بہت مخلص، دیانتدار، خوددار اور باوقار نوجوان، تحریک میں منظر عام پر آئے تھے۔ ڈاکٹر غلام قادر وانی پاکستان آئے اور جب واپس کشمیر گئے، تو ان کو جرأت سے تحریک کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کی وجہ سے، شہید کر دیا گیا، البتہ اعظم انقلابی ابھی تک سلامت ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور نڈر، بے باک کشمیری عبدالحمید کریمی ہیں، تحریک سے مخلص ہیں، مگر وہ ابھی میرپور/مظفر آباد میں مقیم ہیں۔ مخلص سنجیدہ سوچ کے حامل فاروق رحمانی، محمود ساغر اور یوسف نسیم، اسلام آباد کے شہری بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ، جموں کشمیر کی آزادی کے قافلۂ جہاد میں، ایک معروف نام درہال ملکاں، راجوری سے ملک محمد اسلم کا ہے، جس نے جموں کشمیر اور انڈیا کی مختلف جیلوں میں سخت سزائیں برداشت کیں اور اب میرپور میں آزادی کی نئی راہ کی تلاش میں، سرگرداں ہیں۔

سنٹرل بار میں دعوت

جموں کشمیر میں حکومت کا سیکریٹریٹ، جس کو مہاراجہ کی حکمرانی میں دربار کہتے تھے۔ موسم سرما میں، چھ ماہ جموں میں اور گرمیوں میں چھ ماہ کے لئے، سری نگر منتقل ہوتا ہے، دونوں شہر دارالحکومت کہلاتے ہیں۔ ان دنوں سرینگر میں نظامت تھی۔ ہائی کورٹ بھی سرینگر میں مقدمات کی سماعت کر رہا تھا۔ میاں عبدالقیوم صدر مرکزی بار کی دعوت پر، بار روم میں وکلاء سے ملاقات ہوئی، ان کی گفتگو میں، ہندوستانی افواج کے مظالم کے دردناک واقعات سن کر، سب لوگ آبدیدہ ہو گئے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ بار روم، ماتم کدہ کی شکل اختیار کر گیا۔ جذبات کی شدت میں، میں صرف شہداء اور متاثرین کو آنسوؤں کا نذرانہ ہی پیش کر سکا، اور تقریر نہ کر سکا۔

گلمرگ کی سیر

کانفرنس کے شرکاء کو معروف سیاحتی مقام گلمرگ لیجایا گیا۔ کشمیر کی وادی میں سب سے زیادہ خوب صورت خطہ، پہلگام کے بعد، دیگر مرغزادوں کے ساتھ بین الاقوامی سیاحت کا دلفریب مقام گلمرگ ہے۔ اس کی خوبصورت ڈھلوانیں، برف کی سفید چادر میں ملفوف سکیٹنگ کے لئے، موزوں ترین اور معروف ہیں۔ وہاں سیاحوں کا بڑا ہجوم تھا۔ مختلف کھیلوں میں مصروف، نوجوان لڑکے لڑکیاں، قوس قزح کا منظر پیش کر رہے تھے، لفٹ چیئر سے مشرقی چوٹی پر پہنچ کر، جنوب مغرب میں، حاجی پیر اور خورشید آباد کہلر آزاد کشمیر کی بلند چوٹیاں اور وادیاں، بہت دلکش حسین منظر پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ دنیا میں یہ خوبصورت ترین جنت نظیر خطہ اور یہاں کے باسی، بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء سے پاکستان اور ہندوستان کی افواج کی وسیع و عریض چھاؤنی کے سایہ میں، میلوں پر محیط قید خانہ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ سیز فائر، المعروف کنٹرول لائن، کئی مقامات پر کئی بستیوں اور کہیں دو بھائیوں کے مشترک صحن کو، چیر کر تقسیم کرتی ہے۔ محلوں اور صحنوں میں قابض افواج کے مورچے اور خندقیں بنی ہوئی ہیں، پرائیویسی نام کو نہ ہے، پانی کے چشموں اور کھیتوں پر بھی فوج قابض ہے، خواتین کی عصمت، عدم تحفظ کا شکار ہے۔ دیہاتی زندگی کے امور میں، فوج کی مداخلت معمول ہے۔ غیر تمند اور خوددار جوانوں کو، جاسوسی کے الزام میں یرغمال بنالیا جاتا ہے۔ بہت تلخ ہیں اہل جموں کشمیر کی زندگی کے لمحات اور روز مکافات کی وہاں خلق خدا، شدت سے منتظر ہے۔

ہمارے ساتھ کشمیر کے نوجوان ہندوستان کی سیکیورٹی کی وردی میں ملبوس اور اسلحہ تھامے، مجھ سے بار بار سوال کرتے" ملک صاحب، جج صاحب، ہم کشمیریوں کو آزادی کب ملے گی"۔ شروع میں تو، میں بہت محتاط تھا، مگر وہ دوسرے تمام مندوبین سے صرف نظر کر کے، صرف مجھ سے اصرار کرتے، واپس لوٹتے وقت، جب میں نے ان کو محتاط الفاظ میں صرف یہ بتایا کہ" میرا سری نگر آنا، نشاندہی کرتا ہے، کہ آزادی کا وقت قریب تھا اور ہمارا وہاں آنا ہی، آزادی کا پیغام تھا اور اس وقت میرا اس میں یقین بھی تھا"۔ یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور واپس پہنچ کر، ان نوجوانوں نے یہ خوشخبری اوروں تک بھی پہنچائی۔

یٰسین ملک کی دعوت میں، دیگر معروف مہمانوں کے علاوہ آغا اشرف سے بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ ملاقات رہی، وہ آغا شوکت کے بڑے بھائی تھے۔ ایس پی کالج میں، کے ایچ خورشید اور جسٹس اکرم رانجہ کے کلاس فیلو تھے۔ آغا شوکت، مسلم کانفرنس کے سیکریٹری جنرل تھے، جبکہ آغا اشرف کا تعلق نیشنل کانفرنس سے تھا۔ ان کی والدہ ڈوگرہ عہد میں، خواتین کالج میں پرنسپل تھیں۔ جب قائداعظم سرینگر تشریف لائے اور بعد میں پنڈت نہرو بھی آئے، تو دونوں کا، ان کے ہاں ضیافت میں، استقبال کرنے کا، ان کی عظیم والدہ کو اعزاز حاصل ہوا تھا۔ آغا اشرف، جامع ملیہ دہلی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے، بڑے علمی، ادبی شخصیت تھے۔ جسٹس اکرم کے لئے، اپنی کتاب دی اور

ایک جلد مجھے بھی پیش کی۔ جموں کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہونے سے، بہت دکھی تھے۔ وہاں دیگر مہمانوں سے بھی ملاقات بہت معلوماتی رہی۔

قاضی ول افروز صاحب، ڈائریکٹر انجینئرنگ کالج کے ہاں، ضیافت میں دلچسپ واقعہ ہوا، مہمانوں کی آمد پر، کشمیری چائے کے ساتھ باقرخانی، بطور سٹارٹر پیش کی گئی، اس روایت سے ناواقف، انجانے میں، میں نے مسکراتے ہوئے میزبان صاحبہ جو بہت پرکشش شخصیت کی مالک ہیں سے کہا، کہ چائے اور باقرخانی کے بعد، کھانا تو نہ کھایا جائے گا، اس پر انھوں نے کہا، بسم اللہ تو کیجیے، کھانا بھی جی بھر کر کھایا جائے گا۔ میرے اللہ! جب میں نے چائے میں بھیگی باقرخانی منہ میں ڈالی، تو اتنی لذیذ اور خستہ، کہ چائے کے بغیر ہی حلق سے اتر گئی۔ میں نے ایک اور باقرخانی لے لی، مگر معدہ اور کھل گیا۔ کشمیر کا واضوان بہت مشہور ہے، جس میں چند نہیں، بلکہ درجنوں سالن کی ورائٹی ہوتی ہے اور آخر میں گشتابہ پیش کیا جاتا ہے، سفید چاولوں میں یکے بعد دیگرے، تمام سالن پیش کیے جاتے ہیں۔ آخر میں زعفرانی قہوہ سب کچھ ہضم کر دیتا ہے۔ جموں اور پاکستان میں، ایسی پرتکلف دعوت ہو، ہی نہیں سکتی اور نہ ہی پکانے والے میسر ہیں۔ میزبان صاحبہ کی، تمام تر توجہ، ہم پر تھی، انھوں نے بہت کھلایا۔ میں نے پہلی دفعہ، بے احتیاطی کی مگر نارمل ہی رہا۔ کشمیر والوں نے شالوں اور کتابوں کے تحفے دیے۔ ہم سب ان کی محبت اور خلوص سے بہت سرشار ہوئے۔

مفتی سعید کی سرینگر چیف منسٹر ہاؤس، جھیل ڈل کنارے، ضیافت بہت دلچسپ تھی، وہ بہت بے تکلف اور میل جول والے انسان تھے۔ نیشنل کانفرنس کے بعد، پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی منظم کی تھی۔ وہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں، ہوم منسٹر بھی رہ چکے تھے۔ گذشتہ سال ان کی وفات کے بعد، ان کی بیٹی محبوبہ مفتی چیف منسٹر منتخب ہو چکی ہیں۔ کشمیر میں مفتی سعید بہت تجربہ کار اور تیز طرار سیاستدان تھے، وہ آزاد کشمیر کے ساتھ تمام بند راستے کھولنے، تجارت کرنے اور بدوں رکاوٹ، آنے جانے کے حامی تھے، مگر ہندوستان کی حکومت اس پر متفق نہ تھی۔

پریس کانفرنس اور ڈاکٹر رادھا کے آنسو

کانفرنس کے اختتام پر ہونے والی پریس کانفرنس میں، سرینگر اور ہندوستان کے کثیر تعداد میں صحافی امڈ آئے۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک، سرینگر میں اس نوعیت اور اعلیٰ سطح کی یہ پہلی کانفرنس تھی، جس میں پاکستان، ہندوستان اور جموں کشمیر کے تینوں حصوں سے، ہر نظریہ سیاست کے اور طبقات کے دانشور، شامل ہوئے تھے، تینوں ممالک کے متعلقہ لوگوں کی تمام تر توجہ، کانفرنس کے نتیجہ پر تھی۔ جموں کشمیر کانفرنس کا ہر طرف چرچا تھا۔ جس سے کئی وسوسے، سیاسی پیشین گوئیاں جنم لے رہی تھیں اور سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ اس پس منظر میں پریس کے لئے، اعلامیہ بہت محتاط مگر، مثبت پیغام پر مشتمل، تیار کیا گیا۔ جو ڈاکٹر راجموہن نے پیش کیا۔ لیکن سرینگر کے صحافیوں نے سوالات، براہ راست

مجھ سے کیے، ان میں ریاست کی سیاسی اور قانونی حیثیت اور انسانی حقوق کے تحفظ سے، متعلق سوالات بھی تھے۔ میں نے مسلمہ حقائق کا حوالہ دے کر، وضاحت کی، کہ قانون آزادی ہند اور اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی، قراردادوں کے تحت، تابع رائے شماری، جموں کشمیر ایک آزاد وخودمختار ملک ہے، جس کے اقتدار اعلیٰ کے مالک، ریاست کے عوام ہیں، اسی طرح انسانی حقوق کا تحفظ بھی عوام کو حاصل ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں، میں نے مفصل وضاحت کی کہ ریاست کی سیاسی اور جغرافیائی، اکائی اور وحدت قائم ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی افواج کے درمیان، جنگ بندی کے معاہدہ کی آڑ میں، ریاست کے عوام کی ریاست کے فوجی منقسم حصوں میں، آنے جانے، تجارت کرنے اور دیگر مشترک امور چلانے میں، ہندوستان کی سیکیورٹی فورسز کی طرف سے عائد، پابندی اور دونوں ممالک کے پاسپورٹ اور ویزہ لازم قرار دینا، خلاف قانون اور اخلاقی اقدار سے متصادم ہے۔ جبکہ ہماری شہری حیثیت ریاست کی ہے اور ریاست کے ہر حصہ میں آزادی سے آنا جانا، ہم سب کا حق ہے، بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو، ریاست کی شہریت حاصل نہیں ہے اور وہ دونوں افواج، ریاست کے عوام پر سفری پابندی، عائد کرنے کی مجاز نہ ہیں۔ اور بتایا کہ بحیثیت چیف جسٹس، سرینگر کا ایک شہری جو پاسپورٹ پر پاکستان گیا تھا، ویزہ کی معیاد گذرنے کے بعد ان کو پاکستان سے واپس جانے کو کہا گیا۔ انھوں نے مظفرآباد منتقل ہوکر، ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا، تو میں نے فیصلہ میں ان کو آزاد کشمیر میں مستقل رہنے، تجارت کرنے کے تمام حقوق کا تحفظ دیا۔ اسی طرح جموں، راجوری اور پونچھ سے سیز فائر لائن کی دوسری طرف سے آنے والے نوبیاہتا جوڑوں کو تحفظ دیا۔ میرے اس جواب پر دہلی کی ڈاکٹر رادھا کمار بہت ناراض ہوکر رو پڑیں، کہ جسٹس ملک نے، کانفرنس کی کامیابی پر پانی پھیر دیا۔ چوہدری منیر حسین، سوشوبھ۔ جی اور ڈاکٹر گاندھی اس کو حوصلہ دے رہے تھے، مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ میں اتفاقاً ان کے پاس گیا، تو اس کو یہ کہا گیا کہ جسٹس ملک نے صرف ذاتی نکتہ نظر پیش کیا تھا، تب اس نے رونا بند کیا۔ اسی روز مسئلہ کشمیر پر، میرا انٹرویو ٹیلی ویژن پر کیا گیا تھا، جو جموں کشمیر اور ہندوستان میں، لائیو دکھایا گیا تھا۔

جموں میں میزبانی

سرینگر سے جموں واپس پہنچے، تو وہاں، بہت بے قراری سے ہمارا انتظار تھا۔ ڈڈیال، میرپور، مظفرآباد سے نقل مکانی کرنے والوں کے علاوہ، پونچھ، راجوری کے عوام اور کشمیری پنڈت، مقیم جموں بھی، ملاقات کے لئے منتظر تھے۔ ہوائی جہاز سے جموں پہنچے۔ شام کو میرپوری شہریوں کی طرف سے استقبالیہ تھا، جس میں کوٹلی، بھمبر اور ڈڈیال سے نقل مکانی کرنے والے بھی شامل تھے۔ تمام لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز، ان میں تاجر، وکلاء، طلباء اور پروفیسر، صحافی بھی شامل تھے۔ خواتین اور مرد، کم وبیش برابر تعداد میں تھے۔ ہماری آمد پر، جوش و جذبات کا طوفان امڈ آیا۔ مرد وخواتین سب گلے لگ کر آنسوؤں کے سیلاب میں اتنی محبت سے ملے، جیسے خاندان کا گم شدہ، پیارا بھائی اچانک

واپس آ جائے اور خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ جائے۔ میرے ساتھ، راجہ خالد اکبر اور چوہدری منیر حسین بھی تھے۔ جسٹس آر پی سیٹھی، جو کرشن دیو سیٹھی کے چھوٹے بھائی تھے، چیف جسٹس ہائی کورٹ اور جج سپریم کورٹ آف انڈیا رہ چکے تھے، اُن میں میری عمر کے وہ لوگ بھی تھے، جو میرے خاندان سے واقف تھے۔ راجہ اکبر خان، ریاست کے معروف سیاستدان تھے، خالد اکبر کا تعارف اس وجہ سے تھا۔ ہائی کورٹ، چیف جسٹس کی حیثیت میں، میرے فیصلوں کی شہرت ریاست سے باہر پاکستان و ہندوستان اور برطانیہ تک تھی، بالخصوص گلگت بلتستان سے متعلق فیصلہ کو بہت شہرت ملی۔ اس پر مزید جموں کشمیر کی تحریک آزادی، کے ساتھ وابستگی، اور مخصوص نظریہ کے حوالہ سے، ہر سطح پر آگاہی تھی۔ تقریب میں آر پی سیٹھی صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ خواتین میں سے بڑی تعداد، جو سب انجانی تھیں، نے بہت جذبات میں خوش آمدید کہا اور مجھے میر پور کے نامور سپوت کے طور پر، خراج تحسین پیش کیا گیا۔ محبت، خلوص اور پیار کا ایسا ماحول ان لوگوں کی طرف سے تھا، جن کے گھر اور کاروبار لٹ گئے تھے، عزیز و اقارب قتل و غارت گری کا شکار ہوئے تھے اور ۱۹۴۷ء میں نسل پرستی کے تعصب کی وحشت طاری تھی۔ اپنے خطاب میں، کسی ایک مقرر نے بھی، دردناک ماضی کا شکوہ تو کیا، تذکرہ تک نہ کیا۔ یہ کمال صبر و تحمل، شفقت اور رواداری کا منظر اور ناقابل تصور برادرانہ ماحول تھا۔ اس تقریب میں، حُسن اخلاق اور محبت نے گہرے اثرات، مرتب کیے جو انمٹ اور لازوال ہیں، جو الگ کتاب کے متقاضی ہیں۔

پاؤں کے تلووں پر بوسے

ہوٹل کے کمرہ میں میرے پاس، سابق سپیکر جموں کشمیر اسمبلی، مرزا رشید صاحب اور درجن بھر اور لوگ بیٹھے تھے۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ دو سکھ، ایک نوجوان اور دوسرا میرا ہم عمر، کمرہ میں داخل ہوئے، ہاتھ میں بڑا ڈبہ لیے سیدھے میری طرف بڑھے، میں بیڈ پر بیٹھا، ان کی طرف متوجہ ہوا۔ بڑے سکھ نے، نوجوان سے کہا "چُم اوئے آپنڑیں چاچے دے پیر"۔ یکلخت ان دونوں نے، لپک کر میرے دونوں پاؤں پکڑ کر تلووں پر بوسے دینے شروع کر دیئے۔ میں نے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ میں نے کہا "او سردار جی تسیں ایہہ کیہ کر رئے او؟" انھوں نے جو جواب دیا وہ وطن پرستی اور وطن سے محبت کا انمول اور انمٹ نشان ہے۔ انھوں نے کہا "ملک مجید، ہم تمھارے پاؤں نہیں، بلکہ ڈڈیال کی مٹی چوم رہے ہیں"۔ عمر میں بڑا سکھ، سوہنا سنگھ، ڈڈیال سکول میں، میرا کلاس فیلو تھا اور نوجوان سکھ، اس کا انجینئر بیٹا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد، یہ ہماری اچانک ملاقات تھی۔ گلے مل کر ہم دونوں اتنا روئے، کہ دیر تک منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کر، ماضی کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا کر، گم گشتہ ماضی کے انمول سنہری لمحات تلاش کرتے رہے، مگر ہم خالی ہاتھ سہمی نظروں سے، پھر بچھڑنے کے منتظر بن گئے۔ کمرہ میں موجود سب لوگ آبدیدہ ہو گئے۔

جموں کے شہریوں کا استقبالیہ

دوسرے روز راجوری اور پونچھ والوں کی طرف سے، عبدالرشید قریشی، ایڈووکیٹ کی قیادت میں استقبالیہ تقریب ہوئی۔ کشمیری پنڈتوں کے کیمپ میں بھی اور اس کے بعد میرپور، مظفرآباد، باغ اور پونچھ کی سکھ برادری کا استقبالیہ، سردار تیغ سنگھ بہادر کی قیادت میں دیا گیا، جس میں دو مرکزی وزراء بھی دہلی سے تشریف لائے تھے۔ تیغ سنگھ کی دو سال قبل وفات ہوگئی اور اس کی وصیت کے مطابق، اس کی راکھ اس کے بیٹے نے گڑھی دوپٹہ، اس کی جائے پیدائش کے مقام پر، دریائے جہلم کی لہروں کے سپرد کی۔ تیغ سنگھ مظفرآباد میں، سکھوں کی چھٹی بادشاہی کی یاد اپنے اندر سمیٹے رہا۔ وہ ہم سے مل کر بہت جذباتی ہوگیا تھا۔ میں نے بطور، کسٹوڈین جائیداد متروکہ، مظفرآباد اور باغ میں، ۱۹۴۷ء میں ان کی بچھڑ جانے والی بیٹیوں کے حق میں، ان کی جائیدادیں واپس کی تھیں، جن کی جموں میں ان کو اطلاع تھی۔ جموں سے کئی سکھ مظفرآباد، میں بچھڑ جانے والی بہنوں سے، مل بھی چکے تھے، جو اب مسلمان ہو کر شادی شدہ تھیں۔

محترمہ رانی بلوریا کا عشائیہ

محترمہ رانی بلوریا، چیف ایڈمنسٹریٹر میونسپل کارپوریشن جموں،، جس کا خاوند چیف سیکریٹری تھا۔ ان کا ڈوگرہ راجپوت خاندان سے تعلق ہے، جدیدیت کی بہت پرستار ہیں، ان کی پرشکوہ رہائش گاہ پر دعوت میں،، جموں شہر کے اشرافیہ کے مرد خواتین مدعو تھے، جگن ناتھ آزاد کی بیٹی سے بھی وہاں ملاقات ہوئی۔ ریڈیو جموں کے فنکار، لوکل ڈوگری، پوٹھواری اور پنجابی گیتوں میں، اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ڈوگرہ راجپوت گو بہت متعصب ہیں، لیکن ان میں مذہب سے بالاتر، راجپوتی تعصب بہت نمایاں ہے، بہت پر تکلف اور رنگین ماحول تھا۔ راجہ خالد اکبر کو ڈانس بھی کرنا پڑا، البتہ چوہدری منیر خواتین سے گپ شپ میں مصروف اور فون نمبر نوٹ کرتے رہے۔

جموں کے شہریوں کی طرف سے، وید بھسین اور کرشن دیو سیٹھی صاحب کی قیادت میں، اجتماعی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں سول سوسائٹی کے تمام طبقات کی شمولیت یقینی بنائی گئی تھی۔ تقریب میں مہمانوں کے لئے، سیٹیں کم پڑنے پر، بڑی تعداد میں لوگ کھڑے بھی تھے۔ ٹیلیویژن کے کئی چینل مع دوردرشن، پروگرام براہ راست دکھا رہے تھے۔ وید بھسین صاحب، کشمیر ٹائمز کے مالک اور معروف دانشور کو، خطبہ استقبالیہ پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں تقریر کے لئے اٹھا، تو احترام میں، تمام حاضرین نے، کھڑے ہو کر تالیوں سے استقبال کیا۔ یہ بہت ہی اہم تقریب تھی، جس میں جموں کشمیر کی آزادی کا پیغام، مکمل استقامت کے ساتھ، ہندوستان کے دائرہ اختیار اور حکمرانی کے اندر، ڈوگرہ ہندو کے گڑھ اور مرکز میں دینا تھا، اور آداب مہمان نوازی کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔ میرے سیاسی شعور کی یہ کڑی آزمائش تھی۔ لہٰذا ریاست کی مذہبی رواداری اور حسن اخلاق سے آغاز کر کے، قومی آزادی کی

اہمیت، مسئلہ کشمیر سے جنوبی ایشیا میں باہمی اصلاحات اور تعمیر و ترقی میں دشواریوں اور روشن مستقبل کی تصویر کشی، کی قدرت نے صلاحیت دی، کہ بہتے دریا کی اٹھتی موجوں کو تلاطم کی شکل اختیار کیے بغیر، خوشگوار انداز پر قائم رکھ کر، اپنا نصب العین اور مدعا بیان کرنے میں کامیابی ہوئی۔ تقریر کے اختتام پر، سوالات بھی ہوئے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کہ جموں میں میری تقریر کے انداز اور تحریک آزادی کے نکتہ نظر کو، سراہا اور پسند کیا گیا۔ لالہ اوم راج، لالہ ملک راج کے بیٹے، سے شبیر شاہ حریت لیڈر نے، ایک دفعہ قبل ازیں فون پر تعارف کروایا تھا۔ وہ لاہور میں کے۔ ایچ خورشید سے مل چکے تھے، انھوں نے تبصرہ میں کہا، کہ ''مجید ملک جب تم تقریر کر رہے تھے، تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خورشید بول رہے ہیں''۔

اجمیر شریف اور دہلی میں آنے کی دعوت

سرینگر کانفرنس اور پریس کانفرنس کے اختتام پر، ڈاکٹر راج موہن گاندھی نے مجھے کہا، کہ دہلی میں آپ سے کچھ لوگ ملنا چاہتے ہیں، لہٰذا وہاں چلنا ہوگا۔ منیر حسین پاس ہی تھے، وہ بولے کہ صرف اس شرط پر، کہ اجمیر شریف جانے کی اجازت بھی شامل ہو، انھوں نے کہا، کہ آپ کی شرط منظور ہے۔ اس سے قبل یہ ہوا، کہ جموں میں عبدالغنی کوہلی، جو ان دنوں نیشنل کانفرنس میں تھے، ان کے ہاں دعوت تھی۔ اس میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ دہلی سے، دو ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ ان سے میری پہلے سے شناسائی تھی، ہم لندن میں مل چکے تھے۔ کھانے پر تحریک آزادی میں، ہندوستان و پاکستان کی پالیسی اور رویہ پر تکرار ہوتی رہی۔ آخر میں کوہلی نے مجھے کہا، کہ کشمیر اولیاء کی دھرتی ہے اور جب سلطان الاولیاء خواجہ غریب نواز اجمیر شریف، ہندوستان میں ہیں، تو کشمیر پاکستان کے پاس کیسے جا سکتا ہے؟ اس پر میں خاموش رہا۔ جب ہم دہلی پہنچے تو رات کو وجاہت حبیب اللہ، جو وزیر اعظم منموہن سنگھ کے، کشمیر کے شعبہ کے ایڈوائزر تھے، ان کے اور ان کی بیگم صاحبہ سے چار گھنٹے تک، کشمیر سے متعلق تبادلہ خیال ہوا۔ دوسری صبح نماز سے فارغ ہی ہوئے تھے، کہ گاڑی اور ڈرائیور اجمیر شریف لے جانے کے لئے آ گیا۔ ہم وہاں کے لئے روانہ ہوئے۔ دہلی سے باہر دیکھا، کہ بے شمار لوگ پیدل جا رہے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے عام لوگوں کے اس طرح پیدل جانے کا سبب پوچھا، تو بتایا گیا، کہ اس روز عرس شروع ہو رہا تھا، تو لوگ عقیدت کے طور پر اجمیر شریف پیدل جا رہے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ماضی میں ایک شخص کولکتہ سے پیدل، تین ماہ کا سفر کر کے زیارت کے لئے اجمیر شریف پہنچا تھا۔ روایت ہے کہ اکبر بادشاہ آگرہ سے بیٹے کی پیدائش کی تمنا لیے، اجمیر شریف میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوا، تو اس کے گھر شہزادہ سلیم کی پیدائش ہوئی تھی۔ ہم چاشت کے وقت شہر میں داخل ہوئے، ہوٹل مان سنگھ میں وضو کیا، چائے پی اور عالی مرتبت مقام کے بڑے دروازے سے، احاطہ درگاہ میں داخل ہوئے، گو کہ عرس کا پہلا روز تھا، مگر ابھی زائرین کی تعداد مناسب تھی۔ ہم شمالی دروازہ سے داخل ہوئے۔ مجاور

ہر طرف زائرین کے گلے میں چادریں اور ہار ڈالتے اور نذرانے وصول کرتے۔ گلاب کی پتیوں کے ہر طرف انبار تھے، جو پاؤں کے نیچے مسلے جا رہے تھے، پھولوں کے رس سے، ہمارے پاؤں گلابی ہو گئے، یہ تو بعد میں احساس ہوا۔ روضہ مبارک میں داخل ہونے سے، ایک عجیب و غریب، روحانی تمکنت، نفسیاتی رعب اور دل و دماغ پر، روحانی جاذبیت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کافی وقت کپکپی اور تھرتھراہٹ کی سی حالت رہی۔ سورہ فاتحہ، آیت الکرسی اور سورۃ اخلاص کی تلاوت کے ساتھ ساتھ، درود شریف اور سلام کا نذرانہ پیش کرتا رہا۔ کافی وقت روضہ کے اندر گذارہ اور زائرین کا رش بڑھتا دیکھ کر، دوسروں کی سہولت کے خیال سے باہر آئے، بہت دلفریب سماں پیدا ہو چکا تھا۔ خلق خدا، کثیر تعداد میں ٹولیوں میں چادریں، پرچم، پھولوں کے ٹوکرے اٹھائے، کلمہ طیب اور درود شریف کا بلند آواز میں، ورد کرتے آ رہے تھے۔ ہم نے مسجد میں نماز ظہر ادا کی، ساتھ گلی میں واقع ہوٹل میں کھانا کھایا اور بادل نخواستہ اداس اداس خیالات مگر روحانی تسکین میں واپس لوٹے۔

ادھر دہلی میں ہمارا انتظار ہو رہا تھا، ڈاکٹر صاحب کی طرف سے دعوت کا اہتمام تھا، جس میں مخصوص مہمان مدعو تھے، جن کو پہلے سے ہمارا تعارف کروا دیا گیا ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان تعلقات پر گفتگو ہوتی رہی، سفر کی تھکاوٹ کا غلبہ محسوس کرنے پر، ہمیں اجازت ملی، مگر دوسرے روز سپریم کورٹ بار، دہلی اور چیف جسٹس کی طرف سے چائے پر ملاقات کے بعد، این این وہرہ، وزیراعظم کے کشمیر کے شعبہ میں مشیر سے ملاقات، ان کے سیکریٹریٹ میں طے تھی۔ ان کے سٹاف میں تین لوگ شامل تھے، وہاں ہمیں مطلع کیا گیا کہ وزیراعظم کے جموں کشمیر کے شعبہ میں، تین مشیر تھے، تیسرے مشیر سابق سیکریٹری انڈین یونین، بی جے دیش مکھ تھے۔ تینوں مشیروں کے سیکریٹریٹ الگ الگ تھے، روزانہ، ان کی رپورٹ وزیراعظم ہندوستان کو پیش ہوتی تھی۔ یہ نظام ہمارے لئے بہت حیران کن تھا، کیونکہ اس کے بالمقابل، ماسوائے وزارت خارجہ کے، پاکستان کے وزیراعظم کا، کشمیر سے متعلق مشیر، وزیر امور کشمیر ہی مقرر تھا، جو عام طور پر، آزاد کشمیر و گلگت کے انتظامی امور اور کونسل کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے، مسئلہ کشمیر سے متعلق پالیسی بنانے میں اس کا کوئی کردار نہ ہے۔ مسٹر این این وہرہ، ۱۹۴۷ء میں لاہور سے نقل مکانی کر کے گیا تھا۔ اس کے ساتھ گفتگو سے معلوم ہوا، کہ ہندوستان میں پنجابی ہندو ذہن، مسئلہ کشمیر کے حل میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ضد، ہٹ دھرمی اور ہندوستان کی تقسیم کا انتقام، کشمیریوں سے لیا جا رہا تھا۔ دہلی میں پنجابی ہندو، حکومت پر نوکر شاہی کے روپ میں، پاکستان دشمن پالیسی کا محرک تھا۔ وہرہ کو میں نے صاف کہہ دیا، کہ ہندوستان کم، مگر پنجابی ہندو، جموں کشمیر کی آزادی میں زیادہ رکاوٹ تھے۔ ایک اور انکشاف یہ ہوا، کہ ہندوستان، ملک کے تمام دریاؤں کو، انٹرلنک کرنے کے منصوبہ پر کام کر رہا تھا، جس میں جموں کشمیر کے دریا بھی شامل ہیں۔ اس طرح مستقبل میں پاکستان کو پانی سے محروم کرنے اور ریگستان بنانے پر کام کیا جا رہا ہے، شاید ہی پاکستان اس منصوبہ سے آگاہ ہو، مگر ہم نے پاکستان

میں متعلقہ شعبوں کو، اس خطرناک منصوبہ سے آگاہ کر دیا ہے۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء، امیر خسرو، حضرت بختیار کاکیؒ کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے، حاضری دی اور ملحقہ مساجد میں نوافل بھی ادا کیے۔ مرزا اسداللہ غالب کی قبر پر دعاء مغفرت کے بعد، ملحقہ لائبریری میں چند لمحات غالب کی فکر اور تخیل کی محفل سے لطف اندوز ہوئے۔ جامع مسجد، لال قلعہ، چاندنی چوک، قطب مینار بھی گئے اور مسلمانوں کی ہندوستان میں اقتدار، جاہ وجلال وحشمت کے آثار دیکھے، مگر ساتھ ہی ان کی کمزوریوں اور غلط رویہ کی وجہ سے، اقتدار سے محرومی اور آج کے ہندوستانی مسلمان کی، بدحالی بھی دیکھی۔

ڈاکٹر کرن سنگھ سے ملاقات

اجمیر شریف سے دہلی پہنچتے ہی، ڈاکٹر کرن سنگھ سے ملاقات کی دعوت بھی ملی۔ تیسرے روز ان کی رہائش گاہ پر ملاقات طے ہوئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے جانشین، کرن سنگھ ریاست میں ڈوگرہ خاندان کے آخری مرد حکمران اور ۱۹۴۷ء کے بعد، ریاست میں نئے دستور کے تحت، صدر ریاست مقرر ہوئے تھے۔ شیخ عبداللہ نے وزیراعظم کے عہدہ پر فائز ہو کر، راجہ کو دستبردار اقتدار کیا اور شیخ عبداللہ کو ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی رات، گلمرگ میں، بغاوت کے الزام میں، ڈاکٹر کرن سنگھ کے حکم کی تعمیل میں، گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور بخشی غلام محمد، شیخ صاحب کے معتمد خاص ساتھی کو، وزیراعظم کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا۔ وقت مقررہ پر وہ، ہمارے استقبال کے لئے، کرتہ پاجامہ میں ملبوس، گیٹ پر موجود تھے۔ پُرتپاک استقبال کے ساتھ، مہمان خانہ میں لے گئے۔ میں نے ان سے راجہ خالد اکبر اور چوہدری منیر حسین کا تعارف کروایا۔ ابھی خیر خیریت ہی دریافت ہو رہی تھی، کہ میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے کرن سنگھ سے کہا، کہ راجہ خالد اکبر، میرپور کے راجہ اکبر خان کے بیٹے ہیں۔ میں نے اتنا ہی کہا تھا، کہ وہ خود احترام میں کھڑے ہو گئے اور بولے "وہ راجہ اکبر، ہمارے قومی لیڈر"؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اس پر وہ راجہ خالد اکبر سے، دوبارہ گلے ملے اور خوشی کا اظہار کیا۔ بیٹھتے ہی بہت بے تکلفی میں، مجھ سے شکوہ کیا کہ، میں نے لاہور میں وکالت کیوں چھوڑی اور میرپور آ گیا۔ اگر لاہور میں ہی رہا ہوتا تو آج پاکستان میں وزیراعظم ہوتا۔ میں ابھی تعجب میں ہی تھا، کہ کرن سنگھ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے لے کر، میری زندگی کے کارنامے ایک ایک کر کے سنا دیئے۔ ان کے انداز اور رویہ میں بے حد اپنائیت، بے تکلفی اور بے ساختگی نے، ہمیں ششدر کر دیا۔ مجھ سے زیادہ ان کو میرے متعلق، علمیت اور واقفیت نہ جانے کیسے حاصل ہوئی تھی! انھوں نے میرپور آنے کا بہت اشتیاق ظاہر کیا۔ میرپور کی خوشحالی اور میرپور کے باسیوں کا بیرونی ممالک میں، کاروبار کرنے اور ریاست کا نام روشن کرنے پر، ان کو فخر تھا۔ تمام گفتگو میرپوری اور ڈوگری زبان میں ہوتی رہی۔ ان کو جموں کشمیر کا مسئلہ پیدا ہونے اور عوام کے مصائب، ریاست کی انتظامی تقسیم، افواج کے تسلط اور ظلم وتشدد کا بہت رنج تھا، جس پر بہت دکھی تھے۔ ان کی بیٹی ڈاکٹر جوتی کی خواہش ہے، کہ حالات

بہتر ہونے پر، وہ میرپور آ کر ڈوگرہ دارالحکومت میں اور ۱۹۴۷ء میں مسئلہ کشمیر کی وجہ سے، نقل مکانی اور جانی نقصان اور اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے مظالم پر، عوام سے معافی مانگنا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ، چب کوچ راجپوت ہیں۔ ان کا مرکز بھمبر میں، دیوہ وٹالہ کی بستی ہے، جہاں ڈوگرہ تہذیب وتمدن کے آثار موجود ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ دیوہ وٹالہ میں آنے کے بہت خواہش مند تھے، وہ شاعر بھی ہیں اور گلوکار بھی، کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ریاست کی اور عوام کی حالت پر بہت رنجیدہ اور افسردہ ہیں، جس کا اظہار ان کی گفتگو اور اشعار میں کیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری اور گیتوں کی کیسٹس، بطور تحفہ ہمیں پیش کیں۔ یہاں ایک واقعہ دہرانا مناسب ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف، میرپور کے راجہ اکبر خان نے، جموں میں مہاراجہ کے محلات کے سامنے باغیانہ تقریر کی، جس پر ان کے خلاف، بغاوت کا مقدمہ چلا۔ انھوں نے عدالت میں اقبال جرم کیا اور ان کو سزا ہوئی تھی۔ انہی راجہ اکبر خان کا جب میں نے نام لیا تو انہوں نے ''وہ راجہ اکبر، ہمارے قومی لیڈر؟'' کہا اور خالد اکبر کو گلے لگالیا۔ یہ ان کا بڑا پن اور وطن پرست ہونے کا واضح ثبوت تھا۔ ان سے بعد میں، سردار عبدالقیوم بھی ملے اور ریاست کا سربراہ دوبارہ بنانا، تسلیم کیا تھا۔ ان کے ساتھ راجہ ذوالقرنین بھی ان سے ملے تھے۔

ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی دعوت

دہلی میں ہماری آمد کے وقت سے، پاکستان ہائی کمشن کے ساتھ، ہم رابطہ میں تھے، ہماری مصروفیت اور مختلف ملاقاتیں، ان کے علم میں تھیں۔ عزیز احمد خان ہائی کمشنر اور منور احمد بھٹی، ڈپٹی ہائی کمشنر تعینات تھے، ہمارے اعزاز میں، بھٹی صاحب نے ظہرانہ کا اہتمام کیا تھا۔ ہائی کمشن کے عملہ کو، جموں کشمیر جانے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی وہاں کے اندرونی حالات سے انہیں براہ راست آگاہی حاصل تھی۔ معلومات کے ذرائع، میڈیا، خفیہ شعبہ اور حریت رہنماؤں سے معلومات تک محدود تھے۔ ان سے تفصیل سے تبادلہ خیال ہوا اور ہم نے اپنی معلومات سے ان کو آگاہ کیا۔ پاکستان ہائی کمشن کی عمارت کے باہر، بھارت کی خفیہ شعبہ کے لوگ بہت متحرک تھے، جو ان کا معمول بتایا گیا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ ایک لحاظ سے محاصرہ کی کیفیت دکھائی دی، دہلی میں اس رات ڈاکٹر راتھر کی طرف سے عشائیہ تھا، جس میں لوگوں سے، تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ ڈاکٹر راتھر کا تعلق سری نگر اور نیشنل کانفرنس سے تھا۔

راہو جلالی سے ملاقات

مسٹر جلالی، دہلی میں کشمیری دانشور اور بہت بااثر شخصیت ہیں۔ ان کے ہاں چائے کا اہتمام تھا، اس سے قبل دہلی میں، میرپور کالونی دیکھنے کا موقع ملا۔ دہلی میں گیارہ ہزار کے قریب میرپوری تارکین وطن آباد ہیں، ان کی رہائشی کالونی، جدید تعمیرات سے مزین، صاف شفاف ماحول کے ساتھ ''میرپور'' کے نام سے موسوم ہے، بڑی شاہراہ کا نام میرپور روڈ ہے، سینما اور شادی گھر کا نام بھی میرپور سینما اور میرپور شادی گھر رکھا گیا ہے۔ وطن کا تشخص

اور پہچان بہت خوش کن اور دلچسپ تھی۔ جلالی صاحب کے ہاں، ڈڈیال کا ایک نوجوان صحافی ملا۔ اس نے صحافت میں ماسٹر ڈگری حاصل کر رکھی تھی اور سی این این اور بی بی سی میں خصوصی رپورٹنگ کر رہا تھا، اس نے اپنے والد صاحب سے فون پر بات کروائی۔ فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو رہا تھا، مگر ڈڈیال کے علاقہ کے تمام گاؤں اور ہر گاؤں کے معروف لوگوں کا نام لے لے کر، ان کی خیریت دریافت کی۔ ان میں سے، بہت سے لوگ فوت ہو چکے تھے، یہ سن کر وہ اور رویا، اس نے اور اس کے بیٹے نے، ان کے گھر آنے پر بہت اصرار کیا، مگر چاہنے کے باوجود، وقت کی قلت کی وجہ سے، ان کی دلجوئی کرنے سے قاصر رہا۔

ڈاکٹر سعیدہ کے ہاں دانشوروں سے ملاقات

ڈاکٹر سعیدہ، ڈاکٹر مبشر حسن سابق وزیر خزانہ پاکستان، ممتاز دانشور اور معروف سیاستدان مقیم لاہور، کی بھتیجی ہیں، مرکز کے شعبہ منصوبہ بندی اور پلاننگ کی ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ ان کے ہاں مخصوص دانشور، جن میں سابق چیف جسٹس سچر، معروف صحافی کلدیپ نائیر، سونیا جبار، گُم گُم چاند اور متعدد دیگر علمی و ادبی شخصیات مدعو تھیں۔ کلدیپ نائیر سے پہلے سے شناسائی تھی، انہوں نے مہمانوں سے میرا تعارف کروانا شروع کیا، تو جسٹس سچر نے ان کو بٹھا دیا اور کہا، کہ یہ ان کا اعزاز تھا۔ انہوں نے میرا تعارف، میرے متعدد معروف فیصلوں سے، بطور جج اور چیف جسٹس کرواتے ہوئے، اتنا سراہا اور اس قدر تعریف کی، کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ ان سے پہلی دفعہ ۱۹۷۴ء میں، لاہور جوڈیشل کانفرنس میں، اگے کے بروہی صاحب کی وساطت سے، ملاقات ہوئی تھی، تب میں وکیل تھا۔ دوسری بار جوڈیشل کانفرنس میں ملاقات ہوئی، تب میں چیف جسٹس تھا۔ مسٹر غوث علی شاہ کی طرف سے عشائیہ میں، میری نشست دو خواتین کے درمیان تھی۔ دائیں جانب بیگم انڈین ہائی کمشنر اور بائیں جانب بیگم جسٹس سچر کی سیٹ تھی، میرے نام کا ہولڈر، سیٹ کے سامنے دیکھ کر، تعارف ہو گیا تھا۔ بیٹھتے ہی مجھے تعجب ہوا، کہ ہندوستانی خواتین کے درمیان میری سیٹ دانستہ کسی مصلحت کی وجہ سے رکھی گئی تھی۔ پہلے تو ہمارے بیچ، آزاد کشمیر اور عدلیہ کے بارے میں بات ہوئی، پھر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی سے متعلق، جس میں قدرے تلخی بھی ہوئی، مگر ہم نے موضوع بدل کر، کشمیری کھانوں کی ورائیٹی، مہمان نوازی پر، تجزیہ شروع کر دیا۔ جسٹس سچر کے تعارف اور ڈاکٹر سعیدہ کی باوقار شخصیت میں، متانت اور طرزِ رہن سہن بالکل سادہ تھا، ویسا ہی ماحول، میں ڈاکٹر مبشر صاحب کے ہاں دیکھ چکا تھا، رات گئے تک علمی ادبی گفتگو، لطیفے اور جملے بازی کے چٹکلے چلتے رہے اور دوبار، سرسری طور پر، کشمیر کا بھی ذکر ہوا۔ دہلی میں یہ تقریب دلی کی تہذیب و تمدن کی عکاس تھی، یہ ایک یادگار نشست تھی۔

پائینہ ہوٹل میں محترمہ شہابہ کی طرف سے بھی عشائیہ دیا گیا تھا۔ اس سے قبل اشوک ہوٹل میں سینئر صحافی، محترمہ نرجا چوہدری سے چائے پر ملاقات ہوئی۔ دہلی کے تمام تقریبات اور گفتگو میں مرکزی نکتہ اور محور، جموں کشمیر اور

تحریک آزادی ہی رہی۔ ہندوستان وپاکستان صرف الحاق کے زاویہ سے اس مسئلہ کو طے کرنے پر زور دیتے ہیں، جس وجہ سے دونوں اس کو زمینی تنازعہ کی حیثیت دیتے ہیں۔ جب کہ ہم اس کو ماضی کے تناظر میں، جموں کشمیر کے عوام کی آزادی کی جدوجہد کے طور پر، ہندوستان وپاکستان کی افواج کے انخلاء اور ریاست کی سیاسی اور جغرافیائی وحدت اور حیثیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو اس کو قانون آزادی ہند کے ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کے نفاذ پر، معاہدہ امرتسر ۱۶رمارچ ۱۸۴۶ء کے ساقط ہونے اور اقتدار اعلیٰ عوام کو عود ہونے پر ہوئی۔ ہمارے مؤقف کو جاننے اور سمجھنے کے لئے، دہلی میں ہمیں خوب کریدا گیا، بہت سے سوالات کیے گئے، مگر اس مؤقف کے خلاف کوئی دلیل پیش نہ کی جاسکی، ماسوائے اس کے، کہ اسلام آباد کی حکومت کو اس پر پہلے رضامند کیا جائے۔

جموں میں، مزید تقریبات.

عبدالغنی کوہلی، جو ممبر اسمبلی اور وزیر ہیں، ان کے پہلے سوال جس میں انہوں نے کہا تھا، کہ کشمیر اولیاء اللہ کی دھرتی ہے اور برصغیر کے سلطان الاولیاء معین الدین چشتی اجمیر شریف، ہندوستان میں ہیں، تو جموں کشمیر ہندوستان سے الگ کیسے ہوسکتا تھا، تو واپس آکر انہیں جواب دیا، کہ ان کے طنزیہ سوال پر، خلاف پروگرام اجمیر شریف، ہماری حاضری وطلبی ہوئی اور وہاں ہماری دعا اور استدعا پر، جموں کشمیر کی ہندوستان سے، آزادی کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ اب صرف موزوں حالات اور وقت کا انتظار ہے۔ یہ جواب سن کر وہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئے اور میرے جواب سے اختلاف نہ کر سکے۔

جموں میں مفتی سعید نے میری تجویز پر، کہ میرپور کے معروف لیڈر سردار سنت بدھ سنگھ، جنہوں نے مسلمان کسانوں کے حق میں، لگان اراضی کم کروانے کے لئے، مہاراجہ ہری سنگھ کو بحیثیت وزیر وزارت، تجویز دی اور مہاراجہ کے انکار پر اسی وقت، اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر کسان سدھار تحریک شروع کر دی تھی، وہ کئی سال قید میں رہے اور ۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس میں شامل ہوئے۔ ان کی مسلمان عوام کی خدمات کے اعتراف کے لئے، جموں یونیورسٹی میں، سنت بدھ سنگھ چیئر قائم ہونی چاہیے۔ مفتی سعید، چیف منسٹر نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے، وائس چانسلر ڈاکٹر متو کو حکم دیا کہ ''جموں یونیورسٹی میں سنت بدھ سنگھ چیئر قائم کی جائے، جس کے اخراجات کی بھی منظوری دی''۔

جموں یونیورسٹی میں میرا لیکچر رکھا گیا جس کا عنوان تھا ''انسان کی بہترین تخلیق''۔ یونیورسٹی کے پروفیسر اور سٹاف کے ممبران کے علاوہ دانشور طبقہ کے لوگ بھی اس میں شامل تھے، ابتدا میں، راجہ خالد اکبر نے اپنا نکتہ نظر پیش کیا۔ ریاست میں جموں یونیورسٹی سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ اس میں تمام قدیم اور جدید علوم کی تعلیم کی، سہولت فراہم کی گئی ہے۔ رانی بلوریہ کی پرتکلف دعوت کے علاوہ، راجو چوہدری، وید بھسین کے دوست پنڈت بخشی

موتی، جموں کے فائیو سٹار ریوالونگ ہوٹل کے مالک، کی طرف سے، عشائیہ دیا گیا تھا۔ محترمہ سوشوبھ بھاروے، کانفرنس کی دوسری میزبان نے اپنے تبصرہ میں کہا، کہ سری نگر میں تو، توقع کے مطابق ملک صاحب کا استقبال تھا، مگر جموں، جو ہندو اکثریتی شہر ہے، اس میں تو جسٹس ملک کے استقبال اور مہمان نوازی کا تہلکہ مچ گیا تھا۔

جناح ہاؤس، مونٹ پلیزنٹ ممبئی

سنٹر فار ڈائیلاگ وری کنسلی ایشن کی ایگزیکٹو سیکریٹری نے، غالباً ڈاکٹر راجموہن گاندھی، چیئرمین کی ہدایت یا مشاورت سے کشمیر کانفرنس دہلی سے دو دن قبل دہلی آنے کی دعوت دی۔ جسٹس شریف حسین بخاری اور مجھے ممبئی لے جایا گیا، جہاں نہرو سنٹر میں ممبئی کے دانشوروں اور سیاستدانوں کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ رات کو ممبئی پہنچتے ہی، میں نے تقریب سے قبل، جناح ہاؤس واقع مونٹ پلیزنٹ روڈ، مالا بار ہل دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ ممبئی شہر قائداعظم کا شہر تھا، جہاں قائداعظم نے ہندوستان کی آزادی اور انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا ۱۹۰۶ء میں آغاز کیا تھا۔ ہمارا قیام چپاٹی ممبئی کے پوش ہوٹل میں تھا۔ یہ ممبئی کا دیدہ زیب اور دلکش حصہ ہے۔ سفر کی تھکاوٹ کا کم ہی احساس تھا۔ رات بھر قائداعظم کی زندگی کی سیاسی جدوجہد کے مختلف ادوار، ایک ایک کر کے سلسلہ وار سیلف رول تحریک سے ہندوستان کی آزادی، انڈین کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد، لکھنؤ پیکٹ پر قائد کو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب اور بالآخر پاکستان کے قیام میں، عالمی اعزاز کا مقام حاصل کرنے تک کے، مرحلے آشکار ہوتے رہے۔ صبح ناشتہ کے بعد ایک گائیڈ کے ساتھ، جناح ہاؤس کے گیٹ پر انچارج جناح ہاؤس سے ملاقات ہوئی۔ جس نے اپنی معاونت اور حفاظت کے لئے، نصف درجن کتے، ہمراہ رکھے ہوئے تھے۔ جناح ہاؤس کی تعمیر اور اٹھان، قائداعظم کی شخصیت، ذوق شوق اور تازگی کی عکاس ہے۔ کے ایچ خورشید قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری کے طور پر، جناح ہاؤس کے ایک حصہ میں رہتے رہے تھے۔ اس دوران اہم سیاسی، سماجی اور ذاتی پیش آنے والے واقعات، جو اُن سے سن رکھے تھے، وہ فلم کی طرح میرے دل و دماغ کی سکرین پر روشن ہونے لگے۔ بلند و بالا، ناتراشیدہ پیڑوں کی اوٹ میں، بغیر مقیم کے، جناح ہاؤس میں یوں محسوس ہوا، جیسے کسی لمحہ مسٹر جناح اور فاطمہ جناح اپنی سٹڈی یا ڈرائینگ روم سے نمودار ہوں گے۔ تصورات کے جھرمٹ اور سوچ کی گہرائی میں تین گھنٹے گذر گئے، کہ اتنے میں فون کی گھنٹی پر، گائیڈ نے آگاہ کیا کہ نہرو سنٹر کی تقریب میں میرا انتظار ہو رہا تھا۔

ہوٹل میں کافی تعداد میں، مرد خواتین ملاقات کے لئے موجود تھے۔ تعارف کے فوراً بعد، انھوں نے سوالات شروع کر دیئے، کہ میں جموں کشمیر کا شہری تھا۔ لہٰذا جناح ہاؤس اور محمد علی جناح سے اتنی عقیدت کا کیا سبب تھا۔ میں نے ان کا تجسس دور کیا، جس پر ممبئی کے مرد و خواتین نے، قائداعظم کی ذہانت، دانش، بے باکی، دیانتداری اور جرأت کی بہت تعریف کرتے ہوئے بیک زبان کہا، کہ سارے ہندوستان میں محمد علی جناح واحد محب وطن لیڈر تھا،

جس کو کانگریس میں تنگ دل، متعصب اور حاسد ہندو لیڈروں نے، اپنی متعصبانہ روش سے کانگریس سے الگ کیا۔ ممبئی میں قائداعظم کی عظمت کی تعریف سن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ ممبئی کے شہریوں نے ماضی میں بھی جناح کی ذہین، دیانتدار، خوددار، جرأتمندانہ قیادت سے متاثر ہو کر، ان کی یاد میں ایک ماہ میں انفرادی چندہ سے، محمد علی جناح میموریل ہال تعمیر کیا تھا، جو اب تک جناح کی جوانی میں ۴۲ سال کی عمر میں، دلیرانہ قیادت کی مسلمہ عظمت کا شاہکار ہے، اس کی الگ تاریخ ہے۔ انگریز دورِ حکومت میں، ممبئی میں انگریز گورنر ولنگٹن، جو ہندوستانیوں سے حقیر رویہ رکھتا تھا۔ جس وجہ سے ممبئی میں ہندوستانی عوام اور سیاستدان اس کے خلاف تھے۔ ان میں جناح زیادہ متحرک تھے۔ ولنگٹن کے تبادلہ پر، روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر، شٹینلے ریڈ نے الوداعی دعوت کے لئے معززین کی میٹنگ طلب کی، جس میں جناح نے اپنے ساتھیوں سے مل کر، زبردست مخالفت کی اور میٹنگ ناکام بنادی۔ انگریز گورنر نے ٹاؤن ہال میں، جناح کے داخلہ پر پابندی عائد کردی، جس کے ردعمل میں ممبئی کے عوام نے جناح کی ولولہ انگیز، دلیرانہ قیادت کے اعتراف میں، انفرادی چندہ سے ۱۹۱۸ء میں ایک ماہ کے اندر محمد علی جناح میموریل ہال تعمیر کردیا۔ اس میں ہندو، مسلمان، پارسی سب شامل تھے۔

نہرو سینٹر ممبئی میں کانفرنس سے خطاب

ممبئی یونیورسٹی کی وائس چانسلر، ڈاکٹر منیشہ، ڈبل پی ایچ ڈی، کانفرنس کی صدارت کر رہی تھیں۔ کانفرنس ہال میں تمام کرسیوں پر، ممبئی کے دانشور براجمان تھے، جن میں پروفیسر، وکلاء، مقامی سیاستدان، حاضر سروس و ریٹائرڈ ملازم، سول سوسائٹی کے ارکان اور انجمنوں کے عہدیدار کافی تعداد میں شامل تھے۔ ڈاکٹر منیشہ، بہت باوقار اور قدآور شخصیت کی حامل خاتون تھیں۔ کانفرنس کا ایجنڈا ''مسئلہ جموں کشمیر'' تھا۔ ڈاکٹر منیشہ نے ہمارے تعارف کے ساتھ ہی، استقبالیہ کلمات کہے اور جسٹس بخاری کو خطاب کی دعوت دی۔ جسٹس بخاری کا تعلق بارہمولہ کے قریب واقع گاؤں کریری سے ہے۔ وہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے لاہور میں مقیم ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق ہے۔ ویلی کی مخصوص نشست پر آزاد کشمیر اسمبلی کے رکن رہے ہیں، بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج تعینات رہے ہیں۔ لاہور میں کشمیر ایکشن کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ وہ ریاست جموں کشمیر کی وحدت اور خودمختار حیثیت کے حامی ہیں۔ ان کی سوچ بہت مثبت اور خلوص پر مبنی ہے۔ بخاری صاحب نے مسئلہ کشمیر کا پس منظر، وادیٔ کشمیر میں جاری تحریک اور اپنے موقف کو مدلل انداز میں تفصیل سے بیان کیا۔

ڈاکٹر منیشہ نے جموں کشمیر میں تحریک آزادی سے گہری، طویل وابستگی مخصوص سیاسی سوچ اور نکتہ نظر اور بطور چیف جسٹس انسانی حقوق کے تحفظ میں فیصلوں بالخصوص گلگت بلتستان کے فیصلے کے حوالے سے، مفصل تعریفی تعارف کروایا اور مسئلہ جموں کشمیر پر اور اس کے حل کی اہمیت اور ضرورت پر گفتگو کی دعوت دی۔ ایک گھنٹہ دس منٹ پر

محیط، گفتگو اور آدھ گھنٹہ سامعین کے سوالات کے جوابات کو سمیٹنا، شاید یہاں تحریر میں لانا موزوں نہ ہوگا۔ تاہم جموں کشمیر کے ماضی میں الگ ملک کی تاریخی حیثیت، اس میں آباد مختلف مذاہب کے ماننے والے، عوام کی ایک قوم کی حیثیت اور ریاست کی سیاسی اور جغرافیائی وحدت قائم رکھنے کی سوچ کو، ہندوستان پاکستان کے اپنے اپنے ملکی مفادات کے دعوؤں پر فوقیت اور ترجیح رکھنا مناسب ظاہر کیا۔ مزید یہ کہ ہندوستان پاکستان کے بجائے، جموں کشمیر کی ریاست کے باشندہ عوام کو، مکمل آزادی کے ساتھ اتفاق یا کثرت سے، اپنے مستقبل کے فیصلہ کے حق کے استعمال کا اختیار ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر منیشہ نے میٹنگ کی کارروائی کو سمیٹتے ہوئے، حاضرین مجلس کی مسئلہ کشمیر کے حل پر رائے طلب کی، تو ماسوائے تین افراد کے، سب نے ہاتھ بلند کر کے رائے دی کہ ریاست جموں کشمیر کو، خودمختار حیثیت ملنی چاہیے اور ہندوستان کو یہ حیثیت تسلیم کر کے اپنی افواج کو ریاست سے نکال لینا چاہیے۔ جن تین لوگوں نے اختلاف کیا تھا، معلوم ہوا کہ وہ تینوں ہندوستان نیوی کے ریٹائرڈ ایڈمرل تھے۔ ممبئی میں دانشوروں کی مسئلہ کشمیر کے حل پر رائے ہمارے لئے خوشگوار حیرانی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ہندوستان میں صرف امرتسر سے دہلی تک ہی ہندوستانی عوام کو، جموں کشمیر کے متعلق، معلومات اور دلچسپی ہے۔ باقی لوگ اس مسئلہ سے کم ہی آگاہ ہیں۔ ممبئی میں جموں کشمیر کے بارے میں رائے عامہ نے ہمیں خاصا متاثر کیا۔

دلت کانفرنس سے خطاب

ممبئی میں اسی شام نہرو سنٹر میں دلت کانفرنس میں، بطور چیف گیسٹ میں مدعو تھا۔ دلت انسانی حقوق تنظیم کی راہنما، ہندو خاتون اور دیگر عہدیداروں نے قطار میں، میرا استقبال کیا۔ حسب عادت اور اخلاق، میں نے مرد قائدین کو گلے لگا کر، مصافحہ کیا تو تقریب کا خوشی سے ماحول نکھر گیا۔ ہندو مذہب میں ذات پات کی تفریق، تعصب اور نفرت انتہا درجہ پر ہے۔ سب سی اونچی ذات میں برہمن ہیں اور نچلی ترین ذات دلت ہیں، جن کو اچھوت کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں غریب ترین طبقہ میں، ہندوؤں میں دلت ہیں۔ ان کا معروف راہنما ڈاکٹر امبید کر تھا۔ وہ کانگریس کی مرکزی مجلس عمل کا رکن بھی تھا۔ گلے لگا کر ملنے پر دلت مجھ پر فریفتہ ہو گئے۔ اپنے خطاب میں، میں نے احترام آدمیت اور عظمت انسانیت کے پیرایہ میں کائنات کی تخلیق میں، انسان کی اعلیٰ واحسن تخلیق بیان کی اور عالمی حقوق انسانیت کے اسلام میں، متعین حقوق کے تناظر میں، ہندوستان میں حقوق واحترام سے محروم، دلتوں کے طبقہ کی مکمل کر حمایت کی، تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ہزار سے زیادہ لوگ خوشی میں، نعرے بلند کرنے لگے۔ خوشگوار ماحول میں، میں نے دانستہ جذباتی انداز اپنایا۔ ہندوستان میں غیر ملکی مہمان مقرر ہونے کی وجہ سے، کچھ لوگ میرے بے باک اور جرأتمندانہ اظہار پر حیران بھی تھے، مگر مجھے اس کا احساس، جسٹس بخاری اور میڈم سوشوبھا جی نے بعد میں دلایا۔ چائے پر دلت اصرار کرنے لگے، کہ ممبئی میں رہ کر میں ان کی قیادت کروں۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں

آنسو تھے۔ طبقاتی معاشرہ میں ہر ملک اور ہر سوسائٹی میں انسان مظلوم اور لاچار ہے، مگر ہندوستان میں طبقاتی تقسیم بدرجہ اُتم موجود ہے۔

مرچنٹ نیوی کے دفاتر کی زیارت

ہندوستان کی آزادی سے قبل ہمارے علاقہ، اندرہل کے اکثر لوگ برطانوی مرچنٹ نیوی کی معروف بحری کمپنیوں، ہار اور پی این او میں ملازمت کرتے تھے۔ جن میں میرے والد اور قبیلہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان کمپنیوں کے آفس ممبئی میں تھے۔ ہمارے لوگ ممبئی کو دوسرا گھر سمجھتے تھے۔ ممبئی پہنچتے ہی دوسری خواہش ان مرچنٹ نیوی کمپنیوں کے دفاتر کی زیارت کی تھی۔ حقیقت میں تو والد (جو اب دنیا میں نہ تھے) کے پاؤں کی خاک کے نشانات کی چاہت تھی، مگر تجسس کا روپ مختلف تھا۔ کمپنیوں کے سابق دفاتر، ممبئی ہائی کورٹ کی عمارت، گیٹ وے ٹو انڈیا، جہاں مہاتما گاندھی کی جنوبی افریقہ سے ترک سکونت کر کے ہندوستان واپس آنے پر، ہندوستان کے لیڈروں نے استقبالیہ تقریب منعقد کی اور محمد علی جناح نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا تھا اور گاندھی نے جوابی تقریر میں، جناح صاحب کو مسلمان راہنما قرار دے کر شکریہ ادا کیا تھا اور ہندو مسلم انتشار کی بنیاد قائم کی تھی۔ وہ تاریخی مقام دیکھا۔ تاج ہوٹل دیکھا، جہاں محمد علی جناح اور ان کی بیگم رتی جناح فراغت کے لمحات گذارتے رہے تھے۔

خودمختار جموں کشمیر کی پیشکش

ڈاکٹر منموہن سنگھ، وزیراعظم ہندوستان کے جموں کشمیر کے شعبہ سے متعلق تین مشیر مقرر تھے، جن کے الگ الگ سٹاف پر مشتمل سیکریٹریٹ تھے۔ ان میں لاہور کے تارک الوطن این این ڈ ہرہ، یوپی کے وجاہت حبیب اللہ اور جنوب سے جی بی دلیش مکھ تھے۔ تینوں کا تعلق سول سروس سے تھا اور تینوں کی سروس جموں کشمیر سے وابستہ رہ چکی تھی۔ جموں کشمیر کے اندرونی حالات اور مسئلہ کشمیر سے متعلق، روزمرہ حالات کے بارہ میں، وزیراعظم کو رپورٹ پیش کرنا، ان کا معمول تھا۔ ممبئی میں دلیش مکھ نے ملاقات کی خواہش کی۔ چنانچہ دوسری صبح جسٹس شریف حسین بخاری کے کمرہ میں ملاقات کے دوران، انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے مسئلۂ کشمیر پر مؤقف، جموں کشمیر میں جاری تحریک اور عالمی ردعمل کی روشنی میں تنقیدی تجزیہ کے نتیجہ میں، پاکستان کی رضامندی سے مشروط، جموں کشمیر کو مکمل خودمختار حیثیت دینے اور قبول کرنے کی پیشکش کی۔ اس پر میڈم سوشوبھ نے اس کو ٹوک کر کہا، کہ "وزیراعظم کی منظوری کے بغیر اتنی بڑی اہمیت کی پیشکش نہیں کرنی چاہیے تھی"، جس پر دیش مکھ نے ذمہ داری لیتے ہوئے پیشکش دہرائی اور کہا، کہ "اگر پاکستان تیار ہو اور خودمختار جموں کشمیر کی حیثیت قبول کرلے، تو ہندوستان تیار ہوگا"۔ مجھے علم تھا، کہ پاکستان کو ایسی پیشکش قبول نہیں ہوگی، کیونکہ میرے علم میں تھا، کہ نومبر ۱۹۹۳ء میں امریکہ کے صدر کلنٹن کی ایک

ہی پیشکش، بینظیر، وزیراعظم اور صدر پاکستان لغاری، مسترد کر چکے تھے۔ تاہم، ہم نے پاکستان کو ان کی تجویز پیش کرنے کی حامی بھر لی اور اپنے طور پر، میں نے جسٹس بخاری کو یہ ذمہ داری سونپ دی، مگر انھوں نے خاموشی سے کام لیا۔ میں نے پاکستان اسٹیبلشمنٹ کے معتمد خاص ڈاکٹر غلام نبی فائی اور عبدالرشید ترابی سے کہا، کہ وہ پاکستان کے متعلقہ شعبہ کے بڑوں سے، ہندوستان کی تجویز پر بات کریں۔ انھوں نے شوکت مجید، سیکریٹری تعلیم کو مظفر آباد میں میرے خلاف شکایت کی، کہ وہ مجھے منع کرے، کہ میں جموں کو کشمیر میں شامل نہ کروں، کیونکہ ان کی تحریک صرف وادی کشمیر کی حد تک آزادی کی تحریک تھی۔ اتفاق سے وزارت خارجہ نے ان ہی دنوں جموں کشمیر کے قائدین کی مشاورتی میٹنگ منعقد کی، جس میں، میں نے وزیر خارجہ سے سوال کیا کہ "مسئلہ کشمیر کے حتمی حل کے لئے، اگر ہندوستان ریاست جموں کشمیر کو مکمل خودمختار حیثیت دینے کی پیشکش کرے، تو کیا پاکستان کو یہ تجویز قبول ہوگی"؟ وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کا جواب تھا "ہرگز قبول نہ ہوگی۔ ایسا قطعی ناممکن تھا"۔

ممبئی میں مسلمان بیرسٹرز کے وفد سے ملاقات

نہرو سینٹر میں تقریب کے اختتام پر، مسلمان بیرسٹرز، جو دونوں تقریبات میں میرے خیالات سن چکے تھے۔ ہم سے الگ ملاقات میں ممبئی میں، ہماری آمد کو خوش آمدید کہا اور ملتمس ہوئے، کہ جموں کشمیر کے عوام کو، ہندوستان سے الگ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ان کی علیحدگی سے ہندوستان میں، مقیم مسلمانوں کا مستقبل، غیر محفوظ اور مخدوش ہو جائے گا۔ اس سے قبل، دہلی شاہی مسجد کے امام بخاری بھی، ایسا ہی بیان دے چکے تھے۔ ہندوستان اپنے ملک میں آباد، مسلمانوں کو پُرامن آباد رہنے کے لئے، جموں کشمیر کے مسلمانوں کو بطور ضمانت اپنا یرغمال رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ ان مسلمان وکلاء کا مؤقف بھی، ہندوستان کی پالیسی کی تائید میں تھا۔ ہم نے ان سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بتایا، کہ تحریک قیامِ پاکستان میں کانگریس کی اس دلیل کو پہلے ہی، مسترد کیا جا چکا تھا۔

اے۔جی نورانی کی دعوت

مسٹر اے۔جی نورانی، ہندوستان بھر میں نامور قانون دان، دانشور اور کالم نویس ہیں۔ بیرسٹر ہیں اور غیر شادی شدہ ہیں۔ قائداعظم کی ذہانت، دانش، جرأت اور سیاسی بصیرت کے بڑے مداح ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بے باک آواز اور علم بردار ہیں۔ روزنامہ ڈان میں، میں ان کے مضامین اور خیالات کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ لہٰذا ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ ان کو بھی میرا تعارف تھا۔ لہٰذا ان کی دعوت باہمی احترام اور شوقِ ملاقات کی عکاس تھی۔ ممبئی میں ایک بڑے فلیٹ میں واقع ان کی لائبریری میں، انھوں نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا۔ بغیر لمحہ ضائع کیے، اچھے قانون دان کی طرح انھوں نے، مسئلہ کشمیر پر گفتگو

شروع کردی۔ دونوں طرف سے بین الاقوامی قانون، اقوام متحدہ کی قراردادوں، قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء، معاہدہ سندھ طاس، معاہدہ شملہ اور ہندوستان و پاکستان کے مابین مذاکرات پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ ان کا مؤقف کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ رہنے، رکھنے کے حق میں تھا اور ہمارا مؤقف اس کے برعکس۔ تاہم موجودہ حالات میں، بالخصوص ہندوستان کی پاکستان کے بارے نفرت آمیز پالیسی کی روشنی میں، جموں کشمیر کو خودمختار حیثیت دینا، شاید ہندوستان کو قبول ہو، اس رائے سے ان کو اتفاق تھا۔ یہ علمی اور سیاسی محفل دو گھنٹوں پر محیط رہی۔

ڈاکٹر اے ایس آنند، سابق چیف جسٹس ہندوستان

مئی ۲۰۰۶ء میں سی ڈی آر نے، دہلی میں جموں کشمیر کے مسئلہ پر، سہ فریقی کانفرنس منعقد کی، دہلی پہنچنے پر سوشوبھ بھاروے نے بتایا کہ عشائیہ کا اہتمام جسٹس ملک کے اعزاز میں، ہندوستان کے سابق چیف جسٹس، اے ایس آنند نے کیا ہوا ہے، جن کا سابق تعلق میرپور سے تھا اور جسٹس ملک کے ہمراہ، پاکستان سے آنے والے سب مہمان بھی عشائیہ میں مدعو تھے، جج صاحب کا نام آدرش سین آنند تھا، وہ میرپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جورلیہ جی کہلاتے تھے، وہ مہاراجہ کی حکومت میں ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ چیف جسٹس ہائی کورٹ اور جج سپریم کورٹ رہے، وہ جموں منتقل ہوئے۔ آنند نے تمام تعلیم جموں میں حاصل کی تھی، ان سے صرف میرا اور میرے متعلق سناسنایا تعارف تھا، مگر میرے متعلق ڈاکٹر کرن سنگھ کی طرح انہیں، سب معلومات حاصل تھیں۔ ملاقات پر گلے لگ کر ملے اور شکوہ کیا، کہ گذشتہ سال ہمارے دہلی آنے پر، وہ ہماری تلاش میں رہے، مگر ملاقات نہ ہوسکی تھی، گفتگو میرپوری زبان میں ہوتی رہی۔ انہوں نے اپنی بیگم اور چچا رام لال سے تعارف کروایا۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ گو ان کا تعلق یوپی سے تھا، مگر وہ اب میرپوری زبان ہی بولتی تھیں۔ رام لال کو وہ چچالال کہتے تھے، ان کی عمر نوے سال سے اوپر تھی، چچالال، سفید رنگ، میرپوری لباس میں ملبوس ساتھ بیٹھے، میرے چہرے پر نظریں جمائے، اپنے بچپن اور میرپور کی یادوں کو نہایت پرسکون، مگر اعتماد اور اطمینان کے ساتھ، ماضی میں جھانک کر تلاش کرتے رہے۔ تین گھنٹے کی اس ملاقات میں، صرف میرپور، اس کا ماضی اور حال زیربات چیت رہا۔ باقی مہمان ہماری باتیں تو سنتے رہے، مگر کچھ کچھ ہی سمجھ پائے۔ ڈاکٹر ہمایوں، سابق سفیر پاکستان، بہت متاثر ہوئے، کہ میرپور کے لوگوں میں حب الوطنی اور باہمی چاہت کس قدر زیادہ تھی اور میرپور میں کتنے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے تھے۔ جج صاحب، نے جموں کشمیر کے حالیہ دستور پر لکھی اپنی کتاب مجھے پیش کی۔ یہ ایک تاریخ ساز ملاقات تھی۔ میرپور میں وہ امیر اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں مستقل نقل مکانی، جموں میں کی تھی۔ میرپور کے دوسرے جج آر پی سیٹھی نے بھی، جموں کشمیر میں رائج دستور پر کتاب لکھی ہے۔ ان دونوں کتب میں ریاست میں مسلمانوں کے حقوق اور آزادی کے ارتقاء پر، مفصل تجزیہ و تبصرہ کیا گیا ہے۔

جموں انٹرا کشمیر ڈائیلاگ

جموں کشمیر کی تحریک آزادی کی جدوجہد کے سیاسی اور سفارتی محاذ پر میں نے، دنیا بھر کی سفر گردی میں خاک چھانی ہے اور ابھی تک منزل کی تلاش اور جستجو میں جدوجہد جاری ہے۔ کاروانِ تگ ودو میں شامل، بڑے بڑے قد آور عشاق آزادی، آرزوئے پہچان اور منزل کے نشان کی معراج کو پانے کی تمنا میں، خاک پوش ہو گئے اور کئی میری طرز پر سوئے منزل بڑھ رہے تھے، کاش کہ لیلی آزادی کا محمل اٹھتا اور حسن آزادی کے جلوے سے پروانے سرفراز ہو کر راکھ ہوتے۔ مسئلہ جموں کشمیر بین الاقوامی منظر پر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی افواج کے حملہ آور ہو کر، ریاست پر قابض ہونے اور جارحیت کو مستحکم کرنے کی نیت اور مقصد سے، اقوام متحدہ میں، یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے خلاف شکایت کرنے پر منظر عام پر آیا، تب سے عوام کی تحریک آزادی کو، قانون آزادی ہند کے تحت، تائید اور توسیع ہونے کے مسلمہ عمل کو، ایک تنازعہ بالخصوص ہندوستان و پاکستان کے مابین کا نام دیا گیا۔ تحریک آزادی کی حقیقت کو عمداً مسخ کیا گیا۔ جموں کشمیر کے عوام، ماسوائے محدود سیاسی شعور کے حامل طبقہ کے، ریاست کے دونوں اور اب تینوں حصوں میں، مقامی اقتدار اور مالی مراعات کی ہوس اور لالچ میں، آزادی کے نصب العین سے ہٹ کر، ہندوستان و پاکستان کے حامی گروہ میں بٹ گئے ہیں اور اب تک اسی تلاطم گردش میں بھٹک رہے ہیں۔ ان الجھنوں اور مخمصوں کے حل کے لئے، بین الاقوامی اور مقامی سطح پر کئی کانفرنسیں اور مذاکرات کے بے شمار بے نتیجہ دور ہو چکے ہیں، مگر یہ مشق بدستور جاری ہے۔ ان اجتماعات میں مسلسل شریک ہو کر، میں اپنا نکتہ نظر پیش کرتا رہا ہوں۔ ان مخصوص کانفرنسوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند ایک کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے، اب صرف ایک بامقصد مذاکرہ کا ذکر کرنا ہے، جو ۱۲-۱۳ راپریل ۲۰۰۶ء میں، جموں میں ہوا۔ اس ڈائیلاگ کا انتظام بھی سی ڈی آر نے کیا تھا۔ ۱۳ راپریل صبح کے سیشن میں ۲۱ مندوبین کا ایک گروپ ترتیب دیا گیا، جس میں جموں کے ڈوگرہ، ہندو وکلاء، لداخ کے، بدھ رکن لوک سبھا، ہندو کشمیری پنڈت، سری نگر کے رکن اسمبلی اور چند مسلمان خواتین، ڈوڈہ کے ایک وکیل سمیت ۱۹ ممبران اور آزاد کشمیر سے میرے علاوہ، ملک اصغر سیٹھی صدر کوٹلی بار، بطور ممبر شامل تھے۔ مجھے چیئر مین اور امتیاز میر ایڈووکیٹ، ڈوڈہ کو گروپ سیکریٹری، مقرر کر کے گروپ کو، مسئلہ جموں کشمیر کے مستقبل کی تجویز مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ پہلی بار ایک خاص سوچ کے تحت، کیا گیا اور خاص کر جموں کے ہندو اور کشمیری پنڈت، لیہہ کے بدھ، کب ہم سے اتفاق کرنے والے تھے۔ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا رَبِّ اشْرَحْ لِی، دل میں دہرا کر، گروپ میں جموں کشمیر کے، عوام کے ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں، ریاست کی تقسیم اور وحدت کے فوائد و نقصانات، ہندوستان و پاکستان کے حکمرانوں کے گذشتہ ماضی میں سلوک اور رویہ، ریاست کے مستقبل میں موجود قدرتی وسائل کی فراوانی، کی نشاندہی کرتے ہوئے ریاست کی جغرافیائی، بین الاقوامی، ریشمی شاہراہ اور تجارتی

راہداری کی، وسط اور جنوبی ایشیا میں اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ریاست میں برفانی گلیشیئر، جھیلوں اور دریاؤں میں پانی کی فراوانی سے کئی ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کر کے، سرمایہ حاصل کرنے، جنگلات اور سیاحت میں پیداوار اور جدید صنعتی ترقی کی، آمدن سے، ریاست کے خود کفیل ہونے کی تفصیل بیان کر کے، مستقبل میں، ریاست میں نظام حکومت کی شکل، جس میں الگ الگ علاقائی، بااختیار جمہوری حکومتوں کے قیام اور مرکز میں ریاستی دفاع، امور خارجہ، بین الاقوامی تجارت اور رسل و رسائل اور علاقائی حکومتوں کے مابین ربط اور توازن کے اختیارات، کی حامل حکومت کے، قیام کی تجویز پیش کی۔ تمام قومیتوں اور عوام کے مذہبی حقوق اور انسانی مساوی حقوق اور مساوی آزادیوں اور معاشی مساوات کی، دستور میں ضمانت اور تحفظ، جو ناقابل ترمیم ہوں گی کی تجویز دی۔ ریاست میں مسلم و غیر مسلم آبادی میں تفاوت کی وجہ سے، عدم مساوات کے خدشات کے تحفظ کی، دستور میں نمائندگی کی ضمانت مہیا کرنے کا عندیہ پیش کیا۔ اس کے بالمقابل موجودہ کنٹرول لائن پر، ریاست کی تقسیم کے اثرات، فوائد و نقصانات، ہندوستان یا پاکستان سے ساری ریاست کے الحاق کے امکانات، ہندوستان و پاکستان کے مابین تقسیم ہندوستان کے سبب، پیدا ہونے والی نفرت، علاقائی اجارہ داری میں دوڑ اور سرد جنگ میں متحارب اختلاف کو دیکھتے ہوئے بہت کم تھے، لہٰذا ریاست کے عوام کی ریاستی، جغرافیائی اور سیاسی وحدت کی بحالی اور تشخص کے قیام کی صرف ایک ہی صورت، ریاست کے آزاد و خود مختار رہنے میں تھی۔ جموں کے ڈوگرہ، ہندو، سکھ اور کشمیر وادی کے ہندو پنڈت، ہندوستان کے ۷۰ سال میں، حکومتی سلوک اور رویہ سے خاصے نالاں تھے، انہوں نے مذہبی حقوق کے تحفظ سے متعلق، چند سوالات کیے، جس کے متعلق میں نے دستور میں ضمانت فراہم کرنے اور تحفظ کی ضمانت کی تسلی دی، تو اس پر تمام گروپ نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ امتیاز میر ایڈووکیٹ نے، اتفاق رائے پر مبنی رپورٹ تیار کی، جو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کی گئی تھی۔ اتفاق رائے سے رپورٹ پیش ہونے پر ہندوستان اور پاکستان سے شرکاء، مندوبین کانفرنس ششدر رہ گئے، کچھ لوگ جز بز بھی ہوئے۔ اجلاس میں تجویز پر مفصل بحث ہوئی۔ ہمارے گروپ میں شامل مندوبین نے، رپورٹ کی ڈٹ کر حمایت کی، جس کے نتیجہ میں کثرت رائے سے، ہماری تجویز کے حق میں، فیصلہ ہوا اور قرار پایا کہ ''مسئلہ جموں کشمیر ختم کر کے، دونوں ممالک کی افواج کا مکمل انخلاء کر کے، ریاست کے تینوں حصوں کو ۱۹۴۷ء کی پوزیشن میں بحال کر کے، اس کی آزاد خود مختار حیثیت ہندوستان و پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی جانی چاہیے''۔ اس رپورٹ کی نقل ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو ارسال کی گئی۔ اجلاس کے بعد، مجھ سے کئی لوگوں نے سوال کیا، کہ میں نے ڈوگرہ اور ہندوؤں جن میں وکیل بھی شامل تھے، کشمیری پنڈتوں، بالخصوص لداخ لیہہ کے بدھ اور ہندوستان کی لوک سبھا کے رکن کو اپنی تجویز پر کیسے قائل کیا تھا؟ میں نے جواب میں کہا کہ ''یہ سوال ان سے کیا جائے، کیونکہ اس کا بہتر جواب وہی دے سکتے تھے''۔ امتیاز میر ایڈووکیٹ ڈوڈہ اور اصغر سیفی ایڈووکیٹ کوٹلی،

جس کا تعلق لبریشن فرنٹ سے تھا، انہوں نے گروپ میٹنگ میں مسئلہ کشمیر کے حل کی میری تجویز کو، پیش کرنے اور متفقہ حمایت حاصل کرنے کی، حکمت عملی کی خوب تعریف کی۔

حقیقی صورت حال یہ تھی، کہ ۲ رجولائی ۱۹۷۲ء کو شملہ معاہدہ طے ہونے کے وقت سے، مسئلہ کشمیر دوطرفہ مذاکرات کی آڑ میں، ہندوستان کی مذاکرات کی صوابدیدی، اور مذاکرات میں تعطل کی حکمت عملی، کا یرغمال بنا ہوا ہے۔ جموں کشمیر کے عوام سے پوشیدہ، ہر دو ممالک اپنے اپنے زیر تسلط علاقہ میں، اپنا اپنا قبضہ اور تسلط آئے روز مضبوط کر رہے ہیں۔ سندھ طاس معاہدہ ۱۹۶۰ء کی آڑ میں، ہندوستان چناب، جہلم، کشن گنگا اور سندھ کے دریاؤں پر لاتعداد بجلی گھر تعمیر کر رہا ہے اور اس کی اربوں روپیہ آمدن حاصل کر رہا ہے، اسی طرح ریاست کے دیگر متعدد وسائل کے استعمال سے، ریاست کے عوام کا استحصال کر رہا ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی اور آزادی سے محرومی، نوآبادیاتی حیثیت میں جبر اور تشدد سے ریاستی عوام کو محکوم رکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے اٹوٹ انگ کے مؤقف سے مراد صرف ریاست کی زمین اور وسائل ہیں، عوام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کشمیر کی قیادت اور لاکھوں عوام، بھارت کی قید میں ہیں۔

آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں بھی حالات قابل رشک نہیں ہیں، اگرچہ جموں کشمیر کے عوام کی اکثریت، پاکستان سے ریاست کے الحاق کی حامی رہی ہے اور پاکستان اس کو اپنی شہ رگ قرار دیتا ہے، مگر عملی رویہ جو ۱۹۴۹ء سے روا رکھا گیا ہے، اس حقیقت کا غماز ہے کہ شہ رگ کے دعویٰ میں، ریاست کے عوام، ان کے انسانی حقوق، آرزوئیں، افواج، مالیات، انتظامی امور، گلگت بلتستان اور تحریک آزادی کے اختیارات ۲۸ راپریل ۱۹۴۹ء کو لے لینا اور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے عوام کو، وزارت امور کشمیر کی نوکر شاہی کی آمریت کے تابع کرنا، ڈوگرہ مہاراجہ کی آمریت سے بھی بدتر تھا۔ یہ نظام آزاد کشمیر میں ۱۹۷۰ء تک اور گلگت بلتستان میں ۲۰۰۹ء تک جاری رہا۔ اب پاکستان اپنی سیاسی جماعتوں اور قیادت کے زیر اثر، ان علاقوں کو بتدریج پاکستان کا حصہ بنا کر، جموں کشمیر کی تقسیم کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، مزید برآں، پاکستان اور چین کے مابین اقتصادی کاریڈور پر عمل درآمد سے، تقسیم ریاست کے خدشات، حقیقت کی شکل اختیار کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

آزاد جموں کشمیر عبوری حکومت کی حیثیت

قانون آزادی ہند کے تجزیہ سے یہ ثابت ہے، کہ مہاراجہ کا معاہدہ امرتسر کے تحت حاصل کردہ، اختیار حکمرانی، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ساقط ہو گیا اور حق حکمرانی و اقتدار اعلیٰ، عوام کو عود ہو گیا۔ عوام کی طرف سے گذشتہ الیکشن قانون ساز اسمبلی، جو ۵ رجنوری ۱۹۴۷ء میں منعقد ہوئے تھے، اس میں مسلم کانفرنس کو اکثریت حاصل تھی، نیشنل کانفرنس نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا، مسلم کانفرنس نے ۲۱ میں سے ۱۵ سیٹیں حاصل کی تھیں۔ چوہدری حمیداللہ اسمبلی میں پارٹی

لیڈر اور سردار ابراہیم، چیف وہپ مقرر ہوئے تھے۔ مہاراجہ کی معزولی پر، سردار ابراہیم کو عبوری حکومت کا صدر نامزد کیا گیا، ریاست کے عوام نے عبوری حکومت کو تسلیم کر کے، ڈوگرہ فوج، جو اپنی قانونی حیثیت کھو چکی تھی، کے خلاف جدو جہد شروع کر کے بیشتر علاقہ حاصل کر لیا۔ عبوری حکومت کا اپنا قومی پرچم، قومی ترانہ، عدلیہ، انتظامیہ کے تمام اداروں کا قیام، کابینہ، وزیر دفاع، آزاد فوج کے کمانڈر انچیف، چیف آف سٹاف، جنرل ہیڈ کوارٹر اور دارالخلافہ کا قیام، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ آزاد حکومت ہر لحاظ سے ریاست کی، جائز حکومت قرار پائی۔ ہندوستان نے نہایت چالاکی سے، آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر کے عملی قیام اور اس کے تابع آزاد کشمیر ریگولر فورس کے قیام اور ریاست میں ڈوگرہ غیر قانونی فوج کے خلاف جنگ اور فتوحات کو مخفی رکھ کر، آزاد قبائل کے لشکر کے مظفرآباد کے شہر پر حملہ اور وادی کشمیر میں پیش قدمی پر، پاکستان حکومت کی اعانت اور ملوث ہونے کی سازش کا الزام لگا کر، کشمیر میں ہندوستان کی فوج داخل کر دی۔ اور یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو ان ہی الزامات کی بنا پر سیکیورٹی کونسل میں، پاکستان کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کر دیا۔ پاکستان نے اپنے جواب میں، بالمقابل ہندوستان کے خلاف جموں کشمیر میں عوام کے خلاف حملہ کرنے کے الزام کے علاوہ، دستاویز نمبر ایک اور دو میں واضح مؤقف اختیار کیا، کہ جموں کشمیر میں عوام کی آزاد حکومت اور اس کی آزاد فوج، اپنی آزادی کی جنگ، آزادی کے دفاع میں لڑ رہی ہے، جو پاکستان کے کنٹرول میں نہیں تھی، بلکہ آزاد اور خود مختار فوج، اپنی مدد آپ کے تحت، برسرپیکار تھی اور ریاست کے بڑے حصے پر قابض تھی۔

"سیکیورٹی کونسل میں اپنے مؤقف کی تائید میں، ہندوستان کے مستقل نمائندہ گوپال سوامی آئینگر، جس کے ساتھ ڈپٹی لیڈر شیخ عبداللہ تھے، انہوں نے ۱۵ رجنوری میں تجویز دی اور مؤقف اختیار کیا کہ "ریاست جموں کشمیر میں اقتدار اعلیٰ کے مالک، عوام ہیں، جن کو حق اور اختیار حاصل ہے، کہ وہ ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کریں یا آزاد و خود مختار رہ کر جموں کشمیر، آزاد ملک کی حیثیت میں اقوام متحدہ کا رکن بنے"۔ آئینگر اور شیخ عبداللہ نے سیکیورٹی کونسل میں بحث کے دوران، آزاد کشمیر حکومت کے قیام کو تو تسلیم کیا، مگر اس کی آئینی حیثیت ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ ہندوستان نے جموں کشمیر سے متعلق سیکیورٹی کونسل کی ۱۷، ۲۰ رجنوری، ۵ رفروری، ۲۱ راپریل، ۳۰ رجون اور ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء کو متفقہ منظور کی جانے والی، قراردادوں کو تسلیم کر کے، آزاد حکومت اور اس کی آزاد کشمیر ریگولر فورس کی ۳۲ بٹالین کی حیثیت کو تسلیم کر لیا ہوا ہے، جبکہ پاکستان کی افواج اور شہریوں کے آزاد خطہ سے انخلاء پر، ۱۳ راگست کی کمشن کی قرارداد کے پارٹ دوئم - الف شق (۳) کے تحت، خطہ کے تمام انتظام و انصرام کی ذمہ داری، آزاد حکومت اور آزاد فوج کی، تسلیم شدہ ہے۔ جس کی مزید توجیہ ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کی، کمشن کی قرارداد کی شق (۴) الف اور ب میں کی گئی ہے۔

لوکل اتھارٹی

ہمارے چند ماہرین اس بات پر معترض ہیں، کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں میں آزاد حکومت کو، حکومت نہیں بلکہ لوکل اتھارٹی قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت "حکومت" کی نہیں، بلکہ اس سے کم تر محض "مختصر انتظامیہ" کی سی ہے۔ اس کی وضاحت بروقت، حکومت پاکستان نے یو این کمشن سے مانگی تھی اور خط و کتابت میں کمشن نے، اس کی حیثیت بطور حکومت تسلیم کی ہوئی ہے، جو ریکارڈ میں موجود ہے، یو این کمشن کے چیئرمین، جوزف کوربل نے اپنی کتاب "ڈینجر ان کشمیر" میں اس پر مفصل تذکرہ اور تبصرہ کیا ہے۔ صفحہ ۱۹۹ میں اس نے بتایا کہ "آزاد حکومت کو لوکل اتھارٹی ظاہر اس لئے کیا گیا کہ، جس ملک میں یہ حکومت قائم ہے، اس کے تمام شعبوں پر اس کا کنٹرول اور حکمرانی ہے، مگر پوسٹ آفس اور دفاع، وزارت امور کشمیر پاکستان کی تحویل میں تھا۔ جس وجہ سے اس کی اصطلاح لوکل اتھارٹی استعمال کی گئی ہے"۔ میری رائے میں یہ وضاحت، ۵ر جنوری ۱۹۴۹ء کی کمشن کی اپنی قرارداد کی شق ۴۔الف و ب سے متصادم ہے۔ اس ضمن میں آزاد فوج کو، آزاد حکومت کے ماتحت تسلیم کیا گیا ہوا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ آزاد خطہ سے پاکستان آرمی کے انخلاء پر، اس خطہ کا دفاع اور حفاظت آزاد، ریگولر فورس کے ذمہ ہوگی۔ لہٰذا آزاد حکومت ہر لحاظ سے ریاست کی جائز حکومت ہے۔" قرارداد کے پارٹ بی (۲) میں سرینگر حکومت کو بھی لوکل اتھارٹی ظاہر کیا گیا ہے"۔ یہ امر بھی اقوام متحدہ اور ہندوستان و پاکستان کے ریکارڈ پر مسلمہ ہے کہ ۴ اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد فورس کا اور آزاد حکومت کا، ریاست کے دو تہائی سے زائد حصہ پر قبضہ تھا۔ ہندوستان کی فوج نے، جنگ بندی کا اصول طے ہونے کے بعد، یعنی اگست کے بعد اور جنگ بندی کے نفاذ یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے قبل، اکتوبر نومبر میں لداخ، ذوجیلہ پاس، کرگل، راجوری، مینڈھر، پونچھ کے علاقہ پر، ہندوستان میں کمانڈر انچیف لوکرٹ اور پاکستان کے جنرل گریسی اور دہلی میں سپریم کمانڈر اکنلیک اور گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی باہمی سازش اور حکمت عملی کے تحت قبضہ کیا۔ پاکستان اور بھارت کی افواج کی کمانڈ اور کنٹرول، انگریز جرنیلوں کے پاس تھی، جو ماؤنٹ بیٹن کی پالیسی اور احکامات کے تابع تھے۔ ان واقعات کا دستاویزی ثبوت، پاکستان جنرل ہیڈکوارٹر میں موجود ہے۔ (بحوالہ وائٹ پیپر ۱۹۷۷ء وزارت خارجہ پاکستان)

پنڈت نہرو کا خط بنام چیئرمین کمشن

پنڈت نہرو بحیثیت وزیراعظم ہندوستان، گو آزاد حکومت کو ۱۳ر اگست کے ریزولیشن کے تحت تسلیم کر چکا تھا، مگر اس نے چیئرمین کمشن کے نام ۲۰ر اگست ۱۹۴۸ء کو خط لکھ کر اپنا تحفظ ظاہر کیا، کہ ۱۳ر اگست کی قرارداد کی روشنی میں ریاست جموں کشمیر کی ساورنٹی، یعنی اقتدار اعلیٰ کا فیصلہ نہ کیا جائے اور نہ ہی آزاد حکومت کی ریاست یا اپنے

زیر قبضہ علاقہ سے متعلق، اس کی ساورنٹی تسلیم کی جائے۔ (بحوالہ خط و کتابت سردار پٹیل صفحہ ۳۵۹)

پنڈت نہرو کے خط کے جواب میں، کمشن کی طرف سے آزاد حکومت کی حیثیت، اس کے کردار، حکومت کے صدر اور سپریم ہیڈ، سردار ابراہیم اور چوہدری غلام عباس سے کمشن کی ملاقات اور ان کے مؤقف کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ وزارت امور کشمیر نے، آزاد حکومت کے معاملات میں مداخلت، جنگ بندی اور استصواب رائے کی قرارداد منظور ہونے کے فوراً بعد شروع کردی تھی، جس کی توثیق راولپنڈی معاہدہ ۲۸ ر اپریل ۱۹۴۹ء، مابین وزیر بے محکمہ مشتاق گورمانی، سردار ابراہیم اور غلام عباس خان سے کروائی گئی۔ جنگ بندی قائداعظم کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ قائداعظم کی وفات کے فوراً بعد ہندوستان نے، ریاست حیدرآباد اور آزاد کشمیر میں فوج کے ذریعہ، ذوجیلہ پاس، کرگل، پونچھ، راجوری کے علاقہ پر قبضہ کیا تھا۔ ہندوستان کی کوشش تھی کہ مظفرآباد، میر پور، کوٹلی اور بلتستان و گلگت پر بھی قبضہ کرلیا جائے۔ جس کے لئے ہندوستان نے تینوں طرف سے ایک بڑے حملہ کی تیاری کر لی تھی، مگر دونوں ممالک کی فوج کے دونوں کمانڈروں، لوکرٹ اور گریسی نے سپریم کمانڈر مسٹر آکنلیک کی مشاورت سے، جنگ بندی لائن مقرر کر کے، ریاست کو عملاً دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ البتہ وزیراعظم بھارت اور یو این کمشن نے آزاد حکومت کو بطور حکومت تسلیم کیا ہے۔

انگریزوں کی سازش

انگریز برطانوی حکومت، ہندوستان کو متحد رکھ کر کانگرس کو اقتدار منتقل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کیبنٹ مشن کی تمام کوشش یہی ظاہر کرتی ہے، کہ اس کو مسلم لیگ اور قائداعظم کے ڈائریکٹ ایکشن کا ۱۶ ر اگست کے دن منانے اور کلکتہ میں قتل و غارت ہونے کے نتیجہ میں، اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ لارڈ ویول وائسرائے کو بدل کر ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کرنا، سازش کی دوسری کڑی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کا سیکریٹری، کانگرسی ہندو، وی پی مینن مقرر ہوا تھا، جو کانگرس اور وائسرائے کے درمیان رابطہ کار تھا۔ وی پی مینن نے اپنی کتاب "انڈین سٹیٹس" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے مارچ میں، تقسیم ہندوستان کا پلان شملہ میں، پنڈت نہرو اور کرشنا مینن کو دکھایا اور بقول اس کے، اس میں ردوبدل کیا۔ اس کے برعکس یہ پلان قائداعظم سے خفیہ رکھا گیا۔ اس کی تیسری کڑی یہ ہے کہ ایوارڈ مسٹر ریڈکلف نے ۸ ر اگست کو ماؤنٹ بیٹن کو پیش کیا۔ پنڈت نہرو نے ۹ ر اگست کو ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھ کر، اس میں تبدیلی کروائی اور مسلمان اکثریت کے دو اضلاع فیروز پور اور گورداسپور بجائے پاکستان کے، ہندوستان میں شامل کردیئے گئے۔ فائنل ایوارڈ وصول ہوجانے پر نہ سنایا گیا۔ گورداسپور کی مسلم اکثریتی تحصیلوں کو، ہندوستان کے سپرد کر کے، جموں کشمیر میں، زمینی رسائی کا راستہ مہیا کیا گیا۔ ان جانبدارانہ سازشوں میں آخری سازش، مہاراجہ کشمیر سے جعلی اور فرضی الحاق ریاست، بحق ہندوستان، بھی سازش تھی اور حتمی طور پر دونوں ممالک کے

انگریز کمانڈر انچیف ہا کی ملی بھگت سے، تقسیم کشمیر کی سازش کو کامیاب کرنے کی نیت سے، مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا گیا۔ جو اَب تک جوں کی توں حیثیت میں لٹک رہا ہے اور ہندوستان استصواب سے منحرف ہو کر، اپنا تسلط کشمیر میں مضبوط کر رہا ہے اور مزید یہ کہ شملہ معاہدہ کی آڑ میں بتدریج، غیر قانونی قبضہ کو مستقل حیثیت دینے میں مصروف ہے۔

یہاں کانگرس کے قائدین اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے درمیان، ملی بھگت کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں، تیسرا کردار سردار پٹیل اور مہاراجہ کے درمیان خفیہ خط و کتابت کے ذریعہ، رابطہ کا ہے۔ پہلا خط ۳ر جولائی، دوسرا ۱۳ر ستمبر اور تیسرا خط ۲۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء میں اور اس دوران دیگر خطوط جو اَب شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ در پردہ، مکمل منصوبہ بندی، باؤنڈری کمشن کے ایوارڈ سے قبل ہی ہو چکی تھی، کہ ریاست کو ہر صورت، ہندوستان میں شامل کرنا تھا۔ جس کا مزید ثبوت ریکارڈ پر ہے کہ ۲۶ر اکتوبر کو ہندوستان کے ہوائی جہازوں کی کشمیر میں افواج اتارنے کی نقل و حرکت لاہور ہیڈ کوارٹر کے علم میں آ گئی تھی، مگر اس کی اطلاع قائداعظم، جو اس دن لاہور میں تھے، ان کو نہ دی گئی۔ دوسرے دن، اس کا علم ہوتے ہی قائداعظم نے جنرل گریسی کو کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا، تو اس نے تعمیل حکم سے انکار کرتے ہوئے، انگریز فوجی افسران کی، پاکستانی فوج سے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی۔ ایک طرف انگریز جنرل اور ایئر فورس نے ہندوستانی حکومت کے حکم پر، ریاست میں حملہ کر کے، فوج داخل کر دی اور دوسری طرف پاکستانی حکومت کا حکم ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ انگریز اور کانگرس کی مکاری کی یہ انتہا تھی۔

(بحوالہ وائٹ پیپر ۱۹۷۷ء، وزارت خارجہ پاکستان)

دوطرفہ مذاکرات کا انجام

یہ درست ہے کہ قوموں کی آزادی کی جدوجہد میں مذاکرات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور مذاکرات جاری رہنے چاہئیں۔ دنیا میں بیشتر اقوام نے آخری حربہ جنگ کا، اختیار کر کے آزادی حاصل کی ہے، مگر زیادہ تر اقوام نے اپنی جدوجہد میں مذاکرات کے ذریعہ ہی آزادی حاصل کی ہے۔ افریقہ اور ایشیا میں، جنوبی افریقہ اور ہندوستان و پاکستان کی آزادی کی جدوجہد میں، لندن گول میز کانفرنسوں، دہلی و شملہ کانفرنسوں کی مثال موجود ہے۔ برطانوی وائسرائے، کانگرس کی قیادت اور مسلم لیگ کی قیادت میں بھی، ہندوستان کی تقسیم و پاکستان کے قیام اور آزادی سے متعلق، متعدد بار مذاکرات کی مشق ہوتی رہی، جس کے نتیجہ میں، دو آزاد ممالک معرض وجود میں آئے۔

جموں کشمیر میں ہندوستان نے پاکستان کو اطلاع کیے بغیر، ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہوائی جہازوں سے کشمیر میں فوج اتاری تو، دہلی سے پاکستانی ہائی کمشنر ارشد حسین نے اس کی اطلاع، بذریعہ ٹیلی گرام لاہور، جہاں قائداعظم اور لیاقت علی خان مقیم تھے، میں دی، مگر انگریز افسران نے اس امر سے قائداعظم کو دوسرے دن مطلع کیا۔ جس پر ایک

تو قائداعظم نے مہاراجہ کے ریاست کے ہندوستان سے نام نہاد الحاق کو، فراڈ اور ناجائز قرار دے کر، ہندوستان کی فوج کی مداخلت کے خلاف احتجاج کیا اور دوسرا انگریز کمانڈر انچیف کو، جموں کشمیر پر حملہ کا حکم دیا۔ جس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سپریم کمانڈر رایکنلیک کی ایما پر عمل نہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں لاہور میں، دوطرفہ مذاکرات کا فیصلہ ہوا۔

جموں کشمیر پر مذاکرات کی پہلی کانفرنس

حسب پروگرام، یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو گورنر جنرل بھارت، ماؤنٹ بیٹن اور دونوں ممالک کی افواج کے سپریم کمانڈر لاہور آئے، جبکہ وزیراعظم پنڈت نہرو بخار کے بہانے نہ آئے، حالانکہ وہ بیمار نہ تھے۔ اس طرح مذاکرات کی پہلی مشق کو ناکام بنانے کی کوشش کی گئی، تاہم مذاکرات میں قائداعظم نے، ہندوستانی فوج کے ریاست میں داخل ہونے پر احتجاج کیا اور مہاراجہ کے خلاف، آزاد کشمیر میں عبوری حکومت کے قیام اور آزاد فوج کی کارروائی سے پاکستان حکومت کی، قطعی لاتعلقی کا مؤقف اختیار کیا اور کہا، کہ جموں کشمیر خودمختار ملک ہے، اور وہاں کے عوام آزادی کے حق میں، مہاراجہ کے خلاف برسرپیکار تھے۔ مذاکرات میں قائداعظم نے تجویز کیا کہ:-

(i) دونوں ملک ہندوستان و پاکستان، ۴۸ گھنٹوں کے اندر، ریاست میں مکمل جنگ بندی کا حکم دیں۔

(ii) ہندوستان کی فوج اور قبائلی لشکر کا، ریاست سے فوری انخلاء عمل میں لایا جائے۔

(iii) دونوں ممالک کے گورنر جنرل مل کر، ریاست میں امن بحال کریں اور دونوں کی زیرنگرانی اور کنٹرول، ریاست میں استصواب رائے کے تحت فیصلہ کیا جائے۔ گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کردہ امور حکومت بھارت کو پیش کیے، مگر ہندوستان نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ۲ نومبر کو پنڈت نہرو نے ریڈیو پر تقریر میں اقوام متحدہ کے زیرنگرانی رائے شماری کا عندیہ دیا۔ ہندوستان کی بدنیتی کے رویہ کی وجہ سے، یہ مذاکرات بے نتیجہ رہے۔

وزراء اعظم کے درمیان پیغام رسانی

پروفیسر السٹر لیمب کی تحقیق کے مطابق، ہندوستان کی فوج، پٹیالہ ٹائیگرز ۲۶ اکتوبر سے قبل ہی جموں میں موجود تھی۔ تاہم ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریاست میں، کثیر تعداد میں فوج داخل کرنے کے بعد، وزیراعظم پنڈت نہرو نے مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ کو بروز ۲۶ اکتوبر ٹیلی گرام کے ذریعہ، ریاست میں فوج داخل کرنے سے مطلع کیا اور یقین دہانی کرائی، کہ افواج داخل کرنے کا مقصد، ریاست کا ہندوستان سے الحاق کرنے کے لئے اثر انداز ہونا نہ تھا۔ جبکہ ہندوستان کی پالیسی، جس پر وہ کاربند ہے، تھی کہ الحاق کا فیصلہ عوام کی آزادانہ صوابدید سے، استصواب رائے کے ذریعہ ہی ہوگا۔ وزیراعظم برطانیہ نے ۲۷ اکتوبر کو وزیراعظم پاکستان کو بذریعہ ٹیلیگرام، وہی یقین دہانی کرائی۔ ۲۸ اکتوبر کو بھارت کے وزیراعظم نے، وزیراعظم پاکستان کو ٹیلیگرام کے ذریعہ، تفصیل سے

واقعات بارے آگاہ اور براہ راست عہد کیا اور یقین دلایا، کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ، ریاست کے عوام کی خواہش کے مطابق بصرف استصواب رائے کے تحت ہی ہوگا، چنانچہ تینوں وزراء اعظم بھارت، پاکستان اور برطانیہ کے درمیان، چوبیس ٹیلی گرام اور خطوط کا تبادلہ ۳۱ دسمبر تک جاری رہا، جن میں ہندوستانی افواج کی ریاست سے مکمل انخلا اور استصواب رائے کی یقین دہانی اور تسلی دی جاتی رہی۔ اس دوران ریاست میں جنگ جاری رہی اور ہندوستان اندر ہی اندر، سیکیورٹی کونسل میں جانے کے لئے اپنا مقدمہ تیار کرتا رہا۔

ذوالفقار علی بھٹو، سورن سنگھ مذاکرات

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں، ہندوستان اور چین کے درمیان نیفا کے علاقہ میں جنگ میں ہندوستان کو شکست پر، امریکہ کے صدر کینیڈی اور برطانیہ کے وزیر اعظم میکملن کی، مسئلہ کشمیر حل کرنے کی ضمانت پر، پاکستان نے ہندوستان کا ساتھ دیا اور چین کی ترغیب کے باوجود کشمیر پر حملہ نہ کیا، بلکہ مذاکرات کو ترجیح دی۔ مذاکرات کے چھ دور، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء سے ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء کے دوران، ۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۶۲ء راولپنڈی، ۱۶ تا ۱۹ جنوری دہلی، ۸ تا ۱۱ فروری کراچی، ۱۲ تا ۱۴ مارچ کلکتہ، ۲۲ تا ۲۵ اپریل کراچی اور ۱۵، ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء کو نئی دہلی میں منعقد ہوئے، جو بے نتیجہ رہے۔ ان مذاکرات میں پاکستان کی طرف سے، ریاست میں بیک وقت استصواب رائے، علاقائی دریا چناب کی حد پر تقسیم اور بالآخر وادی کشمیر میں رائے شماری کی، تجاویز پیش کی گئیں، جو ہندوستان نے مسترد کر دیں اور جنگ بندی لائن کو معمولی ردوبدل کر کے فیصلہ کرنے کی رعایت پیش کی۔

۱۹۶۵ء میں دونوں ممالک میں جنگ کے بعد، وزیر اعظم شاستری اور صدر ایوب خان کے درمیان، روس کی معاونت کے تحت، تاشقند میں، مذاکرات کے نتیجہ میں ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو جاری ہونے والے، مشترکہ اعلامیہ میں، تمام تنازعات مذاکرات کے ذریعہ طے کرنا قرار پائے، جبکہ اس اعلامیہ میں، مسئلہ کشمیر کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

شملہ معاہدہ اور جموں کشمیر

مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن کی چھ نکاتی حقوق اور اختیار کی تحریک، ہندوستان و پاکستان میں جنگ کی شکل میں، بنگلہ دیش کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ہندوستان پاکستان کے درمیان، وزیر اعظم اندرا گاندھی اور صدر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان شملہ میں طے پانے والے، ۲ جولائی ۱۹۷۲ء کے معاہدہ میں، دیگر امور کے علاوہ، جموں کشمیر میں یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی سیکیورٹی کونسل کے تحت، جنگ بندی کے بجائے، ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ بندی لائن قبول کی گئی اور سیز فائر لائن کا نام اور حیثیت بدل کر نیا نام "لائن آف کنٹرول" رکھا گیا۔ آزاد کشمیر کی مختلف علاقوں میں، اہم دفاعی چوکیوں کے علاوہ جنگ کے دوران ہندوستان کی فوج نے ۳۸۰ مربع میل رقبہ پر قبضہ کیا تھا، وہ علاقہ

بھی واپس نہ لیا گیا۔ ہماری فوج نے بھمبر کے مشرق میں چھمب کے ۵۸ مربع میل علاقہ پر قبضہ کیا تھا جو ہمارے پاس ہے۔ مسئلہ کشمیر دونوں ممالک میں صرف باہمی مذاکرات سے حل کرنا، طے پایا۔ کنٹرول لائن میں یک طرفہ ردوبدل نہ کرنے اور سیکیورٹی کونسل کی منظور کردہ قراردادوں کے تحت، استصواب رائے کا حوالہ دیئے بغیر، دوطرفہ مذاکرات کے تحت، مسئلہ جموں کشمیر حل کرنے کی شرائط طے پائیں۔ شملہ روانگی سے قبل صدر بھٹو نے، پاکستان و آزاد کشمیر کے سیاستدانوں، دانشوروں اور دیگر طبقہ کے لوگوں سے مشاورت کی اور روانگی سے قبل رات کو اپنی ریڈیو تقریر میں کہا کہ "میٹنگ میں جموں کشمیر کے مسئلہ میں کوئی رعایت نہیں دی جائے گی"۔ شملہ معاہدہ کے بعد، پاکستان واپس آ کر ۳/جولائی کو بیان دیا کہ "ہم نے جموں کشمیر پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ مسئلہ ہندوستان و پاکستان نے نہیں، بلکہ صرف جموں کشمیر کے عوام نے ہی حل کرنا ہے"۔ یہ بیان معاہدہ سے ہٹ کر صرف عوام کی مخالفت سے بچنے کی نیت سے دیا گیا تھا۔ شملہ معاہدہ یو این او میں رجسٹر ہے۔ اول، ۱۹۶۰ء سندھ طاس معاہدہ، جس کے تحت ہندوستان کو دریائے بیاس، ستلج اور راوی کا تمام پانی دینے کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کو اپنے زیر قبضہ، جموں کشمیر کے حصہ میں، دریاؤں پر بجلی گھر تعمیر کرنے کا اختیار دینے کے بعد، اعلان تاشقند اور اس کے بعد، معاہدہ شملہ کے تحت، پاکستان نے جموں کشمیر پر اپنا مؤقف اگر قطعی ترک نہیں، تو کمزور ضرور کر لیا ہے۔ اس کے بعد پاکستان نے آزاد کشمیر کو اپنا صوبہ بنانے کی مہم شروع کر دی۔ ۱۹۷۳ء میں پہلی بار پاکستان کی سیاسی جماعت آزاد کشمیر میں منظم کی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں بھٹو نے مظفرآباد نیلم سٹیڈیم میں جلسہ عام منعقد کرا کر، آزاد کشمیر کو صوبہ کی حیثیت کا اعلان کیا، جس کی سردار عبدالقیوم صدر حکومت نے تائید کی۔ دوسرا جلسہ بجوسہ پونچھ میں کیا گیا۔ اس میں بھی اعلان کیا گیا، جس میں سردار ابراہیم اور سردار قیوم نے شرکت کی۔ اسی دوران سردار عبدالقیوم نے آزاد کشمیر اسمبلی کے بند کمرہ اجلاس میں، صوبہ بنانے اور پاکستان کی اسمبلی اور سینٹ میں نمائندگی حاصل کرنے کی قرارداد منظور کرانے کی کوشش کی، مگر قرارداد پیش ہونے سے قبل ہی، لبریشن لیگ کے صدر خورشید اور ہم نے احتجاجی جلسہ کیا، جس پر یہ قرارداد پیش نہ ہو سکی۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے میرپور سٹیڈیم میں جلسہ عام منعقد کیا۔ سٹیج پر، آزاد کشمیر کی تمام سیاسی قیادت موجود تھی۔ جب بھٹو نے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کا اعلان کیا، تو جلسہ گاہ میں چاروں طرف صوبہ نامنظور، صوبہ نامنظور کا شور اور نعرے بلند ہونے پر، بھٹو نے بھی کہا "اچھا صوبہ نامنظور"۔ بھٹو نے اندرا گاندھی کو آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کا تاثر دیا ہوا تھا۔ وہ سیاستدان تھا، اس نے ۲۴/فروری ۱۹۷۵ء کو اچانک اعلان کیا، کہ ۲۸/فروری کو جموں کشمیر کی آزادی کے حق میں ہڑتال کی جائے۔ ۲۸/فروری کو جموں کشمیر کے تینوں حصوں اور پاکستان میں، مکمل ہڑتال پر بھٹو نے اعلان کیا کہ "کشمیری آزادی چاہتے ہیں"۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران ہندوستان کی فوج نے، معاہدہ شملہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۱۹۸۴ء میں سیاچن گلیشیئر پر قبضہ کرلیا، جس کی نشاندہی ایک بیان کے ذریعہ خورشید صاحب نے کی، مگر جنرل ضیاء الحق نے اس پر کہا کہ ''سیاچن کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہاں تو گھاس کا تنکا بھی نہیں اگتا''۔ اب وہ سیاچن بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں، بے نظیر وزیراعظم پاکستان تھیں، راجیو گاندھی وزیراعظم ہندوستان تھا۔ اسلام آباد میں، پریس کانفرنس میں ایک سوال کے جواب میں بولے کہ ''مسئلہ کشمیر ختم ہے۔ جموں کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ تھا''۔ مگر بے نظیر بھٹو خاموش رہیں، جس کے خلاف احتجاج بھی ہوا۔ نواز شریف وزیراعظم پاکستان، کی ملاقات اندر کمار گجرال، وزیراعظم ہندوستان سے ہوئی تو، بقول کلدیپ نائیر صحافی، نواز شریف نے گجرال سے کہا ''گجرال صاحب نہ آپ کشمیر ہمیں دے سکتے ہیں اور نہ ہی ہم کشمیر لے سکتے ہیں، اس کا کوئی درمیانہ حل نکالیں''۔

دسمبر ۱۹۹۳ء میں، امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے، ڈائریکٹر انچارج جنوبی ایشیا، میڈم رابن رافیل کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کا مستقل حل، ہندوستان و پاکستان کو ''آزاد و خودمختار ریاست جموں کشمیر'' تجویز کیا۔ وزیراعظم بے نظیر اور صدر فاروق لغاری نے اس کو مسترد کرتے ہوئے، اخباری بیان میں کہا کہ، خودمختار جموں کشمیر ناقابل قبول تھا، مگر وزیراعظم ہندوستان، نرسیمار اؤ نے کوئی ظاہری ردعمل نہ دیا۔ میاں نواز شریف دوسری دفعہ وزیراعظم منتخب ہوئے تو ان کی دعوت پر وزیراعظم واجپائی، ایک بڑے وفد کے ہمراہ دہلی سے لاہور، بس پر سوار ہو کر آئے۔ لاہور اعلامیہ جاری کیا گیا اور مسئلہ کشمیر پر، فوراً مذاکرات شروع ہوئے۔ پاکستان کی نمائندگی سابق سیکریٹری خارجہ، نیاز اے نائیک کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا، کہ وہ مسٹر ڈکشت کے ساتھ، چناب فارمولہ پر، دہلی میں، جموں کشمیر کے نقشے کا مطالعہ کر رہے تھے، کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان کرگل میں جنگ چھڑ جانے کی اطلاع پر، کانفرنس ادھوری چھوڑ کر، فوری لاہور پہنچے۔ جنگ پاکستان کے کرگل کی خالی چوٹیوں پر قبضہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ نیاز اے نائیک اور آغا شاہی صاحب سے مسئلہ کشمیر کی وجہ سے، میرے مراسم تھے۔ مسئلہ کشمیر میں ہر پیش رفت پر، وہ مجھے اعتماد میں لیتے اور مشاورت کرتے۔ بعد میں مارشل لاء کے ذریعہ جنرل پرویز مشرف نے حکومت پر قبضہ کر کے، ہندوستان سے آگرہ میں اور اسلام آباد میں، مسئلہ کشمیر پر مذاکرات شروع کیے۔ اس نے چار نکات پیش کیے۔ جن میں بقول، تب وزیر خارجہ، خورشید قصوری خاصی پیش رفت ہو چکی تھی۔ وہ نکات یہ تھے (۱) خودمختار جموں کشمیر مسترد (۲) سرحدوں میں تغیر و تبدل نہ ہوگا۔ (۳) کنٹرول لائن بے قعت اور نرم (۴) ریاست کی دونوں طرف کی حکومتوں میں چند شعبوں میں اشتراک عمل۔ یہ تجویز مکمل تقسیم کی تھی۔ جس میں دونوں طرف کی، جزوی قیادت کشمیر بھی متفق تھی اور اب بھی ہے۔ پرویز مشرف کی نمائندگی، پنجاب کا بیوروکریٹ طارق عزیز اور بھارت کی طرف سے این ایس

لامبہ کرر ہے تھے ۔ یہ ریاست کی تقسیم کا فیصلہ تھا۔ ان دنوں دہلی میں، کشمیر کانفرنس میں وزیر اعظم بھارت کے مشیر نے، مجھے اس فیصلہ سے آگاہ کیا، تو میں نے وید بھسین اور دیگر کشمیری قائدین کے ساتھ مل کر، اس کے خلاف مہم چلائی اور ہندوستان کے شرکاء کانفرنس، دیش مکھ، مشیر وزیر اعظم کو، قائل کیا کہ جنرل پرویز مشرف کا وہ فیصلہ، پاکستان اور جموں کشمیر کے عوام تسلیم نہیں کریں گے۔ کانفرنس کے دوران ہی اسلام آباد میں، چیف جسٹس افتخار چوہدری کی معزولی، کے خلاف تحریک شروع ہوگئی اور کشمیر کی تقسیم کا خطرہ تو ٹل گیا، مگر اس کے امکانات بدستور موجود ہیں۔ کانفرنس کے دوران ہی مسٹر لامبہ مجھے ملنے آئے ، اس سے قبل ایک دو کانفرنسوں میں، ہمارا کشمیر سے متعلق ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ ملاقات میں عزیز احمد خان سابق سفیر بھی، از خود شامل ہو گئے۔ لامبہ نے کہا'' جج صاحب مسئلہ کشمیر کے حل میں کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ آپ کیوں رکاوٹ ڈالتے ہیں، مسئلہ کو حل ہونے دیں''۔ میرے اعتراض پر اس نے بتایا کہ حریت کے تمام لیڈر، ماسوائے علی گیلانی اور یاسین ملک کے، اور آزاد کشمیر میں تمام لیڈران، ماسوائے میرے اور امان اللہ خان کے، پرویز مشرف کے تجویز کردہ فیصلہ سے متفق تھے۔ عزیز احمد خان، جو بھارت میں ہائی کمشنر تعینات رہ چکے تھے، اس نے تائید کی کہ وہ اس کا گواہ تھا۔ لامبہ کے پاس سب کے فون نمبر تھے، اس نے پیشکش کی کہ وہ سب سے میری بات کروا سکتا تھا۔ مجھے عزیز احمد کی تائید پر تعجب تو ضرور ہوا، مگر میں نے دونوں کو، دوٹوک بتایا دیا، کہ میں اور لبریشن لیگ ریاست کی، کسی شکل میں تقسیم، قبول نہیں کر سکتے۔ شکایت کے انداز میں میٹنگ ختم ہوئی۔ ہندوستان اور پاکستان میں دوستانہ تعلقات کا حامی طبقہ، بہت متحرک ہے، کہ موجود حیثیت میں ہی مسئلہ کشمیر نمٹایا جائے، مگر جموں کشمیر کے عوام کی بھاری اکثریت، ریاست کی وحدت اور آزادی کے حق میں ہے۔

ان دنوں جبکہ ماضی کے تسلسل میں، وادی کشمیر کے تمام حصوں میں ہندوستان کے خلاف اور آزادی کے حق میں تحریک جاری ہے۔ ہندوستان بدنیتی اور سازش کے تحت اس کو پاکستان کی ترغیب اور اعانت کے تابع، دہشت گردی کی پراکسی جنگ، قرار دے کر عالمی حمایت حاصل کر رہا ہے۔ بلکہ امریکہ نے تو جموں کشمیر کو، ہندوستان کی ریاست قرار دے کر مجاہدین اور حزب المجاہدین کو دہشت گرد قرار دے دیا ہوا ہے، اور ڈرون حملوں کی دھمکی بھی دے دی ہے۔ معاہدہ شملہ کے بعد، اقوام متحدہ کا سیکریٹری جنرل اور امریکہ، برطانیہ، یورپ، روس، چین حتیٰ کہ تمام مسلم ممالک، جموں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے، ہندوستان اور پاکستان کے مابین مذاکرات شروع کرنے کی تائید کرتے ہیں۔ جموں کشمیر میں جاری تحریک آزادی کو دبانے، کچلنے، معصوم لوگوں کو قتل کرنے، زخمی کرنے، گرفتار کر کے جیلوں میں قید کرنے، خواتین اور بچوں بچیوں پر تشدد کرنے، مکانات گرانے اور جلانے کی بھارتی فوج کے تشدد کو کھلی جنگ قرار دینے اور سیکیورٹی کونسل میں یہ معاملات اٹھانے اور افواج کے انخلا کا اور رائے شماری کا مطالبہ

کرنے کی بجائے، پاکستان کے حکمران، سیاستدان اور میڈیا، اس کو انسانی حقوق کی پامالی کی شکایت کے طور پر، بے اختیار بین الاقوامی انسانی حقوق کے کمشن میں، پیش کرتا ہے، جہاں بے نتیجہ بحث جاری رہتی ہے۔ عوامی دباؤ کے تحت پاکستان دوطرفہ مذاکرات کا تقاضا بھی کرتا ہے، جو ہندوستان دہشت گردی کی آڑ میں ٹال دیتا ہے۔ حالات کے گرداب میں جموں کشمیر کے عوام کی دو صدیوں پر محیط، دی گئی عظیم جانوں اور عزت و آبرو کی قربانی، ہندوستان کی صوابدید اور سہولت کے پیش نظر، دوطرفہ مذاکرات کے عمل کی یرغمال بن چکی ہے۔ معاہدہ شملہ کے بعد پاکستان کی حکومت کے سربراہ، ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس کی تقریب میں، رسمی طور پر، جموں کشمیر کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں، جس کی تردید میں ہندوستان معاہدہ شملہ کا حوالہ دیتا ہے۔ جموں کشمیر کے دو کروڑ عوام کی اتنی بڑی آزادی کی، فلسطین کی آزادی کی ہمعصر تحریک کو، زمین کے تنازعہ کی حیثیت دے دی گئی ہے، جس کی تقسیم پر پاکستان قناعت کر رہا ہے۔ اگر آزاد حکومت کے پلیٹ فارم سے، ہماری لبریشن لیگ کے مؤقف اور تجویز کے تحت تحریک چلائی گئی ہوتی، تو ہندوستان کا تسلط کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر پاکستان کے حکمرانوں نے، جو اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے ہیں، انھوں نے ہم پر بھروسہ اور اعتماد ہی نہ کیا اور نہ ہی اب تک کر رہے ہیں اور جموں کشمیر کے عوام جو تمام دنیا کے ممالک میں متحرک ہیں، ان کی طاقت اور حیثیت کو ضائع کیا جا رہا ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے، کہ ہندوستان کشمیر کے دریاؤں کا پانی بند کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہے، اور پاکستان کو ریگستان میں بدلنے کی کوشش میں ہے، مگر پاکستان میں حسب معمول اقتدار کی جنگ جاری ہے۔

ایک آرزو اور مٹی کی خوشبو

جس دھرتی میں میرا جنم ہوا اس کے لگ بھگ دو چھوٹے قصبوں، چلیر، رتہ اور وادی اندرہل کے مرکز میں واقع بڑے قصبہ، ڈڈیال میں کئی اولیاء اور قطب پردہ پوش ہیں، جن میں عارف کامل، میاں محمد بخشؒ کے مرشد، حضرت سائیں غلام محمدؒ اور ان کے مرشد حضرت بابا بدوح شاہ صاحبؒ شامل ہیں۔ کئی اور درگاہوں سے روحانی فیض حاصل کیا جاتا ہے۔ دو دریاؤں اور شمال میں سلسلہ پیر پنجال اور جنوب میں چھوٹے پہاڑی ٹیلوں، اور بیضوی شکل میں، دلربا وادی ڈڈیال المعروف اندرہل، اپنی وضع قطع، زرخیزی سے معمور، اپنی تہہ میں، تیل اور گیس کا اتھاہ سمندر اور غبار سمیٹے ہوئے ہے اور سطح پر میٹھے شیریں پانی کے دریا بسائے، بے مثل اور لاجواب حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس دھرتی کے مکینوں اور بسیرا کرنے والوں میں، اس مٹی اور آب وہوا نے، قد وقامت، وضع قطع، گندمی اور بادامی رنگت کے حسن کے ساتھ ساتھ حسن سلوک، باہمی رغبت ومحبت، مہمان نوازی، صلہ رحمی، تحمل وبردباری، وسعت قلبی، رواداری کی خصلت اور خوشبو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس وادی کے باسیوں میں وطن کی محبت اور

لگن تعصب کی حد کو چھوتی ہے۔ اس کی عظمت اور غیرت ان کو جان سے پیاری ہے، اس میں حسن اور محبت کے شرارے، علم و دانش، عقل و علم کے درخشاں ستارے، منور ہیں۔ اس مٹی میں نامور جانباز، عالمی گوشوں کے جانشین، سمندروں کے ملاح و سالار، عدل و انصاف میں روشن مثالوں کے عظیم ستون، اسلام و شریعت کے پابند علمائے کرام، اس کا عظیم ورثہ ہیں۔ ان میں ادیب، شعرا، ڈاکٹر، انجینئر اور داستان گو بھی شامل ہیں۔ اس وادی کے بسیرا کرنے والوں کی شناخت، اس اکیسویں صدی کی ہی نہیں، بلکہ اس کی حکمرانی کی عظمت کی شناخت، ہندوستان کے ماضی کے معروف مؤرخین اور مصنفین نے اپنے اپنے ادب پاروں اور تاریخ میں رقم کی ہے۔ اکبر اعظم کے دور میں معروف رتن، ابوالفضل، آئین اکبری میں رقم طراز ہیں، کہ ''اکبر کے دور میں اندرہل ایک بڑا پرگنہ تھا، جب کہ دوسرا بڑا، پرگنہ روہتاس تھا۔ اندرہل کے مشرق میں دریائے پونچھ کے دائیں کنارے، چوکھ شہر تھا، جو قریب پانچ میل لمبائی میں تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ، منتشر محلوں میں اور بالآخر دیہاتوں میں بٹ گیا۔ منگلا ڈیم کی تعمیر سے قبل دریا کے کنارے، میں نے آبادی کے کھنڈرات خود دیکھے ہیں۔ پنجاب سے کشمیر جانے کا قدیم راستہ، جہلم سے چوکھ، بھاری، سہنسہ، کوٹلی، پونچھ، حاجی پیر سے اوڑی اور بارہ مولہ سے سری نگر تھا۔ مغل حکومت کے دور میں، لاہور، گجرات، بھمبر، سماہنی، راجوری، شوپیاں سے سری نگر کا راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ جموں سری نگر اور راولپنڈی مظفرآباد سری نگر روڈ، بہت بعد میں تعمیر ہوئی ہیں۔ اندرہل کی مٹی سے پیدا ہونے والے مختلف نوع کے رنگ برنگے پھولوں اور کلیوں کی خوشبو اور مہک دنیا بھر کے دلوں اور دماغوں کو معطر کر رہی ہے۔

ہمارے خطہ کے لوگ، سمندری جہازوں کی سروس میں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ کے آزاد و خوشحال ممالک میں، جمہوری طرز حکومت، احترام آدمیت، انسانی حقوق اور آزادیوں کے تحفظ اور فلاحی نظام کے تحت، اصلاحات بالخصوص، ہر فرد کی مفت تعلیم، حفظان صحت، رہائش و روزگار کی قانونی ضمانت کے حالات سے روشناس ہو کر، واپس آ کر ہم بچوں کو، ان ممالک کے، حالات سناتے تو، ڈوگرہ مہاراجہ کی آمریت میں پولیس، پٹواری اور چوکیدار کے تسلط میں دم گھٹنے لگتا اور ایک امنگ، ایک تمنا اور آرزو، دل و دماغ میں انگڑائی لیتی، کہ کاش ہم بھی ایسی آزادی، ایسی فلاحی سہولتوں کو حاصل کر سکیں۔ جب ہمارے خطہ کے لوگوں نے امریکہ اور یورپ کا رخ کیا اور وہاں آباد ہونا شروع ہو گئے، تو اس آرزو میں مزید شدت آ گئی۔ ہمارے تعلیمی کورس میں، صرف ہندوستان میں مسلمان فاتح بادشاہوں کی تعریف شامل تھی، جس کو پڑھ کر، نفسیاتی تسکین کے ساتھ پھر سے ہندوستان میں حکمرانی کا احساس کروٹ لیتا۔ جبکہ مسلمانوں کی یورپ، افریقہ، وسط ایشیا اور مشرق بعید تک حکمرانی، خلفاء راشدین بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرز حکمرانی، فلاحی ریاست، عدل و انصاف، عاملان

حکومت کا احتساب، تجارتی اور زرعی اصلاحات اور معیشت میں مساوات، کے ساتھ ساتھ سائنس، الجبرا، حساب اور دیگر علوم کے تمام شعبوں میں، ایجادات و معلومات میں، ترقی سے، اسلامی تہذیب وتمدن کی اقدار کے احیا اور عمل نے عالمی تاریخ میں روشن باب کا اضافہ کیا تھا۔ تاہم اس قدر درخشاں ماضی، جس میں بغداد علم کا گہوارہ تھا، استنبول کے ساحلی کناروں سے لے کر سمرقند، بخارا، تاشقند، چینی ترکستان اور افریقہ کے وسیع سبزہ زاروں تک اور خراسان و تہران کو محیط کیے مملکت، منتشر ہوگئی اور سلطنت عثمانیہ کو پہلی جنگ عظیم میں شکست کے نتیجہ میں، انگریز کی استعماریت کے حمایتی، خاندانوں اور قبیلوں کے ماتحت، بطور انعام تقسیم کر دیا گیا اور حکومتوں کو مقامی تنازعات میں اس طرح الجھا دیا گیا، کہ وہ آپس میں ہی الجھے رہیں، تاکہ ان میں اتفاق و اتحاد پیدا ہونے کا امکان کم ہو۔ اس پس منظر میں میری آرزو، مدوجزر کی کیفیت میں تاریکی اور روشنی کی منزل طے کرتی چلی آرہی ہے اور اب اس کی منزل کے آثار نمودار ہورہے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان، خلافت عثمانیہ کی شکست وزوال سے بہت دکھی اور پریشان تھے۔ بالخصوص اتاترک کے ترکِ خلافت کے اعلان پر، مایوسی پھیل گئی، جو تحریک خلافت کی ناکامی پر منتج ہوئی۔ اسی دوران انڈین کانگرس کی تنگ دل وتنگ نظر، ہندو سیاسی قیادت نے، ہندوستان میں مجوزہ قانونی اصلاحات میں، محمد علی جناح کی قیادت میں پیش کردہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی تجاویز، مسترد کر دیں۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے، مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی تجاویز، جس تکبر اور تعصب کے اسلوب میں مسترد کیں، اس کے ردعمل میں محمد علی جناح نے کہا کہ ''اب سے ہمارے راستے جدا ہیں''۔ مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کے صوبوں پر مشتمل، اندرونی خودمختاری کی تحریک بتدریج قرارداد لاہور، ۲۳ رمارچ ۱۹۴۰ء کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ جس کو متعصب ہندو پریس نے طنزیہ ''قرارداد پاکستان'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی کرنا تھا کہ محمد علی جناح، معروف، ذہین ترین محقق بیرسٹر کی قیادت اور پریس کے طنز اور مذاق نے، حقیقت میں تحریک پاکستان کا روپ دھار لیا، اور عالمی سطح پر مسلمان ممالک کی وحدت کی، عالمی قوت کی آرزو، سمٹ کر پاکستان کے قیام میں محیط ہوگئی۔ اوائل عمر میں، ہوش پر جوش سوار ہوتا ہے۔ گو کہ مسلم لیگ کے پاس نہ ٹاٹا و برلہ کی سطح کے، کانگرس کے سرمایہ داروں کے برابر سرمایہ دار تھے اور نہ ہی وافر وسائل تھے، مگر کانگرس کے مخالفانہ پروپیگنڈہ کی تشہیر سے نوجوان طلبا کو خاص رہنمائی حاصل ہوتی۔

جموں کشمیر میں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس میں دریا کے دو کناروں کا بعد اور دوری تھی۔ دونوں کی قیادت مسلمان تھی، دونوں نے باہمی اتحاد کی کوشش میں، قائداعظم کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ قائداعظم ۸رمئی کو، ہمراہ محترمہ فاطمہ جناح، سیالکوٹ سے جموں اور ۱۰رمئی ۱۹۴۴ء کو جموں سے سری نگر پہنچے۔ سوچیت گڑھ سرحد

سے، جموں شہر اور اسی سڑک سے کار کے ذریعے، سفر کے دوران، جموں کشمیر کے تمام عوام، مسلم، غیر مسلم متحد اور منظم انداز میں، شاہراہ جموں و جموں سری نگر روڈ پر، جوق در جوق سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر، پھولوں کے ہار اور گلدستے پیش کرنے کے لئے، اُمڈ کر حاضر ہوئے۔ قائداعظم نے اعتراف میں کہا، کہ "ایسا استقبال تو کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا"۔ قائداعظم کے دورہ سے مسلمان نوجوانوں میں نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا، بڑی عمر کے لوگ اپنی اپنی پسند کے نظریات کے تحت، بٹے ہوئے تھے، مگر نوجوانوں کی پسند صرف قائداعظم ہی تھے۔ ہم لوگ مڈل سکول میں زیر تعلیم تھے۔ گو کہ سیاست میں زیادہ متحرک نہ تھے، تاہم سیاسی تحریک سے آگاہ ضرور تھے اور وابستہ بھی تھے۔ ہمارے گھر ہر روز دونوں جماعتوں کے لیڈروں اور کارکنوں کا طعام و قیام ہوتا۔ آج کل کی طرح ان دنوں ڈڈیال میں کوئی ریسٹورینٹ اور ہوٹل نہ تھا، مہمانوں میں پاکستان، نئے ملک کے قیام کے امکانات، زیر بحث رہتے۔ جب میر پور میں سری کرن سنگھ انٹر کالج میں، میٹرک میں داخل ہوا، تو سیاسی محاذ گرم تھا، اب میں بے خطر اور انجام سے بے نیاز، قائداعظم اور پاکستان کے قیام کا علمبردار تھا۔ میرے سب ساتھی، مسلمان طلبا بھی، پاکستان کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے، جس کی تفصیل قبل ازیں بیان ہو چکی ہے۔

انسانی تاریخ تند و تلخ ابواب اپنے دامن میں سمو لیتی ہے، میں جب تحریک پاکستان کے لمحات کا جائزہ لیتا ہوں اور دیکھتا ہوں، کہ ہندوستان کے سیاسی سمندر، میں مغلیہ سلطنت پر فاتح انگریز کے تسلط میں، مسلمانوں سے تعصب اور ہندو قوم سے ہمدردی کا سلوک، مسلمان علما کا انگریز حکومت سے ترک تعلق، اس کے قائم کردہ اداروں سے، عدم تعاون کے رویہ سے، مسلمان معاشرتی، تجارتی، علمی، ادبی گویا کہ ہر شعبہ میں بتدریج غربت، جہالت، پستی و پسماندگی کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیوں میں، زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھے، کہ سرسید احمد خان نے تعلیم کے چراغ جلائے۔ ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خان کی تحریک پر، آغا سلطان محمد کی صدارت میں، مسلم لیگ قائم ہوئی، جس نے مسلمانوں کے تحفظ کا اعادہ کیا۔ جب کہ محمد علی جناح نے ہندوستان میں مسلمانوں کو بطور ایک قوم، تسلیم کرنے اور منوانے کا مطالبہ کیا اور بالخصوص پاکستان کے قیام کے مطالبہ پر، نہ صرف انگریز ایمپائر، سرمایہ دار انڈین کانگرس، جس میں مسلمان بھی شامل تھے، بلکہ بہت بااثر علما کی تنظیم، جمعیت العلمائے ہند، علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تحریک خاکسار، پنجاب میں تحریک الاحرار، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی، صوبہ سرحد میں عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار پارٹی، پنجاب میں سردار سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی، یہ سب مسلمانوں کی بااثر جماعتیں، جناح اور پاکستان کے خلاف، کانگرس اور اس کے نظریہ متحدہ ہندوستان کی جدوجہد میں شامل تھیں۔ ان کے بہت ہی مؤثر پروپیگنڈہ مہم کے نکات یہ تھے (۱) ہندوستان ایک قوم کا ملک ہے جو ناقابل تقسیم ہے (۲) مجوزہ

پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوگا جو دفاعی اور اقتصادی طور قطعی نا قابلِ عمل ہوگا (۳) ایک بنا ہوا پاکستان بیرونی سازشوں کا مرکز ہوگا اور (۴) مسلمان حکومت چلانے کی مہارت نہیں رکھتے ،لہٰذا پاکستان، دوسروں کا محتاج اور معاشی طور پر کمزور ملک ہوگا۔

تکمیل ادھوری آرزو

ہندوستان کبھی بھی جغرافیائی اور انتظامی طور پر، ایک ملک نہیں رہا تھا، بلکہ کئی ریاستوں میں منقسم تھا۔ مغل بادشاہ اکبراعظم کے زیرحکمرانی، پہلی دفعہ ایک بڑے ملک کی حیثیت قائم ہوئی تھی، جس کو برطانوی حکومت نے منطبق رکھا۔ اب جبکہ، اس کو آزادی حاصل ہونے کو تھی، تو ہندوؤں کے بعد دوسری بڑی اکثریتی آبادی، مسلمانوں نے، مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے محمد علی جناح کی زیرقیادت، الگ ملک پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ یہ ذکر ہو چکا ہے کہ خود مسلمان اور ان کی دیگر تنظیمیں اور ان کی قیادت، مطالبہ قیام پاکستان کے خلاف ہی نہ تھیں، بلکہ کانگرس سے زیادہ دشمن بھی تھیں۔ محمد علی جناح پر کفر کا فتویٰ جاری کیا گیا، انگریز اور انگریز کا ایجنٹ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا، حتیٰ کہ ایک خاکسار نوجوان نے، قائداعظم کے ہوٹل کے کمرہ میں، جب کہ وہ تنہا تھے، قتل کرنے کی نیت سے، چاقو لہرا کر ان پر اچانک حملہ کر دیا، مگر قائداعظم نے اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے، نہایت پھرتی سے نوجوان کے چاقو والے بازو کو قابو کر لیا۔ اسی دوران کارکنوں نے حملہ آور کو پولیس کے حوالہ کر دیا، مگر قائداعظم نے اس کو معاف کر دیا۔ ہم نوجوان، مخالفت کے اس قدر زور اور دباؤ میں، قائداعظم کے تنِ تنہا، کفر کے فتوؤں اور مخالفانہ الزامات کی پروا کیے بغیر، مطالبۂ پاکستان کی جدوجہد پر، ان کی حمایت میں، ٹولیوں اور گروپوں میں پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے۔ اور کرتے بھی کیا ہمارے پاس تو وسائل بھی نہ تھے۔ قائداعظم نے وسائل کی نایابی پر تبصرہ کرتے ہوئے چاندی کے سکوں، جو اس وقت کی کرنسی تھے کے حوالہ سے کہا ''آپ مجھے چاندی کی گولیاں دو میں آپ کو پاکستان دوں گا''۔

کیبنٹ مشن، کانگرس کے دباؤ اور مسلمان جماعتوں کی مخالفت کے سامنے، مسلم لیگ کو پاکستان کا مطالبہ چھوڑنا پڑا، چنانچہ ۹ راپریل ۱۹۴۶ء کو تمام صوبوں کے منتخب ممبران کی دہلی کانفرنس میں، پاکستان کے حق میں منظور کردہ قرارداد کے باوجود ۶ رجون کو، کیبنٹ مشن کی متحدہ ہندوستان کی آزادی کی تجویز، مسلم لیگ کو بادلِ نخواستہ قبول کرنی پڑی۔ ۶ رجون ۱۹۴۶ء کا دن کانگرس اور دیگر پاکستان مخالف قوتوں کی فتح کا، مگر مسلم لیگ کی ناکامی کا پریشان کن دن تھا۔ مگر پاکستان کا قیام جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا مقدر تھا۔ اچانک حالات نے کروٹ لی، قدرت نے کرشمہ دکھایا، کہ جولائی کے اوائل میں، بمبئی میں کانگرس نے، مولانا ابوالکلام آزاد کی بجائے، پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگرس کا صدر منتخب کیا۔ پنڈت نہرو نے ۱۰ رجولائی کو پریس کانفرنس میں اظہار کیا، کہ کانگرس، دستور ساز اسمبلی میں،

کیبنٹ مشن پلان میں شرائط کے ماورا، مکمل آزاد حیثیت میں شامل ہوگی اور شرائط میں ترمیم کرنے کا، ان کو اختیار حاصل ہوگا اور مجوزہ گروپنگ نہیں ہوگی۔ اس پریس کانفرنس کا قائداعظم نے فوراً نوٹس لیا اور نہرو کے خیالات کو، کیبنٹ مشن پلان کی خلاف ورزی وانحراف قرار دیتے ہوئے، کانگرس کی بدنیتی پر احتجاج کیا اور ۲۹ رجولائی کو مسلم لیگ کے اجلاس میں اتفاق رائے سے، ۶ رجون کی قرارداد کو واپس لے کر، مطالبہ پاکستان بحال کر دیا۔ جب کانگرس اور وائسرائے نے، نہرو کے بیان سے متعلق کیبنٹ مشن پلان پر کانگرس کے قائم رہنے اور عمل کرنے کی یقین دہانی کی کوشش کی، تو قائداعظم نے دوٹوک الفاظ میں انکار کرتے ہوئے کہا کہ ''مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا''۔ مسلم لیگ نے ۱۶ راگست کو ڈائریکٹ ایکشن دن منانے کا فیصلہ کیا، جس کے بعد حالات بدل گئے۔

وائسرائے ویول کے تبادلہ میں، لوئی ماؤنٹ بیٹن ۲۲ رمارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے۔ ہندوستان کو جون ۱۹۴۸ء کو آزادی دینے کا اعلان، وزیراعظم برطانیہ نے کیا تھا، مگر ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے سیاسی تناؤ کی روشنی میں، جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہی، انتقال اقتدار کا فیصلہ کیا اور برطانوی کابینہ کی منظوری سے، برطانیہ کے زیرانتظام ہندوستان کو، تقسیم کرنے کا اصول طے کیا گیا، البتہ بنگال اور ریاستوں کی خودمختار حیثیت بحال رکھی گئی۔ تقسیم کے اعلان سے قبل، مئی میں وائسرائے شملہ گیا۔ وہاں پنڈت نہرو اور کرشنا مینن کو، تقسیم کی سکیم دکھائی، جو پنڈت نہرو نے مسترد کر دی۔ چنانچہ اس کی رائے کے مطابق، ترمیم کی گئی اور بنگال کو تقسیم کیا گیا اور ریاستوں کے الحاق کا، اختیاری اصول بھی سکیم میں شامل کیا گیا، مگر قائداعظم سے اس ترمیم کو پوشیدہ رکھا گیا۔ شملہ میں ہی پنڈت نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو حیدرآباد دکن اور جموں کشمیر، ہندوستان میں شامل کرنے کا مشورہ دیا تھا (بحوالہ فریڈم ایٹ مڈنائٹ صفحہ ۱۴۸-۱۴۹ از ماؤنٹ بیٹن لاسٹ وائسرائے، صفحہ ۱۱۷)۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ صوبہ سرحد کو، مسلم اکثریتی صوبہ ہونے کے باوجود، وہاں خان غفار خان کے بھائی ڈاکٹر خان کی کانگرسی حکومت ہونے کی وجہ سے، ریفرنڈم کرایا گیا تھا۔ کانگرس کو یقین تھا کہ فیصلہ ہندوستان کے حق میں ہوگا، مگر اس کا ہندوستان سے زمینی تعلق صرف جموں کشمیر کی ہندوستان میں شمولیت سے ہی ممکن تھا۔ اسی لئے گورداسپور، مسلم اکثریتی ضلع کو سازش کے تحت، خلاف مسلمہ اصول تقسیم، ہندوستان میں شامل کیا گیا۔

قائداعظم کی جوناگڑھ کے الحاق کی پالیسی پر، بہت تنقید ہوتی ہے، مگر ناقدین قانون آزادی ہند اور برطانیہ کی ریاستوں سے متعلق اعلانیہ پالیسی کو، ماؤنٹ بیٹن کی پالیسی کی روشنی میں دیکھتے ہیں، جب کہ قانون کے تحت، ریاستوں کو، کسی ایک ملک کے ساتھ معاہدہ کرنے یا مکمل خودمختاری کا اختیار حاصل تھا۔ میری تحقیق میں یہ آیا ہے، کہ جودھ پور اور بیکانیر کے مہاراجے بھی پاکستان سے الحاق کر رہے تھے، جس کی خبر پا کر ماؤنٹ بیٹن نے پستول

تان کر، ان سے ہندوستان سے الحاق کی دستاویز پر دستخط کرائے۔ الحاق ہندوستان یا پاکستان، قانون آزادی ہند میں شامل نہیں ہے۔ یہ تو کانگرس کے زیر اثر، ماؤنٹ بیٹن نے حکمت عملی اپنائی، تا کہ ہندوستان کی اجارہ داری قائم رہے۔ ۱۵ راگست کو جب قانون آزادی ہند، نافذ العمل ہوگیا، تو اس کے بعد تمام اختیار، ریاستوں کے عوام کو منتقل ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہندوستان نے فوجی قبضہ کے بعد جونا گڑھ، مناور اور حیدرآباد دکن میں ریفرنڈم کرایا۔ جموں کشمیر میں بھی استصواب رائے کا اصول تسلیم کیا گیا، گو کہ یہاں ابھی تک عمل نہ ہوسکا ہے۔

پاکستان کے قیام میں، دو کارنامے یا اسباب قابل غور ہیں، اول: ۶ رجون کو مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان ترک کر کے متحدہ ہندوستان کی سکیم قبول کرنے کے بعد، نو منتخب صدر کانگرس، پنڈت نہرو کا ۱۰ رجولائی کی پریس کانفرنس میں گروپ سکیم سے یکسر انحراف پر، ۲۹ رجولائی کو مسلم لیگ کا دوبارہ مطالبہ پاکستان کا فیصلہ۔ دوسرا: وائسرائے لارڈ ویول کے بجائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری اور اس کی امتیازی ذہانت کی، تشہیر کی ہوس یا شہرت کی تمنا کے تحت، بجائے جون ۱۹۴۸ء کے، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہی انتقال اقتدار کی تکمیل، ایک معجزہ تھے، وگرنہ جون ۱۹۴۸ء میں تو قائداعظم علالت کی آخری کیفیت میں تھے، وہ ۱۹۴۷ء کی طرح پاکستان کا قیام کیسے منواتے اور گورنر جنرل پاکستان کا عہدہ کیسے حاصل کرتے۔ انگلستان میں واپس جانے پر، ایک صحافی نے ماؤنٹ بیٹن کو سوال کیا، کہ اگر آپ کو جناح کی مہلک بیماری کا علم ہوتا، تو کیا آپ انتقال اقتدار کا جون ۱۹۴۸ء تک انتظار نہ کرتے؟ تو اس نے جواب دیا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس کا علم نہ ہوا''۔ (ترجمہ)

سندھ طاس معاہدہ ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

ریڈکلف ایوارڈ مجریہ ۱۷ راگست ۱۹۴۷ء کے تحت، پنجاب کی تقسیم پر دریائے راوی پر واقع مادھوپور ہیڈ ورکس، جس سے اپر باری دوآب نہر جو مرکزی دوآب نہر سے غربی پنجاب کو اور دریائے ستلج پر واقع فیروزپور ہیڈ ورکس، جس سے دیپالپور نہر، جو غربی پنجاب اور بہاولپور کی زمین سیراب کرنے کا ذریعہ تھیں، یہ دونوں ہیڈ ورکس ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ ہندوستان نے یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو ان نہروں کا پانی بند کر کے، پانی مشرقی پنجاب میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جس پر جموں کشمیر کے ساتھ ساتھ، دونوں ممالک میں پانی کا تنازعہ بھی پیدا ہوگیا۔ یہ تنازعہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ تک پہنچا۔ ستمبر ۱۹۵۱ء کو عالمی بینک کے صدر ایوجین بلیک نے، مسئلہ حل کرنے کے لئے، بطور ثالث اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ فیصلہ کے مطابق، مشرقی پنجاب کے دریاؤں، راوی، بیاس اور ستلج کا تمام پانی ہندوستان اور چناب، جہلم، سندھ کا پانی پاکستان کے حصہ میں آیا۔ یہ معاہدہ امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور مغربی جرمنی کی معاونت سے طے ہوا۔ ان تمام ممالک و انڈیا اور پاکستان نے معاہدہ

پردستخط کیے۔ جہلم پر منگلا اور سندھ پر تربیلا ڈیم بنانے کے لئے، ان ممالک نے کنسورشیم بنا کر ۹ سوملین ڈالر کا فنڈ قائم کیا، جس میں ۴ء ۷ ملین ڈالرز ہندوستان نے بھی ادا کیے۔

معاہدہ میں، جموں کشمیر ریاست کے اپنے دریاؤں پر حقوق کو مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا۔ صدر عالمی بینک اور دیگر تمام ممالک، جن میں امریکہ اور برطانیہ، سیکیورٹی کونسل کے مستقل ممبران اور بالخصوص پاکستان میں جنرل ایوب خان کی حکومت نے، مسئلہ کشمیر اور اس کے مطلوبہ حل سے دانستہ یا غیر دانستہ چشم پوشی کی اور جموں کشمیر کو اپنے ریاستی دریاؤں کے پانی سے ریاستی اراضی سیراب کرنے اور بجلی کی پیداوار کے حق سے، نہ صرف محروم رکھا بلکہ معاہدہ میں، ریاست جموں کشمیر کی تابع توثیق، کوئی بھی شق نہ رکھی گئی اور جموں کشمیر اور پاکستان کے مفاد اور مؤقف کے خلاف، ہندوستان کو ان تین دریاؤں، چناب، جہلم اور سندھ پر لامحدود بجلی گھر تعمیر کرنے، ڈیم بنانے کی رعایت تسلیم کر کے، جموں کشمیر میں، ہندوستان کی جارحیت اور غاصبانہ قبضہ کو جائز تسلیم کر لیا گیا۔ اس معاہدہ سے ہندوستان کے خلاف، جموں کشمیر کی متنازعہ حیثیت اور پاکستان کے مؤقف پر، بین الاقوامی اور مقامی سطح پر مہلک اثر پڑا۔ یہ معاہدہ یو این او میں رجسٹرڈ ہے اور اس پر کئی ممالک کے تائیدی دستخط بھی ہیں۔

ہندوستان نے معاہدہ میں، رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، تینوں دریا جن کا منبع اور بہاؤ ہندوستان کے زیر تسلط علاقوں سے ہے، ان پر لاتعداد ڈیم اور بجلی گھر بنانے شروع کر رکھے ہیں اور اس وجہ سے دریاؤں کے پانی کا، پاکستان میں بہاؤ، بتدریج کمی کا مؤجب بن رہا ہے اور پاکستان میں پانی کی کمی دن بدن شدت اختیار کر رہی ہے، جبکہ انڈیا کے مخالفانہ رویہ میں بھی شدت بڑھ رہی ہے۔ انڈیا اس وقت تک عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق، جموں کشمیر سے دس ہزار میگا واٹ تک، بجلی ہندوستان لے جا رہا ہے، جبکہ ۲۲ ہزار میگا واٹ کی حد تک منصوبہ ہے۔ ہندوستان بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی اور انحراف میں، بے مثال ریکارڈ کا حامل ہے۔ خدشہ ہے کہ انڈیا میں تمام دریاؤں کو آپس میں منسلک کرنے کا منصوبہ، جو پایۂ تکمیل کے قریب ہے، قوی امکان ہے، کہ مستقبل قریب میں جدید مشینی ٹیکنالوجی کے استعمال سے، جموں کشمیر کے دریاؤں کا رخ موڑ کر، ان کا پانی بھی ہندوستان لے جائے اور پاکستان بین الاقوامی اداروں میں اپنا یہ مقدمہ بھی، مسئلہ کشمیر کی طرح، پیش کرتے کرتے، خدانخواستہ ریگستان کی شکل نہ اختیار کر جائے۔ امریکہ کے سابق سیکریٹری، جان کیری نے ۲۰۱۶ء میں سینٹ میں بیان دیا تھا، کہ مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کا خطرہ، پانی کے تنازعہ پر متوقع ہے، ان دریاؤں پر اس وقت تک ہندوستان کا ۶۲ بجلی گھر بنانے کا منصوبہ تیار ہے۔ جن میں سے کئی تکمیل کے قریب ہیں اور یہ بجلی ہندوستان میں استعمال ہو گی، جبکہ پاکستان میں دن بدن پانی کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔

پاکستان چین معاہدہ ۲؍ مارچ ۱۹۶۳ء

جموں کشمیر کی پاکستان کے بعد طویل سرحد، گلگت میں ہنزہ وغیرہ اور لداخ کے علاقوں کے ذریعہ چین سے اور اس کے بعد ان دو ممالک سے کم لمبی، ہندوستان سے ملتی ہے۔ ہندوستان کے زیر قبضہ علاقے لداخ میں، اقصائے چین سے، چین نے سڑک تعمیر کر کے، ۱۰ ہزار مربع میل کے قریب علاقہ پر، قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ پاکستان اور چین نے دوستانہ تعلقات کی روشنی میں، معاہدہ کے تحت، چین سنکیانگ وغیرہ کا پاکستان کے زیر انتظام گلگت اور دیگر ملحقہ علاقوں کے درمیان غیر متعین سرحد کی، حدود طے کر کے معاہدہ کیا، مگر اس میں مسئلہ کشمیر حل ہونے پر، جموں کشمیر کی مقتدر اتھارٹی کی حتمی توثیق کی شرط، معاہدہ کی دفعہ چار میں محفوظ رکھی گئی۔ اس طرح اس وقت جموں کشمیر کا قریب ساڑھے ۱۲ ہزار مربع میل علاقہ براہ راست چین کے قبضہ میں ہے، جبکہ ۳۸ ہزار مربع میل علاقہ ہندوستان اور ۳۴ ہزار مربع میل پاکستان کے زیر انتظام ہے۔ ہندوستان اور پاکستان مسئلہ کشمیر میں دعویدار فریق ہیں، جبکہ چین قبضہ کی حد تک فریق ہے۔

ہندوستان، پاکستان و اعلان تاشقند ۱۰؍ جنوری ۱۹۶۶

سوویت یونین کے وزیر اعظم کوسیجن نے ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور صدر ایوب خان کو، ملاقات کی دعوت دے کر، مذاکرات کے ذریعے، جنگ کے تصفیہ کے لئے ملاقات طے کی۔ ۸؍ دسمبر کو ماسکو، دہلی اور کراچی سے ۴؍ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند کانفرنس کا اعلان ہوا۔ پہلے دن تینوں وزرائے خارجہ بھی مذاکرات میں شامل رہے مگر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی (بحوالہ وائٹ پیپر وزارت خارجہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء)۔ دوسرے روز صدر ایوب خان اور وزیر اعظم شاستری اکیلے ملے، تو شاستری نے ایوب خان سے کہا کہ ’’آپ کو افسوس تو ضرور ہوگا مگر ہم جموں کشمیر نہیں چھوڑ سکتے‘‘۔ ایوب خان نے مسئلہ کشمیر کی وجہ سے دونوں ممالک کے عوام کی غربت، تعمیر و ترقی اور فلاح کے فقدان کا مسئلہ پیش کر کے مسئلہ کشمیر کے، منصفانہ حل پر زور دیا۔ وزیر اعظم کوسیجن نے تجویز دی، کہ دونوں ممالک نے باہمی طور پر خود تنازعہ طے کرنا تھا اور یہ کہ جنگ، مسئلہ کا حل نہ تھی۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے تجویز کیا گیا کہ فی الحال، سرینگر اور مظفر آباد میں، دونوں حکومتوں کو، مکمل بااختیار بنا کر، دونوں حصوں میں جلد سے جلد تعمیر و ترقی کی جائے۔ جب بات آگے نہ بڑھی تو ایوب خان نے تجویز کیا کہ ’’اپنی اپنی افواج کو واپس کر کے، سفارتی تعلقات بحال کیے جائیں اور مسئلہ کشمیر، جوں کا توں رہنے دیا جائے‘‘۔ مسٹر کوسیجن نے اس کی تائید کر دی۔ ہندوستان نے دونوں ممالک میں، دوستانہ معاہدہ کی تجویز دی، مگر اس میں مسئلہ کشمیر کا ذکر نہ تھا۔ صرف یہ تھا کہ تمام

مسائل باہمی مذاکرات میں نمائندوں کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔ وزیرِ خارجہ بھٹو نے جب مسئلہ کشمیر کا تذکرہ نہ کرنے پر، اعتراض کیا، تو وزیرِاعظم کوسیجن نے کہا، کہ ایوب خان یہ تجویز تسلیم کر چکے تھے۔ اس طرح مسئلہ کشمیر التوا میں رکھنے پر اتفاق ہوا اور ۱۰ اضمن پر مشتمل، اعلامیہ زیرِ دستخط صدر ایوب خان اور وزیرِاعظم لال بہادر شاستری ۱۰ر جنوری ۱۹۶۶ء کو جاری ہوا۔ اس طرح فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کا، دھماکہ خیز فوجی پلان آپریشن جبرالٹر، نہ صرف ناکام و نامراد ثابت ہوا، بلکہ جموں کشمیر کے عوام پر، ہندوستان کے ظلم، قتل و غارت اور دہشت گردی میں اضافہ کا باعث بھی بنا۔

ایوب خان نے اس اعلامیہ کو، مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف بڑی پیش قدمی قرار دیا۔ امریکہ کے صدر اور برطانیہ کے وزیرِاعظم نے ایوب خان کی تعریف کی۔ وزیرِاعظم شاستری ۱۱ر جنوری کی رات کو وفات پا گئے، ان کی جگہ اندرا گاندھی وزیرِاعظم بن گئی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے مشرقی پاکستان کے دفاعی عدم تحفظ کی سوچ اور علیحدگی کی سازش، یا تفکر و تدبیر کو جنم دیا۔

معاہدۂ شملہ ۲ر جولائی ۱۹۷۲ء

معاہدہ تاشقند کے وقت، مشرقی اور مغربی پاکستان ایک متحدہ قوم اور ملک تھے۔ پاکستان کا صدر کہنہ مشق فوجی، فیلڈ مارشل ایوب خان اور وزیرِ خارجہ، نہایت زیرک، جاذب نظر ذوالفقار علی بھٹو تھا، جبکہ امریکہ اور برطانیہ جیسی عظیم فوجی قوتوں کے ساتھ سیٹو، سینٹو معاہدوں کے تحت، اعلیٰ تربیت یافتہ، جدید اسلحہ سے لیس، فوج، ایئر فورس اور نیوی، جس کے پاس ایم ایم عالم جیسے ایک منٹ میں دشمن کے پانچ ہوائی جہاز گرانے والے، ماہر نشانہ باز پائلٹ ہوں، ایسی لاجواب طاقت اور قیادت جموں کشمیر میں کامیابی حاصل نہ کر سکے، تو صرف افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں چین کی سفارتی مدد اور ہندوستان کو دھمکی، اضافی، حوصلہ تھا۔ تاشقند میں مسئلہ کشمیر کو التوا میں رکھ کر، ہندوستان سے مفاہمت کرنا، کمزوری کا اعتراف تھا۔ وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے، امریکہ کے دورہ پر نیویارک میں، ۳۱ر مارچ ۱۹۶۶ء کو ایک بیان میں کہا، کہ اب جموں کشمیر میں، استصواب رائے کے عمل میں بہت تاخیر ہو چکی ہے، ریاست اب ہندوستان کا اٹوٹ حصہ بن چکی ہے۔ استصواب رائے اس کی حیثیت کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ اس پس منظر میں، مشرقی پاکستان کا، پاکستان سے الگ ہونے پر، ۹۰ ہزار فوج کا قیدی ہونا، پاکستان کی نہایت کمزور اور ہندوستان کی بالاتر کمانڈنگ حیثیت تھی۔ شملہ آنے سے قبل دہلی میں، اندرا گاندھی نے کابینہ اور فوجی جرنیلوں سے طے کر لیا تھا، کہ جموں کشمیر ہندوستان کا مستقل حصہ تھا، اس پر پاکستان سے کوئی بات نہ ہوگی۔ ذوالفقار علی بھٹو، جو

شملہ میں مکمل تیاری سے گئے تھے، وہ تاشقند میں ایوب کے فیصلہ کے بڑے نقاد اور نکتہ چین تھے۔ اب وہ خود آزمائش میں تھے، ان کے مدمقابل نہرو کی بیٹی، ایک تجربہ کار سیاستدان تھیں۔ بھٹو صاحب نے، جموں کشمیر میں ہندوستانی فوج نے جو ۳۴۰ مربع میل رقبہ، لداخ، کرگل، لیپہ، بجیرہ وغیرہ میں، قبضہ میں لیا تھا، وہ واپس حاصل کرنے اور ۵۸ مربع میل جو چھمب، افتخار آباد، بھمبر کے مشرق میں ہماری فوج کے قبضہ میں آیا تھا، وہ ہندوستان کو واپس کرنے کے بجائے، ہندوستان کا مؤقف مان کر، یواین او کی قائم کردہ مسلمہ سیز فائر لائن، یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی بجائے، ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہونے والی سیز فائر لائن تسلیم کر کے، اس کو نیا نام لائن آف کنٹرول دے دیا۔ اس سے ریاست جموں کشمیر، جس کو ہندوستان و پاکستان اور عالمی ادارہ کی سلامتی کونسل نے سیاسی اور جغرافیائی وحدت تسلیم کر رکھا تھا، اس کی وہ حیثیت ہی تبدیل کر دی۔ سب سے کاری ضرب یہ تھی، کہ مسئلہ جموں کشمیر کا مستقبل، یواین چارٹر، سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں اور قانون آزادئ ہند ۱۹۴۷ء، جس کے تحت، جموں کشمیر کے حاکم اعلیٰ صرف اور صرف ریاست کے عوام ہیں، مگر ریاست کے عوام کے بجائے، اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار، ہندوستان اور پاکستان نے، از خود حاصل کر لیا اور اس کے حل کا طریقہ استصواب رائے کی بجائے، صرف دوطرفہ مذاکرات کے عمل میں، محدود کر دیا۔ ہندوستان و پاکستان دونوں ممالک، جمہوری عمل اور جدوجہد سے آزاد ہوئے ہیں، مگر استعماری ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ریاست کے دوکروڑ عوام کو، حق آزادی اور حق خودارادیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہر دو ممالک کے کوئی بھی وزیراعظم، جموں کشمیر کی شہریت حاصل نہیں کر سکتے۔ جو حکمران ریاست کی شہریت پر یقین نہیں رکھتا اور نہ حاصل کر سکتا ہے، وہ ریاست کے مستقبل کے فیصلہ کا اختیار کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ یہ ان ممالک کی اخلاقی اور قانونی پوزیشن ہے۔

شملہ معاہدہ نے جموں کشمیر کو ہمیشہ کے لئے ہندوستان کا یرغمال بنا دیا ہے۔ اس سے قبل ہندوستان نے

(i) سازش کے تحت ایوارڈ میں تبدیلی کرا کر، وائسرائے کی ملی بھگت سے، گورداسپور اور فیروزپور کے مسلم اکثریتی اضلاع کو، ہندوستان میں شامل کر دیا اور نہری پانی کے ہیڈورکس، مادھوپور اور فیروز والا سے پاکستان کو محروم کر دیا۔ دوسرا ہندوستان کو جموں کشمیر سے زمینی طور پر منسلک کر کے، جارحانہ قبضہ کی سہولت فراہم کر دی۔

(ii) ہندوستان نے آزاد فوج کی فتوحات سے بچاؤ کے لئے، یواین او کی پناہ لے کر، جنگ بندی کرا دی اور ریاست میں استصواب رائے کا فیصلہ قبول کیا، جس کو ناکام کرنے کے لئے فوج کے انخلاء اور اس کی تعداد کا تنازعہ پیدا کیا۔ اس دوران مقبوضہ کشمیر میں دستور ساز اسمبلی کے فرضی الیکشن کا ڈرامہ رچا کر، اسمبلی سے یواین او کی قراردادوں کے انتباہ اور امتناع کے باوجود، خلاف ورزی کرتے ہوئے، اسمبلی سے ہندوستان کے ساتھ

الحاق کی توثیق کا اعلان کر دیا اور مختلف حیلوں بہانوں سے استصواب رائے نہ ہونے دیا۔ اعلان تاشقند کی خلاف ورزی اور اس سے انحراف کرتے ہوئے، ہندوستان نے اعلانیہ مشرقی پاکستان میں جارحیت کی اور جنرل اروڑہ کے سامنے جنرل عبداللہ نیازی کو ہتھیار ڈلوائے گئے اور جنگ کی عالمی تاریخ میں ۹۰ ہزار فوج کو قیدی بنایا گیا۔ ہندوستان کے ماضی کے رویہ کی روشنی میں، یہ بھروسہ کرنا کہ ہندوستان مذاکرات کی میز پر، جموں کشمیر کو طشتری میں سجا کر پیش کرے گا، کتنی بڑی خودفریبی اور اپنے آپ سے دھوکہ دہی ہے۔

شملہ معاہدہ یواین او میں رجسٹرڈ ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان اور پاکستان نے ریاست جموں کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا، تو دونوں کے موقف کی روشنی میں سکیورٹی کونسل نے، ریاست کے عوام کے حق حاکمیت کو تسلیم کر کے، حق خودارادیت کو استعمال کرتے ہوئے، ریاست کے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے زیرنگرانی سکیورٹی کونسل کرانے کی قراردادیں منظور کیں، جن پر نہ تو پاکستان عمل کرا سکا، اور نہ ہی ہندوستان نے عمل ہونے دیا۔ اس دوران جموں کشمیر کے عوام، ثانوی حیثیت اختیار کر کے مقامی سطح پر، دونوں قابض ممالک کے ساتھ، الحاق کا راگ الاپتے رہے۔ لہٰذا اصل فریق عوام کو، عالمی سطح پر اور ان ہر دو ممالک میں جائز طور پر، اپنا اپنا گماشتہ اور پیروکار تصور کر لیا گیا۔ جب شملہ میں، مسئلہ جموں کشمیر سلامتی کونسل کی قراردادوں کی روشنی میں، حق خودارادیت اور استصواب رائے سے حل کرنے کی بجائے، ہر دو ممالک نے براہ راست دوطرفہ مذاکرات سے حل کرنے کا معاہدہ کر لیا، تو جموں کشمیر کے عوام نے، اس کی مخالفت کے بجائے اس کی حمایت کی، یا خاموشی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسئلہ کشمیر، عوام کی آزادی اور حق خودارادیت کے بجائے، ریاست کی زمین کی تقسیم اور قبضہ کے تنازعہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہندوستان تمام ریاست کا دعویدار بن کر اپنے زیر تسلط حصہ پر، قبضہ مستحکم کرنے میں بتدریج عمل کر رہا ہے، اور وہی پالیسی و حکمت عملی، پاکستان نے بھی اختیار کر رکھی ہے۔ ہندوستان نے فولادی باڑ لائن آف کنٹرول پر تعمیر کی، تو پاکستان نے اعتراض نہیں کیا۔ ہندوستان نے ریاست میں اپنی سیاسی جماعتیں قائم کرنے اور سپریم کورٹ، الیکشن کمشن اور دیگر مرکزی اداروں کا ریاست میں دائرہ اختیار بڑھا دیا ہے اور اب آئین میں شامل، جموں کشمیر کی خصوصی حیثیت کی محافظ شقوں ۳۵-اے اور ۳۷۰ کو ختم کر کے، ریاست کو ہندوستان میں مدغم کر رہا ہے، گو عوام اس پر معترض اور نالاں ہیں، مگر اس سطح پر ان کی آواز روایتی طور پر کمزور ہے۔ ہندوستان کی پالیسی کی تائید میں، پاکستان بھی بتدریج عمل پیرا ہے، پاکستان نے اول آزاد کشمیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا، آزاد حکومت کو اس کے اختیارات نسبت دفاع، فوج، امور خارجہ، تحریک آزادی اور مالی معاملات سے محروم کر دیا۔ مابعد پاکستان کی سیاسی جماعتیں آزاد کشمیر میں منظم کر کے، باقی ماندہ مقامی انتظامی امور پر بھی، تسلط قائم کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مقبوضہ خطہ کے

برعکس، آزاد کشمیر میں عوام، پاکستان کی ادغام کی حکمت عملی پر معترض نہیں ہیں، بلکہ اس میں شامل ہیں۔ گلگت میں، سٹیٹ سبجیکٹ ایکٹ ختم کر کے پاکستانی سٹیزن شپ ایکٹ نافذ کر دیا گیا ہے۔

اقوام عالم میں، اگر مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے کچھ تنازعہ باقی ہے، تو وہ اب ہندوستان اور پاکستان نے دو طرفہ مذاکرات میں طے کرنا ہے۔ اگرچہ پاکستان کے سیاستدانوں اور حکمرانوں کا موقف ہے، کہ معاہدہ شملہ سے سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں اور جموں کشمیر کے عوام کے حق خودارادیت اور استصواب رائے سے، ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق اور اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ اگر، پاکستان کے معاہدہ شملہ کی یہ تاویل، درست مان بھی لی جائے تو کشمیری عوام، بشمول میرے، یہ سوال کرتے ہیں کہ ۲ رجولائی ۱۹۷۲ء کے بعد، پانچ سال میں جولائی ۱۹۷۷ء تک، ذوالفقار علی بھٹو، جن کی سیاست اور حکومت کا محور اور مرکز، کشمیر تھا، انھوں نے اور ان کے بعد آنے والے تمام سیاستدانوں اور جرنیلوں نے، ۲۰۱۸ء تک، مقبوضہ کشمیر میں اتنی بڑی، مقامی تحریک آزادی جس میں، تمام عوام، طلباء اور طالبات سراپا احتجاج، سڑکوں پر نہتے، ہندوستان کی جابر و ظالم افواج کی گولیوں کے سامنے، سینہ سپر ہیں۔ ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۶ء تک اور جولائی ۲۰۱۶ء سے اب تک، کرفیو کے نفاذ اور باہر کی دنیا سے تمام رابطے کاٹ دیئے جانے، قتل و غارت کرنے، جیلیں بھرنے کے خلاف، پاکستان نے ان مسائل پر توجہ اور استصواب رائے پر عملدرآمد کے لئے، سیکیورٹی کونسل کو آگاہ کیوں نہ کیا اور اس کا باضابطہ اجلاس کیوں نہ طلب کیا۔ اس کے برعکس ہندوستان سے مذاکرات کی استدعا کی جاتی رہی اور ہندوستان ہمیشہ کی طرح مذاکرات سے انکاری رہا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے، کہ جس ملک سے بھی مسئلہ کشمیر کے حل کی بات کی جاتی ہے، یہی جواب ملتا ہے، کہ یہ مسئلہ ہندوستان اور پاکستان نے ہی حل کرنا ہے، اس میں تمام ممالک، امریکہ برطانیہ حتیٰ کہ چین سمیت سبھی شامل ہیں۔

ہندوستان و پاکستان معاہدہ شملہ کے تحت، کنٹرول لائن کو پُرامن رکھنے کے پابند تھے اور کسی قسم کی خلاف ورزی یا ایسی دھمکی سے اجتناب کے بھی، پابند اور ضامن تھے۔ لیکن ہندوستان معاہدہ کی خلاف ورزی اور جارحیت کر کے ۱۹۸۴ء میں سیاچن گلیشیر پر قابض ہو گیا، پاکستان خاموش رہا۔ اس سے قبل تقسیم ہند کی سکیم کے برعکس، ضلع گورداسپور کی مسلم اکثریتی تحصیل گورداسپور و بٹالہ، امرتسر کی تحصیل اجنالہ، جالندھر کی تحصیل نکودر جالندھر اور فیروزپور پاکستان کے بجائے ہندوستان کو دے دی گئیں، مگر پاکستان نے کوئی اظہار ناراضگی نہ کیا، بلکہ اپنی حق تلفی پر خاموش رہا۔ جولائی ۱۹۷۲ء سے اب تک، ہندوستان کنٹرول لائن پر فولادی باڑ نصب کرنے کے باوجود آئے، دن شکرگڑھ، سامبھہ، کٹھوعہ سے لے کر نیلم ویلی تک، آزاد کشمیر میں بلااشتعال فائرنگ اور بھاری توپوں سے گولہ باری کر کے، مقامی آبادی کو نقل مکانی پر مجبور کر چکا ہے۔ فصلیں برباد، مال مویشی مار چکا ہے، بلکہ معصوم طلباء و طالبات اور

عوام کو شہید کر رہا ہے اور فائرنگ بدستور جاری ہے اور عوام شہید اور زخمی ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی وزارت خارجہ، صرف احتجاجی بیان دے کر، خاموش ہو جاتی ہے۔ ان واقعات سے شملہ معاہدہ کی اعلانیہ خلاف ورزی کا ارتکاب ہو رہا ہے۔

شملہ معاہدہ کی کلیدی شق، مسئلہ جموں، کشمیر، دوطرفہ مذاکرات سے حل کرنے کی ہے، مگر اس شق پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جائے، تو روز روشن کی طرح، ہندوستان کا منفی اور انحراف کا رویہ، واضح ہے۔ اول تو پاکستان کی تمام تر کاوش کے نتیجہ میں، چند دفعہ مذاکرات کے لئے رسمی ملاقاتیں ہوئیں، جو ایک دوسرے کے خلاف روایتی الزامات پر موقوف رہیں۔ اس میں ذرا برابر شک نہیں، کہ مسئلہ جموں کشمیر، دوطرفہ مذاکرات کی آڑ میں، ہندوستان کی ہٹ دھرم پالیسی کا یرغمال بنا ہوا ہے اور پاکستان بدستور صرف مذکرات کے مطالبہ پر ہی مصر ہے اور ہندوستان انکار پر بضد ہے۔ اب تو پاکستان کو، ہندوستان کے مذاکرات سے انکار کے، ایک ایک واقعہ کا چارٹ، یو این سکیورٹی کونسل میں پیش کر کے کہہ دینا چاہیے، کہ ہندوستان معاہدہ سے دستکش ہو چکا ہے اور شملہ معاہدہ ساقط ہو چکا ہے۔ لہٰذا جموں کشمیر میں استصواب رائے کے لئے، سیکریٹری جنرل اور سکیورٹی کونسل ضروری اقدامات اٹھائے۔ یو۔این چارٹر میں آرٹیکل ۱۰۳ کے تحت یو۔این کمشن اور سکیورٹی کونسل کی قراردادوں کو معاہدہ شملہ پر فوقیت حاصل ہے، پاکستان اس کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

ہندوستان و پاکستان مذاکرات کا انجام

کشمیر عالمی بالخصوص ایشیا کی تاریخ کے حاصل شدہ اوراق میں ایک آزاد، خودمختار ملک کی حیثیت سے ہندو، بدھ اور مسلم حکمرانی کے تحت، مہذب اقدار کا حامل، ادب و علم میں یکتا، خوش حال، ترقی یافتہ ملک کا مقام رکھتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ناپسندیدہ، یا کسی حد تک پسندیدہ، گلاب سنگھ کے معاہدۂ امرتسر نے، کشمیر ملک کو ریاست جموں کشمیر کی جدید شناخت دی۔ ۱۶ر مارچ ۱۸۴۶ء کے بعد، معاہد امرتسر کے برتر فریق برطانیہ نے ہندوستان میں، انتقال اقتدار کے دن ۵۶۲ ریاستوں اور حکمران راجوں مہاراجوں سے اختیار حکمرانی کے معاہدے اور اقرارنامے، اپنے اختیار برتری کے ساتھ ہی، ساقط اور کالعدم قرار دے کر، ریاستوں کے عوام کو، ہندوستان و پاکستان کے عوام کے برابر حق اور اختیار حکمرانی عود اور منتقل کر دیا۔ تاہم کسی ایک ملک، ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کی صوابدیدی، تجویز بھی دے دی۔ اس تناظر میں، دنیا کے کئی ممالک سے رقبہ، آبادی اور وسائل سے بڑی ریاست، کے الحاق کا تنازعہ بدستور حل طلب ہے۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے دن سے، ہندوستان و پاکستان کی افواج

کے زیر قبضہ، منقسم ریاست کی حاصل شدہ مقامی اور بین الاقوامی قانونی حیثیت، جس کی سیکیورٹی کونسل نے بھی توثیق کی ہوئی ہے، بدستور قائم ہے۔ عوام کی منقسم رائے اور ہندوستان و پاکستان کے حق میں الحاق کے دعوؤں کی روشنی میں، ہردو ممالک کے درمیان الحاق کے اصول اور اس کے مغائر، مذاکرات کا جائزہ ذیل ہے۔

ہندوستان نے ۲۶ اور ۲۷ر اکتوبر کو جموں کشمیر میں اپنی افواج، ہوائی سروس سے اور جموں میں سڑک سے داخل کر دیں۔ وزیر اعظم نہرو نے بذریعہ ٹیلی گرام ۲۷ر اکتوبر کو وزیر اعظم برطانیہ اور ۲۸ر اکتوبر کو وزیر اعظم پاکستان کو یقین دہانی کروائی، کہ ریاست میں امن بحال ہوتے ہی، ہندوستانی فوج واپس ہو جائے گی اور مستقبل میں ہونے والے استصواب رائے پر اثر انداز نہ ہو گی۔ ۲۹ر اکتوبر کو ٹیلی گرام کے ذریعہ، وزیر اعظم پاکستان نے، وزیر اعظم برطانیہ سے احتجاج کیا اور ہندوستانی فوج کو جارح قرار دے کر، اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ۳۰ر اکتوبر کو وزیر اعظم برطانیہ کی طرز کا جواب، وزیر اعظم پاکستان نے ٹیلی گرام میں وزیر اعظم نہرو کو، ارسال کیا اور پاکستان سے سٹینڈسٹل معاہدہ کی روشنی میں، ریاست کے ہندوستان سے عبوری الحاق کو، فراڈ قرار دے کر، اسے مسترد کر دیا اور انڈیا کی فوج کے ریاست سے انخلا کا مطالبہ کر دیا۔ ہندوستان کے وزیر اعظم نے، ۳۱ر اکتوبر، ۴ر نومبر، ۸ر نومبر، ۱۳ر نومبر، ۲۱ر نومبر، ۱۲ر دسمبر، ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء، کو خط ارسال کر کے، جموں کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کی، حمایت اور استصواب رائے سے الحاق کی بار بار ضمانت دی۔ جواب میں وزیر اعظم پاکستان نے، وزیر اعظم ہندوستان سے ٹیلیگرام کے ذریعہ ۶ر نومبر، ۱۰ر نومبر، ۱۶ر دسمبر اور بذریعہ خط ۳۱ر دسمبر اپنے مؤقف کو دہرا کر، ہندوستان کی فوج کے انخلا کا پھر سے مطالبہ کیا۔

پنڈت نہرو و محمد علی بوگرہ رابطہ

محمد علی بوگرہ کی تمام کوشش جوں کی توں پوزیشن میں، ختم ہوئی۔ پنڈت نہرو نے کبھی پاکستان کے اندر کی غیر مستحکم سیاسی حالت کا اور کبھی دفاعی اور خارجہ پالیسی کی آڑ میں، کشمیری عوام کی غلامی اور ظلم کی سزا کو طول دیا۔ چوہدری محمد علی کو متحدہ ہندوستان میں، کانگریس اور انگریز حکمرانوں کے، مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ اور انتقال اقتدار کے وقت، پنجاب اور بنگال کی غیر منصفانہ اور جانبدارانہ تقسیم، ریاستوں کے الحاق اور جموں کشمیر میں سازش کے تحت، اندرونی و بیرونی قوتوں کی ملی بھگت سے، ہندوستان کی مداخلت اور تسلط قائم کرنے کا، گہرا علم تھا۔ یہی پوزیشن، حسین شہید سہروردی کی بھی تھی۔ وہ اس وقت متحدہ بنگال کے باصلاحیت، کہنہ مشق و متحرک چیف منسٹر رہ چکے تھے۔ یہ دونوں، مسئلہ کشمیر پر ہندوستان سے نمٹنے کی معقول صلاحیت رکھتے تھے، مگر ان دونوں کو، سکندر مرزا اور ایوب خان نے، یکے بعد دیگرے ایک ایک سال کے بعد چلتا کیا۔ چوہدری محمد علی صرف کراچی میں کل جماعتی کشمیر کانفرنس

منعقد کرا سکے۔ سہروردی صاحب چین کا دورہ کر کے دونوں ملکوں میں تعلقات بہتر کر سکے۔

فیروز خان نون اور جموں کشمیر

ہندوستان نے جموں کشمیر میں استصواب رائے غیر مؤثر اور ناکام بنانے کی نیت سے، دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا۔ ۱۹۵۶ء کے آخر میں اسمبلی نے، ایک قرارداد کے ذریعہ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی توثیق کی۔ اس سے قبل روس کے وزیر اعظم بلگانن اور سیکریٹری خورشیف، سرینگر اور دہلی میں جموں کشمیر کو، ہندوستان کی شمالی ریاست قرار دے چکے تھے۔ الحاق کی قرارداد کے خلاف، وزیر اعظم پاکستان فیروز خان نون نے، جرأت سے مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں اٹھایا۔ روس غیر جانبدار رہا اور سیکیورٹی کونسل نے ۲۴ رجنوری ۱۹۵۷ء کو جموں کشمیر اسمبلی کی، الحاق کی قرارداد، سیکیورٹی کونسل کی قراردادوں کے مغائر قرار دے کر کالعدم کردی۔ اس کے بعد ۲۱ رفروری اور ۲ ردسمبر کی قراردادوں میں سیکیورٹی کونسل کی تمام قراردادوں کی توثیق کردی، جس کے بعد پاکستان نے براہ راست جموں کشمیر کے مسئلہ کو، خصوصیت سے سیکیورٹی کونسل میں نہیں اٹھایا۔

ذوالفقار علی بھٹو-سورن سنگھ مذاکرات، دسمبر ۱۹۶۲ء تا مئی ۱۹۶۳ء

مئی ۱۹۶۰ء میں امریکن جاسوس طیارہ یو-۲، روس نے گرادیا۔ اس طیارہ نے پشاور کے پاس بڈھ بیر کے ہوائی اڈہ سے پرواز کی تھی، جس کی وجہ سے، روس نے پاکستان کو انتباہ بھی کیا تھا۔ ۲۳ رستمبر ۱۹۶۰ء کو، سندھ طاس معاہدہ کرنے وزیر اعظم نہرو کراچی آئے، وہاں سے راولپنڈی اور کوہ مری بھی آئے۔ کوہ مری میں ایوب خان سے مذاکرات بھی ہوئے اور فیصلہ ہوا کہ "آئندہ مسئلہ کشمیر نہیں بلکہ مذاکرات میں صرف "کشمیر" کا حوالہ دیا جائے گا"۔ ان مذاکرات میں بھی کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ اس سے قبل اکتوبر، نومبر ۱۹۵۹ء میں چین نے لداخ میں، ہندوستان کے مقبوضہ ۱۰ ہزار مربع میل علاقہ پر قبضہ کرلیا تھا، جہاں ہندوستان اور چین کی فوجوں میں جھڑپ ہوئی تھی۔ ۱۲ راکتوبر ۱۹۶۲ء کو وزیر اعظم نہرو نے، اپنی فوج کو حکم دیا کہ چین سے رقبہ واپس لیا جائے۔ ہندوستانی حملہ کے جواب میں، چین نے ہندوستان سے ملحقہ سرحد، شمال مشرق نیفا میں جوابی حملہ کیا، تو ہندوستان کے کمانڈر جنرل کول اور ہندوستانی فوج شکست کھا کر بھاگ آئی۔ اس پر پنڈت نہرو نے، امریکہ اور برطانیہ سے مدد طلب کی اور ایوب خان کو بھی مدد کے لئے خط ارسال کیا۔ اسی دوران امریکہ اور برطانیہ کے خصوصی سفارتکار، ایورل ہیرئیمین اور ڈنکن سینڈز، ایوب خان سے ملے اور پنڈت نہرو سے ملاقات میں، مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لئے، پاکستان سے رابطہ کا پیغام پہنچایا۔ بوگرہ، وزیر خارجہ نے غیر جانبدار رہنے کی یقین دہانی کرائی اور ایوب خان ایک ہفتہ کے لئے، جنگ

ختم ہونے تک، گلگت میں یاک پر سواری کرتے ہوئے دکھائے گئے۔ ایوب خان کی اس مشکل وقت میں، کشمیر میں مداخلت نہ کرنے کے، صلہ کے طور پر، امریکہ کے صدر کینیڈی اور برطانیہ کے وزیراعظم میکملن کی ترغیب پر، ہندوستان پاکستان سے مسئلہ جموں کشمیر پر، مذاکرات کے لئے آمادہ ہوا۔ ہندوستان کے وزیر ریلوے، سردار سورن سنگھ اور پاکستان کے وزیر صنعت، ذوالفقار علی بھٹو کے مابین ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۲ء سے ۱۶ر مئی ۱۹۶۳ء تک راولپنڈی، نیو دہلی، کراچی اور کولکتہ کے مقام پر تین سے چار چار دن، لگاتار مذاکرات ہوتے رہے۔ ان مذاکرات میں، بقول بھٹو صاحب "انھوں نے تمام ریاست میں بیک وقت رائے شماری، علاقائی رائے شماری، مسلم وغیر مسلم آبادی کے تناسب سے حل، وادی کشمیر کو ایک خاص مدت تک، غیر جانبدار انتظام کے تحت رکھے جانے کے بعد صرف وادی میں رائے شماری اور بالآخر دریائے چناب کو سرحد قرار دینے کی، یکے بعد دیگرے تجاویز دیں، مگر ہندوستان نے مذاکرات کو بالآخر تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا اور موقف اختیار کیا، کہ حل سیاسی ہونا چاہیے، جس سے عوام کو نقل مکانی نہ کرنی پڑے۔ آخری دور مذاکرات میں، ہندوستان کی طرف سے اس وقت کی جنگ بندی لائن میں، معمولی ردوبدل کے ساتھ، اس کو مستقل سرحد قرار دینا، تجویز کیا گیا، جس پر مذاکرات ختم ہوئے"۔

ان دوطرفہ مذاکرات میں ہندوستان، جبکہ نیفا میں وہ شکست خوردہ اور پاکستان کی حمایت کا محتاج تھا۔ دوسری طرف پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خان حکمران تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان متحد تھے اور مذاکرات میں پاکستان کی نمائندگی ذوالفقار علی بھٹو جیسے نہایت زیرک وذہین کررہے تھے۔ اگر ان حالات میں بھی دوطرفہ مذاکرات میں انڈیا، اپنے زیر قبضہ جموں کشمیر کلی یا جزوی طور پر، چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوا، تو آج کے حالات میں پاکستان کے سیاستدان اور حکمران، کس بہتر سہارے کے بل بوتے پر، ہندوستان سے موجودہ کنٹرول لائن کے مستقل بارڈر کے سوا کوئی حل چاہتے ہیں۔ اب تو ہندوستان گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے علاقے بھی حاصل کرنے کا دعویدار ہے۔

ہندوستانی دستور کے نفاذ کا اثر

ہندوستان نے اپنے دستور میں جموں کشمیر ریاست کو ہندوستان کا حصہ ظاہر کیا ہے اور عبوری آرٹیکل ۳۷۰ کے تحت ریاست کی خصوصی حیثیت کا تعین کیا ہے۔ آرٹیکل ۳۵-الف کے تحت ریاست کے عوام کی شہریت، جائیداد کی منتقلی، سروسز وغیرہ کو تحفظ دیا گیا ہے۔ سپیشل حیثیت اور محفوظ حقوق کو جموں کشمیر اسمبلی کی منظوری کے تابع رکھا گیا تھا، مگر ہندوستان مکمل تسلط قائم کرنے کی پالیسی کے تحت، ریاست کی سپیشل حیثیت میں کمی کرنے کی نیت سے، بتدریج ترمیم کرنے پر عمل پیرا ہے۔ ریاست کا ہندوستان سے نام نہاد الحاق اور اس کی توثیق بدون استصواب رائے، بدون عوام کی صوابدید، قانون آزادی ہند اور سیکیورٹی کونسل اور یو۔ این کمشن کی مسلمہ قراردادوں کے نقیض اور ان سے

متصادم ہونے کی بنا پر کالعدم ہے۔ ریاست کے عوام اس کو قطعاً قبول نہیں کرتے اور اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں اور استصواب رائے کے حق میں متحد اور منظم جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہندوستان کا آئین، قانون اور ضابطۂ کار کا، ریاست میں نفاذ اور لاگو کرنے کا کوئی قانونی، اخلاقی اور سیاسی جواز نہیں ہے۔ ریاستی حکومت کے شعبوں اور امور میں مداخلت اور ہندوستان کے اپنے حق میں، منتقل اور تفویض کرانا صریحاً ناجائز اور تجاوز ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کا روزاول، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء سے واضح مؤقف ہے، کہ ریاست جموں کشمیر نہ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان کا حصہ ہے، بلکہ صرف ریاست کے عوام ہی، حق خودارادیت کے تحت، سکیورٹی کونسل کی نگرانی میں، استصواب رائے کے ذریعے ریاست کے پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کرنے کے مجاز ہیں۔ حکومتی پالیسی کے علاوہ، پاکستان نے اپنے مؤقف کی تائید میں، پاکستان کے دستور میں آرٹیکل ۲۵۷ میں بطور ضمانت، یہ قرار دے رکھا ہے ''جب ریاست جموں کشمیر کے عوام پاکستان کے ساتھ الحاق کریں گے تو پاکستان اور اس ریاست میں تعلقات کا تعین، ریاست کے عوام کی خواہشات کے تابع کیا جائے گا''۔ پاکستان کے آئین کا آرٹیکل ۲۵۷ سکیورٹی کونسل اور یو۔این کمشن کی قراردادوں کے عین مطابق ہے اور اس کو ہر لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ جبکہ ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ اور پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۲۵۷ کا موازنہ کیا جائے، تو ہندوستان کے ریاست پر غاصبانہ قبضہ اور عملداری کا، واضح ثبوت ملتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو غور اور فیصلہ طلب یہ ہے، کہ استصواب رائے اور الحاق کے فیصلہ سے قبل، سرینگر اور مظفرآباد کی قانون ساز اسمبلیوں کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو، ریاست یا ریاست کے کسی حصہ پر، عبوری یا مستقل اختیار حکمرانی منتقل یا تفویض کرنے کا قطعی کوئی اختیار نہیں ہے اور ایسا کرنا، سکیورٹی کونسل اور یو۔این کمشن کی قراردادوں سے متصادم ہے۔ اسی اصول کے تحت، ریاست یا اس کا کوئی حصہ ہندوستان، پاکستان یا کسی اور سے منسلک کرنے کا بھی، ان اسمبلیوں کو اختیار نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی مجاز ہیں۔ ہندوستان آگاہ ہے، کہ ریاست کے عوام کی اکثریت، ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے خلاف ہے۔ لہٰذا ہندوستان استصواب رائے کے عمل کو ناکام بنانے اور ریاست کے زیادہ حصہ پر، اپنے غاصبانہ قبضہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے تمام حربے استعمال کرنے پر عمل پیرا ہے۔ لیکن پاکستان کو ہندوستان کی پیروی پر احتراز کرنا چاہیے۔ گوکہ ماضی میں کمزور پالیسیوں سے پاکستان، سندھ طاس معاہدہ اور شملہ معاہدہ کے تحت، ہندوستان کی حکمت عملی اور رویہ کا یرغمال بن چکا ہے، مگر اس سے مایوس ہو، کر جموں کشمیر سے دستبردار ہوکر، ریاست کی تقسیم کی خودکشی نہیں کرنی چاہیے۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

جموں کشمیر کے عوام کے لئے، پُرامن اور آسان راستہ یہ ہے، کہ حالات سے سمجھوتہ کرلیں اور دونوں ممالک سے اپنا مستقبل وابستہ کرلیں۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے عوام اور ہندوستانی مقبوضہ حصّہ میں، غیر مسلم عوام کی اکثریت تو، اس تقسیم کو تسلیم کرنے کو تیار ہوگی، مگر ہندوستان کے زیرِ تسلط، جموں کشمیر کے مسلمان عوام کے دل میں، ہندو اکثریت آبادی کی حکومت کے رویہ، اور متعصبانہ طرزِ حکومت کے خلاف، وہی بدگمانی اور خدشات ہیں، جن کی وجہ سے، پاکستان الگ ملک کی حیثیت میں قائم ہوا۔ بدقسمتی سے، جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے، وہاں نسلی اور مذہبی منافرت اور اقلیتوں سے امتیازی رویہ کی، انتہا ہو چکی ہے، آئے روز مذہبی تعصب اور منافرت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اقلیت میں مسلمان، سکھ، عیسائی اور دلت برادریوں پر، تشدد کے واقعات، عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور تجاوزات معمول بن چکا ہے۔ جس کی وجہ سے، جموں کشمیر کے مسلمان، ہندوستان کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ وہاں مسلسل آزادی اور استصواب رائے، کی تحریک جاری ہے اور وہاں کے عوام کو، پاکستان کی موجودہ تقسیم ریاست اور دو طرفہ مذاکرات کی پالیسی سے اتفاق نہیں ہے۔ وہاں ہر روز جوان شہید ہو رہے ہیں اور ہزاروں عوام جیلوں میں، عرصہ سے صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں، شہدا کی قبروں کی تعداد، ان گنت ہے، مگر ہندوستان جبر اور تسلط اور پاکستان مخالف پالیسی پر، بضد ہے۔

ہندوستان نے اس پالیسی کے تحت، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں، آزاد کشمیر کے ۳۲۰ مربع میل دفاعی اہمیت کے حامل، اہم ترین لداخ، کرگل، ہنی مرگ، لیپہ اور چھپر ہ کے شمال مشرق میں واقع خاکی ٹیکری کی چوٹیوں پر قبضہ کرلیا، ۱۹۸۴ء میں سیاچن گلیشیئر پر بھی قبضہ کرلیا اور یہ علاقہ واپس کرنے سے صاف انکاری ہے۔ وہ گلگت اور آزاد کشمیر پر بھی اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ پاکستان وچین کی شروع کی گئی اقتصادی راہداری پر بھی، معترض ہے، مگر پاکستان کے لئے، سب سے زیادہ خطرناک بات، دریاؤں کے پانی پر ہندوستان کا کنٹرول اور سندھ طاس معاہدہ کے تحت، کشمیر کے دریاؤں پر لاتعداد بجلی گھر تعمیر کرنے کے ہندوستانی اختیار کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کے اس وقت کے حکمران، اس خطرہ کو کم اہمیت دے رہے ہیں، مگر پاکستان کے خلاف، ہندوستان کی دشمنی اور اجارہ داری کی پالیسی کے تحت، مستقبل میں پاکستان کے لئے، اس کے تباہ کن نتائج ہوں گے۔ میری رائے میں، ریاست کے عوام کے حقوق کے ماورا، خود پاکستان کی سلامتی اور خوشحالی کی ضمانت، صرف کشمیر کے دریاؤں کے پانی پر، ہندوستان کا مکمل اور ہمیشہ کے لئے کنٹرول، ختم کرنے میں ہے۔ ہندوستان تو جموں کشمیر کے دریاؤں کا رخ بدل کر، پانی ہندوستان لے جانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے، عالمی ماہرین کی رائے میں، جموں کشمیر کے دریاؤں سے ۶۰ سے ۶۵ ہزار میگاواٹ پن بجلی

حاصل کرنے کی موجودہ حالات میں گنجائش ہے، جبکہ ٹیکنالوجی میں ترقی کی صورت میں، مزید اضافہ بھی ممکن ہے۔ عالمی بینک کی سال ۲۰۱۷ء کی رپورٹ کے مطابق، ہندوستان جموں کشمیر سے ۱۰ ہزار میگا واٹ کے قریب بجلی ہندوستان میں لے جارہا ہے، معدنیات، جنگلات کے وسائل کی منتقلی، اس کے علاوہ ہے۔ مشرق سے شمال مغرب میں، ہندوستان کی چین سے ملحقہ سرحد کی مضبوط ترین دفاع کی معقول ضمانت، ریاست کے بلند اور مشکل ترین گلیشیرز، پہاڑ اور دریا ہیں۔ پاکستان اس بات سے آگاہ ہے، کہ ہندوستان نے پانی میں خود کفیل رہنے کے لئے، ملک کے تمام دریاؤں کو منسلک کرنے کا، عظیم منصوبہ مکمل کرلیا ہے، اور کچھ بعید نہیں کہ کشمیر کے دریاؤں کا پانی بھی، ہندوستان لے جائے۔ اس پالیسی کی، امریکہ کے سابق سیکریٹری خارجہ نے، چند سال قبل سینٹ میں نشاندہی کردی تھی، ایسی صورت حال میں، پاکستان کے شعبہ آبپاشی کے ماہرین اور حکمرانوں کی ترجیحات، جموں کشمیر کے دریاؤں کے پانی کے تحفظ کے ماسوا ہیں۔ اہم ترین قومی مفاد کا تقاضا ہے، کہ جموں کشمیر کے دریا، جو ہر لحاظ سے پاکستان کی شہ رگ ہیں، ان پر ہندوستان کا تسلط اور کنٹرول کیسے ختم کیا جائے، اس کا فوری جواب اور حل تلاش کرنا ہوگا۔

اب تک پاکستان کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں ہندوستان پر برتری حاصل رہی ہے، مگر پاکستان، چین، اقتصادی راہداری اور دفاعی اسلحہ میں، اشتراک کے حسد میں، امریکہ ہندوستان کو جدید نیوکلیئر مواد اور ٹیکنالوجی کی سہولت فراہم کرکے، پاکستان پر برتری دلانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ امریکہ کی اس پالیسی کا اثر بھی، جموں کشمیر پر پڑے گا۔ ہندوستان نے کشمیر میں جاری، اندرونی تحریک کو، پاکستان کی افغانستان پالیسی سے منسلک ظاہر کرکے، امریکہ سے بھی اس کو دہشت گرد تحریک، قرار دلوادیا ہے۔ ہندوستان مقبوضہ جموں کشمیر میں جاری، مقامی تحریک آزادی کو، بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر دہشت گردی سے جوڑنے کی پالیسی پر، کاربند ہے اور اس میں اس کو، امریکہ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ گوکہ پاکستان کی نیوکلیئر ٹیکنالوجی ہندوستانی ٹیکنالوجی سے مختلف اور برتر ہے، تاہم اس کا جدید ارتقاء جاری رکھنا، نہایت ضروری ہے۔

ہمارا قومی مدعا ساری ریاست جموں کشمیر سے، ہندوستان کا قبضہ اور تسلط مکمل طور پر ختم کرنا، ریاست کو جغرافیائی، سیاسی اور انتظامی طور پر متحد کرنا ہے اور متذکرہ بالا تجزیہ کی روشنی میں، ریاست کی موجودہ تقسیم کو ختم کرنا ہے۔ اس نکتۂ نظر کی کامیابی کی، کلیدی ضرورت ریاستی عوام میں فکری اتحاد ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق، ریاست میں غیر مسلم آبادی ۲۳ فیصد تھی جو اَب ۲۵ فیصد ہے، جس کا مسکن دریائے چناب کے کنارے ہیں، ماسوائے ڈوڈہ، کشتواڑ کے اور لداخ میں دریائے سندھ کے دائیں، البیہ شہر میں اور گرد ونواح میں بدھ مت آبادی ہے۔ لہٰذا اس غیر مسلم آبادی کو بھی، ہم خیال بنانا ضروری ہے۔ یہ ماضی اور حال میں ثابت ہو چکا ہے، کہ

ریاست کی مسلم اکثریت، ہندوستان سے ریاست کے الحاق کے خلاف ہے۔ اسی طرح ریاستی غیر مسلم بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کے خلاف ہیں، ان دو مختلف مذہبی قومیتوں کی اکثریتی آبادی کا اتفاق، صرف ریاست کو آزاد و خود مختار حیثیت اختیار کرنے میں ہی ممکن ہے۔ جس میں باہمی اعتماد پیدا کرنے اور اجتماعی مفادات پر قائل کرنے کے لئے، سیاسی تدبر، علم و فراست کی حامل قیادت کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی قبل، قیادت کا اس سیاسی فکر میں ایمان اور یقین اشد لازمی ہے۔ ان صف اول کے لیڈروں کی دانش اور دور اندیشی کی داد دینی چاہیے، جنہوں نے آزاد کشمیر کو باقی ریاستوں کی طرح مدغم کرنے اور پاکستان کا حصہ بنانے کے بجائے، اس کا تشخص، آزاد حکومت، اس کے پرچم، قومی ترانے، آزاد فوج، دیگر اداروں کی حیثیت میں الگ قائم کیا اور دستور میں ریاست کی الگ حیثیت کو تحفظ دیا۔ بعد میں نااہل حکمرانوں نے حکومت کے اختیارات میں، مداخلت بھی کی مگر وہ حکمران، ایسے نااہل تھے، جن کے رویہ سے مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔ یہاں پر تحریک آزادی پر نظر ثانی کر کے، ریاست کو متحد کرنے کے عمل کے آغاز سے قبل تحریک کی اساس کا احاطہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

جموں کشمیر میں دستور کا نفاذ

ریاست جموں کشمیر میں ۱۹۳۱ء کی تحریک حقوق کے اثر میں، عوام کے مطالبات پر، اصلاحاتی سفارشات کا کمشن مقرر کیا گیا۔ کمشن کے چیئرمین، جے گلینسی جبکہ پنڈت پریم ناتھ براز، غلام احمد عشائی اور چوہدری غلام عباس اس کے ممبران مقرر ہوئے۔ گلینسی کمشن کی سفارشات کے تحت دیگر اصلاحات کے علاوہ قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی۔ چنانچہ ریاست کا پہلا دستور ایکٹ ۲۲ راپریل ۱۹۳۴ء کے دن نافذ ہوا۔ مزید اصلاحات اور نمائندگی میں اضافہ کے ساتھ، ۷ رستمبر ۱۹۳۹ء کے دن دستور ایکٹ ۱۹۳۹ء نافذ ہوا۔ اس دستور کے تحت، قانون ساز اسمبلی جسے پرجا سبھا کا نام دیا گیا تھا، کا آخری الیکشن جنوری ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے دن قانون آزادی ہند کے نفاذ پر، ہندوستان، پاکستان کے ساتھ ہی ریاست جموں کشمیر کو بھی آزاد و خود مختار حیثیت حاصل ہو گئی۔ حکومت برطانیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین معاہدہ امرتسر ۱۶ رمارچ ۱۸۴۶ء کو، اور دوسرا معاہدہ گلگت لیز کا ۲۶ رمارچ ۱۹۳۵ء کو، حکومت برطانیہ اور مہاراجہ ہری سنگھ (جانشین گلاب سنگھ) کے مابین ہوا تھا۔ قانون آزادی کے نفاذ پر برطانوی پیرا مونسٹی ریاست پر ساقط ہونے پر، بیک وقت دونوں معاہدے بھی ساقط ہو گئے اور اختیار حکمرانی ریاست کے باشندوں کو عود ہو گیا۔ ہندوستان کی حکمران جماعت کانگریس اور پاکستان کی مسلم لیگ حکمران جماعت کا بھی یہی موقف تھا، البتہ کانگریس آخر تک اس موقف کی حامی رہی۔ اس کی واضح مثال ریاست حیدرآباد دکن کی آئینی اور قانونی حیثیت سے متعلق، کانگریس نے ۱۰ راگست ۱۹۴۸ء کو جو وائیٹ پیپر شائع کیا، اس میں دوٹوک

موقف دہرایا گیا کہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے دن قانون آزادی کے نفاذ پر، ریاست پر برطانوی ساورنٹی ساقط ہونے کے ساتھ ہی نظام کا حکمرانی کا اختیار ختم ہوا اور اختیار حکمرانی ریاست کے باشندوں کو عود ہو گیا۔ چنانچہ نظام حیدرآباد (حکمران) جس نے ریاست حیدرآباد کو خودمختار ریاست ڈیکلیئر کر دیا ہوا تھا، اور اقوام متحدہ میں رکنیت حاصل کرنے کی تحریک بھی کر رکھی تھی، نیز پاکستان اور چند دیگر ممالک میں اپنے سفیر بھی مقرر کر چکا تھا۔ کانگریس کی حکومت نے ۱۲، ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو، عوام کی حمایت کے مفروضہ پر، حیدرآباد ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ریاست جوناگڑھ کے نواب اور ریاست مناوادر کے والیان نے اپنی ریاستوں کا الحاق پاکستان سے کیا، جو پاکستان نے ۵ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو منظور کیا۔ ہندوستان نے ان دونوں ریاستوں کے حکمرانوں کا الحاق بھی متذکرہ بالا موقف کی روشنی میں مسترد کر کے، دونوں ریاستوں کے عوام کی حمایت کے مفروضہ پر، دونوں ریاستوں پر قبضہ کر کے اپنی نگرانی اور صوابدید کے تحت استصواب رائے کروا لیا اور پاکستان کے دعویٰ کو مسترد کر دیا۔

جموں کشمیر میں سردار پٹیل کی ایما پر، جج ہائیکورٹ مشرقی پنجاب، مہر چند مہاجن کو رخصت دے کر مہاراجہ کا وزیراعظم بنایا گیا۔ مہر چند مہاجن نے، پاکستان کے خلاف اجناس اور پٹرول کی ترسیل میں رکاوٹ ڈالنے کے الزام کا، پلان تیار کیا اور ہندوستان سے فوجی مدد اور اسلحہ کی درخواست کی۔ اسی دوران، ریاست میں مہاراجہ کے خلاف عوام نے اپنی مدد آپ کے تحت، تحریک شروع کی، تو قبائلی لشکر نے مظفرآباد پر حملہ آور ہو کر، بارہمولہ تک قبضہ کر لیا، جس پر ہندوستان سے مدد طلب کی گئی۔ ہندوستان میں ریاستوں کے الحاق کے انچارج سیکریٹری، وی پی مینن، سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کی تجویز کے تحت، گورنر جنرل مونٹ بیٹن سے جب مشاورت ہوئی تو بقول مینن، مونٹ بیٹن نے کہا کہ جموں کشمیر تب ایک خودمختار ریاست تھی، جس میں ہندوستان فوج نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس پر وی پی مینن اور مہاجن ۲۵ر اکتوبر کے دن سرینگر پہنچے، ۲۶ تاریخ رات کو مہاراجہ بذریعہ روڈ، جموں کے لئے روانہ کیا اور ۲۶ر اکتوبر کو دہلی پہنچ کر گورنر جنرل کو رپورٹ پیش کی۔ شام کو دونوں بذریعہ ہوائی جہاز، پھر جموں آئے اور مہاراجہ سے الحاق نامہ پر دستخط کروا کر واپس دہلی پہنچے۔ مونٹ بیٹن گورنر جنرل انڈیا نے، جموں کشمیر کے عوام کی استصواب رائے میں الحاق ریاست کی توثیق کی شرط کے تابع، الحاق نامہ منظور کیا۔ اس فرضی اور جعلی الحاق نامہ کی تردید، مہر چند مہاجن اور ڈاکٹر کرن سنگھ کی کتابوں سے بھی ہوتی ہے، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ پروفیسر السٹر لیمب نے بھی تحقیق سے اس کو جھوٹ قرار دیا ہے۔ قائداعظمؒ نے اس الحاق نامہ کو اسی دن فراڈ قرار دے دیا تھا۔

۲۶ر اکتوبر کو ریاست جموں کشمیر میں، نام نہاد مہاراجہ کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی انتظامیہ، ضلع جموں، کٹھوعہ، اودھم پور اور وادی کشمیر کے ایک ضلع اسلام آباد اننت ناگ تک محدود ہو چکی تھی۔ لداخ، ماسوائے محاصرہ میں

لیہ کا شہر، اور تمام گلگت پر مہاراجہ کی سابق ملٹری مسلمان یونٹس نے، بغاوت کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ بھمبر میں اکھنور تک، میر پور، کوٹلی، راجوری اور تمام پونچھ ماسوائے محاصرہ میں پونچھ شہر کے، تمام علاقے آزاد کشمیر حکومت کی آزاد جموں کشمیر ریگولر فورس کے زیر قبضہ تھے۔ کشمیر میں مظفر آباد اور بارہ مولا پٹن تک، آزاد فورس کے حامی، قبائلی لشکر کے قبضہ میں تھا۔ دو تہائی سے زیادہ آبادی اور زمینی اکثریت کا علاقہ، حکومت آزاد جموں کشمیر کے قبضہ اور حکمرانی میں تھا۔ مہاراجہ تو بقول مہاجن اور وی پی مینن، کشمیر سے بھگوڑہ تھا۔ ریاست جس پر اس کا عملاً تسلط ختم ہو چکا تھا، اس کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی قانونی حیثیت کیا تھی؟ ان میں سے بیشتر علاقے معاہدہ جنگ بندی کے بعد، دونوں افواج کے انگریز کمانڈروں نے انگریز سپریم کمانڈر کی سازش کے تحت، ہندوستان کی فوج کے سپرد کیے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کے اپنے موقف کی روشنی میں، جو اختیارِ حکمرانی، نظام حیدرآباد، نواب جونا گڑھ اور مناوادر کا ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کی پیرا مونٹسی ساقط ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا، ویسا ہی اختیارِ حکمرانی، مہاراجہ جموں کشمیر کو ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کے بعد الحاق کرنے کا کیسے حاصل تھا؟ مزید براں مہاراجہ کے الحاق کو گورنر جنرل ہندوستان نے، ریاست کے باشندوں کی توثیق سے مشروط کیوں کیا تھا؟ اور کیا توثیق الحاق کی وہ شرط ابھی تک محتاج تکمیل نہیں ہے؟ لہٰذا ریاست ہندوستان کا حصہ نہیں ہے، بلکہ یہ بدستور خود مختار حیثیت کی حامل ریاست ہے۔

سیکیورٹی کونسل میں ریاست کی حیثیت

جموں کشمیر کی قانونی اور آئینی حیثیت سے متعلق، ہندوستان کے موقف کا، بین الاقوامی کسوٹی پر جائزہ بھی ضروری ہے۔ سیکیورٹی کونسل میں جموں کشمیر کا معاملہ پیش کرنے سے قبل، ہندوستان نے اپنی افواج کو داخل کرنے کا جواز صرف قبائلی لشکر کے کشمیر میں حملہ اور ریاستی عوام کے دفاع کا ظاہر کیا اور امن قائم ہوتے ہی افواج کے ریاست سے انخلا کا عہد کیا۔ پہلی ٹیلی گرام بروز ۲۷؍اکتوبر بروز یر اعظم پاکستان کو ارسال کی، اس کے دوسرے روز ۲۸؍اکتوبر سے ۳۱؍دسمبر تک دونوں وزرائے اعظم، انڈیا و پاکستان کے درمیان ستائیس ٹیلیگرامز اور دو خطوط کا تبادلہ ہوا، اور پاکستان کو تسلی دی جاتی رہی اور ساتھ ہی ہندوستان کے بھاری اسلحہ، ٹینکوں اور فضائی فورس کے استعمال سے آزاد کشمیر ریگولر فورس، جو صرف درہ کی بنی سنگل گولی والی بندوق اور دشمن فوج سے چھینے ہوئے اسلحہ اور مقامی باشندوں کی معاونت سے، ہندوستان کی فوج کو شکست دے کر پیش قدمی کر رہی تھی۔ اس سے خوفزدہ ہو کر، ہندوستان نے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں، پاکستان پر حملہ آوروں کی اعانت اور جارحیت کے الزام کے تحت پیش کر دیا۔ نہایت چالاکی سے حکومت آزاد کشمیر اور اس کی مقامی ریگولر چالیس بٹالین، دوسری جنگ عظیم کے بعد ریٹائرڈ جوانوں پر مشتمل فورس کا تذکرہ کیے بغیر، صرف قبائلی لشکر اور پاکستان فوج کے خلاف الزام تراشی کی۔

پاکستان نے اپنے جواب دعوٰی، جو تین دستاویزات پر مشتمل ہے، میں اصل ذمینی حقائق مع دستاویزی ثبوت کے پیش کئے۔ ہندوستان کی نمائندگی گوپال سوامی آئینگر، بحیثیت لیڈر اور شیخ محمد عبداللہ بحیثیت ڈپٹی لیڈر انڈیا کر رہے تھے۔ ۱۵ رجنوری ۱۹۴۸ء کی تقریر میں، آئینگر نے جموں کشمیر پر ہندوستان کا موقف پیش کیا کہ **"ریاست جموں کشمیر کے باشندوں کو یہ اختیار اور حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے رکھیں، پاکستان سے الحاق کریں یا ریاست کی حیثیت خود مختار رکھ کر جموں کشمیر کو اقوام متحدہ میں رکن مقرر کریں"**۔ اس بیان میں ریاست جموں کشمیر کی خود مختار حیثیت، ریاست کے باشندوں کے اختیار اور حق رائے دہی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں مہاراجہ کی کسی طرح کی حیثیت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی شیخ عبداللہ کے جموں کشمیر کا لیڈر ہونے کا دعوٰی ہے۔ گوپال سوامی آئینگر اور چوہدری ظفر اللہ نے، اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے، ۲۷ رجنوری اور ۶ رفروری کو تحریری طور پر، ریاست میں استصواب رائے کرانے کی تجاویز سیکیورٹی کونسل میں پیش کیں۔ جن کی بنا پر ۲۱ راپریل کو سیکیورٹی کونسل نے استصواب رائے سے متعلق مفصل قرارداد نمبر (۴۷) اتفاق رائے سے منظور کی۔ اس قرارداد کے منظور ہونے پر مہاراجہ کے نام نہاد، فرضی اور جعلی الحاق نامہ کی رہی سہی حیثیت بھی ختم ہوگئی۔ یو این کمشن نے ریاست کے تمام حصوں کا دورہ کر کے ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء کو معاہدہ جنگ بندی، حکومت آزاد جموں کشمیر کی حیثیت اور عوام کے اختیار، افواج کے انخلا اور دیگر تمام متعلقہ امور کی نسبت قرارداد منظور کی۔ جنگ بندی پر عملدرآمد کے بعد، یو این کمشن نے استصواب رائے سے قبل، افواج کے انخلا، ریاست کو متحد کرنے، آزاد کشمیر افواج کے تعین کے علاوہ، دیگر متعلقہ امور سے متعلق قرارداد ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی۔ اس کے بعد ہندوستان نے استصواب رائے میں ناکامی کے خطرہ کو بھانپتے ہوئے، استصواب رائے کو غیر مؤثر کرنے کی حکمت عملی اختیار کر کے، اپنے زیر قبضہ علاقہ میں دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کرانے کا قدم اٹھایا اور ریاست کے جزوی حصہ میں، یکطرفہ، بلا مقابلہ انتخاب کو، رائے شماری کے متبادل کا منصوبہ بنایا۔ جس پر انتخاب اور اسمبلی کے خلاف پاکستان نے عذر اٹھایا۔ چنانچہ سیکیورٹی کونسل نے اتفاق رائے سے، قرارداد نمبر ۹۱ میں ۳۰ رمارچ ۱۹۵۱ء کو نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل اور نام نہاد دستور ساز اسمبلی کی حیثیت کو، مسترد کرتے ہوئے قرار دیا، کہ ریاست یا اس کے کسی حصہ سے متعلق، کسی سیاسی جماعت یا اسمبلی کو، سیکیورٹی کونسل اور یو این کمشن کی متذکرہ بالا قراردادوں کے نقیض، ریاست یا اس کے کسی حصہ کو، کسی ملک کا حصہ بنانے یا منسلک کرنے کا اختیار نہیں ہے اور نہ اسے تسلیم کیا جائے گا۔ ہندوستان نے دوسری بار نام نہاد اسمبلی کے ذریعے ہندوستان سے الحاق کی توثیق کی قرارداد منظور کرائی۔ یہ قرارداد ۱۹۵۶ء میں پاس کی گئی تھی۔ اس قرارداد کے خلاف پاکستان کے عذر پر، سیکیورٹی کونسل نے قرارداد نمبر ۱۲۲ منظور کردہ ۲۴ رجنوری ۱۹۵۷ء کے تحت ۳۰ رمارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد کے

متن کا حوالہ دیتے ہوئے اور سیکیورٹی کونسل اور یو این کمشن کی جملہ قراردادوں سے متصادم، متضاد اور نقیض قرار دے کر، اسمبلی کی قرارداد کو بدوں اختیار کالعدم قرار دے دیا۔ اب تک سیکیورٹی کونسل کے ایجنڈہ پر، مسئلہ جموں کشمیر جوں کا توں، استصواب رائے زیرِ نگرانی سیکیورٹی کونسل، حل طلب ہے۔ اس پس منظر میں جب اختیارِ حکمرانی ختم ہونے کے باوصف، مہاراجہ جموں میں رسمی طور پر موجود تھا۔ ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف شیخ عبداللہ، جو وزیرِاعظم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، دونوں مہاراجہ کا وجود ختم کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ ہندوستان ریاست پر مستقل تسلط قائم رکھنے کی نیت سے اقوامِ متحدہ، پاکستان اور ریاست کے عوام کو دھوکہ دینے اور اپنے وعدوں سے انحراف کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ چنانچہ اس نے شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کو، پنڈت نہرو، جس پر شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو اندھا اعتماد تھا، کے ذریعہ ریاست کو مکمل یا اندرونی خودمختار حیثیت سے رکھنے کا جھانسہ دے کر، ریاست کو عبوری طور پر، ہندوستان کے مجوزہ آئین کے تحت ہندوستان کا حصہ ظاہر کرنے پر قائل کرلیا۔

آرٹیکل ۳۷۰ کی آئینی حیثیت

ہندوستان کی دستور ساز پارلیمنٹ نے، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ڈومینین سٹیٹس میں آزادی حاصل کر کے، اپنا دستور تیار کرنا شروع کیا۔ دو سال کے بعد ۱۹۴۹ء میں، گوپال سوامی آئینگر، جو مسئلہ جموں کشمیر پر سیکیورٹی کونسل میں مستقل نمائندہ ہندوستان کی حیثیت سے، جموں کشمیر ریاست کی خودمختار حیثیت تسلیم کرتے ہوئے، ریاست میں استصواب رائے کی تجویز پیش کر کے، استصواب رائے اور ریاست کے باشندوں کا حق خودارادیت بیان چکے تھے۔ انہوں نے دستور ہندوستان کا، دستور ساز اسمبلی میں حتمی منظوری کا ڈرافٹ پیش کیا۔ اس مرحلہ پر جبکہ جموں کشمیر ریاست سے متعلق، سیکیورٹی کونسل اور یو این کمشن کی متفقہ قراردادیں منظور ہو چکی تھیں اور ہندوستان ان کو بطور فریق تسلیم کر چکا تھا، استصواب رائے میں ناکامی سے بچنے اور ریاست کے ایک حصہ پر ناجائز قبضہ کو قائم رکھنے کی نیت سے، معزول اور اختیار سے محروم مہاراجہ سے، ریاست کا دستور ۱۹۳۹ء موجود ہوتے ہوئے، اس کو ریاست میں مزید جمہوری شکل دینے کیلئے، ۵ رمارچ ۱۹۴۸ء کو نیشنل اسمبلی کے قیام کا نوٹیفکیشن جاری کروایا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے ۲۰ رجون ۱۹۴۹ء کو کرن سنگھ، اپنے بیٹے کو حکومت سپرد کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کیا اور خود سبکدوش ہو گیا۔ حالانکہ وہ معاہدہ امرتسر ساقط ہوتے ہی، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے دن، سبکدوش ہو چکا تھا اور انڈین کانگریس کا ہی، یہ موقف، قانونی حیثیت والیان ریاست حیدرآباد، جوناگڑھ اور مناوادر میں اپنایا گیا تھا۔ پروگرام کے تحت ہندوستان کا آئین ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء، کے دن نافذ ہونا تھا، لہٰذا گوپال سوامی آئینگر کی تجویز پر کہ، گوکہ ریاست کا مستقبل، اس کے باشندوں نے استصواب رائے سے طے کرنا تھا اور مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں موجود تھا۔ تاہم ریاست کو عبوری طور

پر ہندوستان کی یونٹ کے طور پر دستور میں شامل کرنا تجویز کیا گیا۔ اس تجویز کی سردار پٹیل اور دیگر اراکین نے تائید کی، چنانچہ دستور میں آرٹیکل ۳۷۰ شامل کر لیا گیا۔ اس وقت ریاست کے آئین ۱۹۳۹ء کے تحت ریاست کی الگ حیثیت تھی۔ ہندوستان کی آئین سازی میں، ریاست کے عوام کی کوئی نمائندگی نہ تھی۔ ہندوستان نے خود ہی ریاست کو ہندوستان کا حصہ بنالیا۔ مہاراجہ کی طرف سے جعلی اور فرضی الحاق نامہ، جس کی حیثیت کا ذکر ہو چکا ہے، اسی کو بنیاد بنا کر، آرٹیکل ۳۷۰ دستور ہندوستان میں شامل کیا گیا۔ صدارتی حکم ۱۹۵۴ء کے تحت، دہلی معاہدہ ۱۹۵۲ء کی روشنی میں، آرٹیکل ۳۵-اے کا ہندوستان کے دستور میں اضافہ کیا گیا تھا۔ آرٹیکل ۳۷۰ کی حیثیت محض عبوری تھی، جس کے تحت تین شعبوں (۱) دفاع، (۲) امور خارجہ، (۳) کمیونیکیشن کو (ریاست میں استصواب رائے کے حتمی نتیجہ تک) عبوری طور پر تحفظ دیا گیا تھا۔ بقول سردار پٹیل، یہ آرٹیکل ہندوستان اور ریاست کے مابین ایک عبوری تعلق تھا۔ آرٹیکل ۳۵-اے، حکومت ہندوستان اور شیخ عبداللہ کے درمیان، معاہدہ دہلی ۱۹۵۲ء کے نتیجہ میں، ۱۹۵۴ء میں ہندوستان کے دستور میں شامل کیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی حکومت ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو بغاوت کے الزام میں ختم کر دی گئی تھی۔ فرضی الحاق نامہ اور معاہدہ دہلی ۱۹۵۲ء، دونوں انفرادی حیثیت میں کیے گئے تھے۔ ریاست جموں کشمیر اور اس کے عوام ان کے پابند نہ ہیں اور نہ تھے۔ عوام ان معاہدوں سے ہمیشہ لاتعلق و مخالف رہے۔

مہاراجہ کے جس الحاق نامہ کو آرٹیکل ۳۷۰ دستور میں عبوری طور پر شامل کرنے کی، جواز یت بنایا گیا، اسی الحاق نامہ کے ساتھ شامل خط کی ضمن نمبر ۷ میں شرط تحریر ہے کہ، اس الحاق نامہ کے تحت مہاراجہ (یعنی ریاست کے عوام) ہندوستان کے مجوزہ مستقبل کے دستور (جو اس وقت زیر غور اور زیر بحث تھا) کا پابند نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ، اس وقت جموں کشمیر کی دستور ساز اسمبلی بھی وجود میں نہ آئی تھی۔ یہ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وجود میں آئی۔ نیا دستور جموں کشمیر ۲۶ رجنوری ۱۹۵۷ء کے دن سے نافذ العمل ہوا، جبکہ ہندوستان کا دستور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۱ء کے دن سے نافذ ہوا تھا۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ آرٹیکل ۳۷۰ کو نام نہاد مہاراجہ اور ریاست کے عوام کی حمایت اور تائید حاصل نہ تھی، روز اول سے یہ دھوکہ، فریب اور جھوٹ پر مبنی تھا۔ ہندوستان ریاست جموں کشمیر کو زبردستی ہتھیانے اور ہندوستان کے تسلط میں لانے کے لئے شروع سے سازش کرتا رہا ہے۔ اس نے برطانوی حکومت کی منتقلی اقتدار کی پالیسی اور قانون آزادی ۱۹۴۷ء، جس کے تحت والیان ریاستوں کا اختیار حکمرانی ختم ہوا اور ریاستوں میں عوام کو آزادی اور خود مختار حیثیت حاصل ہوئی۔ انگریز وائسرائے پر اثر انداز ہو کر، ماضی کے قانون ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ریاستوں کے الحاق کی پالیسی نافذ کروائی۔ تقسیم کی طے کردہ پالیسی کے خلاف پنجاب کے مسلمان اکثریتی آبادی کے ضلع گورداسپور کو، ریاست میں ہندوستان کو مداخلت کی سہولت کے طور پر ہندوستان میں شامل کروایا اور

وائسرائے اور مہاتما گاندھی کے اثر رسوخ کو، اپنے حق میں الحاق کے لئے استعمال کیا۔ انگریز فوج اور جرنیلوں کو کشمیر کی جنگ میں استعمال کیا۔ ہندوستان، پاکستان میں تعینات انگریز، کمانڈر ان چیف اور دونوں افواج کے انگریز سپریم کمانڈر ان چیف نے، ہندوستان کی فوج کو ریاست میں مکمل پسپائی سے بچانے اور آزاد فوج کے زیر قبضہ علاقہ کو ہندوستان کے سپرد کرنے کی حکمت عملی تیار کی اور سکیورٹی کونسل میں ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو ٹروس ایگریمنٹ کے تحت فوری جنگ بندی پر عمل کرنے کے بجائے یکم جنوری ۱۹۴۹ء کے دن عمل شروع کیا۔ گزشتہ چار ماہ میں جموں کے مغرب میں اکھنور سے بھمبر کے مشرق کوٹلی موئیل گاؤں تک، نوشہرہ سے راجوری، پونچھ شہر کے گرد تمام علاقہ مع تحصیل مینڈھر اور لداخ میں ہیڈ کوارٹر لیہہ جو محاصرہ میں تھا، چند اور دیگر تمام ملحقہ علاقہ جات، جو آزاد افواج کے قبضہ میں تھے، ان تمام علاقوں پر جو ریاست کا نصف تھے، ملی بھگت سے ہندوستان کا قبضہ کروا دیا۔

یکم جنوری کی جنگ بندی کے بعد، اول ہندوستان نے شیخ عبداللہ کو، ریاست میں حکمرانی کی اجارہ داری کی شہ دے کر اور بعد میں دوسرے اقتدار کی ہوس کے حامیوں اور پجاریوں کو، یکے بعد دیگرے استعمال کر کے، ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی، اس کی جوازیت کے لئے ریاست میں انڈین کانگریس منظم کی، جس کی تقلید میں ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی ریاست میں تنظیم سازی شروع کر دی، جن میں بھارتی جنتا پارٹی سرفہرست ہے۔ اس کے آخر میں ہندوستان کی کانگریس اور شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس اور مفتی سعید کی پی ڈی پی اور بھارتی جنتا پارٹی اور نیشنل کانفرنس اور کبھی بی جے پی اور پی ڈی پی کی مخلوط حکومتیں قائم ہوتی رہیں، جس سے ہندوستان کے حکمرانوں کو ریاست کے اندرونی معاملات میں براہ راست مداخلت اور پالیسی سازی کے مواقعات بتدریج حاصل ہوتے رہے۔

پاکستان کی کشمیر پالیسی اور اس میں بتدریج کمزوری اور پسپائی کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح آزاد جموں کشمیر میں اختیارات سے محرومی، حکومتی محدود اقتدار کی ہوس میں خوشامد اور منافقانہ حب الوطنی کا معمول، جس کے نتیجہ میں آزاد کشمیر میں پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی تنظیم اور حصول اقتدار جیسے حقائق نے جدوجہد آزادی میں حیران کن دراڑیں ڈال دیں۔

پاکستان میں ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۹ء میں دستور مسترد اور معطل کر کے، فوج نے مارشل لا کے نفاذ کے تحت ملک پر قابض ہو کر، ہندوستان سے مصالحانہ پالیسی کے تحت، مسئلہ کشمیر کے حل میں سکیورٹی کونسل کی زیر نگرانی، استصواب رائے کروانے کی روش بدل کر ماضی کی پالیسی کے برعکس، سکیورٹی کونسل میں مسئلہ اٹھانے میں نیم دلی دکھائی جانے لگی تھی۔ سندھ طاس معاہدہ جو ۱۹۶۰ء میں جنرل ایوب خان نے کیا، اس کے تحت جموں

ہندوستان کے ناجائز، عارضی تسلط کو بالواسطہ، جائز اور مستقل تسلیم کر کے، اس کو اپنے زیر قبضہ دریاؤں سے بجلی پیدا کرنے اور پانی استعمال کرنے کا اختیار دے کر، ہندوستان کے قبضہ کو تقویت دی۔

۱۹۶۶ء میں اعلان تاشقند میں، عمداً مسئلہ کشمیر کا ذکر نہ کیا گیا، جس کا فائدہ انڈیا کو ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں معاہدۂ شملہ میں تو مسئلہ کشمیر کی قریب قریب ہیئت ہی بدل دی گئی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی بجائے ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ بندی لائن کو تسلیم کیا گیا اور جنگ بندی لائن کو بدل کر لائن آف کنٹرول کا نام دیا گیا، یعنی ریاست میں ہندوستان اور پاکستان کا کنٹرول۔ جموں کشمیر میں ایک طرف آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵-اے کے تحت جموں کشمیر کے عوام کے کنٹرول و حیثیت اور دوسری طرف پاکستان کے دستور میں، جموں کشمیر سے متعلق آرٹیکل ۲۵۷ اور یواین کمشن کی قرارداد ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء میں ریاست کے آزاد علاقہ میں قائم عوامی حکومت، آزاد ریاست جموں کشمیر کی اس علاقہ میں انتظام و انصرام کو معدوم قرار دے کر، ریاست میں ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف پاکستان کا کنٹرول تسلیم کر لیا گیا۔ سندھ طاس معاہدہ کے بعد شملہ معاہدہ ریاست کی باہمی تقسیم کی تیسری کڑی تھی۔ پہلی کڑی جنوری ۱۹۴۹ء میں حد جنگ بندی کا تعین تھی، اس کی توثیق، استصواب رائے زیر نگرانی سیکیورٹی کونسل کے بجائے ہندوستان پاکستان کے مابین مذاکرات کے ذریعہ مسئلہ حل کرنے کی شق شامل کر کے، کر دی گئی، اس سے ہندوستان کو مزید تقویت ملی۔ ۲۰۰۶ء میں اسلام آباد میں سارک کانفرنس میں، ۴ جنوری کو انڈیا پاکستان کے مابین اعلامیہ کے تحت ہونے والے مذاکرات میں، جنرل پرویز مشرف نے، مسئلہ کشمیر کے حل میں out of box حل کی تجویز پیش کر دی، جس کا ایجنڈا چار نقاط پر محیط تھا۔ جموں کشمیر میں ہندوستان کے ہمنوا گروپ نے بھی اس کی حمایت کی، مگر سنجیدہ دانشور قیادت نے، اس کی حمایت سے انکار کر دیا۔ یہ تجویز چند سفری اور تجارتی سہولتوں پر مبنی، ریاست کی تقسیم کی تجویز تھی، جو ناکام ہوئی۔ پاکستان کی سول حکومتوں نے بھی ہندوستان سے یکے بعد دیگرے، جس قدر بھی مذاکرات کیے، ان کا دائرہ کار بھی تقسیم ریاست تک ہی محدود رہا، جن کا مقصد کچھ مزید مسلم آبادی کا علاقہ حاصل کرنا تھا، جس میں وادی کشمیر، پونچھ اور راجوری شامل تھا، مگر اسے تسلیم نہ کیا گیا۔ ایک اور اہم واقعہ پاکستان پر دہشت گردی کے الزام کا تھا، بالخصوص نیویارک امریکہ میں ۹/۱۱ کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا الزام اسامہ بن لادن، ایک سعودی اور اس کے ساتھیوں پر لگایا گیا۔ وہ ان دنوں افغانستان میں تھا، چنانچہ امریکہ نے افغانستان میں فوج اتار دی اور اس خطہ میں نئی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ پاکستان امریکہ کی حمایت میں فریق تو بن گیا، مگر باہمی اعتماد کی کمی رہی۔ اس مہم میں ایک تو پاکستان خود سخت دہشت گردی کا شکار رہا، دوسری طرف پاکستان کی فوج پر دہشت گردی کے تربیتی کیمپ قائم کرنے اور دہشت گردوں کو پناہ گاہیں مہیا کرنے کے الزام کا سامنا رہا۔ ہندوستان نے اس کا بھی فائدہ اٹھایا، مگر سب سے زیادہ نقصان یہ

ہوا، کہ متذکرہ بالا حالات وواقعات کے اثر میں، جموں کشمیر کا مسئلہ پس پردہ چلا گیا۔ بین الاقوامی حالات تبدیل ہو گئے۔ بااثر ممالک کی پالیسی میں تبدیلی آ گئی۔ ہندوستان پاکستان کے درمیان مسئلہ کشمیر خالصتاً زمین کے تنازعہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور ہندوستان کی تقسیم کے اصول پر، پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد، جموں کشمیر کی تقسیم ہی مناسب طے ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے مسئلہ کے مستقل حل کو دونوں ممالک کی باہمی صوابدید کے تابع کر دیا۔ بین الاقوامی فورم پر جب کبھی اُن سے جموں کشمیر سے متعلق بات کی جاتی، تو جواب ملتا کہ یہ مسئلہ ہندوستان اور پاکستان نے باہمی طور پر حل کرنا ہے۔

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ جموں کشمیر میں دستور ۱۹۳۹ء نافذ تھا، جس میں اختیار حکمرانی مہاراجہ کو حاصل تھا، جو قانون آزادی کے نفاذ پر ساقط ہو چکا تھا۔ تحریک آزادی کے حق میں شروع کی گئی مسلح جدوجہد اور مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں پیش ہونے اور جنگ بندی کے بعد ریاست بٹ چکی تھی۔ استصواب رائے میں عوامی صوابدید کے خطرہ کو بھانپتے ہوئے، ہندوستان اور شیخ عبداللہ نے اپنے زیر تسلط حصہ میں قومی اسمبلی قائم کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے لئے مہاراجہ سے ۵/مارچ ۱۹۴۸ء کو نوٹیفکیشن جاری کروایا۔ مہاراجہ کو ۱۹/جون ۱۹۴۹ء کو جلاوطن کر کے، ڈاکٹر کرن سنگھ، اس کے بیٹے کو صدر ریاست بنا کر اس سے قومی اسمبلی کے قیام کا نوٹیفکیشن ۲۰/اپریل ۱۹۵۱ء کو جاری کروایا۔ قومی اسمبلی کو اس نوٹیفکیشن کے تحت دستور ساز اسمبلی کی حیثیت دے دی گئی، چنانچہ نیا دستور سابقہ دستور میں ترامیم کے بعد، ۱۷/نومبر ۱۹۵۶ء کو مرتب ہونے پر دستور ساز اسمبلی ساقط ہو گئی اور نیا دستور ۲۶/جنوری ۱۹۵۷ء کے دن سے نافذ ہوا۔ دستور میں شروع میں صدر ریاست اور وزیراعظم کے عہدے مقرر تھے، بعد میں ترمیم کر کے ان کو گورنر اور چیف منسٹر کے عہدوں میں بدل دیا گیا۔ گورنر کے چناؤ کے بجائے تقرری کا اختیار ہندوستان نے حاصل کر لیا۔ جنتا پارٹی نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد، ریاست کو حتمی طور پر ہندوستان میں مدغم کرنے کا سیاسی منصوبہ بنایا۔ ریاست میں اسمبلی کے انتخابات میں تمام وسائل جھونک کر، جائز ناجائز ذرائع استعمال کر کے، کچھ سیٹس حاصل کر کے، کشمیر کی مقامی جماعت پی ڈی پی کی شراکت میں ریاست میں حکومت بنالی۔

ہندوستان نے عالمی، بین الاقوامی حالات اور پاکستان کی سست، کمزور کشمیر پالیسی کی روشنی میں، ریاست کو مدغم کرنے کے منصوبہ پر عمل کرتے ہوئے، عالمی سفارت کاری شروع کر دی۔ مشرق وسطیٰ میں مسلم ممالک، یورپ اور امریکہ حتیٰ کہ چین کو ہندوستان میں صنعتیں اور تجارتی رعائتیں دے کر سرمایہ کاری کروائی۔ ان ممالک میں روس، افغانستان اور ایران پہلے سے ہندوستان سے تجارت میں پسندیدہ فوقیتی حیثیت کے حامل تھے۔ ایک رائے یہ بھی ہے، کہ ان تمام ممالک سے پیشگی مشاورت اور مفاہمت سے ہندوستان نے ریاست کے ادغام کا قدم اٹھایا۔ اگر،

کوئی ملک یا عوام اس سے بے خبر تھے، تو وہ صرف جموں کشمیر کے عوام تھے۔ ہندوستان نے پہلے اپنے حمایتی گورنر کا تقرر کیا، مخلوط حکومت ختم کی، ریاست کی اسمبلی توڑ دی۔ جولائی ماہ کے آخری ہفتہ میں، جموں کشمیر میں آنے والے تمام غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاحوں، تاجروں اور امرناتھ کے یاتریوں کو تین اگست سے قبل، ہر صورت ریاست سے نکل جانے کا ہنگامی حکم جاری کیا، جسے بار بار نشر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مزید سپیشل تربیت یافتہ فوجی دستے ریاست میں ارسال کرنے شروع کر دیے۔

۵/اگست ۲۰۱۹ء سے قبل، ماضی کے سنہرے ادوار سے مستفید ہونے کے عادی جموں کشمیر کے عوام، سلطان شہاب الدین کی وسیع ترفتوحات اور سلطان زین العابدین المعروف بڈھ شاہ کے ترقی میں عروج کے سنہری ادوار کے بعد، متواتر آزمائشوں سے گزرتے رہے۔ جدید دور سے قبل پنجاب کے ضلع کانگڑہ سے نقل مکانی کر کے، جموں میں آباد ہونے والے خاندان کے گلاب سنگھ اور اس کی جانشین نسل کے جبر کے کئی سال، ریاست کے عوام مظلوم رہے۔ آخر میں جاتے جاتے ہری سنگھ ریاستی عوام پر ہندوستان کو مساط کر گیا اور اس کار غلامی میں ہوس اقتدار میں اجارہ داری کے حامل، خود ریاست کے اندر سے ہندوستان کو میسر آتے رہے۔ جولائی ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں عوام نے جانوں کی قربانی جو لاکھوں میں شمار ہوتی ہے، کے علاوہ مسلسل اذیت میں آزادی کی جدو جہد جاری رکھی۔ ۵/اگست کو ہندوستان کے وزیر اعظم نے اکیسویں صدی، جو انسانوں کی آزادی اور انسانی حقوق کی محافظ روشن صدی ہے، کے انیسویں سال میں جموں کشمیر کے عوام کو ہندوستان کی غلامی کے اندھیروں میں دفن کرنے کا اقدام کیا۔ ہندوستان کی آزادی کے قد آور راہنماؤں کے، جموں کشمیر میں استصواب رائے کروانے کے بین الاقوامی وعدوں سے انحراف، ہندوستان کے دستور میں ہمنوا کشمیری عوام کے خصوصی امتیازی حقوق اور حیثیت کے تحفظ کی ضمانت کو جس طرح پامال کر کے اور بدوں اختیار ریاست کے دستور کو مسترد کر کے، ریاست کو مزید بانٹ کر لداخ کو مرکز کے ماتحت کیا اور بقیہ ریاست کو تین ڈویژن میں انتظامی حیثیت میں تقسیم کر کے، اپنے طور پر انڈین یونین میں ضم کیا اور پورے جموں کشمیر کے عوام کو بلا استثنیٰ گھروں میں بند کر کے، ان کے تمام دنیا سے تمام رابطے منقطع کر دیے اور عرف عام میں، مکمل لاک ڈاؤن نافذ کر کے، ایک کروڑ سے زائد انسانوں کو، تنہائی کے اندھیروں میں قید کر دیا۔ انسانی تاریخ میں اس سے قبل نازی ہٹلر کا صرف ایک کارنامہ ملتا ہے، مگر وہ تو جنگ عظیم کے دور کا واقعہ ہالوکاسٹ ہے، اس صدی میں جموں کشمیر کے عوام کا ہالوکاسٹ، ہندوستان کے نام اور اس کی جمہوریت اور آزادی کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ ریاست میں لاک ڈاؤن کی سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے، اس کا اختتام و انجام بدستور جبر اور ظلم کے اندھیروں میں گم ہے۔ عوام بالخصوص نوجوان بچے اور بچیاں جبری لاک ڈاؤن وادغام کے

خلاف اور آزادی کے حق میں سراپا احتجاج، گلیوں اور سڑکوں پر موج در موج نکلتے ہیں، جن کو گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید اور زخمی کر دیا جاتا ہے۔ متعدد نوجوان گرفتار، ہندوستان کے دور دراز عقوبت خانوں میں سخت تشدد کا نشانہ بن رہے ہیں۔ وزیراعظم نریندر مودی نے ہندوستان کے نام نہاد سیکولر اور دنیا کی بڑی جمہوریت کہلانے کے دعووں کا پردہ چاک کر کے، اکھنڈ بھارت کے اصل چہرہ کو بے نقاب کر دیا اور محمد علی جناح کے نظریۂ پاکستان کو درست ثابت کر دیا ہے۔ ہندوستان میں دانشور ہندوؤں کو قائداعظم کی سیاسی بصیرت سے اتفاق کرنا پڑا ہے اور انہوں نے اپنے بیانات میں اس کی تائید کی ہے۔

جموں کشمیر کے ہندوستان میں ادغام پر عالمی ردعمل

جموں کشمیر ریاست کے تمام حصوں میں عوام کا ہندوستان کے خلاف شدید غم وغصہ اور احتجاج ایک لازمی امر تھا۔ ریاست میں غیر مسلم اور مسلمانوں میں مخصوص اقتدار پرست طبقہ، جس کے لئے بطور خصوصی حیثیت انڈین دستور میں آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵-اے کو شامل کیا گیا تھا، اس کے ہندوستان پر اعتماد کو خصوصاً بہت بڑا جھٹکا لگا۔ اس پہ مزید زیادتی یہ کہ لاک ڈاؤن اور کرفیو میں ان کو بدستور گھروں میں محبوس رکھا گیا ہوا ہے۔ لاک ڈاؤن اور کرفیو میں شدت کے نتیجہ میں، خبر رساں ایجنسیوں اور صحافیوں کی بھی ریاست میں داخلہ اور رپورٹوں پر پابندی عائد ہے، جدید ٹیکنالوجی کے ذرائع بھی منقطع ہیں۔ انسانی حقوق کی پامالی پر عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں نے شدید احتجاج کیا۔ اسی طرح بیرونی ممالک میں مقیم جموں کشمیر کے عوام نے بڑے بڑے احتجاجی مظاہرے کر کے دنیا کے پارلیمانی نمائندوں اور مجالس کو جموں کشمیر کے بھارت میں ناجائز اور جبری ادغام اور لاک ڈاؤن کی شدت پر متوجہ کیا، جس پر یورپی یونین، برطانیہ، امریکہ اور دیگر ممالک میں عوامی نمائندوں نے ہندوستان کے غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویہ اور عمل کی مذمت کی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

آزاد جموں کشمیر میں، شدید ردعمل کے طور پر بڑے بڑے احتجاجی مظاہرے کیے گئے، جو اب بھی متواتر کیے جا رہے ہیں۔ عوام سراپا احتجاج ہیں۔ حکومتی سطح پر مظاہروں کے علاوہ کل جماعتی کانفرنسیں، سیمینار، مباحثے منعقد ہوئے، قراردادیں منظور ہوئیں، قانون ساز اسمبلی کے خصوصی اجلاس ہوئے، جن میں وزیراعظم پاکستان نے بھی خطاب کیا اور ہندوستان کے اقدام کی مذمت کی۔ صدر حکومت اور وزیراعظم آزاد کشمیر نے یورپ اور برطانیہ میں کشمیری نوجوانوں اور اراکین پارلیمنٹ سے خطاب اور ملاقاتیں کر کے اپنا مؤقف پیش کیا۔ یہ مشق جاری ہے۔

پاکستان مسئلہ کشمیر میں سکیورٹی کونسل میں فریق ہے۔ مسئلہ کشمیر سے متعلق سوچ طلب نکتہ یہ ہے، کہ جموں کشمیر کی مسلمہ طور الگ خود مختار حیثیت، ہندوستان، پاکستان اور اقوام متحدہ میں، دنیا کے تمام ممالک نے تسلیم کر رکھی ہے اور یہ بھی تسلیم ہے کہ ریاست کے فیصلہ کا اختیار بھی صرف ریاست کے عوام ہی کو حاصل ہے، مگر ان کا اقوام متحدہ میں اپنا مؤقف پیش کرنے کا اختیار نہیں مانا جاتا۔ حالانکہ یواین او چارٹر میں ایسا اختیار موجود ہے۔ یہ عجیب بات بلکہ دوغلہ پن ہے۔ تاہم پاکستان کو فریق کی حیثیت میں، ہندوستان کے ریاست کے ادغام اور لاک ڈاؤن کے خلاف اسی روز سکیورٹی کونسل میں مسئلہ پیش کر کے، سکیورٹی کونسل کی سابق قراردادوں کی روشنی میں، ہندوستان کے غیر قانونی اقدام کو مسترد کرا کر، ریاست میں لاک ڈاؤن اور کرفیو ختم کروانا چاہیے تھا، مگر پاکستان نے ایسا کرنے سے، عمداً آج تک اجتناب کیا، یہ کیوں کیا؟ اس کی کوئی وضاحت یا جوازیت پیش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس وزیراعظم پاکستان نے مظفر آباد میں جلسہ عام اور اسمبلی میں اپنے خطاب میں، ریاست کے عوام کو ان کے پیش کیے جانے والے لائحہ عمل تک صبر سے کام لینے کا فیصلہ سنایا۔ آج تک کشمیری اس فیصلہ کے منتظر ہیں، البتہ سکیورٹی کونسل کے بجائے وزیر خارجہ پاکستان نے، ریاست میں انسانی حقوق کی پامالی کا معاملہ جنیوا میں بین الاقوامی انسانی حقوق کی کونسل کے اجلاس میں پیش کیا، مگر حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رسمی قرارداد بھی منظور نہ کروا سکے، بلکہ ایک اطلاع کے مطابق اجلاس میں قرارداد پیش ہی نہ کر سکے۔ یہ ایک بڑی ناکامی تھی۔

ایک سال سے جموں کشمیر کے عوام لاک ڈاؤن کی کیفیت میں، دنیا سے مکمل منقطع، ہندوستان کی نو لاکھ فوج کے محاصرہ میں، جموں کشمیر ریاست کی جغرافیائی اور سیاسی وحدت اور مکمل آزادی کے نظریہ پر، ڈٹے ہوئے ہیں اور صبح و شام ہر گھر اور ہر گلی کوچہ میں آزدی کے نعرے گونج رہے ہیں۔ ہندوستان کے ماضی کے ہمنوا گروہ بھی، مخالفت میں شامل ہو چکے ہیں۔ اب ہندوستان کے خلاف تمام عوام مستعد اور متحد ہیں اور اس وقت ہندوستان کو ریاست کے تمام عوام کی مخالفت کا سامنا ہے۔ ہندوستان کا ریاست کی خصوصی الگ حیثیت ختم کرنے اور ریاست کو ہندوستان میں مدغم کرنے کا اقدام، اس وقت تک مکمل ناکام ہے، جس کا اعتراف ہندوستان میں بھی ہو رہا ہے۔

ہندوستان نے ۵ راگست ۲۰۱۹ء کو اول تو ریاست کو ہندوستان کے دستور میں ترمیم کر کے ہندوستان کا مستقل حصہ بنا لیا اور ساتھ ہی ریاست میں کرفیو اور لاک ڈاؤن نافذ کر دیا۔ ہندوستان کے لاک ڈاؤن اور کرفیو کے نفاذ کو بہ نسبت ریاست کے ہندوستان کا مستقل حصہ بنانے کے اقدام کو زیادہ تشہیر اور عالمی توجہ حاصل ہوئی۔ بالخصوص ریاست کے اندر تمام حصوں میں سخت ردعمل اور احتجاج کی بنا پر وادی کشمیر میں ریاست کی آزادی کے

حق اور ہندوستان کے خلاف احتجاجی مظاہروں میں شامل نوجوانوں کو آنسو گیس اور گولی چلانے کے نتیجہ میں قتل اور زخمی کرنے کے ہندوستانی فوج کے وحشیانہ رویہ نے عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں اور عوام کو کشمیر میں ریاستی تشدد کے خلاف متاثر کیا۔ چنانچہ ریاست کے ادغام کی نسبت کرفیو اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے انسانی حقوق کی پامالی، زیادہ عالمی تنظیموں اور حکومتوں کی توجہ کا محور بنی چلی آ رہی ہے۔ پاکستان میں بھی زیادہ تر انسانی حقوق کی پامالی کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں سیاسی اور سفارتی دانشوروں نے، جموں کشمیر کو ہندوستان میں مدغم کرنے کے ہندوستان کے اقدام کو مسترد کرتے ہوئے، جموں کشمیر، پاکستان کا حصّہ ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ اپنے مؤقف کی تائید میں ۵ راگست ۲۰۲۰ء کو پاکستان اور جموں کشمیر میں یوم استحصال منایا گیا۔ سارے ملک میں ریلیاں نکالی گئیں۔ وزیراعظم پاکستان نے مظفر آباد میں آزاد کشمیر اسمبلی میں خطاب کے دوران وزیراعظم ہندوستان کے ریاست پر جبر سے قبضہ کرنے اور عوام کو کرفیو میں محصور کرنے کی شدت سے مذمت کی اور ریاست کو ہندوستان کے تسلط سے جلد آزاد کروانے کا عندیہ دیا۔ پاکستان نے اسی دن پاکستان کا نیا نقشہ بھی مرتب کیا ہے، جس میں ریاست جموں کشمیر، ریاست جونا گڑھ اور سر کریک کے سمندری حصّہ کو ملک پاکستان کا حصّہ دکھایا گیا ہے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستان کا نیا نقشہ اقوام متحدہ میں بھی پیش کر کے تسلیم کروایا جائے گا، اس کو پاکستان کا سیاسی نقشہ کہا گیا ہے۔ لائن آف کنٹرول جو دراصل سیز فائر لائن ہے، وہ حذف ہے۔ اسی طرح آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی حدود حکمرانی اور نام ونشان غائب ہیں، یہ علاقے پاکستان کا حصّہ ظاہر کیے گئے ہیں، مگر عمران خان، وزیراعظم پاکستان نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے، جنگ کی پالیسی ختم کرنے اور صرف سیاسی پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس نے اسی پالیسی کو اپنا ویژن قرار دے کر زندگی بھر جموں کشمیر کو حاصل کرنے کی جدوجہد کو، جاری رکھنے کا عہد کیا ہے۔ بقول وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی، ہندوستان کے نئے نقشہ، جس میں ہندوستان کے آئین کے تحت، جموں کشمیر کو انڈین یونین کا حصّہ ظاہر کیا گیا ہے، اس کی نفی اور تردید میں پاکستان کا نیا نقشہ جاری کیا گیا ہے۔ اس صورت حال میں جموں کشمیر ریاست کے دونوں ملک دعویدار ہیں۔ دونوں ممالک کی افواج ریاست پر قابض ہیں، جبکہ لداخ کے شمال مشرق کے حصّہ اقصاء چن اور اس کے جنوب میں زائد از بارہ ہزار مربع میل علاقہ اور ہنزہ کے شمال میں سرحدی معاہدہ مابین چین و پاکستان ۱۹۶۳ء، چین ریاست کے کم وبیش پانچ ہزار مربع میل پر قابض ہے۔ حالیہ ہندوستان اور چین کے درمیان جو فوجی کشمکش جاری ہے، لداخ کا وہ حصّہ جموں کشمیر ریاست میں شامل ہے۔ پاکستان کے نقشہ میں لیہہ، صدر مقام لداخ کے مشرق میں وہ تمام علاقہ جو کم وبیش پندرہ ہزار

مربع میل پر مشتمل ہے اور اقصاء چن کا علاقہ شامل ہے، ظاہر نہیں کیا گیا۔ یہ بڑا ستم ہے، لداخ کا کل علاقہ ۴۶۹۶۱ مربع میل ہے جس میں سے سکردو اور سیاچن گلیشیر کا ۱۱۷۰۸ مربع میل اور گلگت کا ۲۷۶۸ ۱ مربع میل اور کم وبیش آزاد کشمیر کا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ پاکستان کے زیرکنٹرول ہے، بقیہ علاقہ ریاست ہندوستان کے زیرتسلط ہے۔ اب جب کہ پاکستان نے پوری ریاست کو ایک طرف تو پاکستان کا حصہ ظاہر کیا ہے اور ساتھ ہی ہندوستان کے زیرقبضہ علاقہ کو، متنازعہ علاقہ تابع تصفیہ بذریعہ استصواب رائے زیرنگرانی سیکیورٹی کونسل درج کیا ہے، ہندستان تو استصواب رائے سے مکمل منحرف ہے اور اس کی نولاکھ فوج اس علاقہ پر مورچہ بند ہے، ہندوستان کی فوج کو نکالنے کی ذمہ داری تو نقشہ پاکستان کے تحت پاکستان پر عائد ہوگئی ہے، مگر پاکستان نے جنگ کرنے کی پالیسی ترک کرنے کا اعلان کردیا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز ہے کہ ریاست جموں کشمیر تین مما لک، انڈیا، پاکستان اور چین میں عملاً تقسیم کرلی گئی ہے، جس کے صلہ میں پاکستان کے حق میں الحاق کے حامی سرینگر میں راہ نما علی گیلانی کو پاکستان کے اعلیٰ سول ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، جب کہ ایسے ہی سول ایوارڈ سے ہندوستان اپنے حمایتیوں کو بھی نوازے گا۔ چین سی پیک کی شکل میں رعائتیں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ جموں کشمیر کے عوام کی صدیوں پر محیط آزادی کی جدوجہد انفرادی مفادات اور اعزازات کی شکل میں، صلہ پر محیط کرنے کی سیاسی حکمت عملی کامیاب ہوتی ہے یا نہیں، اس کا دارومدار جموں کشمیر کے عوام کی روشن خیالی، بے لوث جدوجہد برائے وحدت ریاست اور مکمل آزادی پر منحصر ہے۔

تقسیم ریاست کی نشاندہی کی تائید مزید ایک غیر معمولی نقشہ پاکستان میں، ریاست جوناگڑھ پر از سرنو بہتر سال کے بعد دعویٰ کرنے سے بھی ہوتی ہے۔ جوناگڑھ اور مناوادر کی دو چھوٹی ہندو اکثریتی آبادی کے والیان، مسلمان نوابوں نے، اپنی ریاستوں کا الحاق پاکستان سے کیا، جو پاکستان نے ۱۵رستمبر ۱۹۴۷ء کو منظور کیا۔ ہندوستان نے ان پر قبضہ کر کے رائے شماری کے بعد ہندوستان کا حصہ بنا دیا۔ اب پاکستان نے جو نقشہ کے ذریعہ دعویٰ کیا ہے، دراصل جواز پیدا کرتا ہے، کہ اگر جوناگڑھ اور مناوادر کے نوابوں کا ہندو اکثریتی آبادی کا پاکستان سے الحاق درست تھا، تو پھر مہاراجہ ہری سنگھ جو مقابلتاً زیادہ بااختیار تھا، اُس کا جموں کشمیر ریاست کا ہندوستان سے الحاق جائز اور درست تھا اور یہی اب ہندوستان کا مؤقف ہے۔ جوناگڑھ اور مناوادر کے پاکستان سے الحاق کے بعد، ہندوستان کے جبری قبضہ کرنے کا مسئلہ پاکستان نے کشمیر پر اپنا مؤقف پیش کرتے ہوئے ۱۵رجنوری ۱۹۴۸ء کے دن سیکیورٹی کونسل میں اٹھایا تھا، مگر یہ معاملہ توجہ حاصل نہ کر سکا اور ختم ہوگیا۔ اب اس کو جموں کشمیر کے مسئلہ کے بالمقابل اٹھانا بے سود حکمت عملی ثابت ہوگی، بلکہ اس سے ہندوستان کے مؤقف کو تقویت

حاصل ہوگی۔ البتہ یہ دعویٰ شاید جموں کشمیر کی موجودہ تقسیم کے حق میں بہتر ثابت ہو۔

نیا نقشہ پاکستان کے آئین سے بھی متصادم ہے۔ پاکستان کا جغرافیائی حدود اربعہ، اول قانون آزادی میں برٹش انڈیا کی تقسیم کی حیثیت میں واضح طور پر درج ہے، اس کے بعد پاکستان کے دستور میں بیان کیا گیا ہے، جس میں جموں کشمیر شامل نہیں۔ اس کی مزید تائید دستور کے آرٹیکل ۲۵۷ سے کی گئی ہے۔ اس آرٹیکل کی حیثیت اور اثر کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ ریاست کے ہندوستان میں ادغام کے ردعمل میں، پاکستانی فوج کے چند ریٹائرڈ جرنیل اور بین الاقوامی امور میں ماہر سینئر صحافی، پاکستانی حکومت کو مشورہ دے رہے ہیں، کہ آزاد کشمیر اور گلگت کو پاکستان کے صوبے کی حیثیت دے کر، جموں کشمیر کے عوام کو پاکستان کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے اور ہندوستان کے زیر تسلط علاقہ کے عوام کے حصہ میں آنے والی پارلیمانی سیٹیں خالی رکھی جائیں۔ اس حکمت عملی کے تحت بقول ان کے، تمام ریاست پر پاکستان کا دعویٰ کامیاب ہوگا۔ وہ لوگ اس بات سے لاعلم ہیں، کہ یہ حکمت عملی ہندوستان نے ۱۹۵۰ء میں اختیار کر کے، اپنی پارلیمنٹ میں ریاست کے عوام کو نمائندگی دی تھی۔ اس وقت بھی جموں کشمیر اور لداخ کے علاقوں سے انڈین پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں وہ بحیثیت نمائندگان فعال ہیں، تاہم اس حکمت عملی سے ہندوستان ریاست کے عوام کی جدوجہد آزادی ختم نہ کر سکا۔ ہندوستان کا یہ اقدام قانون آزادی ۱۹۴۷ء، اور اقوام متحدہ میں اختیار کردہ واضح مؤقف اور سیکیورٹی کونسل کی مسلمہ قراردادوں سے متصادم اور ان کے مغائر ہونے کی بنا پر، قطعی ناجائز تھا اور ہے۔ اگر پاکستان ایسا اقدام کرے گا، تو وہ بھی ہندوستان کے برابر اور ہم پلہ، جموں کشمیر کے حق خودارادیت کے استعمال میں رکاوٹ کا برابر کا مجرم ہوگا اور ریاستی عوام کی ہمدردی اور حمایت سے محروم ہو جائے گا۔

حکومت آزاد ریاست جموں کشمیر، جو ۴ اور ۲۴ / اکتوبر کو ریاست کے عوام کی، اسمبلی کے منتخب نمائندہ کی قیادت میں قائم ہوئی، اس کی توثیق اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کی مرکزی جنرل کونسل نے کی اور اس کی نمائندہ حیثیت پاکستان نے اور اس کے بعد یو این کمشن نے ۱۳/ اگست ۱۹۴۸ء اور سیکیورٹی کونسل نے بعد میں متعدد قرار دادوں میں تسلیم کی ہے۔ یہ ۱۹۴۷ء میں پہلی عوامی انقلابی حکومت تھی۔ دوسری جانب مہاراجہ جو قانونی حیثیت کھو چکا تھا، جموں شہر اور اس کے گردونواح تک محدود ہو چکا تھا۔ آزاد حکومت ہی صرف ریاست کی جائز حکومت تھی۔ ۵/ اگست ۲۰۱۹ء کے بعد پوری ریاست میں ماسوا گلگت کے صرف آزاد کشمیر حکومت ہی ریاست کے عوام کی جائز نمائندہ حکومت ہے۔ ریاست میں واحد منتخب صدر، وزیر اعظم، سپیکر اسمبلی اور سپریم کورٹ کے ادارے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں آزاد کشمیر ریگولر فورس کی حیثیت مسلمہ ہے اور آزاد کشمیر کے دفاع کی ذمہ

داری آزاد فوج کی ہے۔ موجودہ ہنگامی حالات میں، جبکہ ہندوستان کے ریاست بڑے حصّہ پر جبر سے قبضہ کرنے، کرفیو اور محاصرہ کے تحت عوام کو قتل کرنے اور پابند سلاسل کر کے ان کی تحریک آزادی کو کچلنے کے سنگین عمل کے خلاف پاکستان نے اخلاقی، سیاسی اور سفارتی مدد تک خود کو محدود کر رکھا ہے۔ ایسی صورت حال میں آخری کشمیری کی شہادت کا انتظار کرنے کی بجائے، حکومت آزاد کشمیر کو خاموشی سے ایک لاکھ نوجوانوں پر مشتمل گوریلہ کمانڈو فورس منظم کر کے آزاد کشمیر ریگولر فورس کے نام سے قائم کر دینی چاہیے۔ سفارتی محاذ پر بیرونی ممالک میں مقیم جموں کشمیر کے نوجوانوں پر مشتمل تنظیمیں قائم کی جائیں۔ جموں کشمیر میں جو نوجوان آزاد کشمیر کا پرچم لہرا کر آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہیں، ان کی تربیت کا انتظام مقامی طور پر کیا جائے۔

جموں کشمیر کے عوام پر ہندوستان نے نو لاکھ فوج، ہندو مذہب اور قوم پرست دہشت گردوں کے منظم حملوں کی شکل میں مسلط کر رکھی ہے۔ یہ واقعات تمام دنیا اور اقوام متحدہ کے علم میں ہیں۔ ہندوستان کے خلاف ریاستی عوام کو حق دفاع اور تحفظ، یو این چارٹر اور قراردادوں کے تحت حاصل ہے۔ ہندوستان ریاست میں حملہ آور اور جارح کی حیثیت میں ہے، اس کو ریاست کے عوام کے کسی طبقہ کی حمایت حاصل نہ ہے۔ اس نے اپنے خلاف خود موقع فراہم کیا ہے، اس کا بروقت فائدہ اٹھانا لازمی ہے۔ ریاست کے عوام متواتر حالت جنگ میں ہیں۔ اپنے دفاع اور آزادی کے لئے وہ یو این چارٹر کے تحت، جنگ جاری رکھنے کے مجاز ہیں۔ ریاست کی آزاد حکومت اپنی آزادی کا مسئلہ یو این او میں پیش کر سکتی ہے، اس کو اختیار حاصل ہے۔

یو این چارٹر آرٹیکل ۳۵ (۲) کے تحت اقوام متحدہ کا نان ممبر ملک بھی سیکیورٹی کونسل اور جنرل اسمبلی میں اپنا مسئلہ پیش کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور دفاع کرنے کا مجاز ہے، جس کی مثال مسئلہ فلسطین ہے۔ فلسطینی جنرل اسمبلی میں کئی بار اپنا مسئلہ پیش کر چکے ہیں۔ انہوں نے تو اقوام متحدہ میں مبصر کی حیثیت بھی حاصل کر لی ہوئی ہے۔ حکومت آزاد کشمیر کی پوزیشن بدرجہا بہتر ہے۔ اس کی حیثیت مسلمہ ہے، اس کی ریاست کے ایک حصّہ میں حکومت ہے، اس کی فوج کی تنظیم کو بھی تسلیم کیا گیا ہوا ہے، اس کو ریاست میں غیر ملکی افواج سے انخلا اور ریاست میں استصواب رائے زیر نگرانی کی سیکیورٹی کونسل کروانے کے لئے استعمال کرنا سب کے مفاد میں ہے۔ جب استصواب رائے میں ریاست کی قیادت پر اعتماد کیا جاتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ حصول آزادی کے لئے ہندوستان کی جارحیت کے خلاف، عالمی سطح پر اس کو اپنی قومی آزادی کا موقف پیش کرنے اور حمایت حاصل کرنے پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور یہ اختیار استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔

پاکستان دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہے۔ پاکستان کی سرزمین کو سیراب کرنے والے بڑے دریاؤں

سندھ، چناب اور جہلم کے منبع ہندوستان کے زیر تسلط جموں کشمیر میں واقع ہیں۔ ہندوستان مقبوضہ جموں کشمیر میں متعدد بجلی گھر اور ڈیم تعمیر کر کے، پاکستان میں پانی کا بہاؤ کم کر رہا ہے۔ عالمی بنک بھی ثالثی میں کردار ادا کرنے میں پس وپیش کر رہا ہے۔ اس طرح پاکستان میں زراعت کا مستقبل مخدوش ہے۔ لہٰذا خود پاکستان کی اپنی بقا کے لئے، جموں کشمیر سے ہندوستان کا انخلا اشد ضروری ہے۔ پاکستان کی موجودہ جموں کشمیر پالیسی، خود پاکستان کے مستقبل کے لئے سنگین خطرہ کی غماز ہے۔ ہندوستان کے اکھنڈ بھارت کی تکمیل کے راستہ میں، پاکستان بہت بڑی رکاوٹ ہے، جس وجہ سے ہندوستان نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو الگ کرنے میں کردار ادا کیا۔ اس کے بعد بلوچستان میں اور افغانستان کے ملحق صوبہ خیبر پختونخوا میں تخریب کار علیحدگی پسند تنظیموں کی ہندوستان اعلانیہ حمایت کر رہا ہے۔

پاکستان کے امور خارجہ کا عملہ اور سفارتکار، ہندوستان کے اس مجرمانہ کردار کو، عالمی سطح پر اجاگر نہیں کر پا رہے، یہ مصالحانہ خارجہ پالیسی کا ثبوت ہے۔ سیکیورٹی کونسل کی عارضی رکنیت کی نشست کے انتخاب میں، گذشتہ سال پاکستان نے دیگر دوست ممالک کے ساتھ، ہندوستان کی بطور امیدوار حمایت کر کے، اس کو دو سال کے لئے سیکیورٹی کونسل کا رکن منتخب کروا دیا ہے۔ اس سال ۱۳ جولائی کو جب جموں کشمیر کے عوام ریاست میں اور عالمی سطح پر، یوم شہدا کشمیر کا دن منانے میں سراپا احتجاج، مظاہرے کر رہے تھے، پاکستان نے عین اسی دن کئی سالوں سے بند واہگہ کے راستہ ہندوستان اور افغانستان کی تجارت کھول دی۔ اس سے ہندوستان کے محاصرہ میں یرغمال، مظلوم کشمیری عوام کو کیا پیغام دیا گیا ہے۔ اور مزید دکھ کی بات یہ ہے، کہ ناراضگی کے خوف کے احساس کی وجہ سے، جموں کشمیر کے حکمران اور تینوں حصوں میں منقسم عوام، اپنے برادر ملک سے واہگہ کے راستہ تجارت کے خلاف احتجاج بھی نہ کر سکے۔

متذکرہ بالا واقعات اور حالات، بالخصوص پاکستان کی عملی کشمیر پالیسی، جموں کشمیر سے متعلق بین الاقوامی معاہدات، اعلانات اور باہمی مذاکرات میں، پاکستان نے ہندوستان کو ریاست میں جارحانہ تسلط مستحکم کرنے میں، جو رعایتیں اور سہولتیں دیں، ان پر وزارت خارجہ پاکستان اسلام آباد اور دیگر مقامات پر منعقد ہونے والی، آل پارٹیز کانفرنسوں، سیمینارز میں اور لبریشن لیگ کے پلیٹ فارم سے ہم نے متذکرہ بالا اپنا نکتہ نظر باوصف اختلاف رائے کے، پوری جرأت اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔ پریس اور سوشل میڈیا ہمارے مؤقف کے شاہد ہیں۔

یہ مؤقف دہرانے میں کوئی عار نہیں، کہ کئی دہائیاں گزر جانے اور جموں کشمیر کے عوام کی تحریک آزادی

میں کئی مد و جذر اور تبدیلیاں رونما ہونے کے باوصف، جموں کشمیر کے عوام ریاست جموں کشمیر کے تشخص، اس کی وحدت اور مکمل آزادی کے روز اول سے، طے کردہ نصب العین پر قائم جدو جہد میں برسرپیکار ہیں۔ ان جدو جہد میں حصول نصب العین کا طریق کار ۴ اور ۲۴ راکتوبر کے جاری کردہ اعلامیہ اور قائداعظم کے یکم نومبر ۱۹۴۷ء کے ہندوستان کے گورنر جنرل کے سامنے بیان کردہ مؤقف اور سیکیورٹی کونسل میں ۱۵ رجنوری ۱۹۴۸ء کو پیش کردہ، جواب دعویٰ میں اختیار کرنے کے اصول میں ہے۔ ہندوستان کے نمائندہ، گوپال سوامی آئینگر نے ۱۵ رجنوری ۱۹۴۸ء کو سیکیورٹی کونسل میں یہ تسلیم ہوا ہے، کہ جموں کشمیر آزاد، خودمختار ریاست ہے۔ ریاست کے عوام کو حق اور اختیار حاصل ہے، کہ ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کریں یا خودمختار رہ کر اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کریں۔ ہندوستان اور پاکستان، دونوں اس کمٹمنٹ کے پابند ہیں اور اقوام متحدہ نے بھی ریاست کی الگ حیثیت اور اس میں بسنے والے عوام کو، ریاست کی مستقبل میں حیثیت اختیار کرنے کے حق اور اختیار کی توثیق کر رکھی ہے۔ بالخصوص سیکیورٹی کونسل کی ۳۰ رمارچ ۱۹۵۱ء اور ۲۴ رجنوری ۱۹۵۷ء کی متفقہ منظور کردہ مینڈیٹری، امتناعی قراردادوں کے، ہندوستان اور پاکستان نے دونوں پابند ہیں اور ریاست یا اس کے کسی حصہ کو اپنے ملک میں شامل کرنے یا مدغم کرنے کے مجاز نہ ہیں۔ ریاست کے عوام اور بالخصوص جموں کشمیر لبریشن لیگ کا یہ پختہ مؤقف ۱۹۶۲ء سے چلا آرہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اسی مؤقف اور نصب العین پر قائم رہ کر، جموں کشمیر کے عوام کو باعزت اور باوقار آزادی کا مقام حاصل ہوگا۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ
رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد (اقبال)

حرف آخر

آزاد حکومت کے قیام اور مہاراجہ کو حکمرانی سے معزول کرنے کا اعلان، ۴ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہوا اور اس عبوری، عوام کی حکومت کو، مکمل ترتیب ۲۴ راکتوبر کو دے کر، مفصل قومی آزادی کا کلیدی اعلامیہ، جاری کیا گیا، جو آج تک بلاترمیم قائم ہے۔ وزیراعظم پاکستان کی، اس کو تائید حاصل تھی، ہندوستان کے وزیراعظم سے پیغامات کے تبادلہ میں اس کا ذکر موجود ہے اور اس کی توثیق، قائداعظم محمد علی جناح نے، بحیثیت گورنر جنرل پاکستان، ہندوستان کے گورنر جنرل، ماؤنٹ بیٹن سے لاہور میں، یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو، جموں کشمیر پر مذاکرات میں بھی کی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے، میرپور اور پلندری کے دورہ کے دوران، آزاد کشمیر کا قومی ترانہ پیش ہونے پر ،احترام میں کھڑے ہوکر، آزاد کشمیر کے پرچم کو سلامی دی اور آزاد کشمیر فوج سے گارڈ آف آنر بھی لی۔ جب ہندوستان نے مسئلہ کشمیر سیکیورٹی کونسل میں پیش کیا، تو پاکستان نے، قائداعظم کی رہنمائی اور نگرانی میں مرتب کردہ جواب دعویٰ میں، جو موقف اختیار کرکے، ۱۵رجنوری ۱۹۴۸ء کو، سلامتی کونسل میں معرکۃ الآرا دستاویز پیش کی ،وہ سنہری حروف ذیل ہیں:

''جموں کشمیر میں نام نہاد حملہ آور قبائلی لشکر نہیں، بلکہ خود کشمیر کے عوام ہیں جو مشکل ترین حالات میں، ڈوگرہ آمریت کو ختم کرنے اور ریاست پر ہندوستان کے قبضہ اور تسلط کے خلاف جہاد کررہے ہیں۔

آزاد کشمیر افواج میں، جموں کشمیر کے سپوت ہی شامل ہیں، جس کی توثیق و تائید بین الاقوامی صحافیوں اور پریس نے بھی کی ہے اور عالمی مبصرین نے بھی تائید کی ہے۔ آزاد کشمیر فورسز، ریاست میں جہاں جہاں جاتی ہیں ،عوام ان کو بطور آزادی کی فوج ،استقبال کرکے بغل گیر ہوتے ہیں۔ پاکستان کا اور ہمارا آزاد کشمیر حکومت اور اس کی افواج پر کوئی اثر یا کنٹرول نہیں ہے''۔ (اقتباس تقریر ظفراللہ خان)

''ریاست کی مسلم آبادی نے آزاد حکومت قائم کی ہے، جس کی افواج اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہی ہیں''۔ دستاویز ۱۱ شق (سی)۔ ''مسلم عوام نے آزادی کے لئے جان کی بازی لگادی ہے۔ قانون آزادی ہند اور پالیسی کے تحت ریاست کو اختیار ہے، کہ وہ کسی ملک سے الحاق کرلے یا آزاد خودمختار رہے''۔

(دستاویز ۱۱ پیراگراف ۷ جواب دعویٰ پاکستان)

آزاد حکومت ایک مسلمہ حقیقت ہے، جو جموں کشمیر کے دونوں حصوں کے عوام کی نمائندہ ہے۔ اگرچہ اس کے اعلامیہ میں غیر مسلم عوام کی نمائندگی کا بھی دعویٰ ہے، مگر غیر مسلم اس میں شامل نہیں ہیں، ان کو بھی نمائندگی کی دعوت دی جانی چاہیے اور ان کی عملاً شمولیت تک نمائندگی کا حق محفوظ رکھا جانا لازمی ہے۔ اسی طرح گلگت بلتستان کا انتظامی ڈھانچہ مقامی سطح پر سہولت کار کی خاطر قائم رکھ کر، ریاستی حصہ کی حیثیت میں، قانون ساز اسمبلی اور کونسل کو سینٹ کی حیثیت دے کر، اس میں انہیں نمائندگی دی جانی ضروری ہے۔ آزاد حکومت ،اس کا دائرہ اختیار دو حصوں میں، ساری ریاست کی سطح پر اور مقامی و مہاجرین مقیم پاکستان مع بیرونی ممالک میں، رہائش

پذیر باشندگان ریاست کی حد تک، مسلمہ ہے۔ اس کا علاقائی دائرہ اختیار تو اقوام متحدہ کی قرار دادوں میں بھی تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ ہندوستان بھی اس کو تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا ابتدا میں، اختیار کیے گئے مؤقف کو عملی طور پر، مؤثر اور فعال کردار کے طور پر شروع کرنا چاہیے۔ اقوام متحدہ کے مقرر کردہ کمشن میں شامل، نمائندگان اور ثالث کے طور پر مقرر کردہ ممبران کی پیش کی گئی جملہ تجاویز اور رپورٹوں میں، آزاد حکومت اور اس کی افواج کی موجودگی اور فعالیت کو تسلیم کیا گیا ہے، ان تمام ممالک اور اسلامی ممالک کی تنظیم، جس تنظیم نے، آزاد حکومت کو مبصر کے درجہ کی رکنیت دے رکھی ہے، ان اسلامی ممالک میں آزاد حکومت کے مبصر کی سطح کے سفارتی دفاتر قائم کرنے کی تحریک کرکے، وہاں پر آزاد خود مختار ریاست کے حق میں، تحریک آزادی کی تبلیغ اور پروپیگنڈہ مہم شروع کرنی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی ممالک اور دیگر ہمدرد اور حمایتی، چین جیسے ممالک کی حمایت سے آزاد حکومت کو، اقوام متحدہ میں، شروع میں، فلسطین کی طرح، مبصر رکن کی حیثیت دلوائی جائے، اس میں سنجیدہ کوشش کی ضرورت ہے۔ آزاد حکومت کے لئے مبصر رکن کا مقام حاصل کرنا، مشکل نہیں ہے۔ اکیسویں صدی آزادی اور جمہوریت کی صدی ہے۔ جموں کشمیر کا مسئلہ پہلے سے ہی بین الاقوامی شہرت کا حامل، حل طلب مسئلہ ہے، جو سیکیورٹی کونسل، کے ایجنڈا پر بھی موجود ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کو ہندوستان و پاکستان کے مابین زمینی تنازعہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ تاہم جموں کشمیر کے دو کروڑ عوام کا حق خود ارادیت مسلمہ ہے اور جنوبی ایشیا میں دو متحارب ایٹمی قوت کے حامل، ممالک کے درمیان تنازعہ کو، جموں کشمیر کو آزاد خود مختار ریاست تسلیم کرکے یہ تنازعہ آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے، جس کے لئے عالمی حمایت آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ آزاد خود مختار ریاست کی تحریک شروع کرنے میں معاونت حاصل کرنے میں، آسانی کا ایک پہلو یہ بھی ہے، کہ ماضی میں امریکہ بھی اس حیثیت کا حامی رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک بڑا طبقہ، مسئلہ کشمیر کی وجہ سے جنوبی ایشیا میں، پڑوسی ممالک میں مسلسل کشیدگی سے بیزار ہے۔ تاجر اور صنعت کار گروپ بھی تعلقات میں بحالی اور رابطہ کے حق میں ہے۔ ہندوستانی حکمرانوں اور سیاستدانوں کو بھی نفرت، ضد اور حسد پاکستان سے ہے، ۱۹۴۷ء میں، کانگرس کے خود پسند لیڈروں کی سوچ اور دعویٰ تھا، کہ پاکستان چند ماہ بھی قائم نہ رہ سکے گا۔ پاکستان کا جوہری عالمی قوت کی حیثیت حاصل کرنا، تو ہندوستان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، لہٰذا آج کا ہندوستان، جس کا کشمیر میں دم گھٹ رہا ہے، عالمی اور جموں کشمیر کے عوام کے دباؤ کے تحت، خود مختار ریاست کے حق میں مان سکے گا۔ اس میں نہ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان کی شکست ہے، بلکہ صرف جموں کشمیر کے عوام کی فتح اور کامیابی ہوگی۔ اس مدعا اور نصب العین کا سپرنگ بورڈ آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر ہوگی، جو مکمل با اختیار ہوگی۔ البتہ اس کی سیاسی اور سفارتی رہنمائی، پس

پردہ پاکستان کو کرنی ہوگی۔ ''مجھے احساس ہے کہ موجودہ سٹیٹس کو، کے حامی مفاد پرست گروپ، ریاست کے اندر اور باہر، میری سوچ سے، متفق نہیں ہوں گے، مگر ان کو ادراک ہونا چاہیے، کہ موجودہ سٹیٹس کو، ریاست کی تقسیم کے بعد ختم ہو جائے گا اور آزاد کشمیر کے انفراسٹرکچر کا، مالی بوجھ، علاقائی، انتظامی ردوبدل اور ملحقہ علاقوں سے ادغام کی حیثیت میں، ختم کرنا ہوگا۔ یہی انجام گلگت بلتستان کا ہزارہ کے ساتھ ملا کر، کوہستانی صوبہ کی حیثیت میں قیام سے ہوگا۔ نئی اقدار، نئے اسلوب اور رویوں کے ساتھ مجبوراً نباہ کرنا ہوگا۔ ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں''۔

ہندوستان کی اختیار کردہ، کشمیر پالیسی کا تدارک اور جموں کشمیر کے عوام کی جدوجہد کی کامیابی، موجودہ حالات میں، میری تجویز کردہ حکمت عملی اپنانے میں مضمر ہے، اسی میں ریاست جموں کشمیر کی جغرافیائی یکجہتی، سیاسی تشخص کی، شناخت کی ضمانت ہے، اسی سے دریاؤں کے پانی پر تنازعہ کا امکان بھی ختم ہوگا۔ فیصلہ پاکستان اور جموں کشمیر کے عوام کی حالیہ جاری پالیسی کو قبول کرنے یا اس کی نظر ثانی پر، میری تجویز کردہ حکمت عملی اختیار کرنے پر منحصر ہے۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی (اقبال)

❶ شوکت مجید	❷ فرحت مجید	❸ یاسمین مجید	❹ عذرا مجید	❺ ڈاکٹر نجمہ مجید
❻ شاہد مجید	❼ ارشد مجید	❽ شازیہ مجید	❾ اسماء مجید	

❶ شوکت مجید

ڈاکٹر زاہدہ قاسم (اہلیہ)	ڈاکٹر عائشہ شوکت	ڈاکٹر آمنہ شوکت

❷ فرحت مجید

ممتاز ملک (شوہر)	احسن ممتاز	سدرہ ممتاز	صہیب ممتاز

❸ یاسمین مجید

طارق محمود ملک (شوہر)	صدف کامران	طلال عزیز
عروج طارق	فاطمہ طارق	بلال طارق

❹ عذرا مجید

چوہدری شکیل (شوہر)

❺ ڈاکٹر نجمہ مجید

ڈاکٹر عبدالحمید (شوہر)	احمد یونس	فاتحہ حمید	شفق حمید	علی حمید

❻ ارشد مجید

صباحت ارشد (اہلیہ)	محمد عمر ارشد	حسن ارشد	مریم ارشد

❼ شازیہ مجید

سجاد ممتاز ملک (شوہر)	فاطمہ سجاد	محسن سجاد

❽ محمد یعقوب (برادر)

سلیم اختر (اہلیہ)	طاہر یعقوب	امجد یعقوب	نائلہ یعقوب	شمائلہ یعقوب

❾ محمد ایوب (برادر)

نگینہ ایوب (اہلیہ)	طاہرہ ایوب	قمر ایوب

کتابیات

۱۔ میموریز آف جناح	کے ایچ خورشید
۲۔ آتشِ چنار	شیخ محمد عبداللہ
۳۔ کشمکش	چوہدری غلام عباس خان
۴۔ کشمیر ساگا	سردار محمد ابراہیم خان
۵۔ کشمیر آزادی کی دہلیز پر	خواجہ غلام احمد پنڈت
۶۔ سٹرگل فار فریڈم آف کشمیر	پنڈت پریم ناتھ بزاز
۷۔ ہیر اپیرنٹ	ڈاکٹر کرن سنگھ
۸۔ کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی	ڈاکٹر پروفیسر محمد سرور عباسی
۹۔ ایمرجینس آف پاکستان	چوہدری محمد علی
۱۰۔ وائٹ پیپر ۱۹۷۷ء	وزارت خارجہ پاکستان
۱۱۔ آزادی کی جدوجہد	خالد حسن
۱۲۔ کشمیر ڈسپیوٹڈ لیگیسی	السٹر لیمب
۱۳۔ ڈینجر ان کشمیر	جوزف کوربل (چیئرمین یو این کمیشن)
۱۴۔ ڈاکومینٹس آن کشمیر پرابلم	ایم ایس ڈیورا - آرگرور، انڈیا
۱۵۔ خط و کتابت سردار پٹیل	۱۹۴۵ء-۱۹۵۰ء (جلد اول)
۱۶۔ کشمیر	ایم جے اکبر
۱۷۔ دستور پاکستان	دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء
۱۸۔ دستور جموں کشمیر و دستور ہندوستان	۱۹۵۱ء جسٹس اے ایس آنند
۱۹۔ دستور جموں کشمیر	۱۹۵۷ء جسٹس آر پی سیٹھی
۲۰۔ دستور آزاد جموں کشمیر	ایکٹ ۱۹۷۴ء آزاد جموں کشمیر
۲۱۔ شمالی علاقہ جات	فیصلہ ہائی کورٹ آزاد جموں کشمیر، ۸ر مارچ ۱۹۹۳ء

RASKAM

HUNZA

GILGIT AGENCY

GILGIT
Attempts to establish
Dogra Control
C. 1850 - 1890

Most leased from
Kashmir by the
British in 1935

BALTISTAN

SKARDU
Conquered in 1840

1864
Dogra effort to gain foothold
in Southern Sinkiang

VALE
OF KASHMIR

SRINAGAR
Purchased from the
British in 1846

LADAKH

LEH
A Buddhist kingdom conquered
by the Dogras in 1834

1841
Attempted Dogra
invasion of Western Tibet

POONCH

POONCH

Jagir of Poonch
Final Jammu &
Kashmir control in 1938

JAMMU
Dogra Heartland

JAMMU

1841
Attempted Dogra
invasion of Western Tibet

STAGES IN THE CREATION OF THE STATE OF JAMMU KASHMIR